احمد ندیم قاسمی

ندیم کی غزلیں

ندیم کی غزلیں

احمد ندیم قاسمی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۱ء —

پبلشرز — نیاز احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

تعداد: ایک ہزار

قیمت -/۴۵۰ روپے

کمبائن پرنٹرز۔ لاہور

اپنے محبوب بھائی

فتح محمد ملک

کے نام
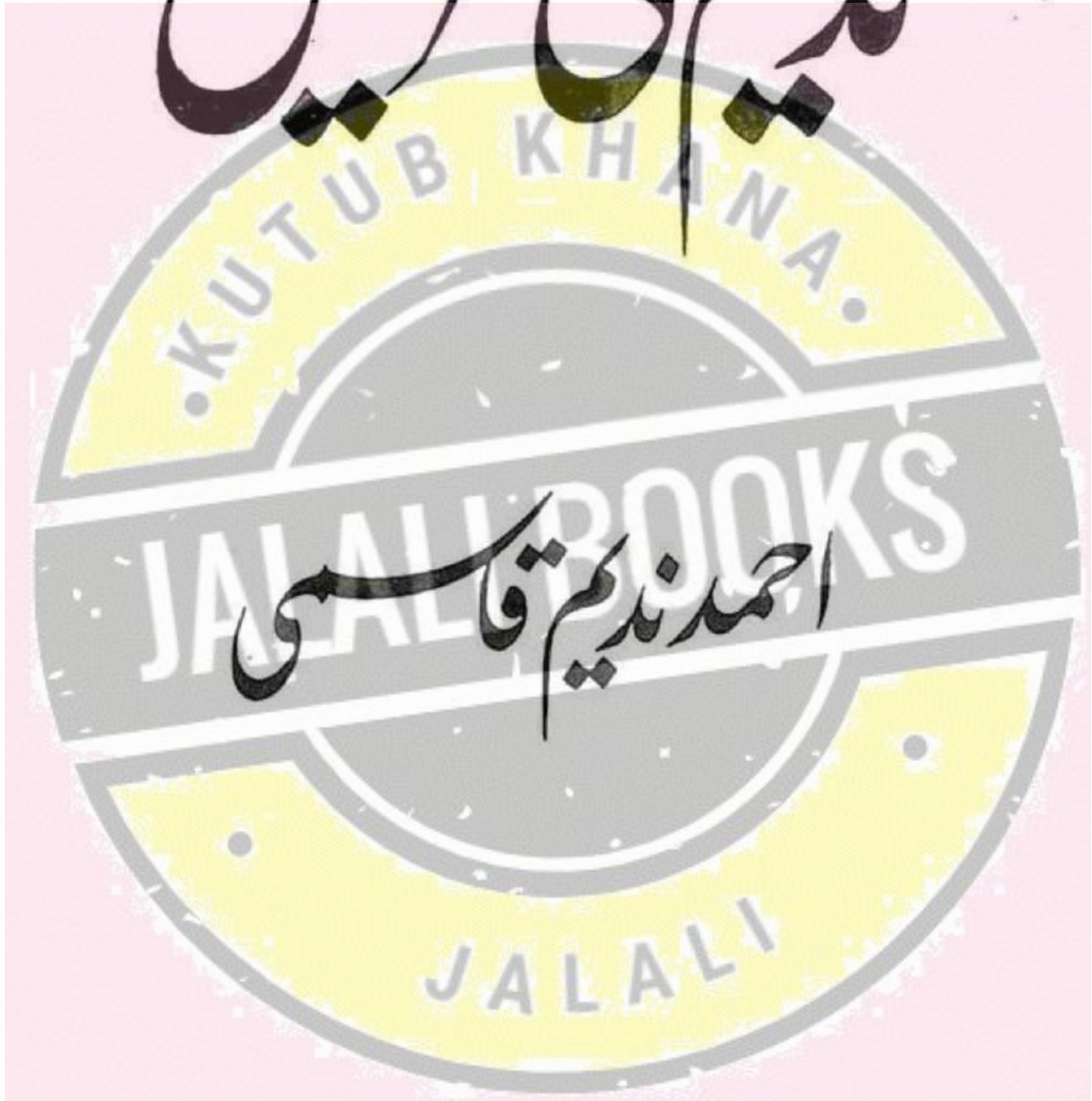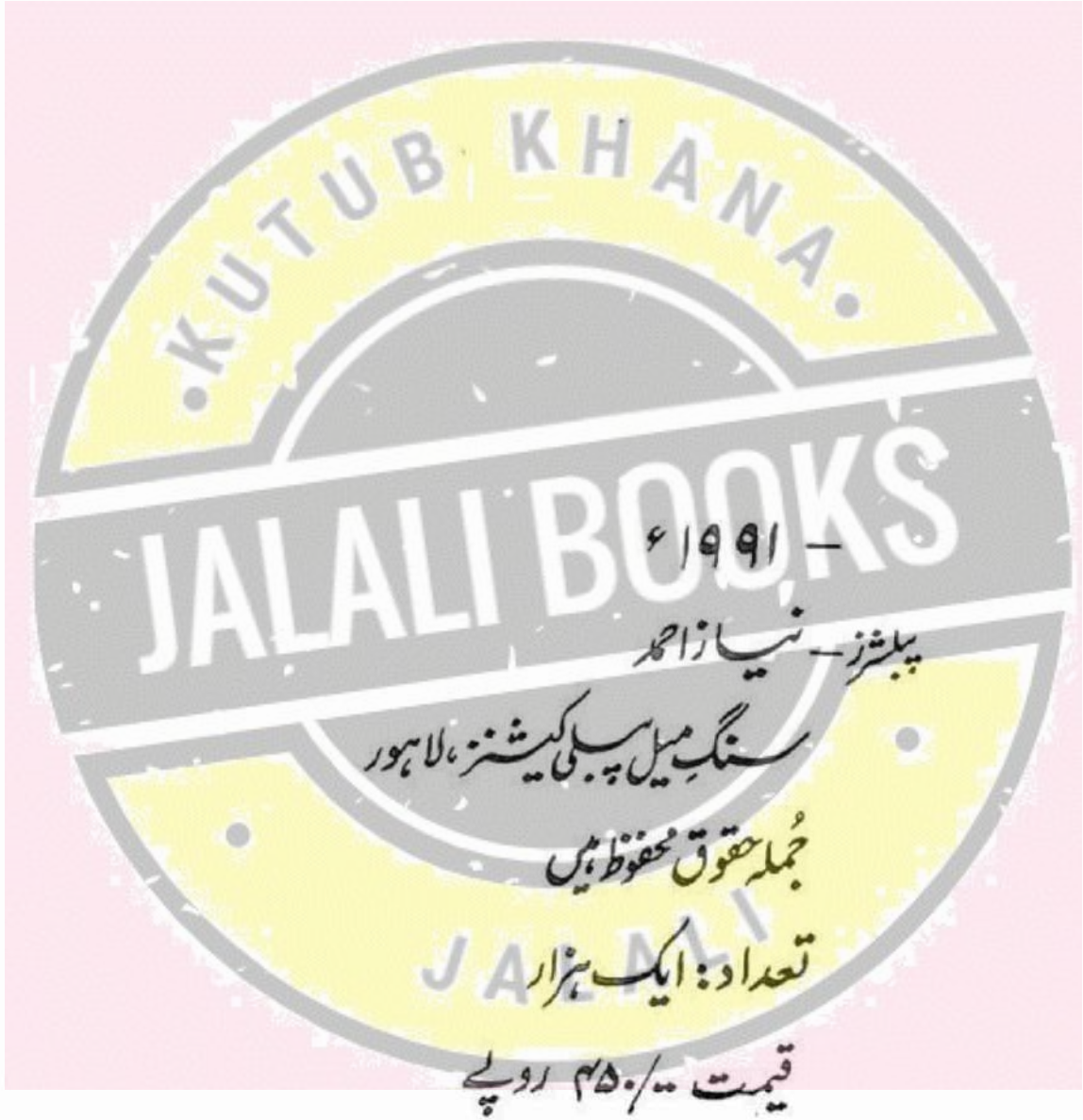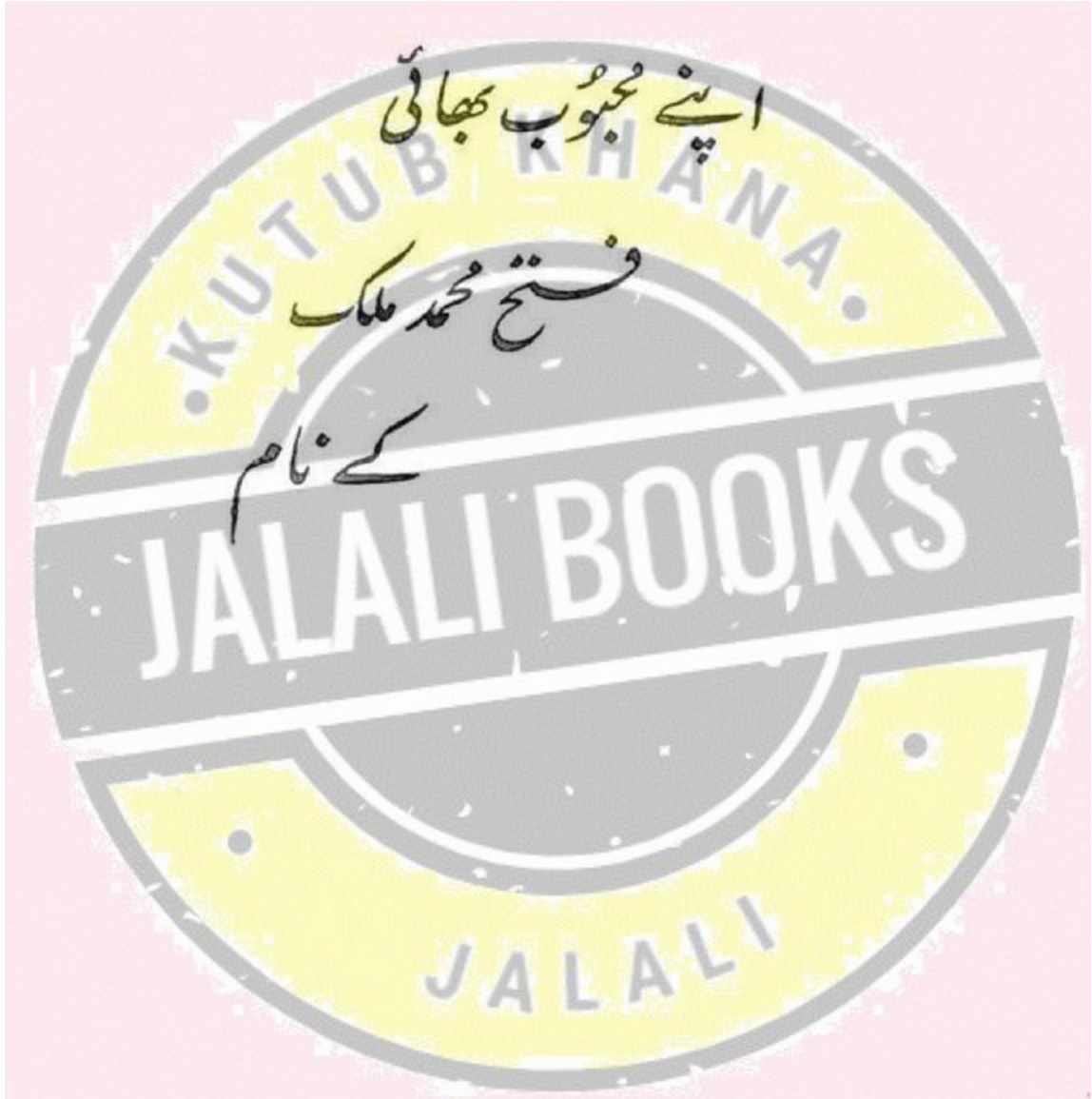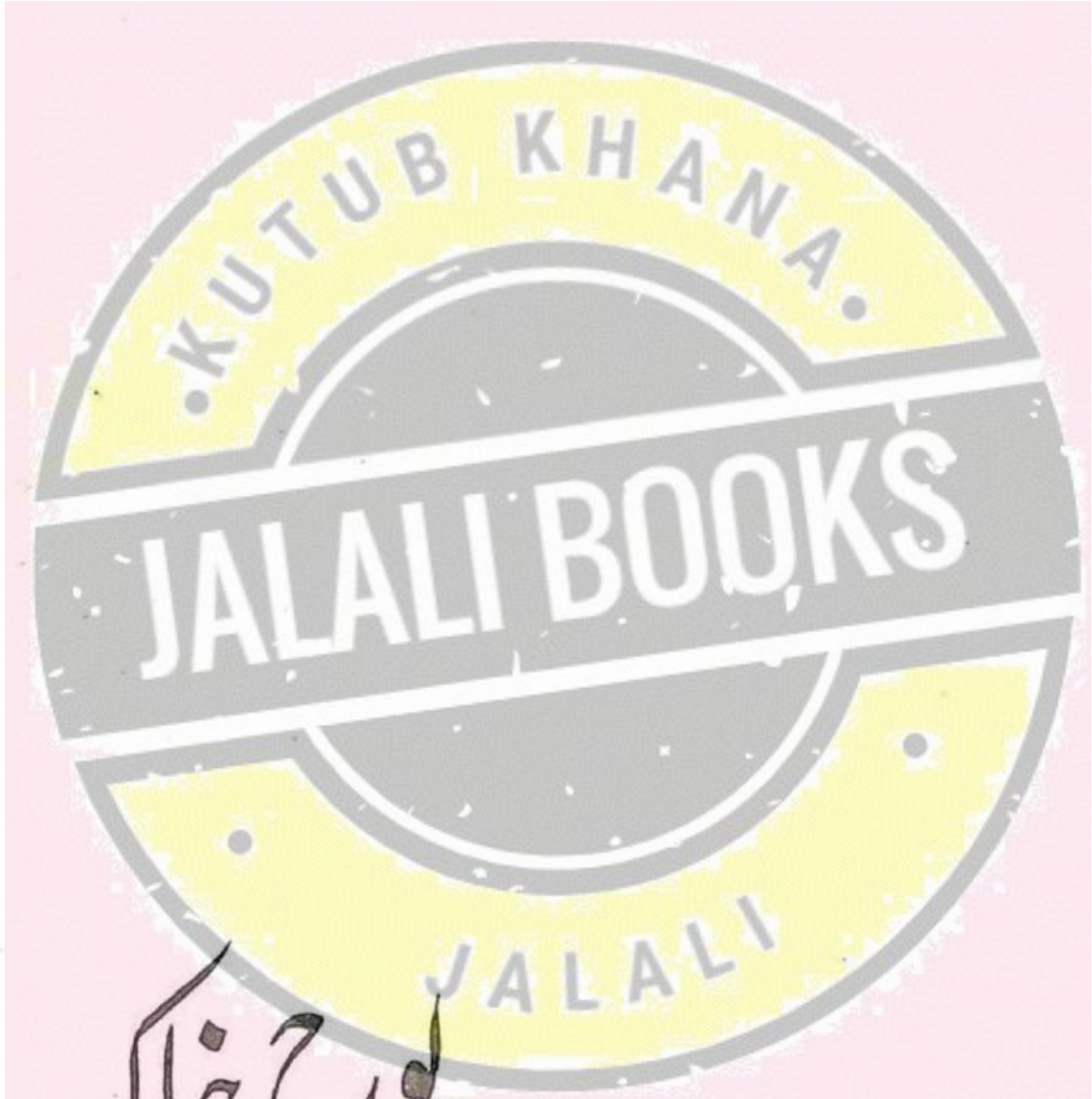
لوحِ خاک
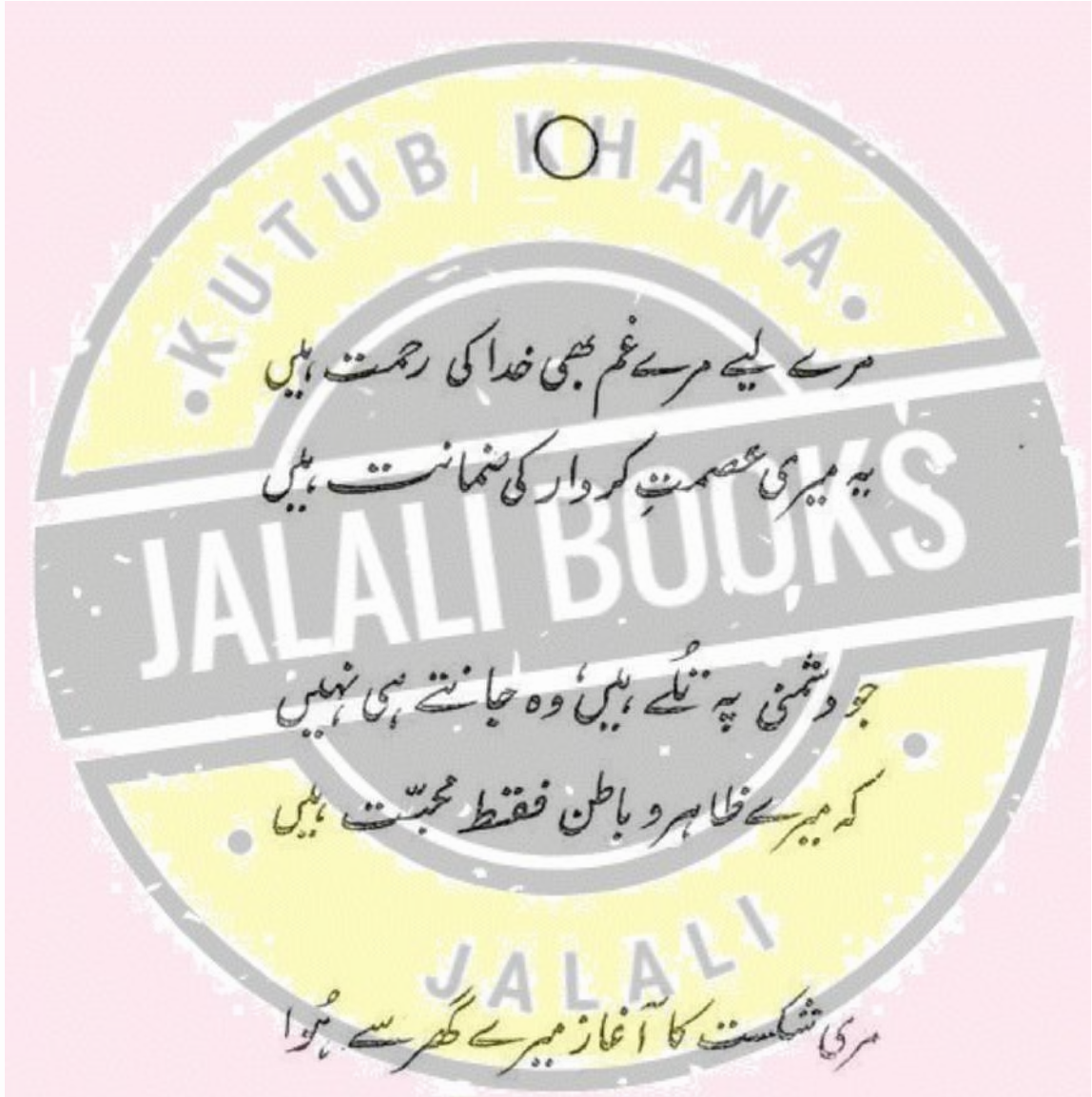
مرے لیے مرے غم بھی خدا کی رحمت ہیں
یہ میری عصمتِ کردار کی ضمانت ہیں

جو دشمنی پہ تُلے ہیں، وہ جانتے ہی نہیں
کہ میرے ظاہر و باطن فقط محبّت ہیں

مری شکست کا آغاز میرے گھر سے ہُوا
یہ اور بات کہ دیوار و در سلامت ہیں

میں جب بھی آئینۂ زندگی میں جھانکتا ہُوں
جو آدمی نظر آتے ہیں، نقشِ حیرت ہیں

جو چہرہ سامنے آیا، وہ سامنے ہی رہا
زوالِ عمر کے دن کِتنے خُوبصورت ہیں

جنوری ۱۹۸۷ء

آئینے میں بھی وہ حیرت نہ رہی
جب حقیقت ہی حقیقت نہ رہی

جب سے آنکھوں میں کھٹکنے لگی ریت
میرے صحراؤں میں وسعت نہ رہی

عشق، تہذیب میں زنجیر ہوا
کوئی شدت، کوئی حدت نہ رہی
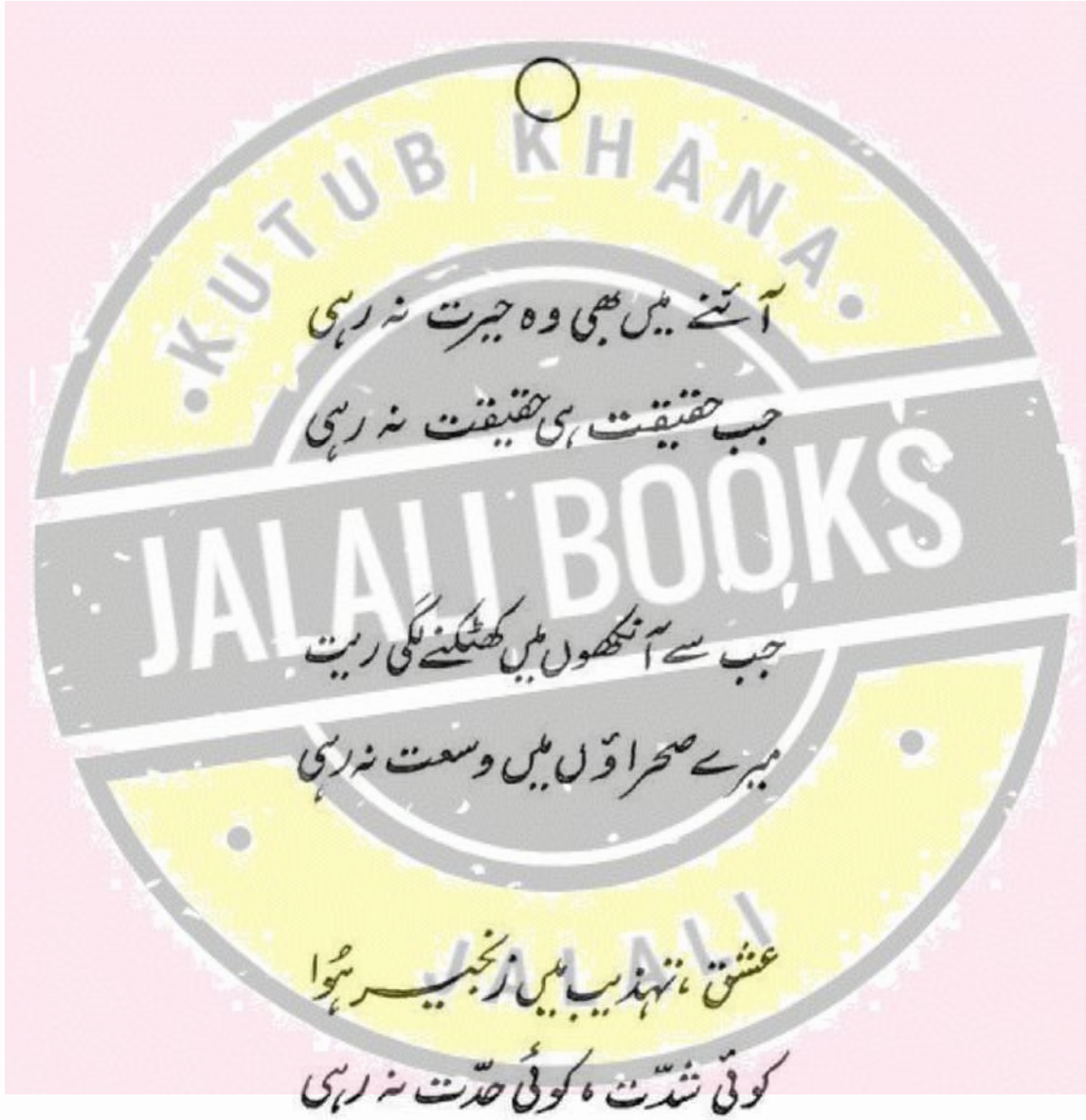
جانے اب تک ہے خدا کیوں تنہا
کوئی خلوت بھی تو خلوت نہ رہی

مُسکراؤں بھی تو کِس برتے پر
اب تو رونے کی بھی فرصت نہ رہی

اب تو تیور ہی بِلک اُٹھتے ہیں
آہ و فریاد کی حاجت نہ رہی

خُود سے بیگانہ ہُوا ہُوں جب سے
مجُھ کو تجُھ سے بھی محبّت نہ رہی

اِتنا پامال ہُوا ذوقِ ندیم
زخم کھانے میں بھی لذّت نہ رہی

ستمبر ۱۹۸۶ء

دل میں محبت درد کے پیڑ اُگاتی رہی
صحرا سے پھولوں کی خوشبو آتی رہی

حبس جو ٹوٹا، مجھے ہوا نے سمیٹ لیا
دیر تلک پھر ماں کی طرح لپٹاتی رہی

رات کو جیسے فرشتے چھت پہ اُترتے رہے
بوندوں میں قدموں کی سی چاپ آتی رہی
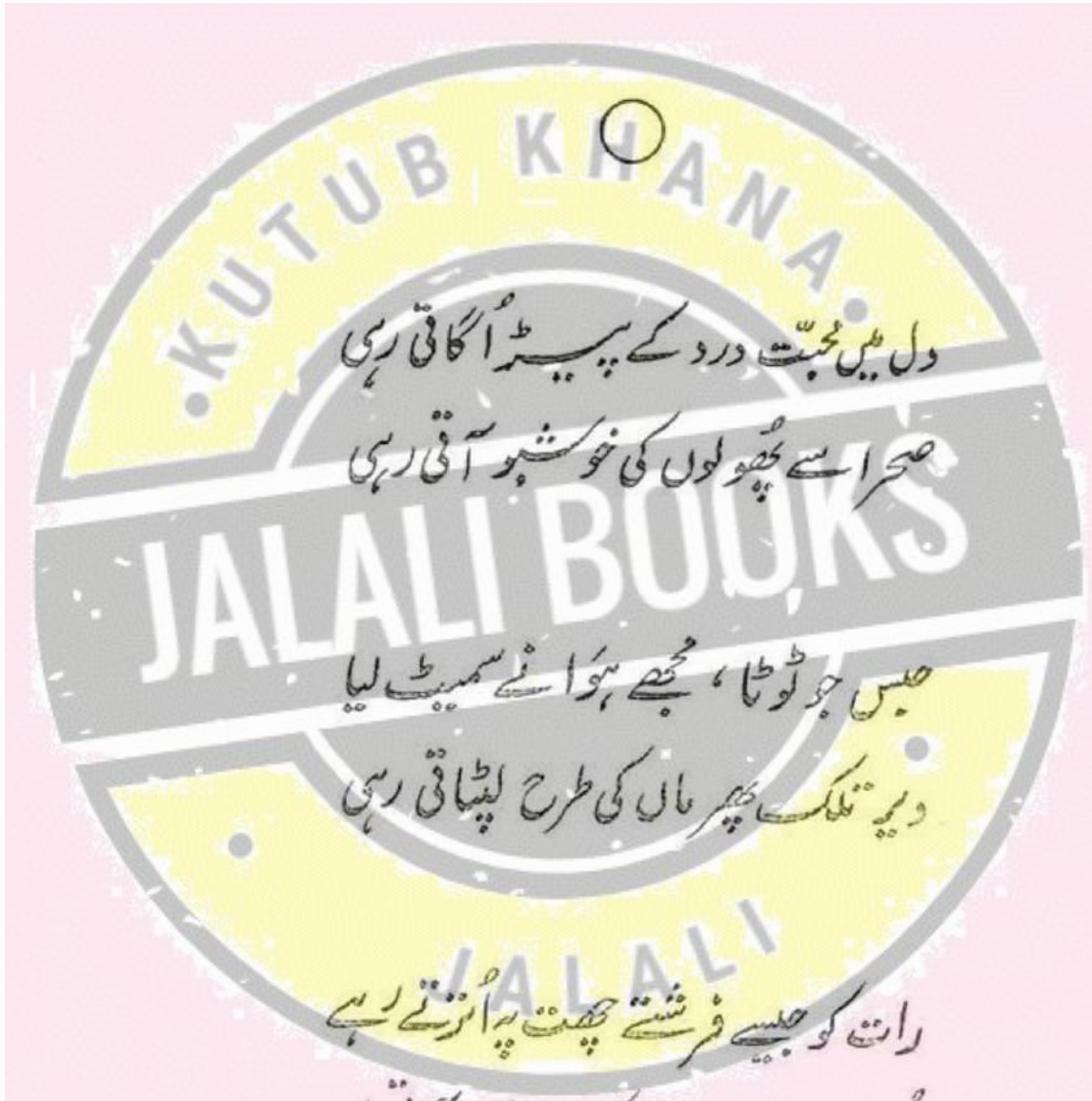
جب کوئی پتّہ ٹوٹ کے جانبِ خاک چلا
شاخ وداعی رنگ میں ہاتھ ہلاتی رہی

جیسے کوئی در پر دستک دیتا ہو
دل کی دھڑکن شب بھر مجھ کو جگاتی رہی

تجھ سے بچھڑ جانے کے بعد، اس لمحے تک
کونج سی اک، میرے اندر کرلاتی رہی

وہ جو ندیم نے صبحِ ازل سے سیکھا تھا
بس وہی نغمہ ہجر کی رات سناتی رہی

ستمبر ۸۶ ۱۹ء

شفق غبار بنی، اور کوچ کرنے لگی
جبینِ وقت پہ گردِ سفر اُترنے لگی

خدا گواہ، ستم گر جری نہیں ہوتا
گجر پہ ضرب پڑی اور رات ڈرنے لگی

زمیں نے پہلے تو نورِ سحر میں غسل کیا
پھر آفتاب کے آئینے میں سنورنے لگی
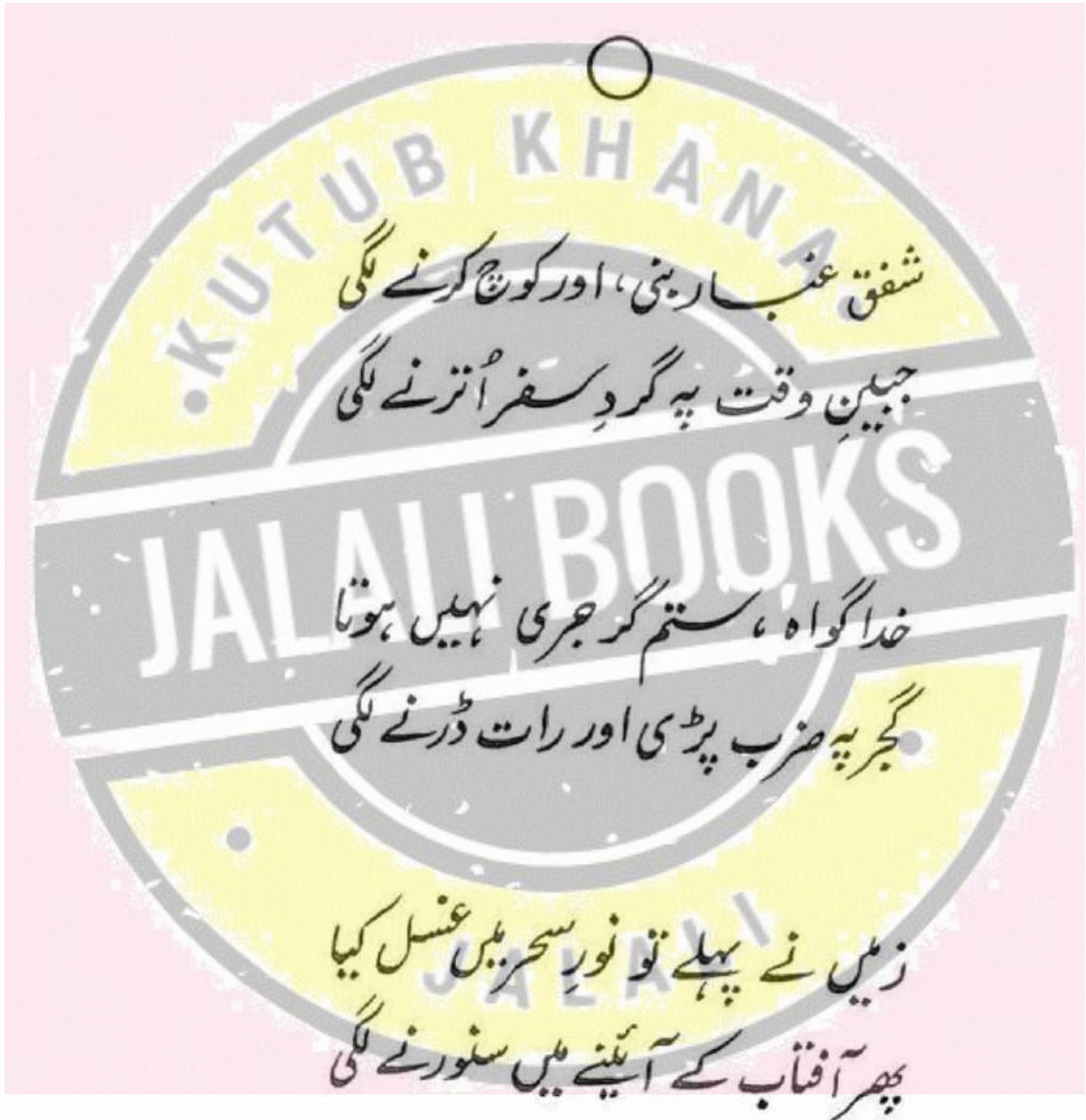
وہ جیسے جلس زدوں کے مزار ڈھونڈتی ہے
قدم قدم پہ نگارِ صبا ٹھہرنے لگی

غزال ساتھ تھے، لیکن شغال تاک میں تھے
حیات جب کسی گلزار سے گزرنے لگی

شبِ وصال کا آغاز ہی قیامت تھا
ندیمؔ وقت کی گردش طرار سے بھرنے لگی

اگست ۱۹۸۶ء
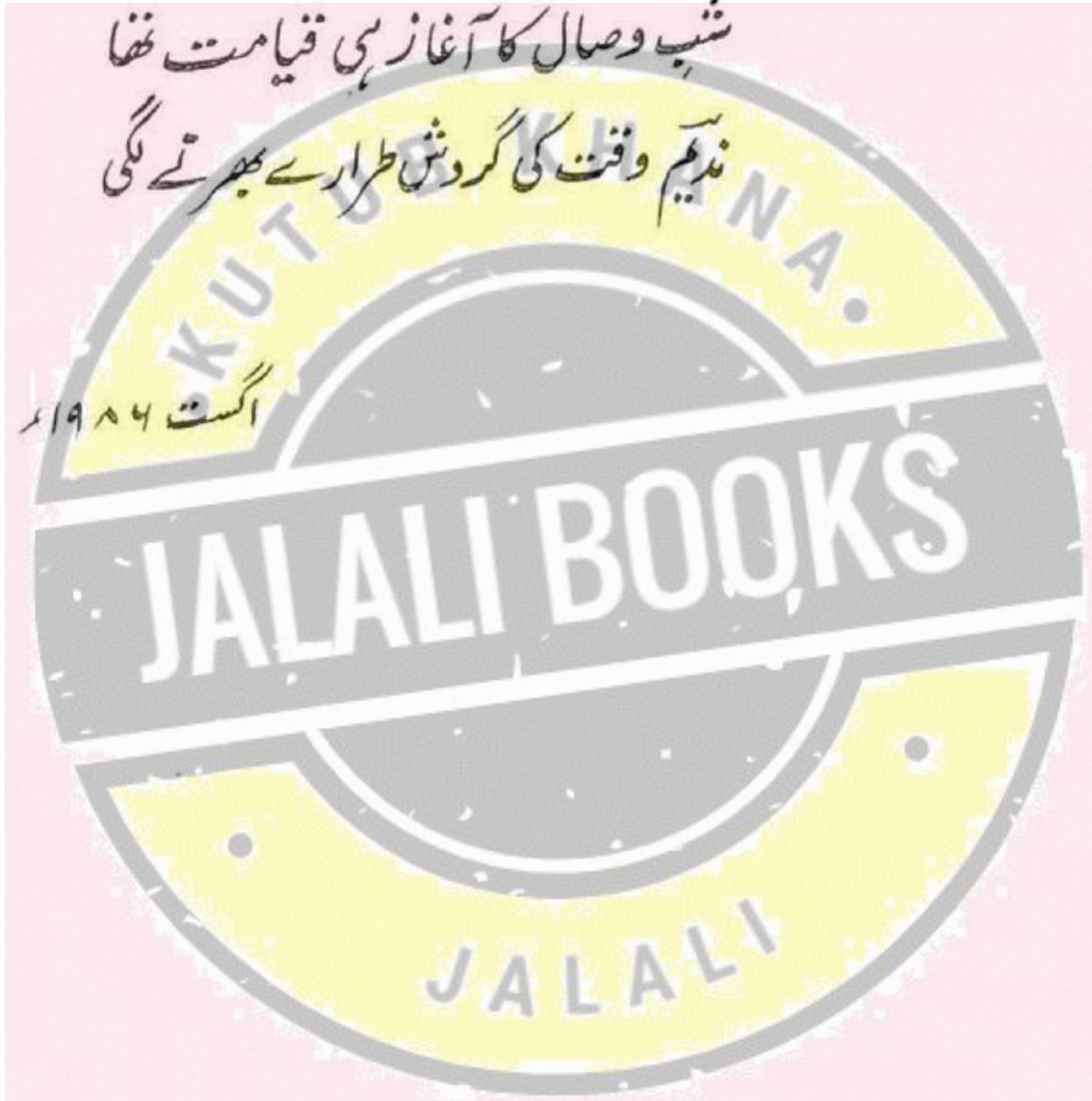
نذرِ یگانہ

ایک بار پھر ہم کو حکمِ انتظار آئے
ایک بار پھر دل کو بے سبب قرار آئے

تیرے ہجر میں ہم نے، نفی وقت کی کر دی
رات کیا گزاری ہے زندگی گزار آئے

اب سکوں سے جینے کا، اپنے پاس گُر یہ ہے
رو لیے کہیں چھُپ کر، اور تھکن اُتار آئے

کاروبارِ اُلفت میں نقد تھا ہر اِک سودا
ہم جو خالی ہاتھ آئے، اپنی جاں ہی وار آئے

ابتدائے عالم سے، آدمی کے دامن میں
صرف چار لمحے ہیں، وہ بھی مستعار آئے

ہم بساطِ دُنیا کے کچھ عجب کھلاڑی تھے
کائنات کی خاطر، اپنی ذات وار آئے

صرف ایک سُورج ہی روشنی نہیں دیتا
صدیاں جگمگا اُٹھیں، جب فرازِ دار آئے

فروری ۱۹۸٦ء

طلوعِ صبح کا الزام میرے سر آیا
کنوئیں کی تہہ سے مجھے آسماں نظر آیا

صدا ذرا سی بھی، اس خامشی میں حادثہ تھی
خود اپنے دل کے دھڑکنے سے مجھ کو ڈر آیا

میں دشت و کوہ میں ہوں یا خود اپنے آنگن میں
نکل کے گھر سے، میں دراصل اپنے گھر آیا
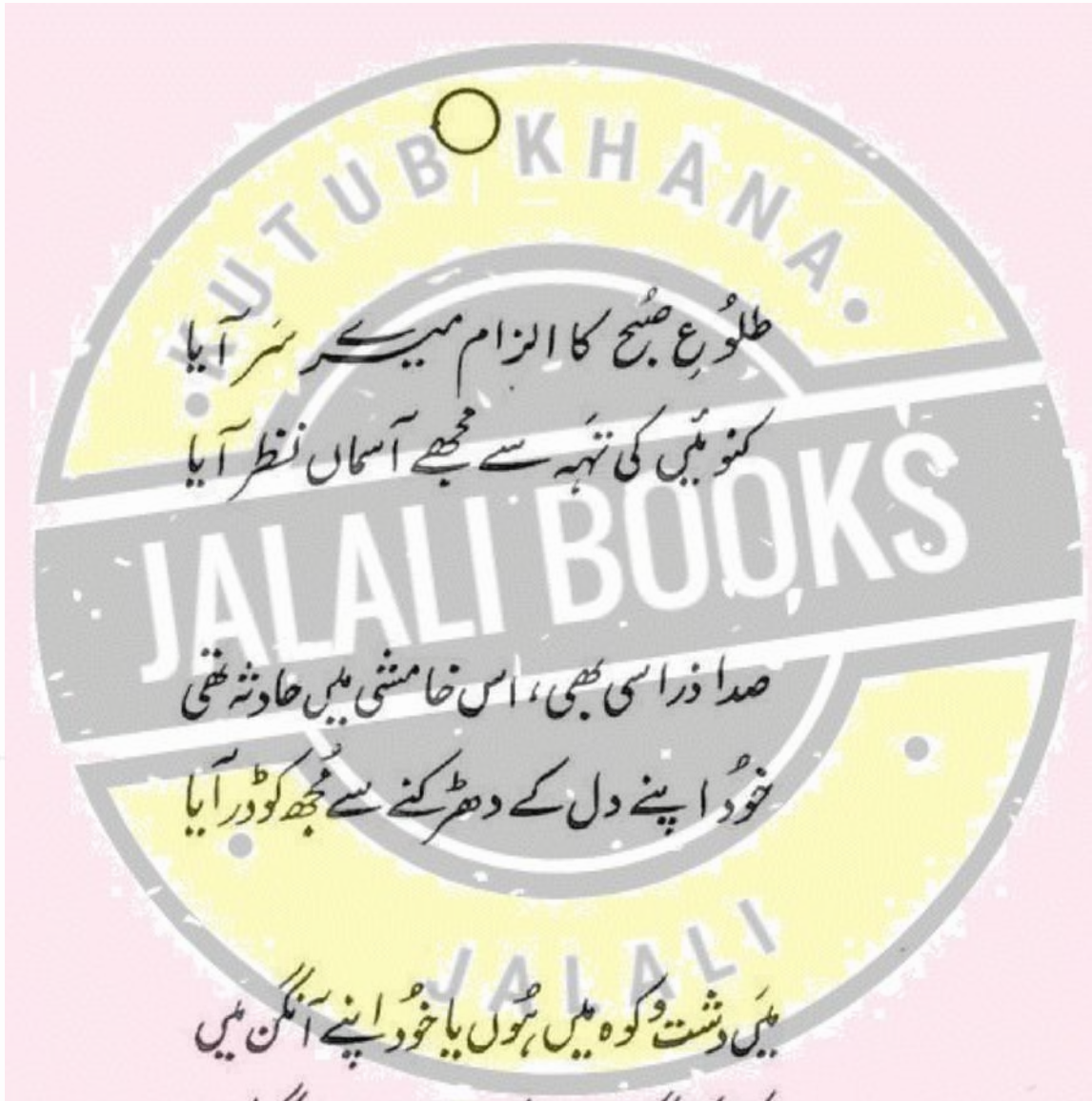
یہ ایک اشکِ ندامت مجھے ڈبو ہی نہ دے
سمندروں سے تو میں بے خطر گزر آیا

اس آدمی کے شعور و غرورِ ذات سے ڈر
اُنا بچا کے جو افلاک سے اُتر آیا

میں زیرِ تربیّتِ زندگی رہا برسوں
فقط لحد میں اُتر جانے کا ہنر آیا

سفر میں سر پہ برستے رہے ببول کے پھول
ندیم یوں مرے قبضے میں تاجِ زر آیا

اکتوبر ۱۹۸۵ء

شامِ فراق ایک عجب تجربہ ہُوا
جھونکا چلا تو جیسے ترا سامنا ہُوا

کیا جانے اُس کا کوئی ہدف ہے بھی یا نہیں
انساں ہے ایک تیر، ازل سے چلا ہُوا

شبنم چمک اُٹھی کفِ گُل پر کچھ اس طرح
جیسے زمیں پر ہو ستارا پڑا ہُوا

پہلے وہ رنگ رنگ تھا، اب گرد گرد ہے
یہ برگِ خشک ہے کہ نگر ہے لُٹا ہُوا

شہراہِ شب پہ راہنماؤں کی بھیڑ تھی
ہر ہاتھ میں چراغ تھا لیکن بجھا ہُوا

اس دور میں جنوں کے بھی تیور بدل گئے
مجنوں چھپا رہا ہے گریباں سِلا ہُوا

جب انتظار حد سے گزرنے لگا ندیمؔ
ہم نے سُنا سکوت کو بھی بولتا ہُوا

اکتوبر ۱۹۸۵ء
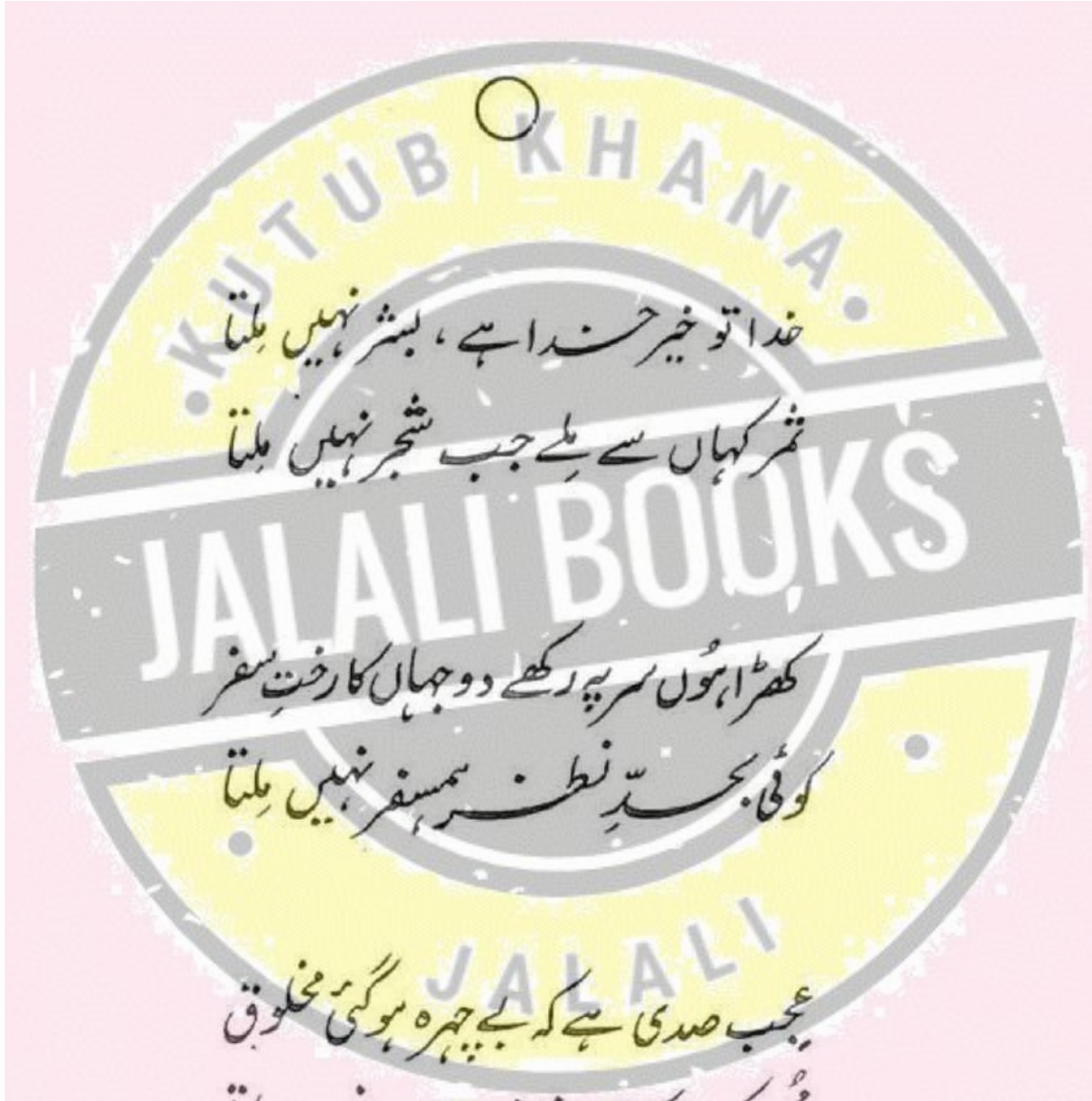
خدا تو خیر خدا ہے، بشر نہیں ملتا
ثمر کہاں سے ملے جب شجر نہیں ملتا

کھڑا ہوں سر پہ رکھے دو جہاں کا رختِ سفر
کوئی بحدِّ نظر ہمسفر نہیں ملتا

عجب صدی ہے کہ بے چہرہ ہو گئی مخلوق
مجھے کسی کے بھی شانوں پہ، سر نہیں ملتا

اسیر رہتے ہیں حالات کی چٹانوں میں
وہ آئنے، جنھیں آئینہ گر نہیں ملتا

اِسی لیے تو جو کل حال تھا، وہ آج بھی ہے
کِسی دُعا کا ثبوتِ اثر نہیں مِلتا

ندیمؔ یوں صدفِ لفظ کے گہر نہ لُٹا
یہاں تو کوئی بھی صاحب نظر نہیں مِلتا

جون ۱۹۸۵ء

۱

کہنا چاہُوں، مگر اے کاش کبھی کہہ پاؤں
آسمانوں سے اُتر آ کہ تجھے اپناؤں

چھان ڈالی ہے زمیں، اور فضا اور خلا
مَیں تری کھوج میں نکلوں تو کہاں تک جاؤں
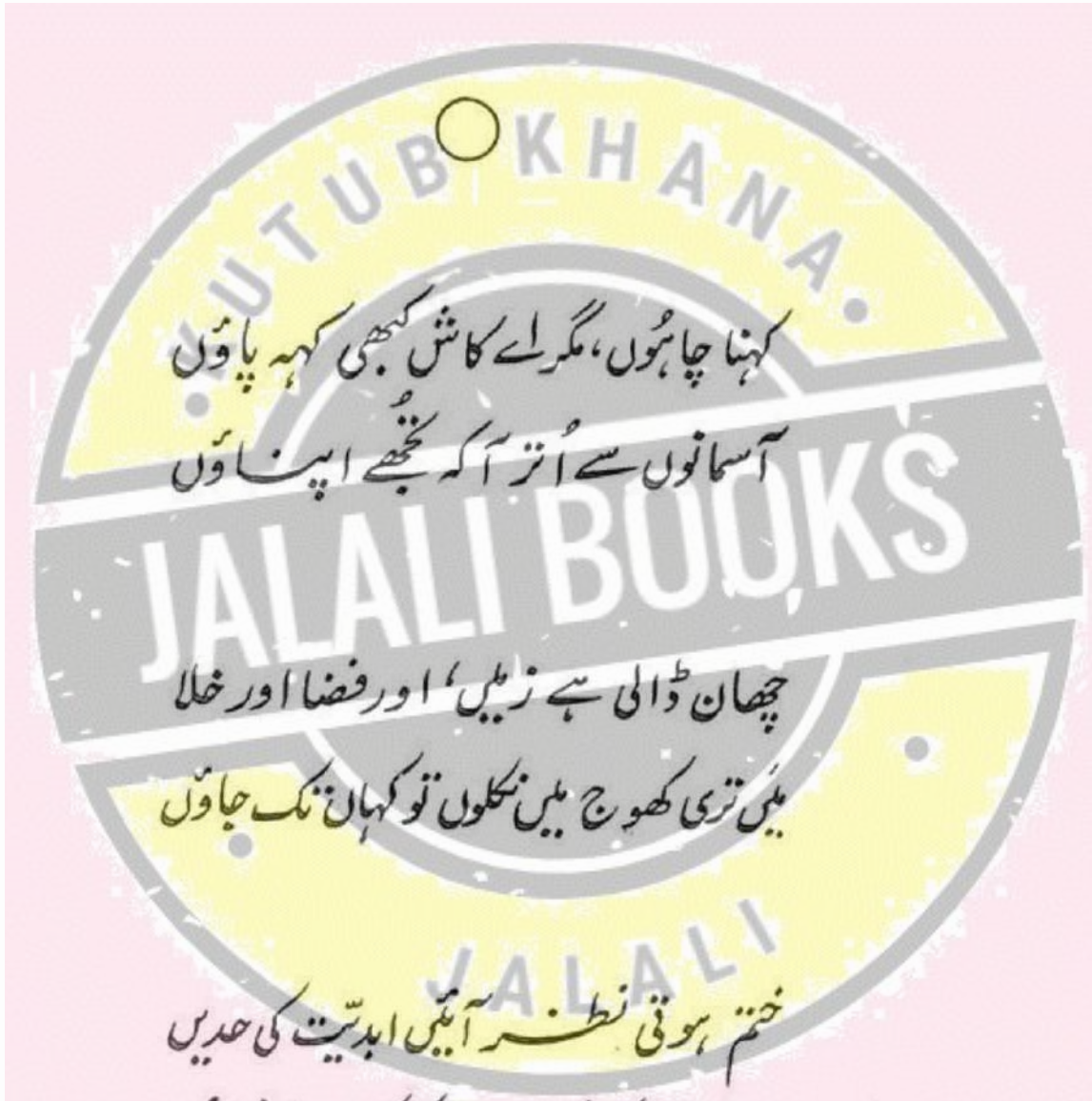
ختم ہوتی نظر آئیں ابدیّت کی حدیں
اس سے آگے مَیں خیالوں کو کہاں پہنچاؤں

تُو نے ہر عدل قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے
اے خدا، مَیں ترا معیار کہاں سے لاؤں

دُھن یہ رہتی ہے کہ صحراؤں کی جھولی بھرنے
کوہ سے چھین کے اِک آدھ گھٹا لے آؤں

کب خزاں ان کو ہرا ہونے کی عزّت دے گی
زرد پتّوں میں اگر اپنا لہُو دوڑاؤں

مَیں پھڑکتا ہُوں تو صیّاد کا کیا جاتا ہے
اپنے ہی خُون سے مَیں اپنا ہی جی بہلاؤں

وہ یہ کہتے ہُوئے، پگھلا ہُوا زر پی جائے
شاید اس طرح کبھی صاحبِ فن کہلاؤں

جنوری ۱۹۸۵ء

بارش کو بُلا رہا ہُوں کب سے
مَیں خاک اُڑا رہا ہُوں کب سے

ہر شاخ ہے برگ و بر سے خالی
اشجار اُگا رہا ہُوں کب سے
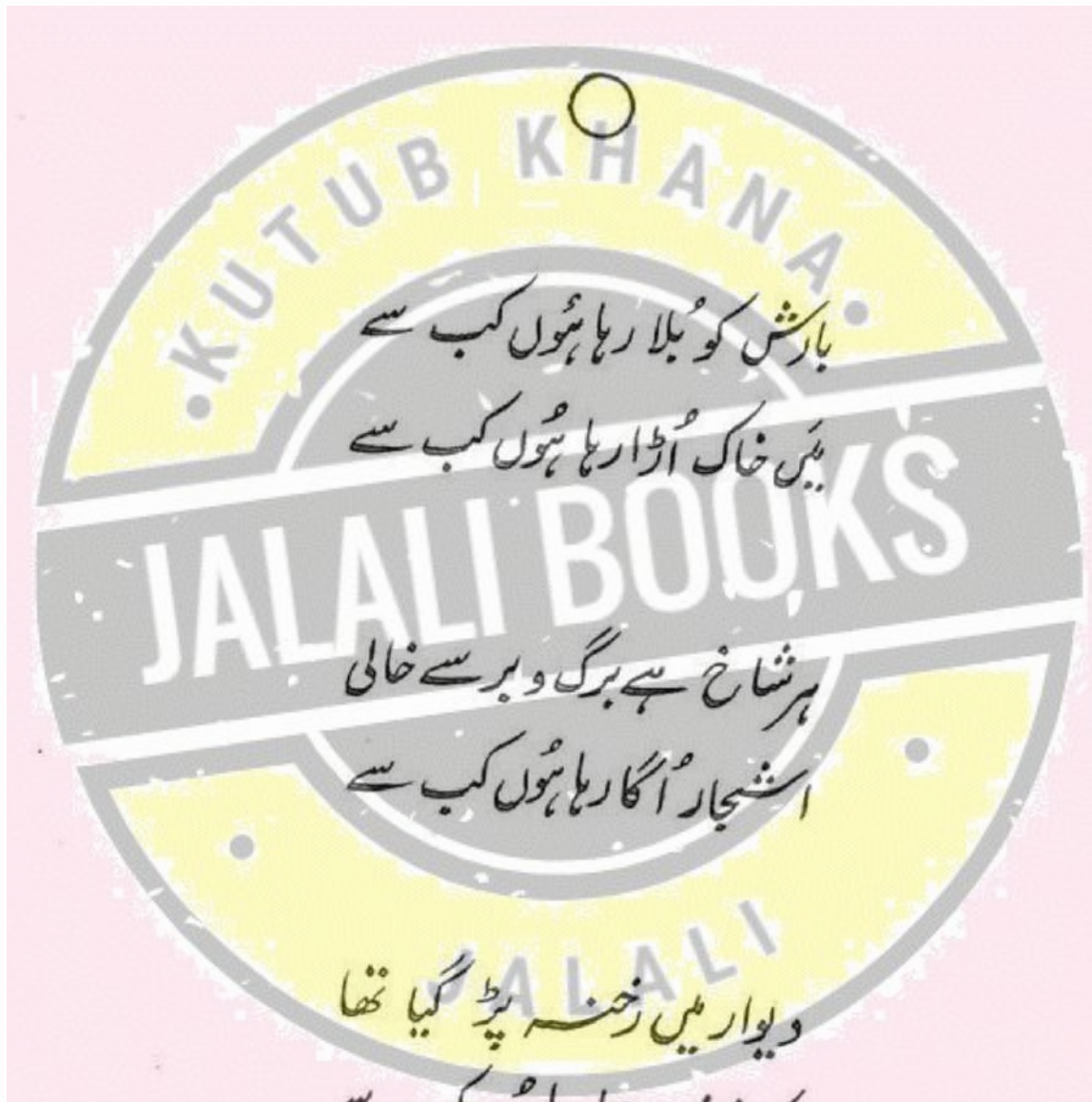
دیوار میں رخنہ پڑ گیا تھا
اِک خشت جما رہا ہُوں کب سے

گرداب میں سَر اُٹھا اُٹھا کر
ساحل کو بُلا رہا ہُوں کب سے

اِک سمت کی جُستجو کی دُھن میں
ہر سمت کو جا رہا ہُوں کب سے

اِک پل نہیں رُکتی یاد اُس کی
مَیں جس کو بُھلا رہا ہُوں کب سے

چہرے ہی نہیں جو منعکس ہوں
آئینے دکھا رہا ہُوں کب سے

جنوری ۱۹۸۵ء

بھلا کیا پڑھ لیا ہے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں
کہ اس کی بخششوں کے اتنے چرچے ہیں فقیروں میں

کوئی سورج سے سیکھے، عدل کیا ہے، حق رسی کیا ہے
کہ یکساں دھوپ بٹتی ہے صنوبروں میں کبیروں میں

ابھی غیروں کے دکھ پر بھیگنا بھولی نہیں آنکھیں
ابھی کچھ روشنی باقی ہے لوگوں کے ضمیروں میں
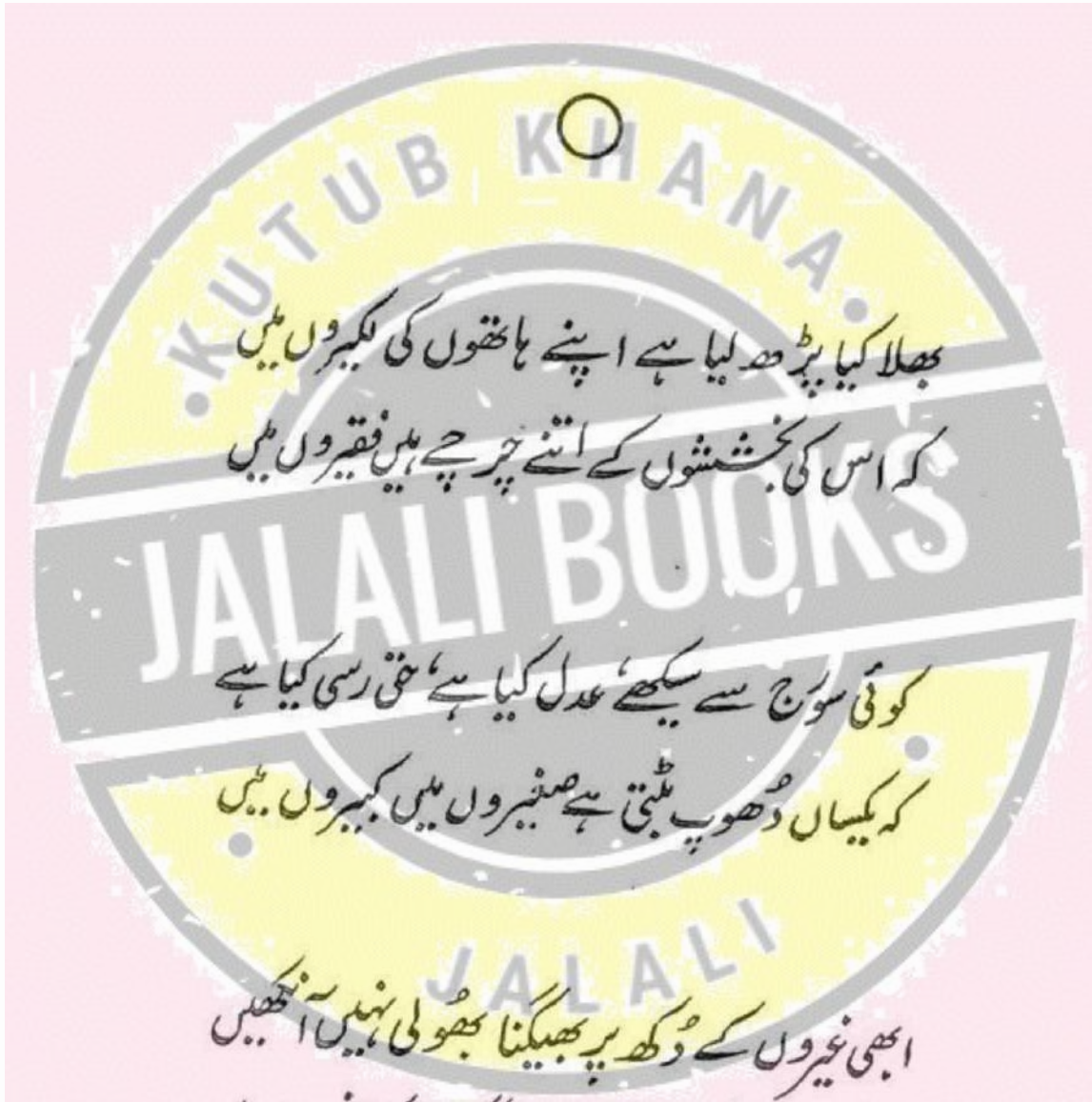
نہ وہ ہوتا، نہ میں اک شخص کو دل سے لگا رکھتا
میں دشمن کو بھی گنتا ہوں محبّت کے سفیروں میں

سبیلیں جس نے اپنے خُوں کی، ہر سُو لگائی ہوں
مَیں صرف ایسے غنی کا نام لکھتا ہُوں امیروں میں

بدن آزاد ہیں، اندر مگر زنجیر بجتی ہے
کہ مَیں مختار ہو کر بھی گِنا جاؤں اسیروں میں

اکتوبر ۱۹۸۴ء

○
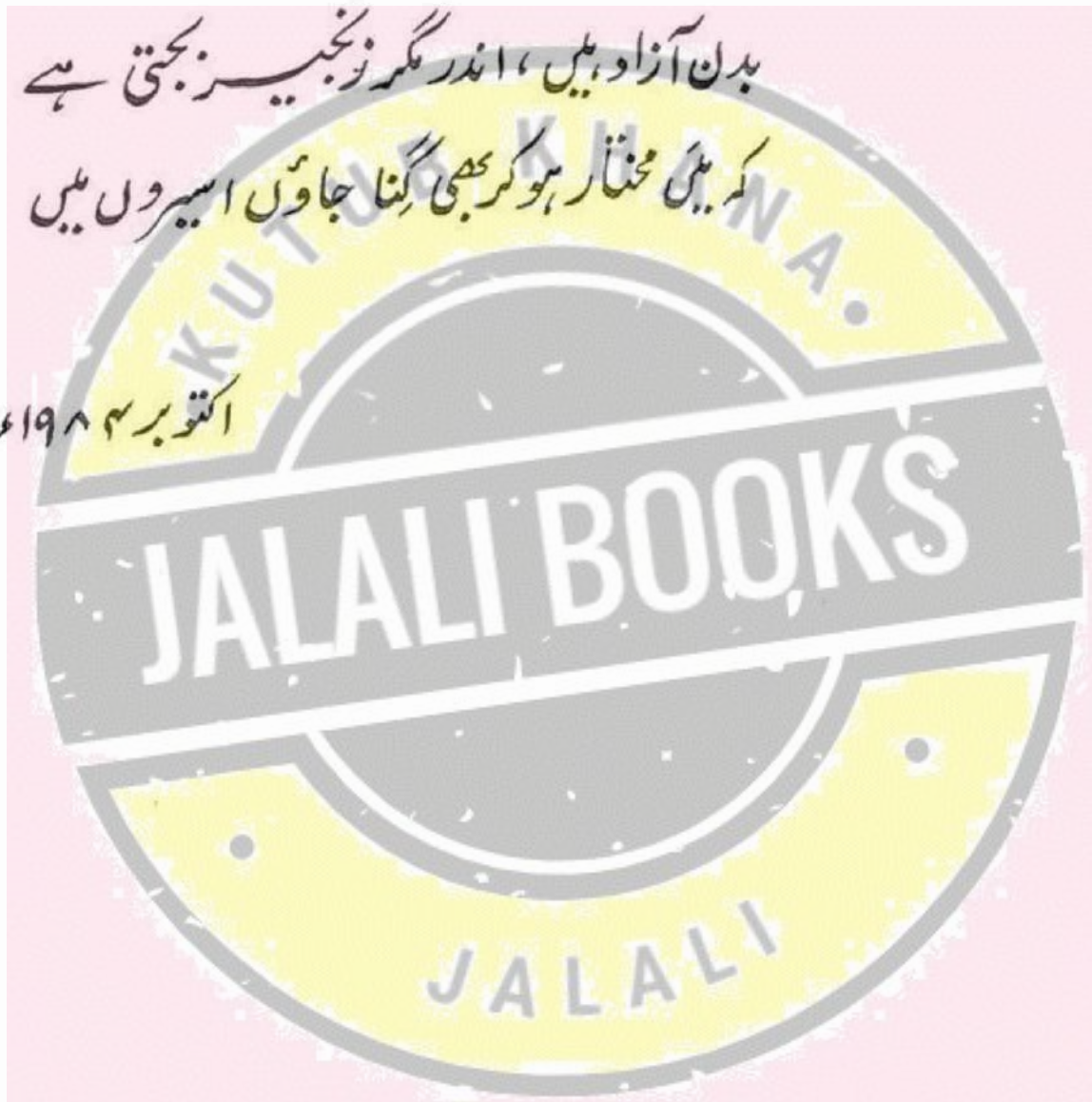
کائناتوں کے تماشائی تھے
ہم کبھی لالۂ صحرائی تھے

خول ٹوٹا جو انا کا، تو کھلا
ہم خود اپنے ہی تمنّائی تھے

عمر بھر بات ادھوری ہی رہی
اور ہم مخزنِ گویائی تھے

عشق کرتے تھے جنوں کی حد تک
جو بظاہر ہمہ دانائی تھے

ہم، بہ ایں دامنِ صد چاک ندیم
تاجدارِ شبِ تنہائی تھے

ستمبر ۱۹۸۲ء

آخرِ کار ہم انجامِ سفر تک پہنچے
تیرے در سے جو چلے، پھر ترے در تک پہنچے

پَو جو پھوٹی تو ستاروں کی لَویں ٹوٹ گئیں
صرف آنسو شبِ فرقت کے، سحر تک پہنچے

راہ میں قصر بھی، معبد بھی، چمن زار بھی تھے
کن خرابوں سے گزر کر ترے گھر تک پہنچے

اتنا بے بس بھی نہیں ساحلِ بحرِ حالات
موجِ پایاب مچل جائے تو سر تک پہنچے

ہر بشر کو جو خدا پاس بلا لیتا ہے
وہ خُدا بھی تو کِسی روز بشر تک پہنچے

اِک شجر تک بھی نہیں ہے مرے صحرا میں ندیمؔ
اور ضِد ہے، کہ مرا ہاتھ ثمر تک پہنچے

نومبر ۱۹۸۱ء
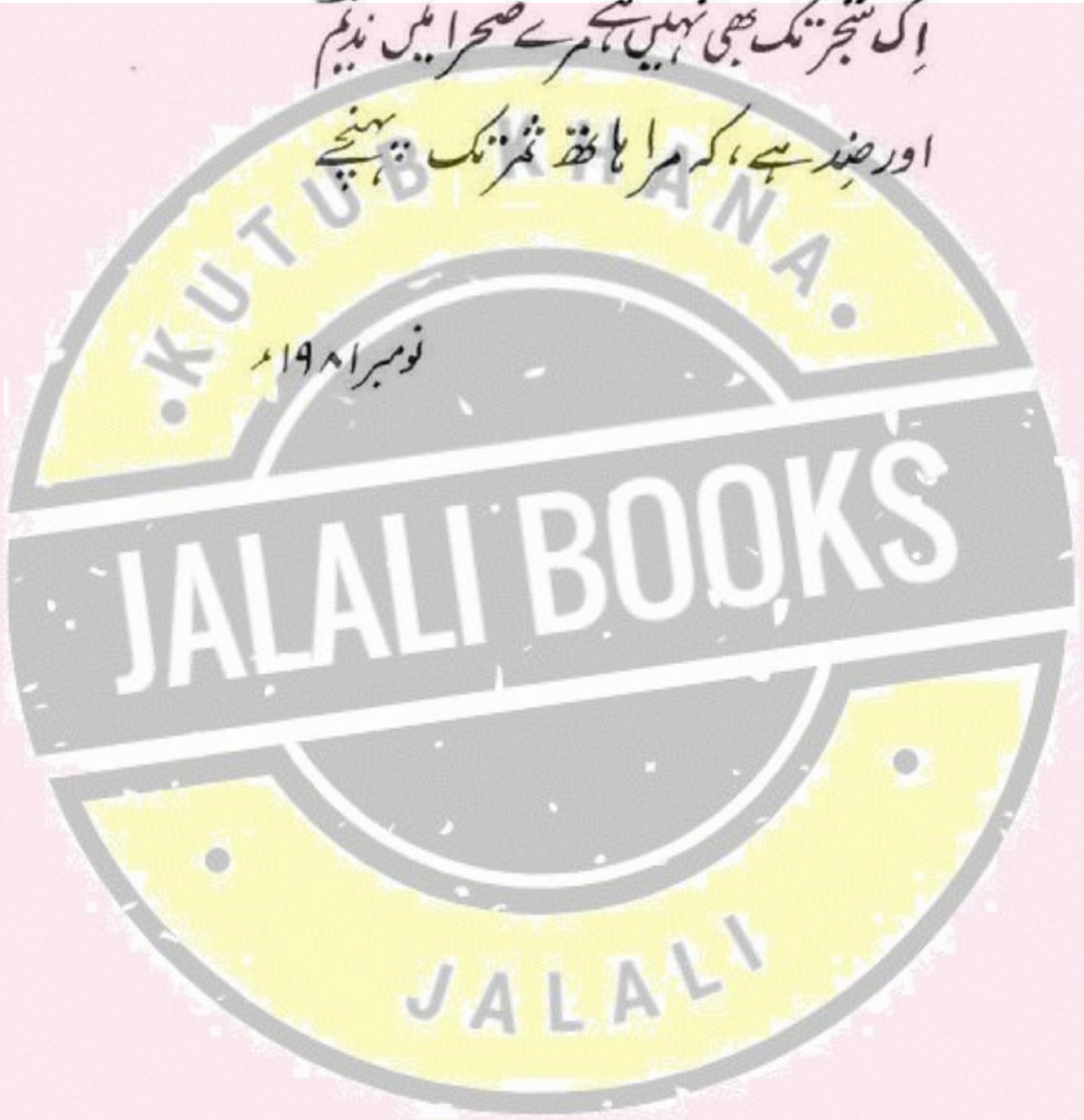
مجھے دُکھ یہ ہے کہ بہار میں بھی طیور بے پرو بال ہیں
مرے ہمسفر نہ ملول ہوں، یہ ملال میرے ملال ہیں

مری بے کلی سے خفا نہ ہو، مری جستجو کا بھرم نہ کھو
تجھے اک جواب وبال ہے، مرے لب پہ لاکھ سوال ہیں

وہ بھی اِک لکیر سی آ بجو، یہ ہے چار سُو کی فضائے ہُو
وہ گھڑی بھی تیرے وصال کی، یہ فراق کے مہ و سال ہیں

یہ عجیب حسنِ قیاس ہے، کہ جو دُور ہے، وہی پاس ہے
یہ تصوّرات کے واہمے، مرے دشتِ غم کے غزال ہیں

یہ جو عرصہ گاہِ خیال ہے، ترا فن ہے، ترا جمال ہے
مری شاعری ہو کہ نثر ہو، یہ سبھی ترے خد و خال ہیں

یہ عجب طرح کا تضاد ہے، یہ دل و نظر کا فساد ہے
مرے تجربے ہیں کمال پر، مرے درد رُو بہ زوال ہیں

نومبر ۱۹۸۱ء
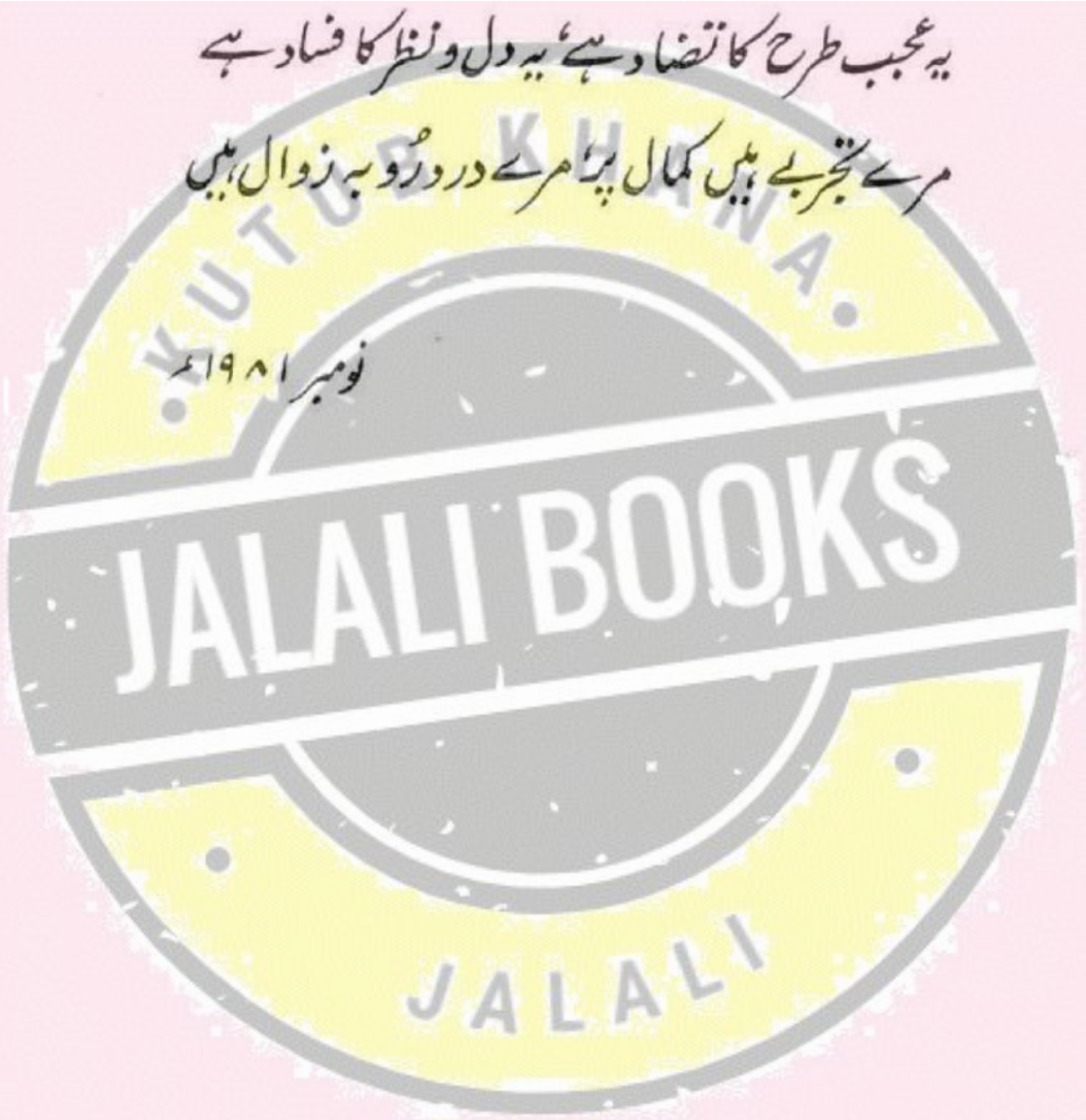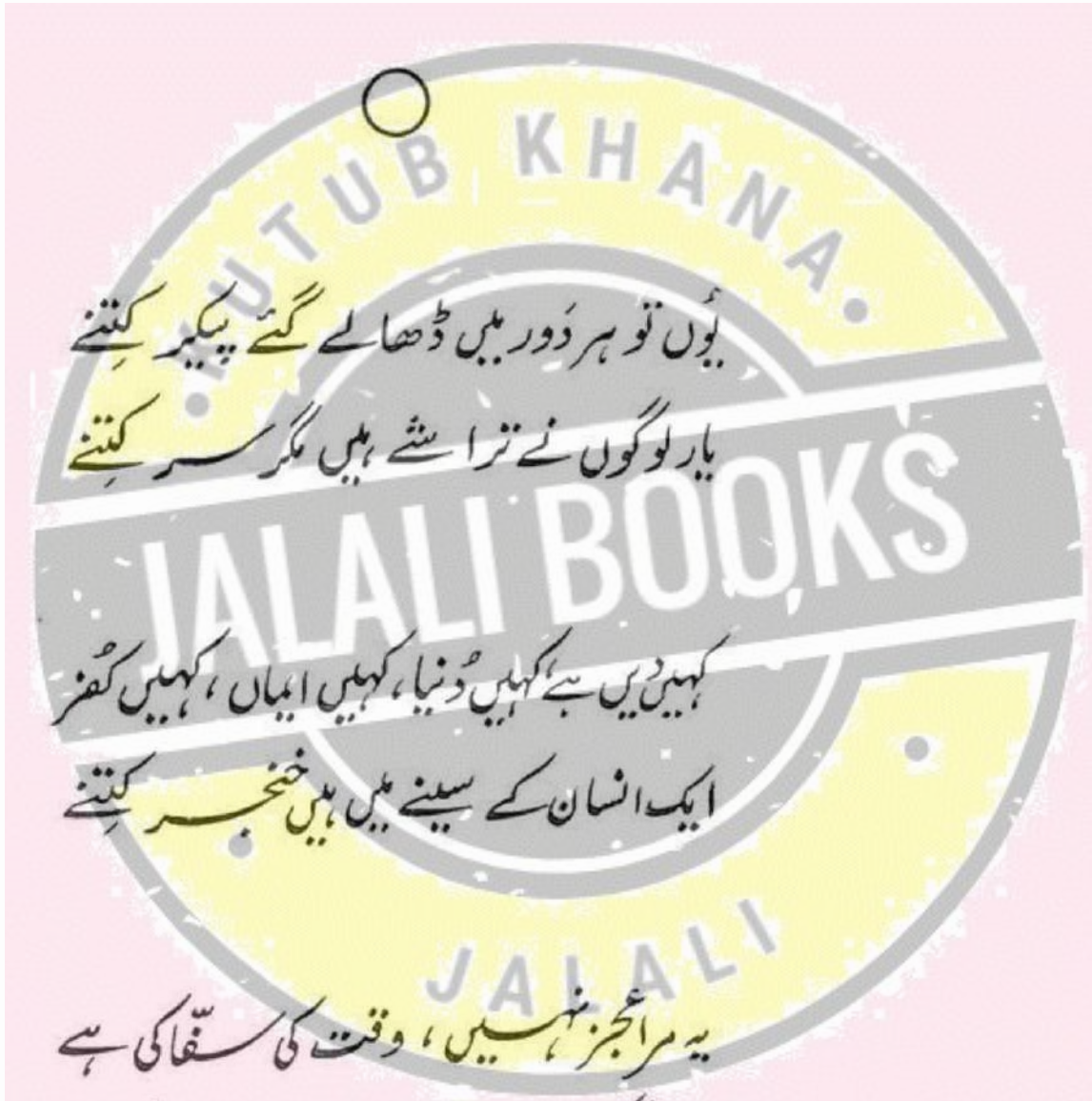
یُوں تو ہر دَور میں ڈھالے گئے پیکر کِتنے
یار لوگوں نے تراشے ہیں مگر سر کِتنے

کہیں دیں ہے، کہیں دُنیا، کہیں ایماں، کہیں کُفر
ایک انسان کے سینے میں ہیں خنجر کِتنے

یہ مرا عجز نہیں، وقت کی سفّاکی ہے
دب گئے ہیں مرے اندر مرے جوہر کِتنے

میرے دامانِ دریدہ پہ نہ جاؤ لوگو!
صدفِ دل میں لیے بیٹھا ہُوں گوہر کِتنے

ایک جھونکا ہی اُڑا لے گیا، تنکوں کی طرح
اُن درختوں کو، جو لگتے تھے تناور کتنے

ایک آئینے میں بس ایک ہی چہرہ ہے ندیمؔ
دل ہی جب ایک ہے، ہوں گے مرے دلبر کتنے

جولائی ۱۹۸۱ء

تیری گفتار میں تو پیار کے تیور کم تھے
کبھی جھانکا تری آنکھوں میں تو ہم ہی ہم تھے

لمس کے دم سے بصارت بھی، بصیرت بھی ملی
چھو کے دیکھا تو جو پتّھر تھے، ترے ریشم تھے
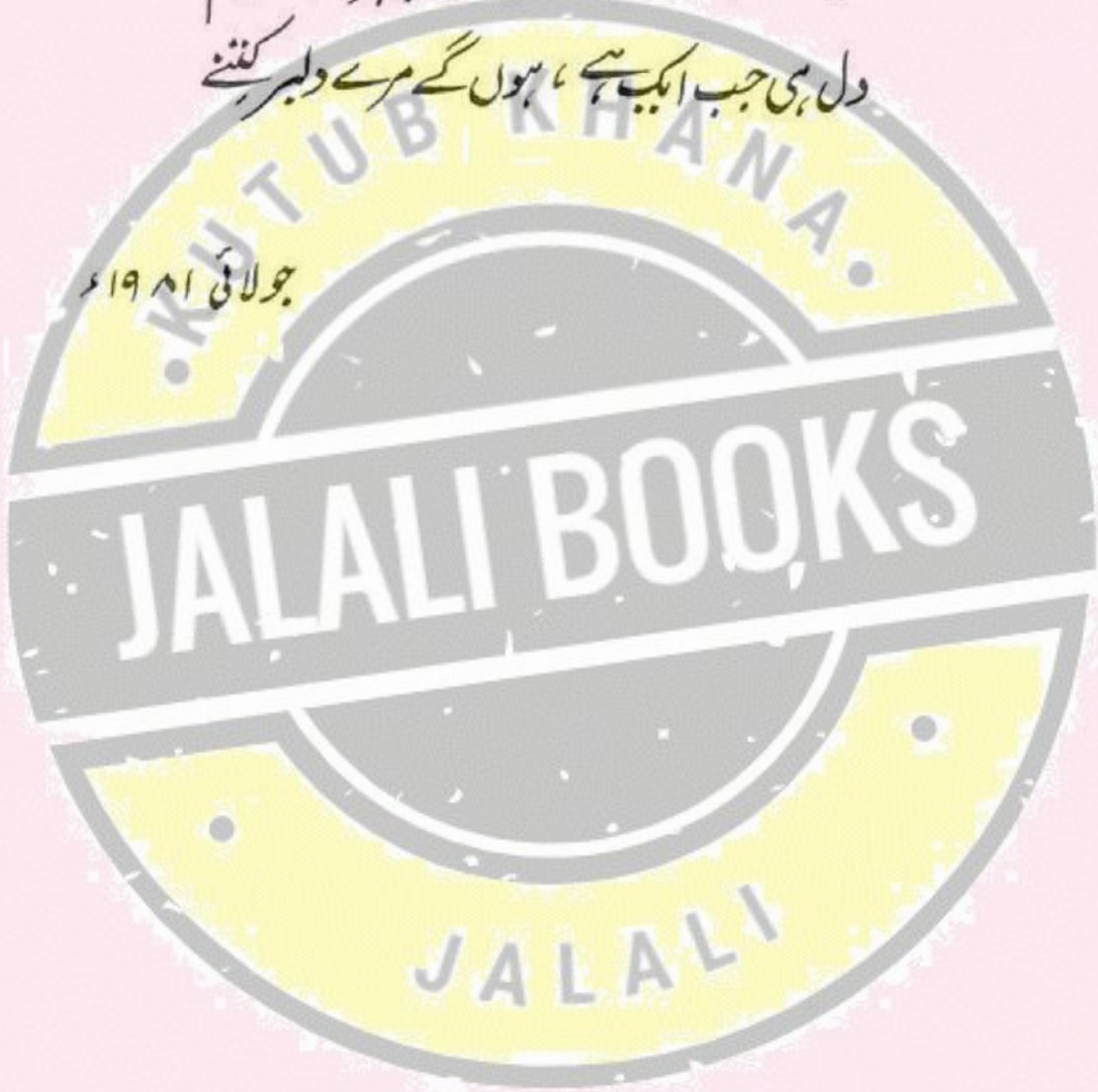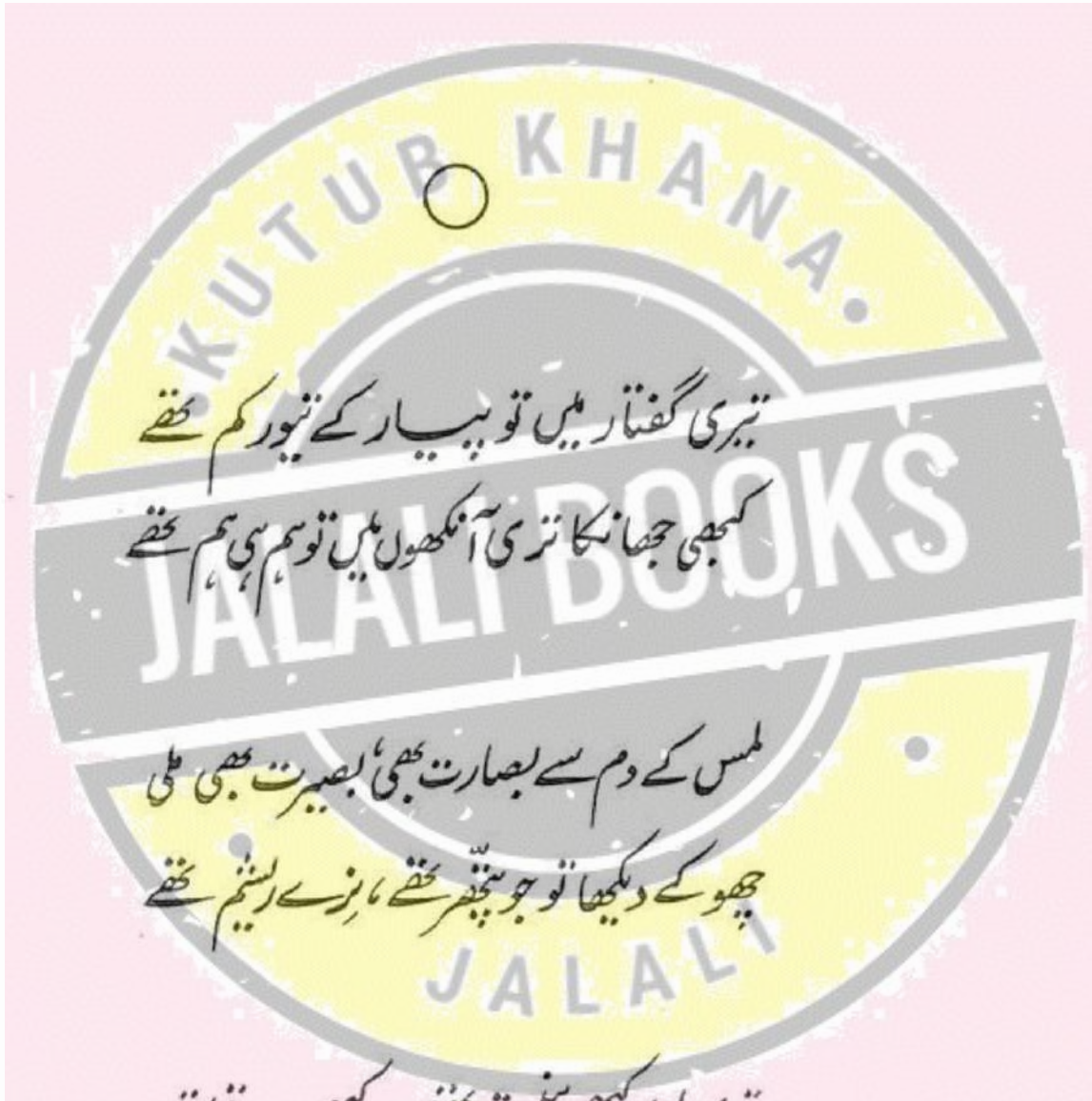
تیری یادیں کبھی ہنستی تھیں، کبھی روتی تھیں
میرے گھر کے یہی ہیرے تھے، یہی نیلم تھے

برف گرماتی رہی، دھوپ اماں دیتی رہی
دل کی نگری میں جو موسم تھے، ترے موسم تھے

میری پونجی مرے اپنے ہی لہو کی بخشی کشید
زندگی بھر کی کمائی مرے اپنے غم تھے

آنسوؤں نے عجب انداز میں سیراب کیا
کہیں بھیگے ہُوئے دامن، کہیں باطن نم تھے

جن کے دامن کی ہوا میرے چراغوں پہ چلی
وہ کوئی اور کہاں تھے، وہ مرے ہمدم تھے

مَیں نے پایا تھا بس اتنا ہی حقیقت کا سراغ
دُور تک پھیلتے خاکے تھے، مگر مبہم تھے

مَیں نے گرنے نہ دیا، مر کے بھی، معیارِ وقار
ڈوبتے وقت مرے ہاتھ، مرے پرچم تھے

مَیں سرِ عرش بھی پہنچا تو سرِ فرش رہا
کائناتوں کے سب امکاں مرے اندر ضم تھے

عُمر بھر خاک میں جو اشک ہُوئے جذب ندیمؔ
برگِ گُل پر کبھی ٹپکے تو وہی شبنم تھے

جولائی ۱۹۸۱ء

خزاں نصیب ہیں، رشتہ مگر بہار سے بھی
مجھے تو گُل کی توقّع ہے نوکِ خار سے بھی

مُصر ہُوں مَیں، کہ گِنا جاؤں باوقاروں میں
انھیں یہ ضد کہ مَیں خارج رہوں شمار سے بھی
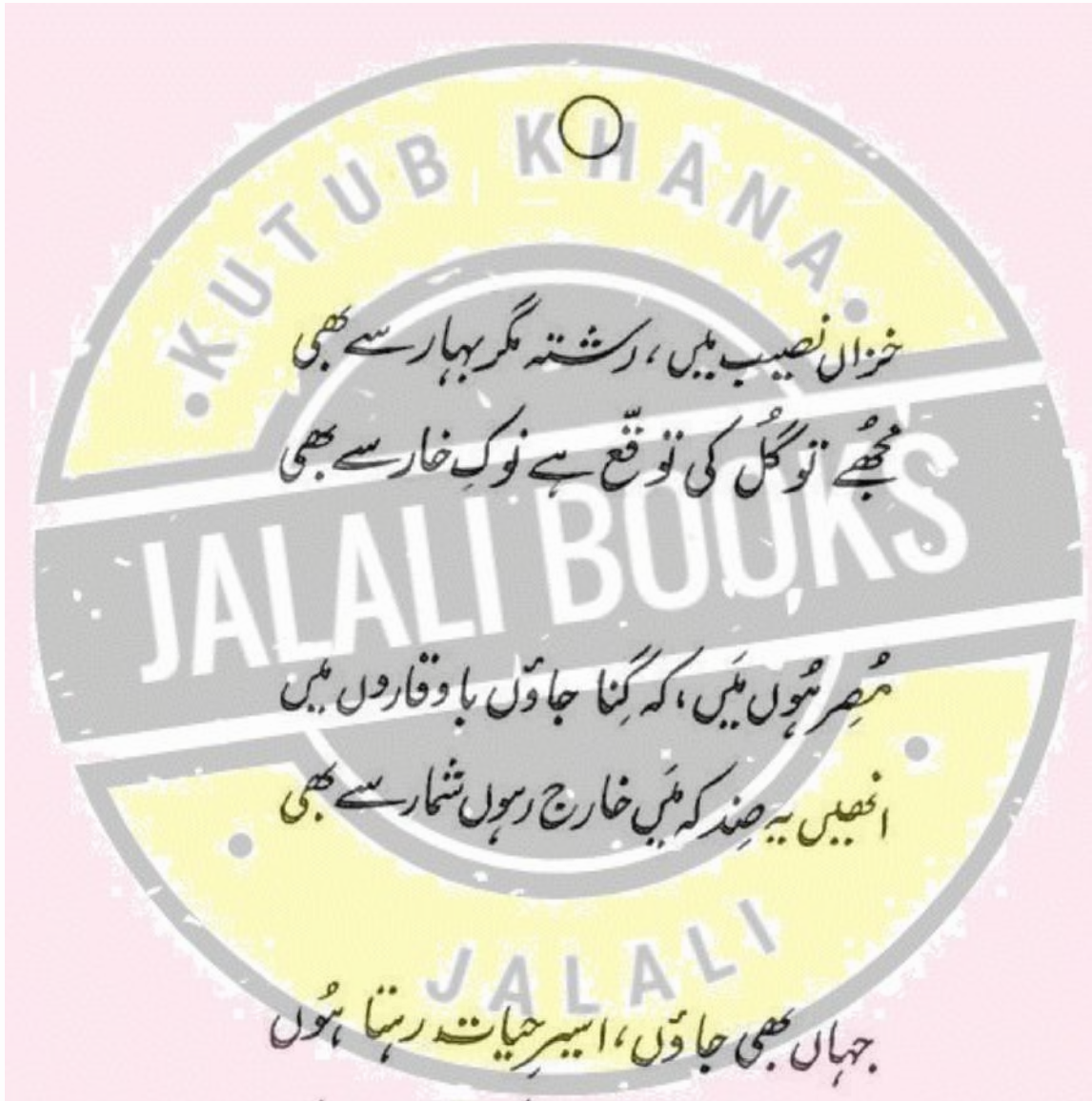
جہاں بھی جاؤں، اسیرِ حیات رہتا ہُوں
یہ مسئلہ تو نہ حل ہو سکا فرار سے بھی

سحر کی کِتنی دُعائیں خُدا سے مانگی ہیں
اب التماس کروں گا جمالِ یار سے بھی

عجیب حشرِ محبّت کا سامنا ہے، کہ وہ
خفا خفا ہے، مگر دیکھتا ہے پیار سے بھی

مَیں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے نت نئے خاکے مرے غبار سے بھی

ندیم وقت کا مرہم نہ میرے کام آیا
کہ زخمِ دل نہ بھرا طُولِ انتظار سے بھی

مئی ۱۹۸۱ء

اِک محبت کے عوض، ارض و سما دے دُوں گا
تجھ سے کافر کو تو مَیں اپنا خدا دے دُوں گا

جستجو بھی مرا فن ہے، مرے بچھڑے ہوئے دوست!
جو بھی در بند ملا، اُس پہ صدا دے دُوں گا

ایک پل بھی ترے پہلو میں جو مل جائے، تو مَیں
اپنے اشکوں سے اسے آبِ بقا دے دُوں گا
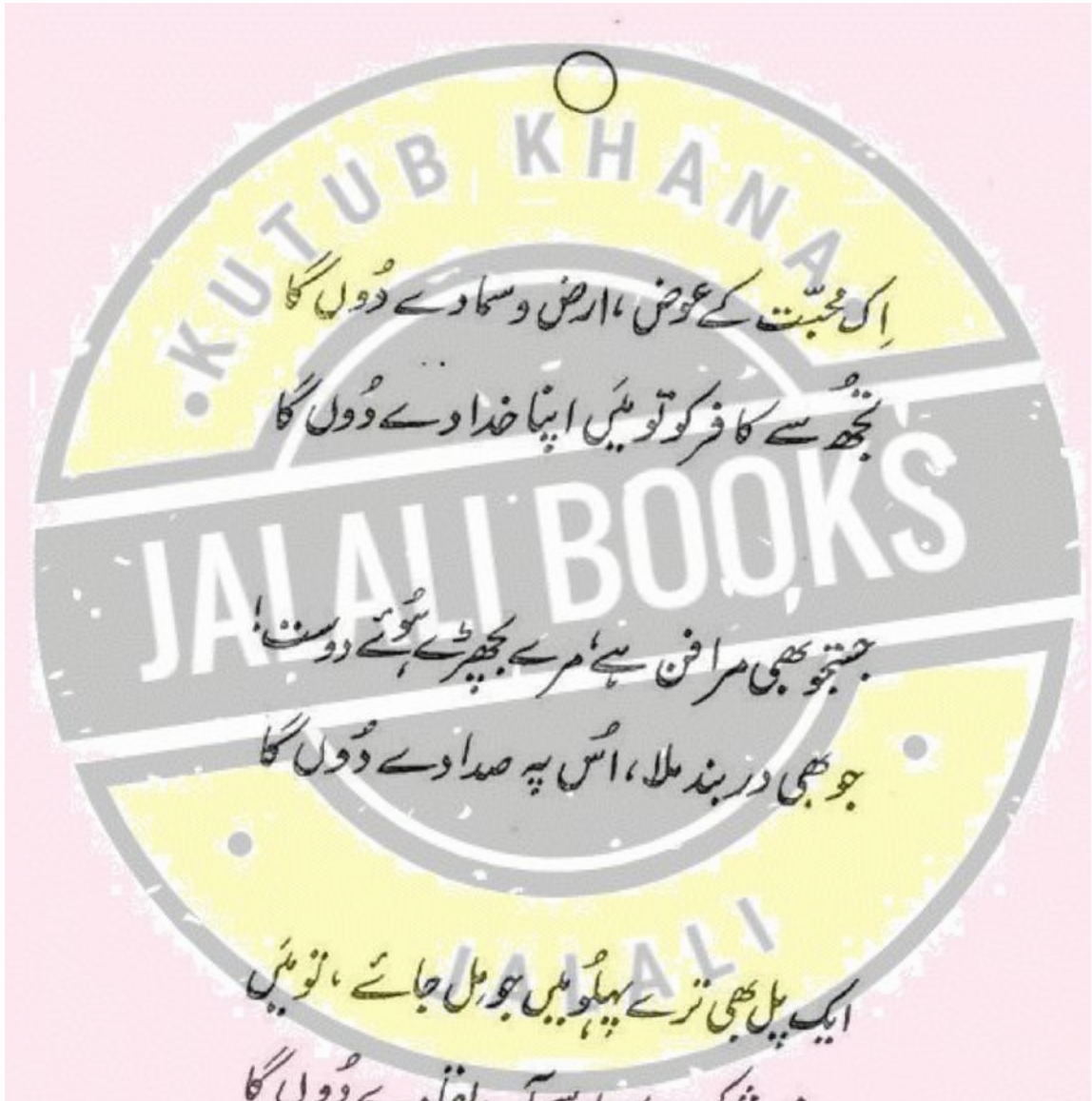
تُو کرم کر نہیں سکتا تو ستم توڑ کے دیکھ
مَیں ترے ظلم کو بھی حُسنِ ادا دے دُوں گا

رُخ بدل دُوں گا صبا کا، ترے کوچے کی طرف
اور طُوفان کو اپنا ہی پتہ دے دُوں گا

جب بھی آئیں مرے ہاتھوں میں رُتوں کی باگیں
برف کو دُھوپ، تو صحرا کو گھٹا دے دُوں گا

مئی ۱۹۸۱ء

کسی لاعلاج رجائی نے یہ خبر چمن میں اُڑائی ہے
کوئی پتّا جب نہ ہو شاخ پر تو سمجھ لو، فصلِ گُل آئی ہے

کوئی اشتراک ضرور ہے، وہ ہو رنگ کا کہ امنگ کا
مرا دل بھی تو گُلِ سُرخ ہے، ترا ہاتھ بھی تو حنائی ہے

وہ کشش کچھ اور ہی چیز ہے جسے حُسن کہتے ہیں اہلِ دل
نہ جمالِ عارض و چشم و لب، نہ کمالِ چست قبائی ہے

سفرِ حیات کے موڑ پر، مجھے تُو مِلا کہ خدا مِلا
یہی میرا کعبۂ جستجو، یہی میری حدِّ رسائی ہے

مَیں جُھکوں تو چرخ جُھکا رہے، مَیں رُکوں تو وقت رُکا رہے
مَیں تری وفا کا جب اہل ہُوں، مرے بس میں ساری خدائی ہے

مَیں ندیمؔ قریۂ سیم و زر سے بھی سر کشیدہ گزر گیا
جو مری انا کا غرور ہے، مری عمر بھر کی کمائی ہے

اپریل ۱۹۸۱ء

○
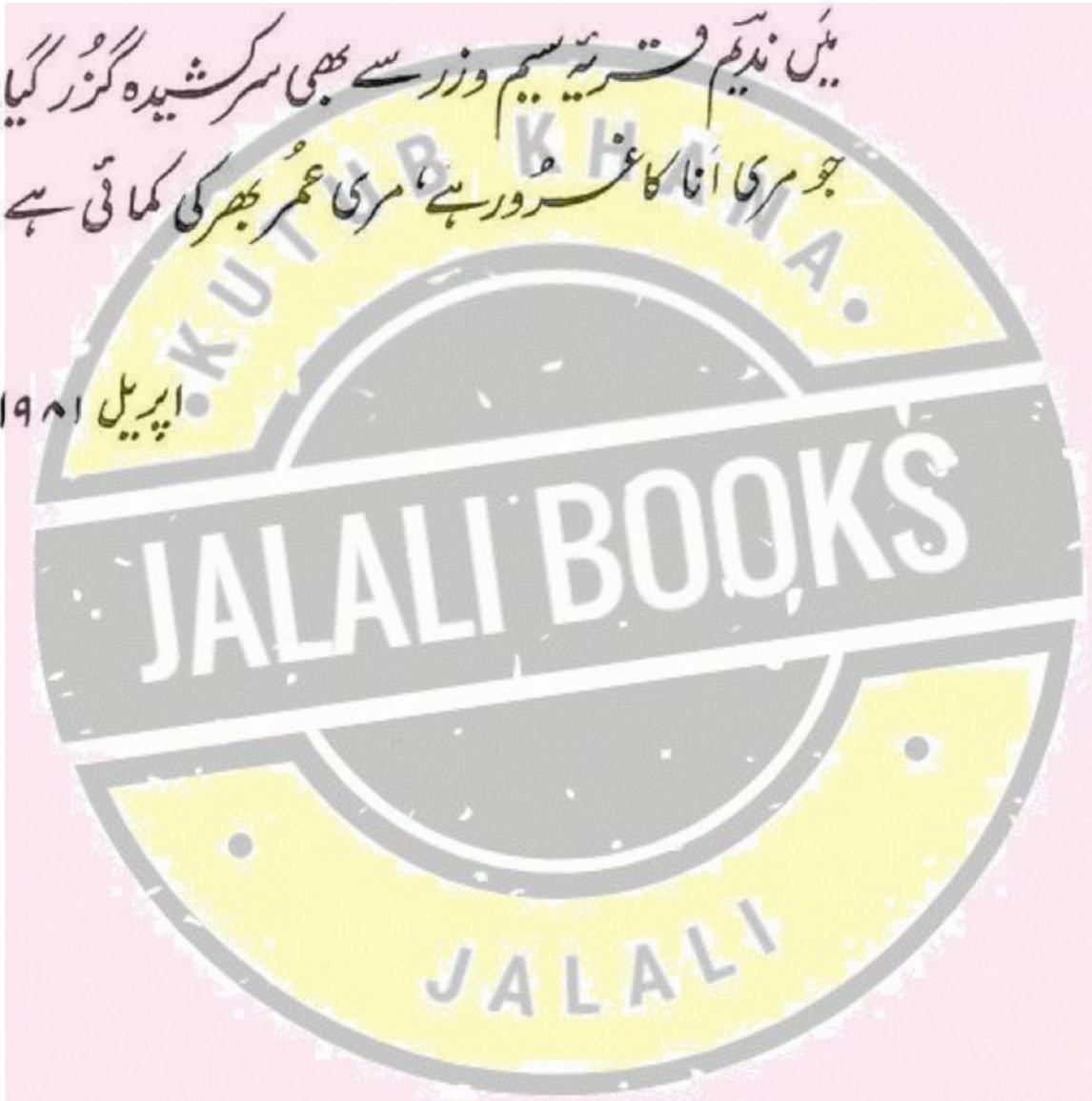
کام ہی کیا ہے مُسافر کو، گزُرنے کے سوا
سبھی آرام میسّر ہیں، ٹھہرنے کے سوا

لہر اُٹھتی ہے نہ دریا میں بھنور پڑتے ہیں
کوئی چارہ نہ رہا پار اُترنے کے سوا

کاش واعظ نے محبت بھی سکھائی ہوتی
اور کیا کیجیے اللہ سے ڈرنے کے سوا

حُسن کا فرض ہُوا کرتی ہے آرائشِ حُسن
صُبح کیا کرتی ہے ہر روز سنورنے کے سوا

عمر گزُری ہے اُس انساں کے تجسّس میں ندیمؔ
اور بھی کام جو کر لیتا ہو، مرنے کے سوا

اپریل ۱۹۸۱ء

○

عرش سے سچ کی ہدایت بار ہا ملتی رہی
ہم جو سچ بولے تو کیوں اس کی سزا ملتی رہی

رزق کی خاطر زمیں کھودی مگر پتھّر ملے
اور اُدھر پتھّر میں کیڑے کو غذا ملتی رہی

ہم تو اس کو بھی مشیّت کی سخاوت ہی کہیں
زندگی بھر سانس لینے کو ہوا ملتی رہی

ایک پل بھی زندہ رہنا اِک قیامت تھا ندیمؔ
اور طُولِ عُمر کی ہم کو دُعا ملتی رہی

مارچ ۱۹۸۱ء

بھرم غزال کا جس طرح رم کے ساتھ رہا
مرا ضمیر بھی میرے قلم کے ساتھ رہا

جُدائیوں کے سفر سر خوشی میں گزرے ہیں
کہ اس کا عکس مری چشمِ نم کے ساتھ رہا

اِک آفتاب مرے سر سے ڈھل سکا نہ کبھی
کہ میرا سایہ مرے ہر قدم کے ساتھ رہا
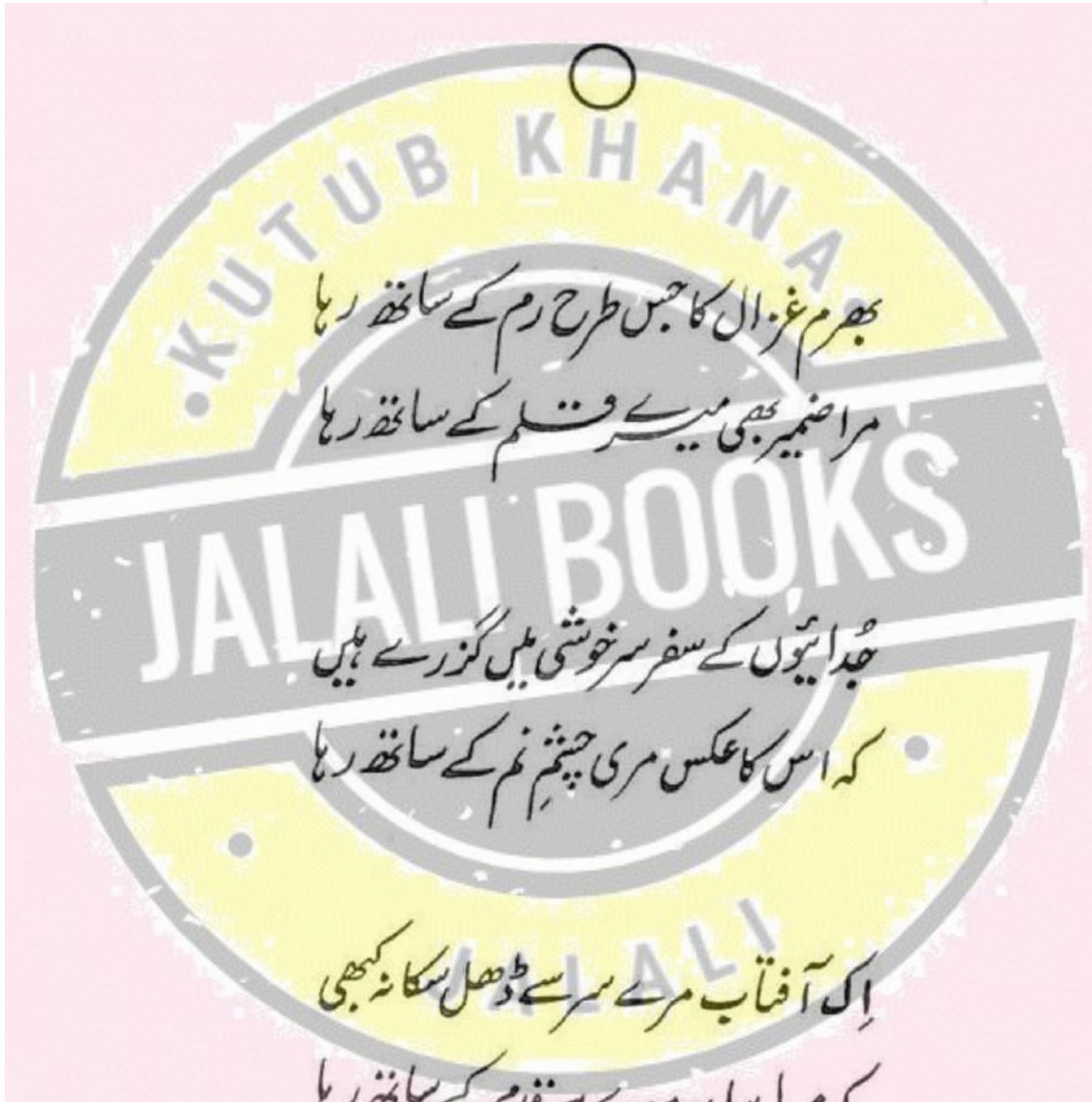
نہ بھول پائے وطن کو، جلا وطن جیسے
ہر آدمی کا تعلّق ارم کے ساتھ رہا

دُعا کو ہاتھ اُٹھانے سے خوف آتا ہے
کہ جبرِ برق بھی ابرِ کرم کے ساتھ رہا

گواہ ہے مرا اسلوبِ جاں کنی، کہ ندیم
مرا غرورِ ہنر میرے دم کے ساتھ رہا

مارچ ۱۹۸۱ء

○
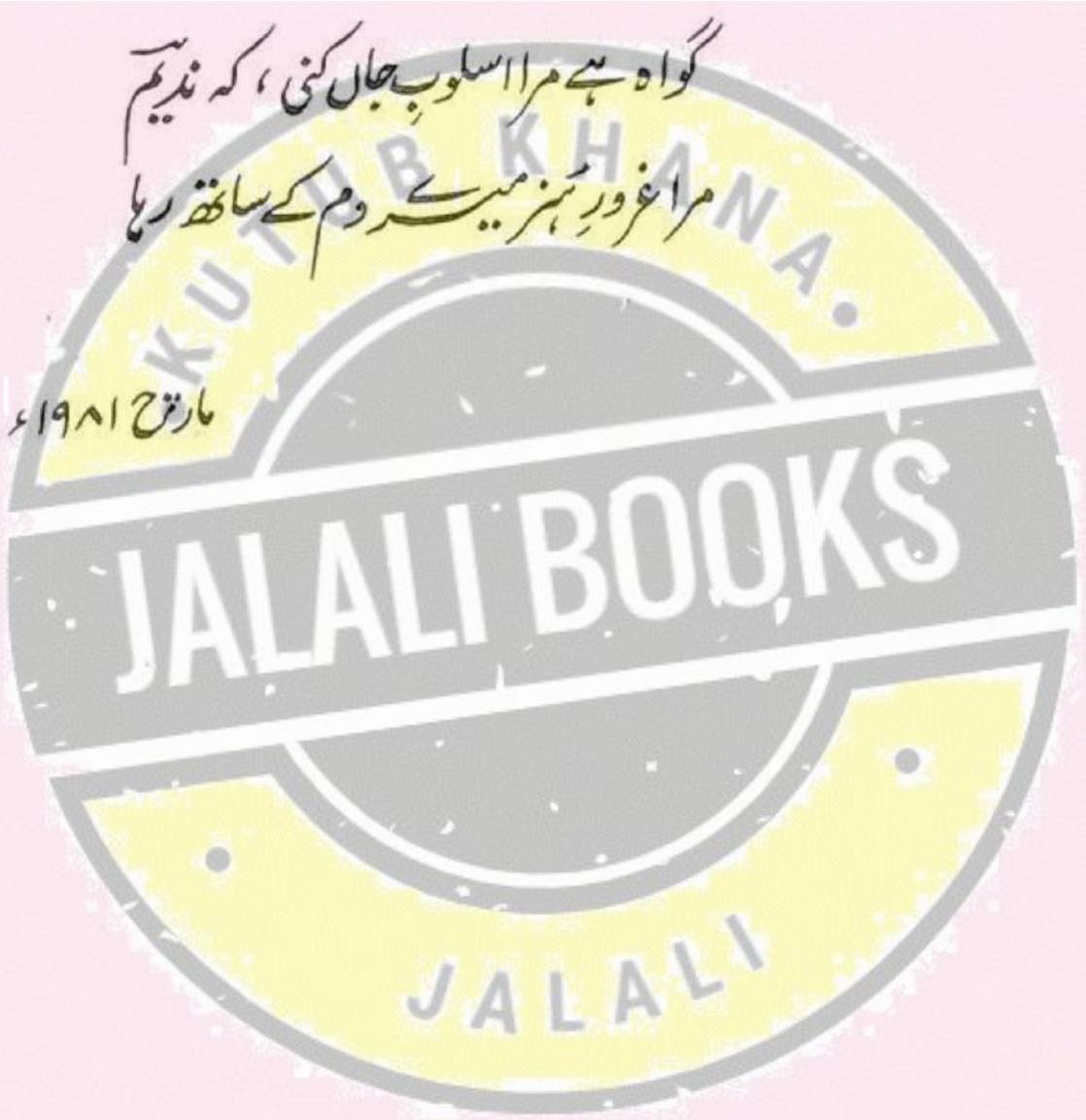
انساں ابھی شہپارۂ ازژنگ نہیں ہے
چہرے پہ سبھی کچھ ہے، مگر رنگ نہیں ہے

جنّت کے سفر میں جو نہ حائل ہوں تو بہتر
فطرت کے عناصر سے مری جنگ نہیں ہے

احساسِ جمال اس کو کبھی ہو نہیں سکتا
شیشے کے مقدّر میں اگر سنگ نہیں ہے

انجام، محبّت کی مسافت کا نہ ڈھونڈو
اتنا بھی تو صحرائے زمیں تنگ نہیں ہے

اِک دَر ہے اگر بند تو بستی میں ہیں سَو دَر
اے دستِ سخا، پائے گدا لنگ نہیں ہے

مارچ ۱۹۸۱ء

دستگیری کر، اے زبانِ جمال
آج مطلوب ہے بیانِ جمال

اور کِس کا ہے یہ طلسمِ خرام
نقشِ پا سے ملا نشانِ جمال
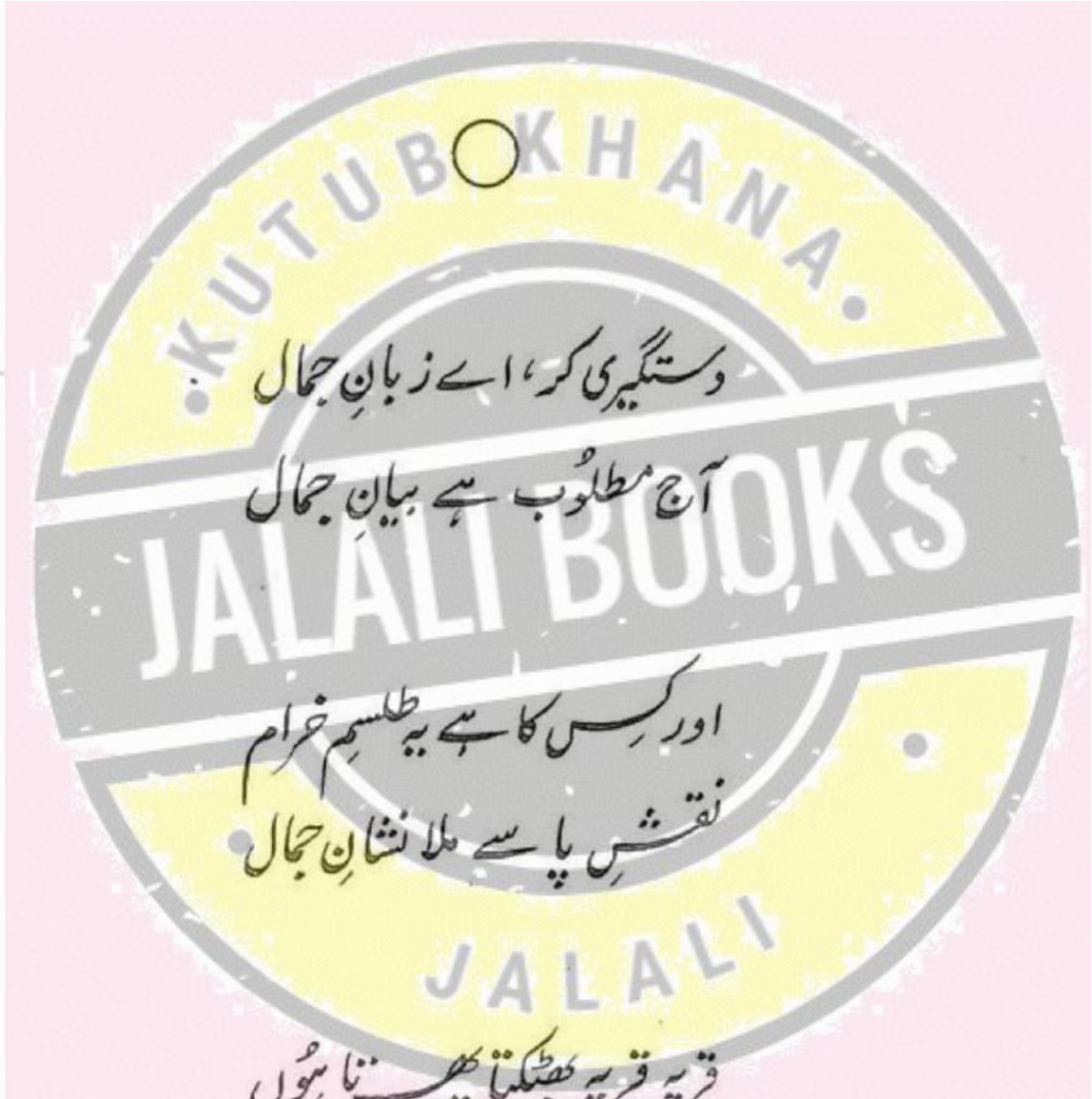
قریہ قریہ بھٹکتا پھرتا ہوں
تیرا پیکر ہے اِک جہانِ جمال

ڈھونڈتی ہیں کسے تری آنکھیں
اُڑتے پھرتے ہیں طائرانِ جمال

تیرا اقبالِ حسن اور بڑھے
اِک تبسّم سے کیا زیانِ جمال

اب تو ہر سانس میں ہے گونج تری
اب تو شب پر بھی ہے گمانِ جمال

گُل سے جب برگِ گُل بچھڑ کے گرے
ٹوٹ پڑتا ہے آسمانِ جمال

خشک لب میرے، چھلنی پاؤں مرے
اور لقب ہے، مزاجدانِ جمال

چاند ہے قیسِ دشتِ ہفت افلاک
اور زمیں ناقۂ روانِ جمال

بخش دے گا مجھے خدائے جمیل
مَیں کہ ہُوں ایک مدح خوانِ جمال

شعر کہنا شعاعیں چُننا ہے،
شاعری، نورِ جاودانِ جمال

مارچ ۱۹۸۱ء

زندگی غیر کی سوغات نہ ہو
رزق آلودۂ خیرات نہ ہو

کائناتوں کے تناظر میں، زمیں
کہیں منجملۂ ذرّات نہ ہو

جبکہ سب کچھ ہے مرے ہونے سے
کیوں مری ذات کا اثبات نہ ہو
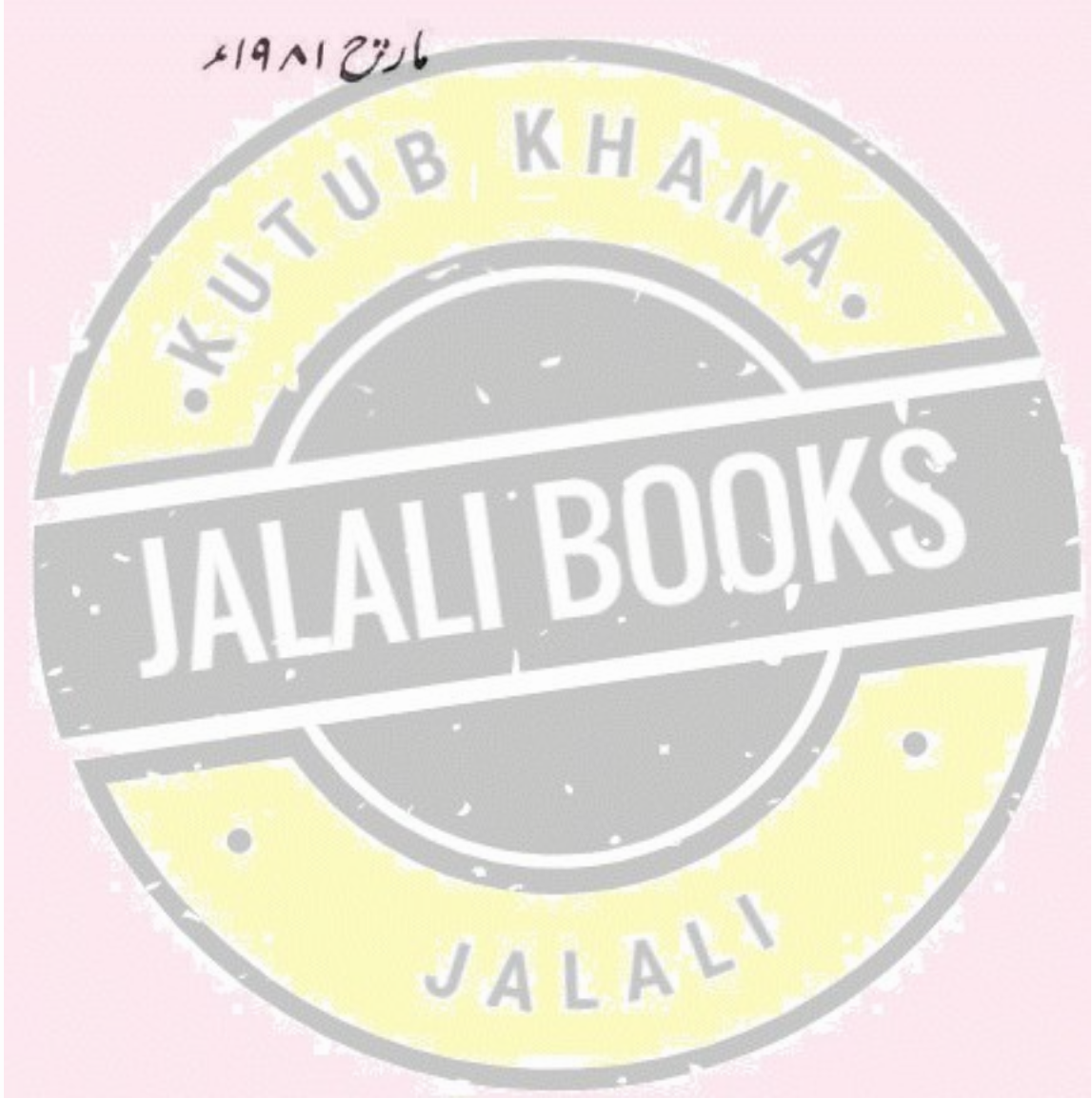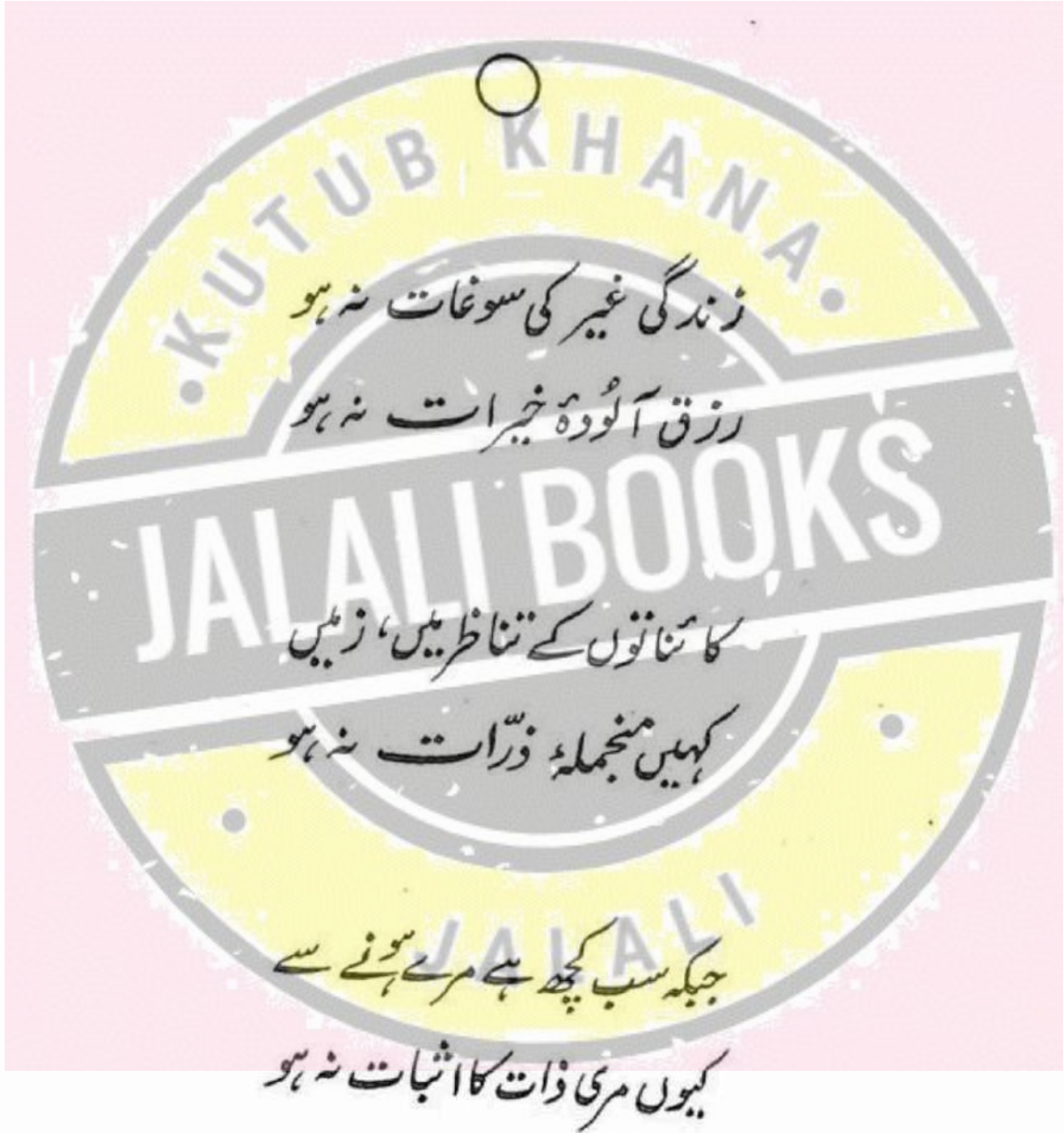
روزِ روشن سے جو آنچ آتی ہے
یہ کہیں جلتی ہوئی رات نہ ہو

میں عناصر سے دُعا مانگتا ہُوں
چھت ٹپکتی ہو تو برسات نہ ہو

آئنہ دیکھ کے مجُھ کو، بولا
کوئی واماندۂ حالات نہ ہو

اب تو یہ غایتِ فن ٹھہری ہے
شعر شرمندۂ جذبات نہ ہو

لب ترستے ہیں تبسّم کو ندیمؔ
ضبطِ غم کی یہ مکافات نہ ہو

فروری ۱۹۸۱ء

○

لچک سی جیسے لپکتی ہوئی صدائیں پڑے
ترا خرام جو دیکھا تو بَل ہوائیں پڑے

جو دن تھا حشر کا دن تھا، جو شب تھی حشر کی شب
عجیب طرح کے جنگل رہِ وفا میں پڑے

خدا کو گونج کا انداز کتنا پیارا ہے
مری دُعا ہی مرے دامنِ دُعا میں پڑے

جو مشتِ خاک تھی، تپ کر بھی مشتِ خاک رہی
مجھے زمانہ ہُوا علمِ کیمیا میں پڑے

مَیں ایک بار تو خود اپنے کام آؤں ندیمؔ
مرے مزاج کا سونا مری دوا میں پڑے

فروری ۱۹۸۱ء
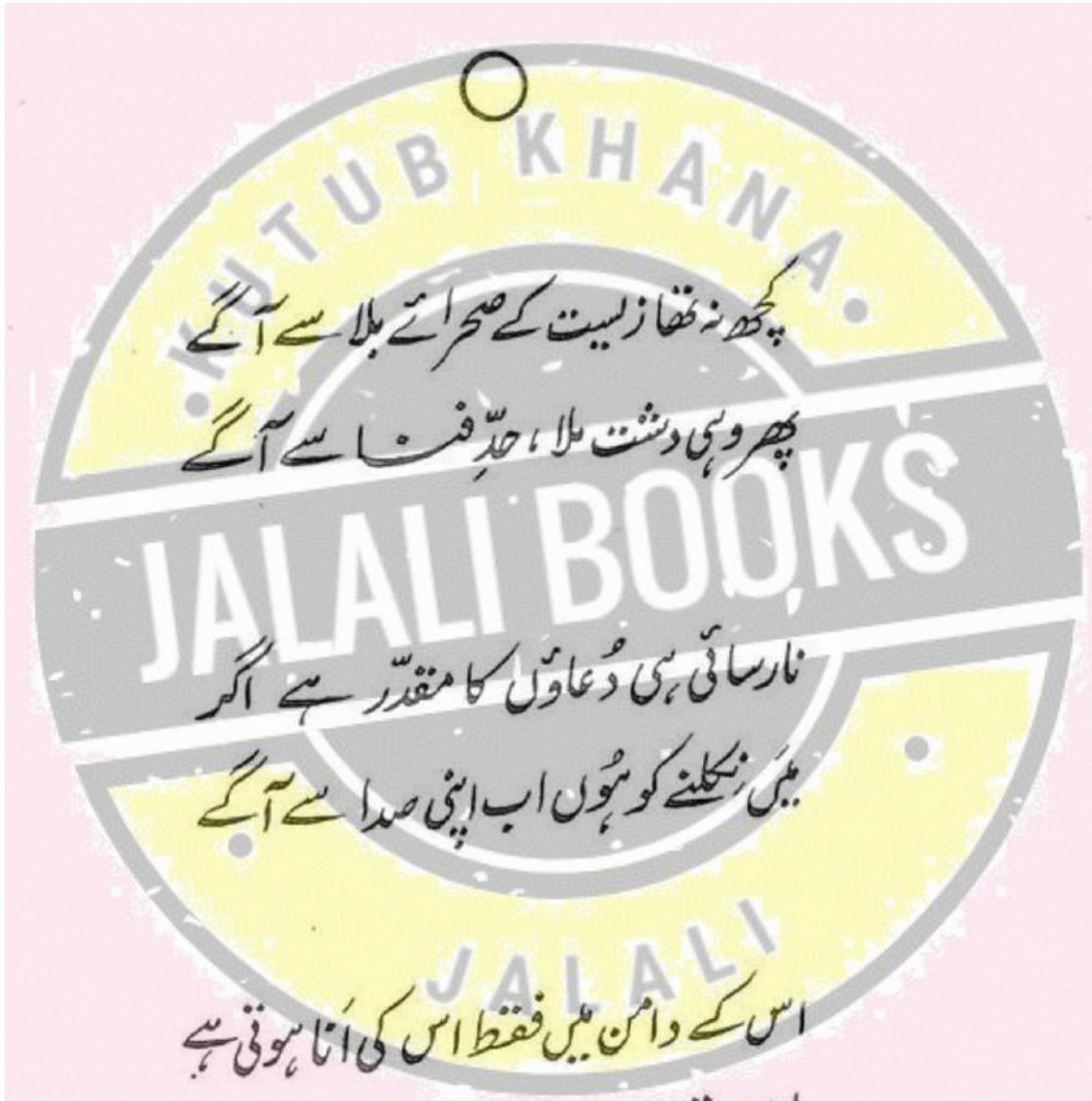
کچھ نہ تھا زیست کے صحرائے بلا سے آگے
پھر وہی دشت بلا، حدِّ فنا سے آگے

نارسائی ہی دُعاؤں کا مقدّر ہے اگر
میں نکلنے کو ہوں اب اپنی صدا سے آگے

اس کے دامن میں فقط اس کی اَنا ہوتی ہے
ہاتھ رہتا ہو سدا جس کا، عطا سے آگے

یوں خلاؤں کے تجسّس میں ہوں غلطاں جیسے
اِک زمیں اور بھی ہو ماہ و سہا سے آگے

مجھ کو امکان کے روزن سے نظر آتے ہیں
نت نئے ارض و سما۔ ارض و سما سے آگے

یہ کسی بھولی ہوئی یاد کی ہے رمز ندیمؔ
اک ہیولیٰ سا ہے کیا، موجِ صبا سے آگے

فروری ۱۹۸۱ء

○
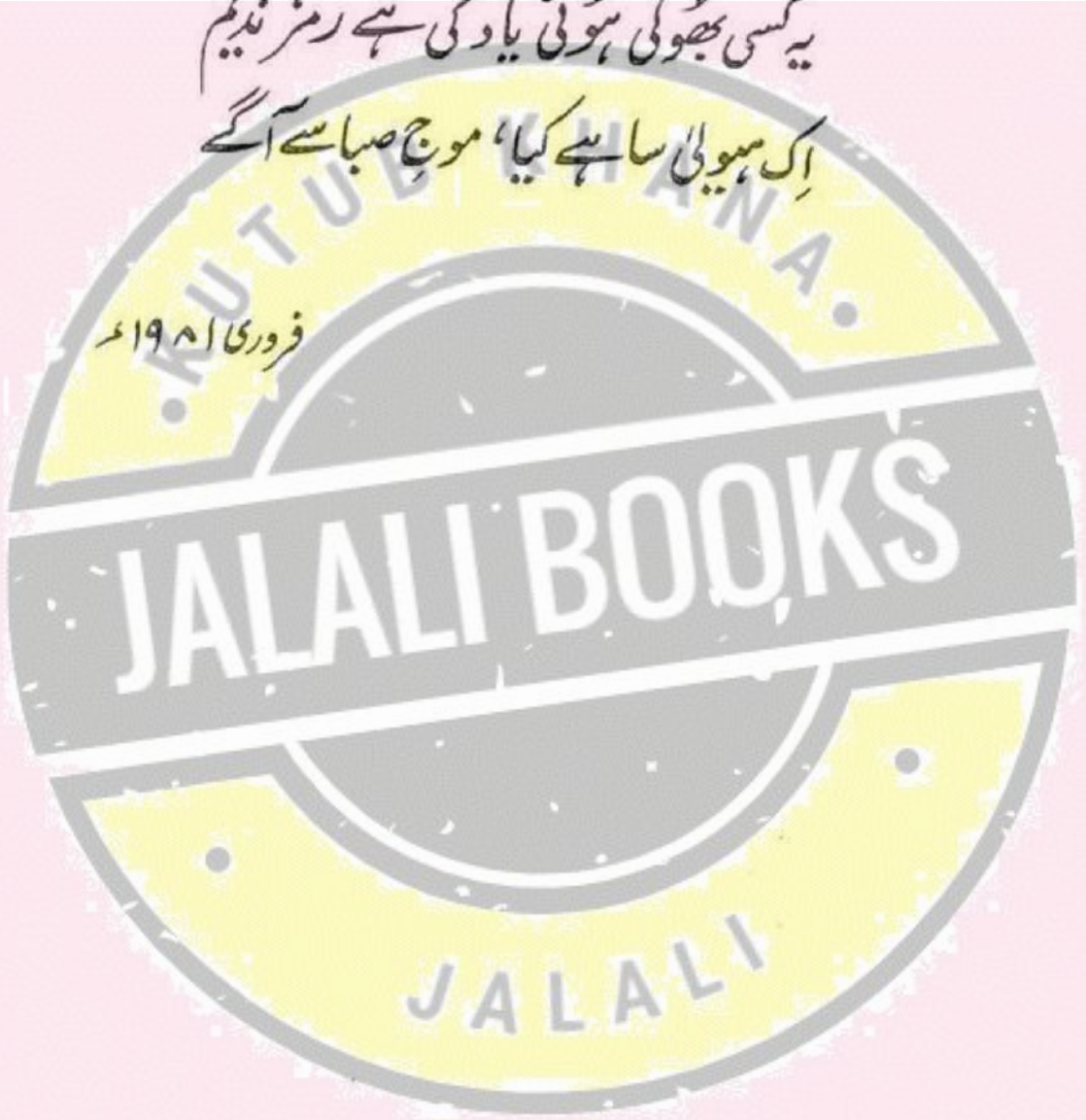
میری پہچان نمازیں ہیں نہ تکبیریں ہیں
آج کل میرا تعارف مری تقصیریں ہیں

آنکھ کھلتے ہی اُبھر جاتے ہیں منظر سارے
خواب لاکھوں ہیں، مگر ایک ہی تعبیریں ہیں

پڑھنے والو! کوئی مفہوم تو ہوگا ان کا
صفحۂ ابر پہ کوندوں کی جو تحریریں ہیں

ہم پذیرائی پہ مامور ہیں، اے خواجۂ شہر!
ہاتھ میں پھول ہیں اور پاؤں میں زنجیریں ہیں

سب خد و خال خدا کے ہیں مصوّر جیسے
یہ جو انسان نظر آتے ہیں، تصویریں ہیں!

فروری ۱۹۸۱ء

دل میں اب درد مچلتا ہی نہیں
اِک دیا تھا، سو وہ جلتا ہی نہیں

زہرِ تنہائی کا تریاق ہے چاند
اور وہ بادل سے نِکلتا ہی نہیں

یوں تو چھتنار ہے نخلِ اُمید
پھُولنا خُوب ہے، پھَلتا ہی نہیں
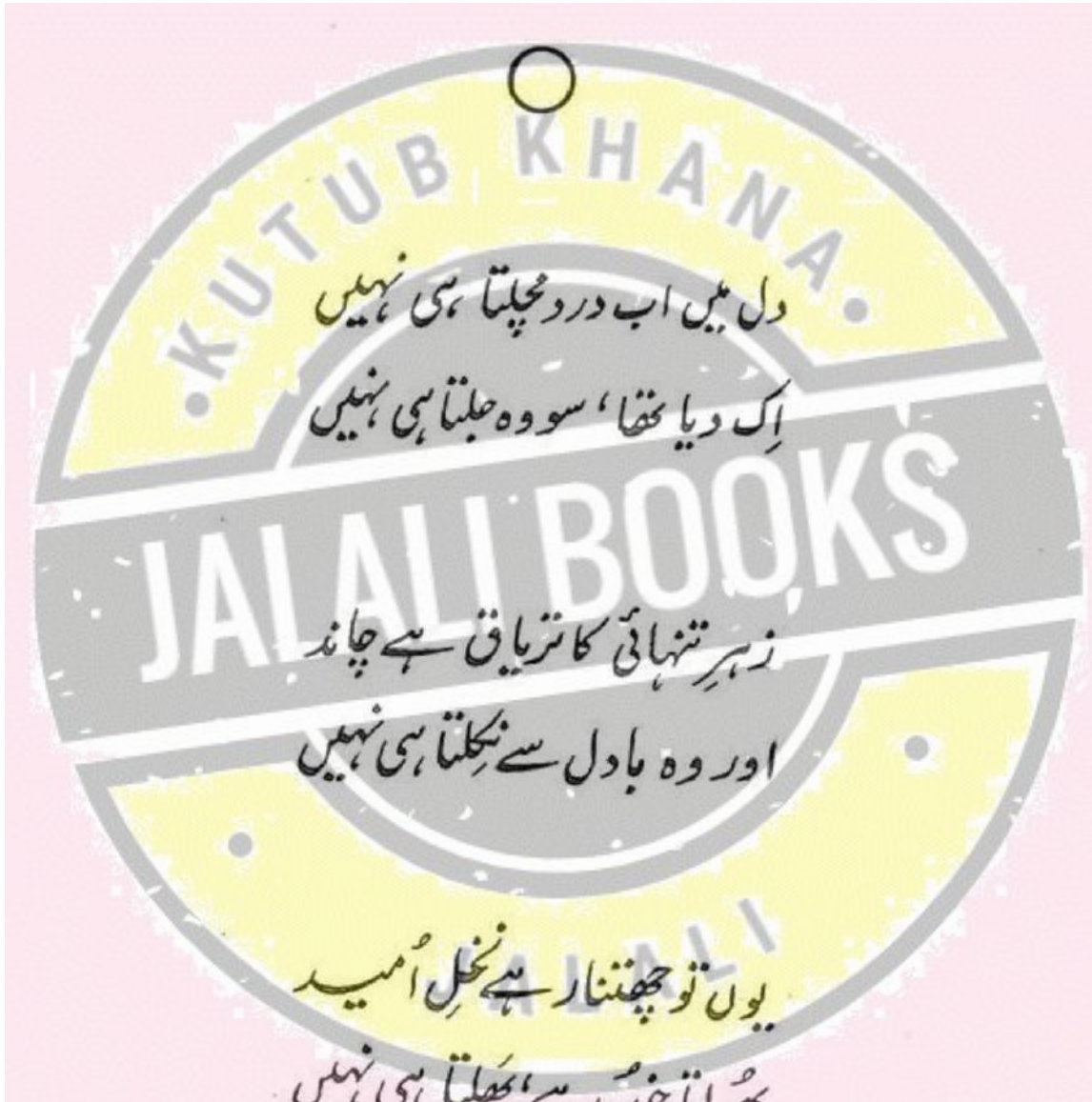
مُجھ کو قسّامِ ازل نے بخشا
وہ مقدّر، جو بدلتا ہی نہیں

جی کے بھی - مر کے بھی دیکھا مَیں نے
دل کِسی طَور بہلتا ہی نہیں

شام ہر دن کو نِگل جاتی ہے
اِک یہ لمحہ ہے جو ٹلتا ہی نہیں

اِس پہ شاہد ہے مری عُمرِ ندیم
وقت اُڑتا بھی ہے، چلتا ہی نہیں

جنوری ۱۹۸۱ء

○

یہ غم نہیں، کوئی پتھّر اِدھر بھی آئے گا
کہ اس کے بعد مرا شیشہ گر بھی آئے گا

میں اس یقیں سے ٹھٹھرتا ہُوں شب کے سائے تلے
اسی شجر پہ سحر کا ثمر بھی آئے گا

میں عُمر بھر دریِ دل وا رکھوں گا اس کے لیے
کہ وہ خُدا ہے تو پھر اپنے گھر بھی آئے گا

یہ سوچ کر میں اُلجھتا ہُوں آسمانوں سے
کہ ٹُوٹ کر کوئی تارا اِدھر بھی آئے گا

ندیمؔ درد سے دل ہی نہیں ہرے ہوں گے
ہُنر وروں کو غزل کا ہُنر بھی آئے گا

دسمبر ۱۹۸۰ء
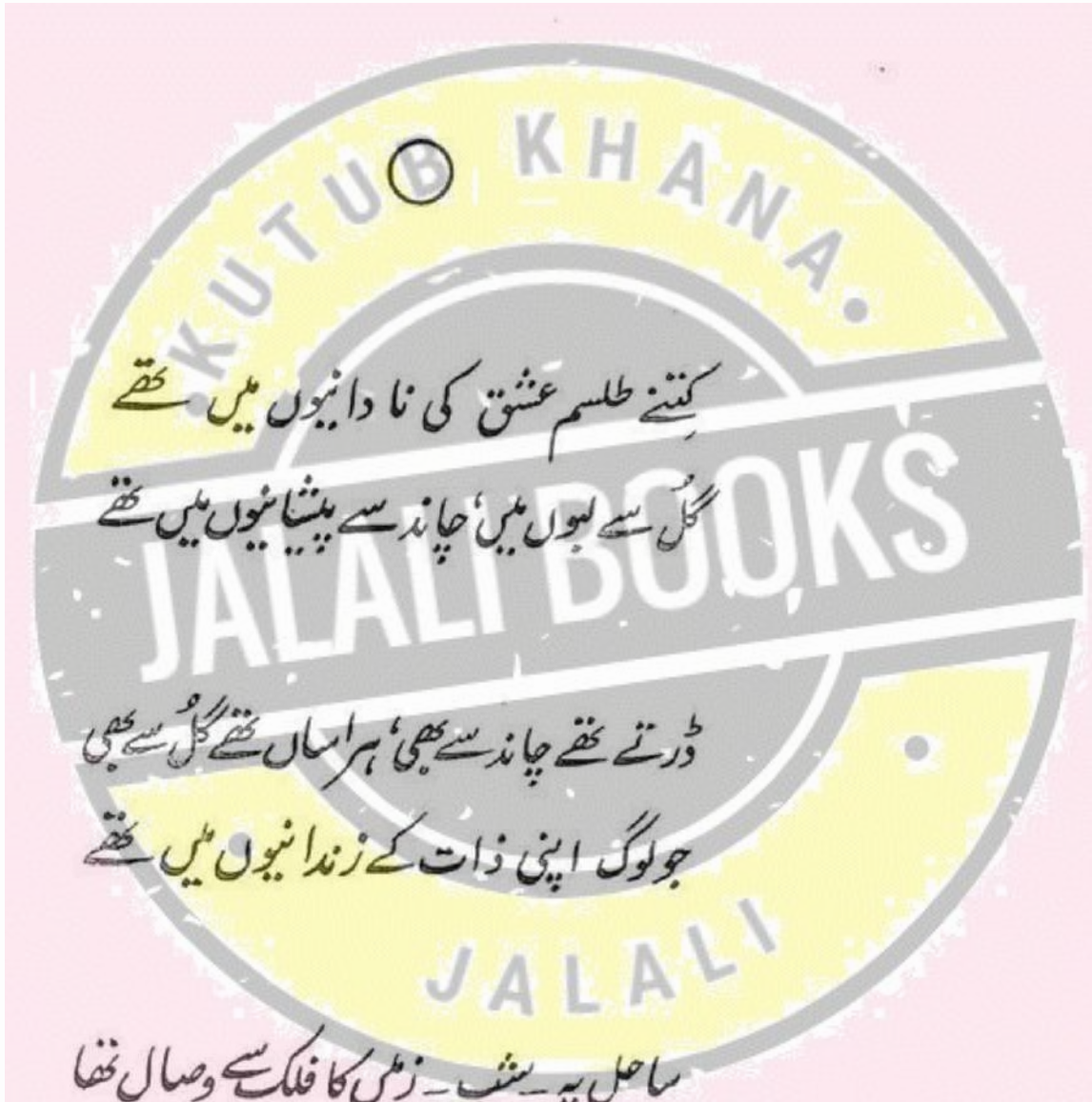
کتنے طلسم عشق کی نادانیوں میں تھے
گُل سے لبوں میں، چاند سے پیشانیوں میں تھے

ڈرتے تھے چاند سے بھی، ہراساں تھے گُل سے بھی
جو لوگ اپنی ذات کے زندانیوں میں تھے

ساحل پہ شب زمیں کا فلک سے وصال تھا
اُترے ہوئے نجوم، رواں پانیوں میں تھے

ہر فکر کا مآل، جوازِ گناہ تھا
جتنے ثواب تھے، مری حیرانیوں میں تھے

دِیمک تنے کو چاٹتی جاتی تھی، اور ہم
کِتنے مگن شجر کی نگہبانیوں میں تھے

چہرے تو اہلِ شہر کے تھے پُرسکوں مگر
ڈُوبے ہُوئے ضمیر پشیمانیوں میں تھے

یوسف کا اِک لقب مہِ کنعاں تو تھا، مگر
یوسف کے بھائی بھی انہی کنعانیوں میں تھے

پھُولوں میں پتھروں کو لپیٹے ہُوئے ندیمؔ
مصرُوف یار لوگ گُل افشانیوں میں تھے

اکتوبر ۱۹۸۰ء

اِن زمینوں میں شجرکاریِ نو ہے درکار
سبز ہوتے نہیں اُکھڑے ہُوئے پودے زنہار

فصلِ گُل آئے تو بٹ جائے توجّہ شاید
مُجھ سے ہوتا نہیں سُوکھے ہُوئے پتّوں کا شمار
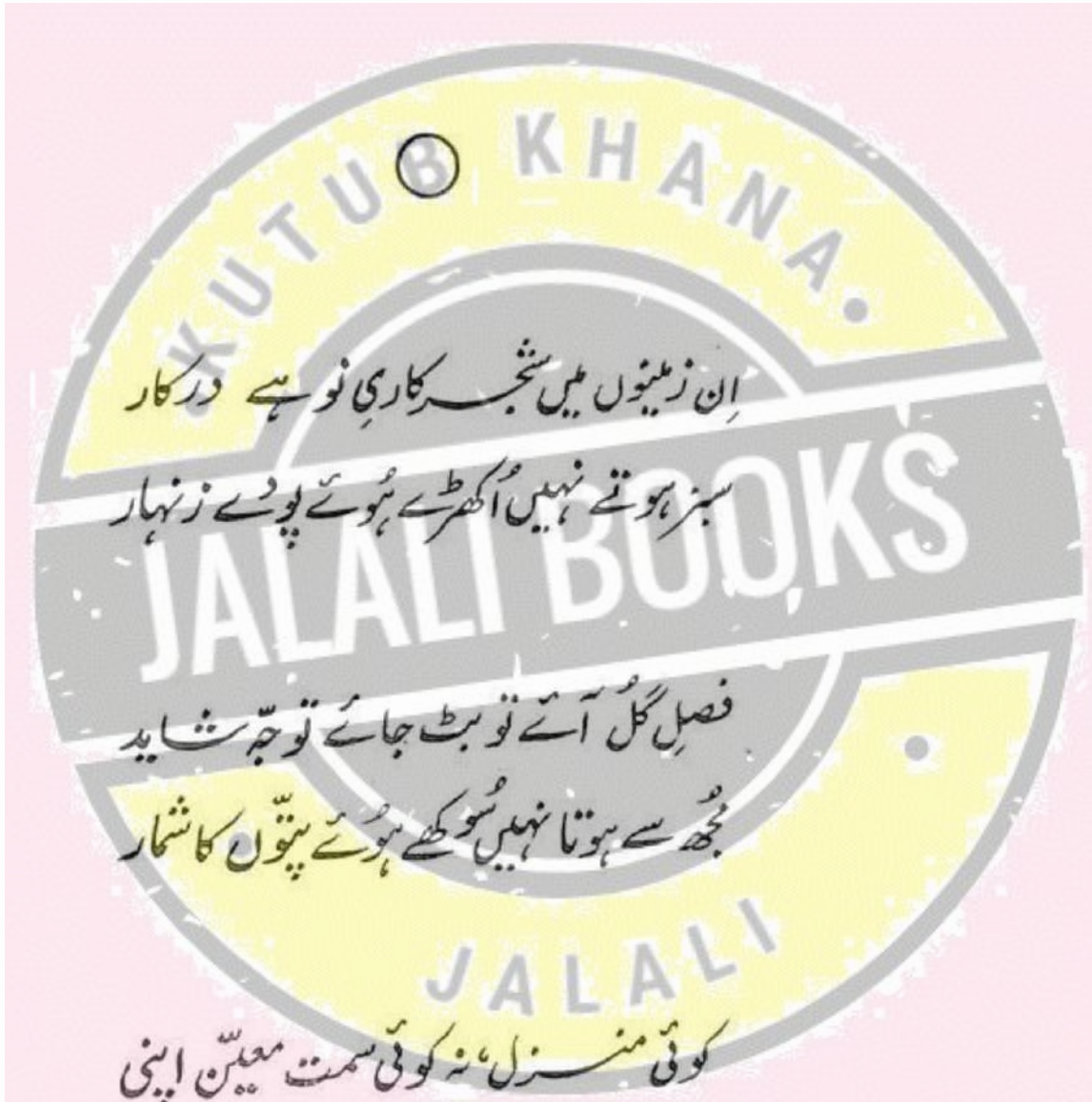
کوئی منزل، نہ کوئی سمت معیّن اپنی
ہم ہیں بے ربط کہانی کے ادھورے کردار

اب زبردست کو یلغار کی حاجت ہی نہیں
اب تو نیلام پہ چڑھ جاتا ہے قوموں کا وقار

رُخ پہ برنائی بھی ہو، چال میں رعنائی بھی ہو
صرف مخلوقِ خدا سے نہیں سجتے بازار

اب تو مہرِ لبِ اظہار، خدارا، توڑو
مجھ کو اس وقت فقط اذنِ فغاں ہے درکار

اب تو واجب ہوا خورشیدِ قیامت کا طلوع
چار جانب ہے گھٹا ٹوپ اندھیرے کا حصار

قد غنوں پر سے اُچھل جاتا ہے سیلِ تاریخ
اور فلک تک تو کبھی اُٹھ نہیں سکتی دیوار

تبر زن آج تو وہ شخص بھی کہلائے ندیم
شیر کی جگہ جو کرتا رہے چڑیوں کا شکار

اکتوبر ۱۹۸۰ء

بے شمار انسان ہیں، سب کا سراپا ایک ہے
سب کے خال و خد جُدا ہیں، اور چہرہ ایک ہے

بے حساب اسلوب ہیں اظہارِ مطلب کے، مگر
آنکھ سے گرتے ہُوئے اشکوں کا لہجہ ایک ہے

آخری سچّائی کی منزل ہے سب کے سامنے
سب کی راہیں مختلف ہیں، سب کا جذبہ ایک ہے

مَیں نے ماضی اور مستقبل کی صدیاں چھان لیں
مَیں نے دیکھا۔ وقت کے کیسے میں لمحہ ایک ہے

عدل کر، اولادِ آدم کے مقدّر! عدل کر
تشنہ لب لاکھوں کروڑوں، اور دریا ایک ہے

وسعتِ عالم میں مانندِ لحد اُبھرا ہُوا
جستجو کے بحرِ ظلمت میں جزیرہ ایک ہے

سب کے سب فانی ہیں، باقی ہے فقط ذاتِ خدا،
قاتل و مقتول کی قبروں پہ کتبہ ایک ہے

پیار سے قائم ہے تخلیقِ دوعالم کا بھرم
اس شجر کی اَن گنت شاخیں ہیں، پتّا ایک ہے

جتنے چہرے ہیں وہ اِک چہرے کا عکس و نقش ہیں
یوں تو رشتے سیکڑوں ہیں، اصل رشتہ ایک ہے

کیا بتاؤں، کون سی تخصیص مجھ کو بھا گئی
یوں تو اپنے ہیں سب انساں، میرا اپنا ایک ہے

کتنی وحدت ہے صداؤں کے تنوع میں ندیمؔ
ساز سب کے اپنے اپنے، سب کا نغمہ ایک ہے

ستمبر ۱۹۸۰ء

دکھ سب کو خود اپنی ذات کا ہے

انجام یہی حیات کا ہے

ہر شخص کے کہہ رہے ہیں تیور

مرکز وہی کائنات کا ہے

مجبور نہیں خدا، مگر کیوں
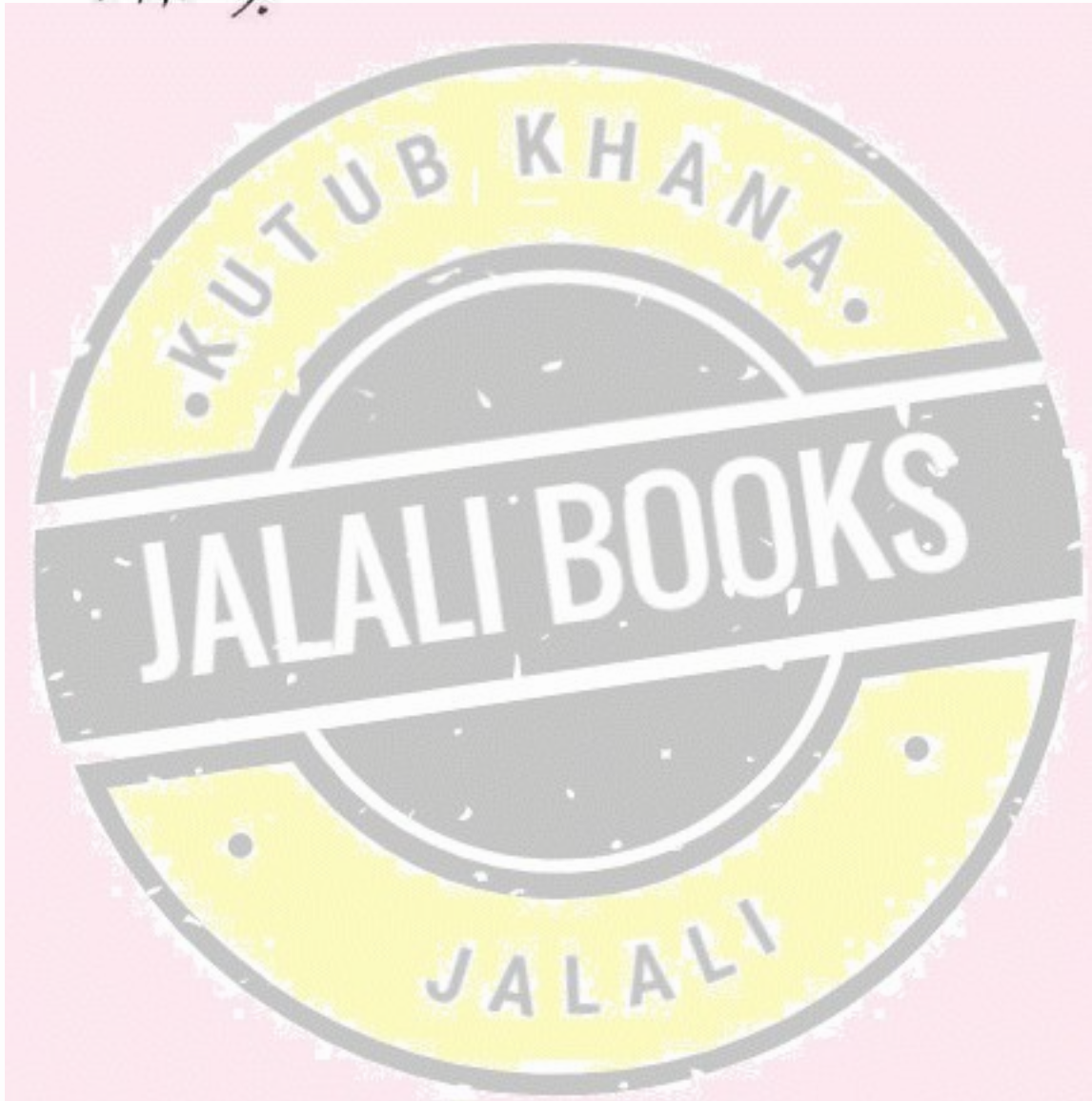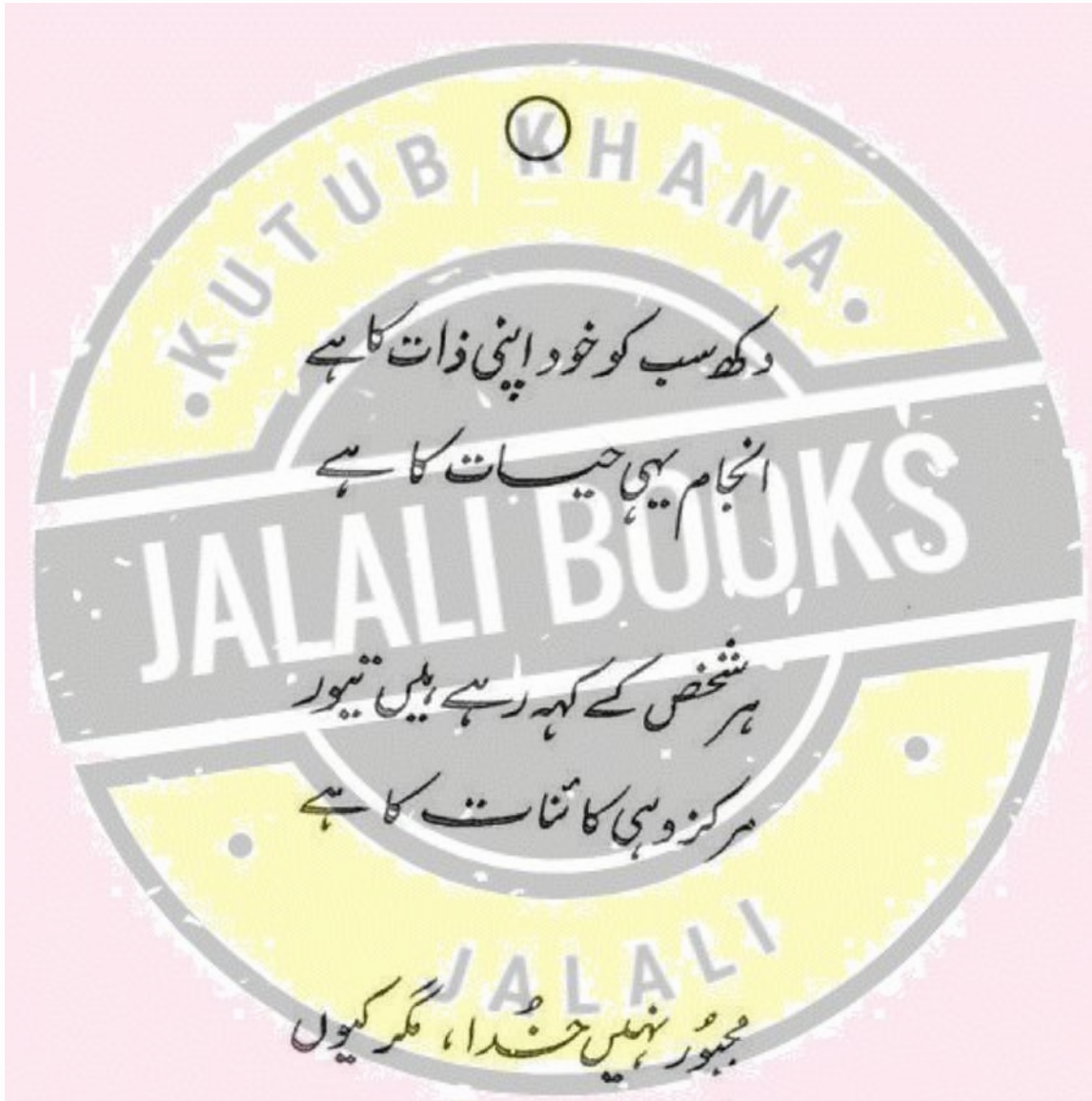
جو کچھ ہے، ہدف ممات کا ہے

اِک سانس پہ دسترس نہیں ہے

اور خواب وہی ثبات کا ہے

دُنیا کو بنا لیا ہے دشمن
جھگڑا فقط التفات کا ہے

محکومیِ خیر و شر کو تج دے
یہ راستہ ہی نجات کا ہے

مشرق سے نکل رہا ہے سورج
یہ سارا کمال رات کا ہے

قدرت کی بھی اِک جہت نہیں ہے
یہ کھیل ہی شش جہات کا ہے

تِنکا ہے ندیمؔ — زندگانی
اور سیل تغیّرات کا ہے

اگست ۱۹۸۰ء

کچھ گھبرایا گھبرایا سا لگتا ہُوں
ابھی ابھی زندانِ ذات سے نکلا ہُوں

روزِ قیامت ہے میرا ہر روزِ حیات
حشر ہُوں اور خود اپنے اندر برپا ہُوں

زندگی کرنے کا فن خود سیکھا ہی نہیں
اور سارے الزام خدا پر دھرتا ہُوں
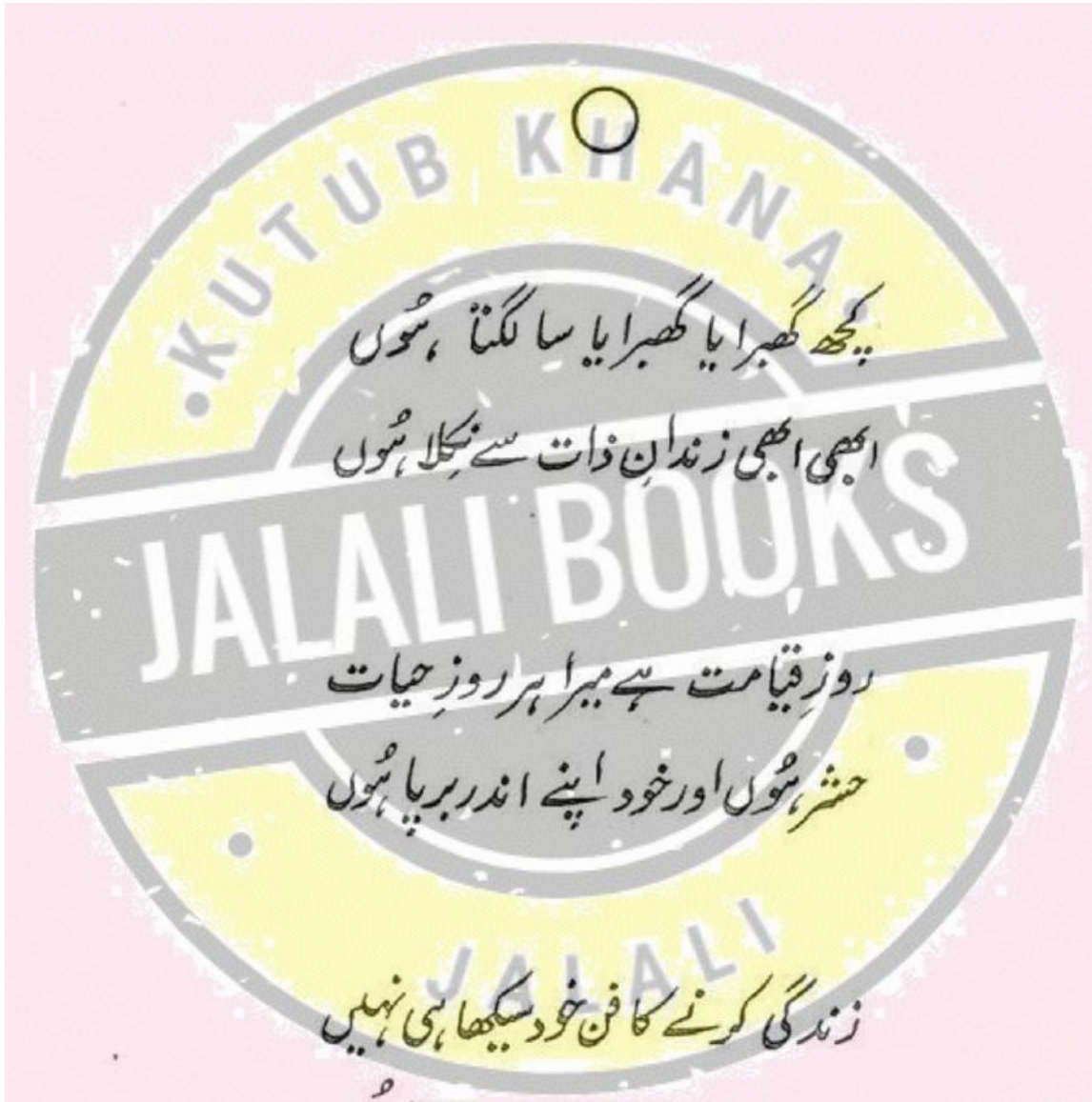
مَیں نے پیاس بُجھانی چاہی پیاسوں کی
اب صحرا میں غائب ہوتا دریا ہُوں

ایک دیا ہوں، جس نے جل کے سحر کر دی
اب سورج کے حوالے، اب مَیں چلتا ہوں

تیرے ساتھ چلوں، گر تیری اجازت ہو
قافلۂ گُل! میں جو خزاں کا پتّا ہوں

دھرتی پر کچھ دیر تو مجھ کو رُکنے دو!
کڑے سفر کے بعد یہاں تک پہنچا ہوں

ہَی جو گراں ہوں رُت کے ہزار انباروں سے
پھول کی پتّی سامنے ہو تو سَستا ہوں

میرا کمالِ فن ہے امکانات کی سیر
ریت پہ بیٹھا پھول بناتا رہتا ہوں

کوئی شجر ہی نہیں ہے جس سے کلام کروں
حبس کے ویرانوں میں بھٹکتا جھونکا ہوں

میں — میرے نقّاد — بہت ہی بُرا سہی
اتنا بُرا نہیں ہُوں جتنا اچھا ہُوں

رات کو روشن رکھنا میرا کام ندیمؔ
شام کا پہلا، صُبح کا آخری تارا ہُوں

اپنے لہُو سے آپ چراغاں کرتا ہُوں
مُجھ کو بھی دیکھو، مَیں بھی تو اک تماشا ہُوں

میرے عدوئے تیرہ ضمیر کو کیا معلوم
نُورِ سحر ہُوں، اور اُفق پر ملتا ہُوں

دشتِ خیال کا ایک بگولا ہُوں، لیکن
عرش کو چھُوتا ہُوں، جب فرش سے اُٹھتا ہُوں

میری حیات، تلاشِ جنّتِ گم گشتہ
اوّل دن سے اپنے وطن سے بچھڑا ہُوں

باندھ رکھا ہے مَیں نے ازل سے رختِ سفر
کھول کے شہپرِ فکر، ابد تک اُڑتا ہُوں

ایک آواز مسلسل پیچھا کرتی ہے
—انسانو! مَیں باغِ بہشت میں تنہا ہُوں—

مَیں انسان ہُوں، میرا غروب قیامت ہے
مَیں سُورج ہُوں اور بظاہر ڈُوبا ہُوں

گُزرے دِنوں کی گُونج بھی میرے کان میں ہے
آنے والے دَور کی چاپ بھی سُنتا ہُوں

پاس رہے جس کو آدابِ عداوت کا
مَیں دیوانہ اُس دشمن پر مرتا ہُوں

شاید مستقبل کا مؤرّخ ہی سُن لے
پتھّر کی دیوار پہ دستک دیتا ہُوں

شعر کہے تو کبھی کبھی محسوس ہُوا
جیسے ابر ہُوں، اور خلا میں برسا ہُوں

اپنی فنا سے مجھ کو بلا کی ضد ہے ندیمؔ
سبزہ بن کر اپنی لحد سے نکلا ہُوں

اگست ۱۹۸۰ء
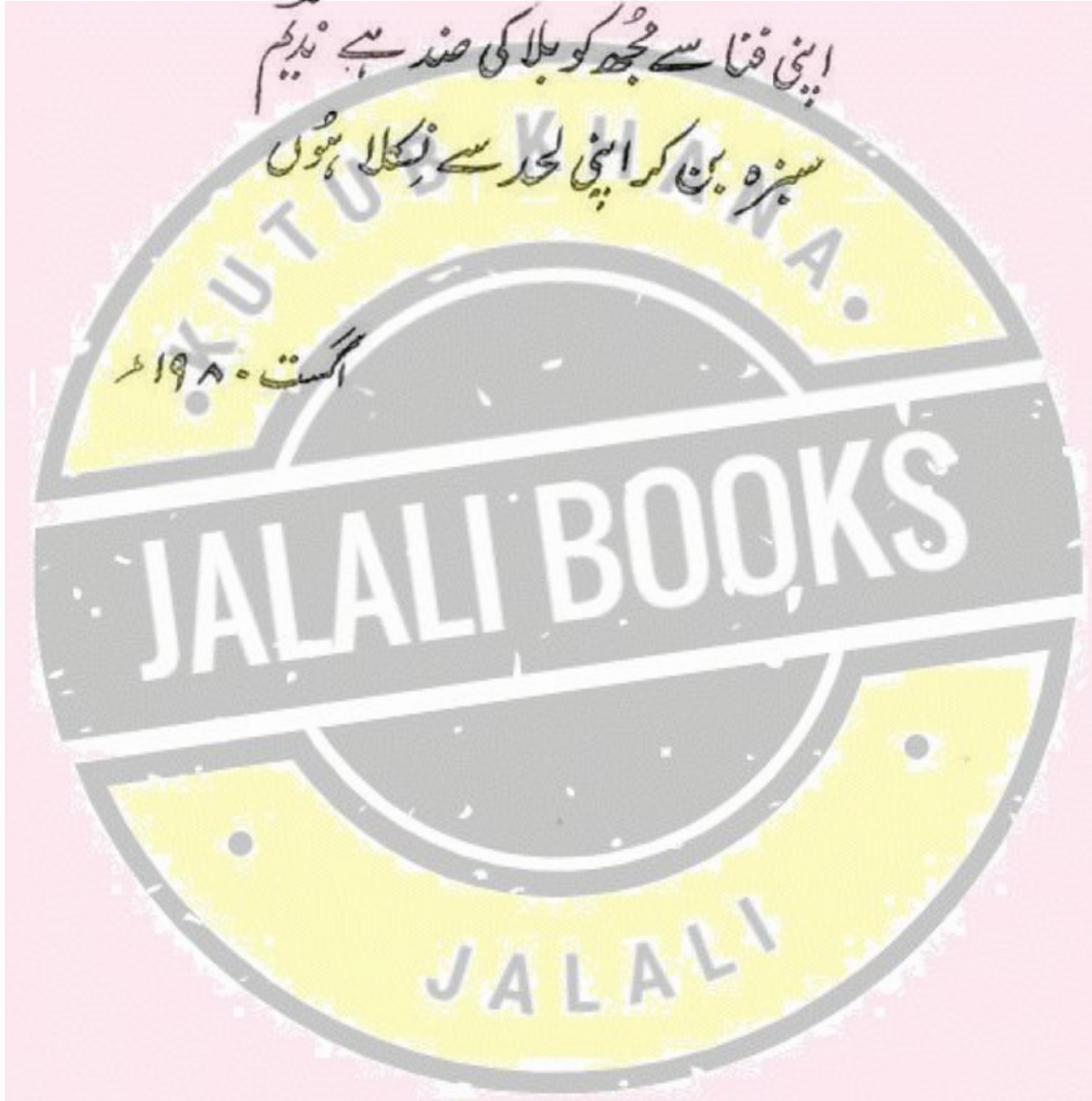
پیماں جو بندھ رہے ہیں، کوئی سُن رہا نہ ہو
یعنی کہیں قریب ہمارا خدا نہ ہو

اے پاسِ وضع کے نفسِ سرد! دیکھنا
میرا چراغِ ضبطِ فغاں بُجھ گیا نہ ہو

مَیں سُن رہا ہُوں کب سے ترے دل کی دھڑکنیں
لیکن یہ رخشِ وقت کی آوازِ پا نہ ہو

شبنم کے انتظار میں مُرجھا کے جو گِرا
وہ برگِ گُل کہیں مرا دستِ دُعا نہ ہو

دکھ ہے تو صرف یہ، کہ وہ دُکھ دے کے خوش ہُوا
ورنہ کسی بھی دُکھ سے مجھے دُکھ ذرا نہ ہُوا

وہ غم ہی کیا، جو غم کا مداوا نہ کر سکے
وہ دل ہی کیا، جو راکھ تو ہو، کیمیا نہ ہو

کوئی سبب تو ہو مرے باطن کے نُور کا
آنسو ہی دل میں، بن کے ستارہ، گرا نہ ہو

آئندہ کا سفر ہے، مگر ہر قدم پہ فکر
ماضی کا نقشِ پا ہی مرے زیرِ پا نہ ہو

آواز کفر ہے، تو کچھ ایسا ہو اہتمام
ٹوٹے گر آسماں بھی، تو کوئی صدا نہ ہو

انعام پا رہا ہوں میں خُود اپنے قتل کا
یارب، اس امتحاں میں کوئی مبتلا نہ ہو

تہذیب کا یہ کتنا مہذّب اصُول ہے
پردے میں چاہے کچھ ہو، مگر برملا نہ ہو

اِک عُمر سے ہے مُجھ کو اس انسان کی تلاش
اچھا جو مُجھ سے بڑھ کے ہو، مُجھ سے بُرا نہ ہو

گر وُہ مری دُعا ہے، تو پُوری بھی ہو ندیم
گر وُہ مرا خُدا ہے، تو پھر نارسا نہ ہو

اگست ۱۹۸۰ء
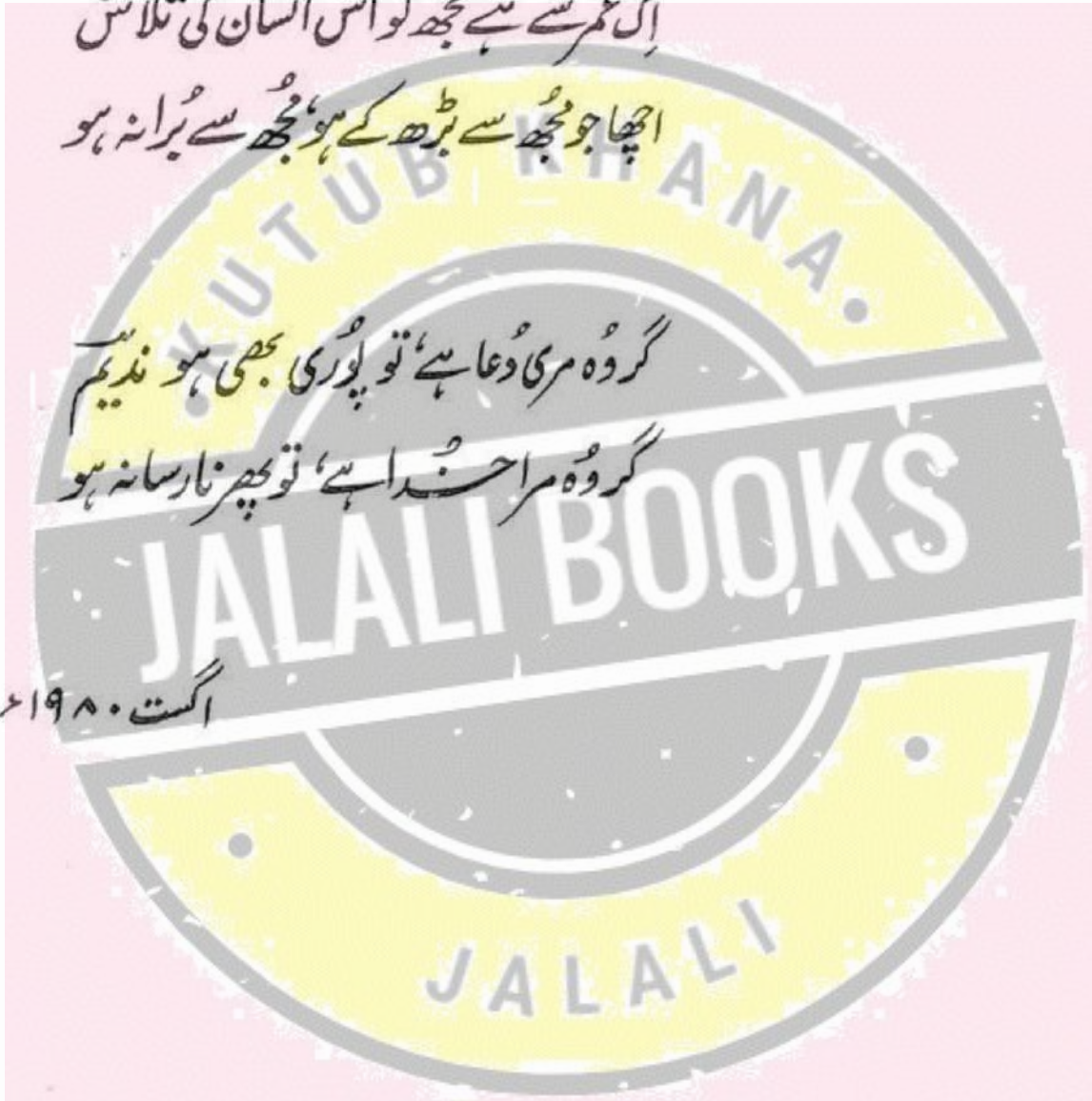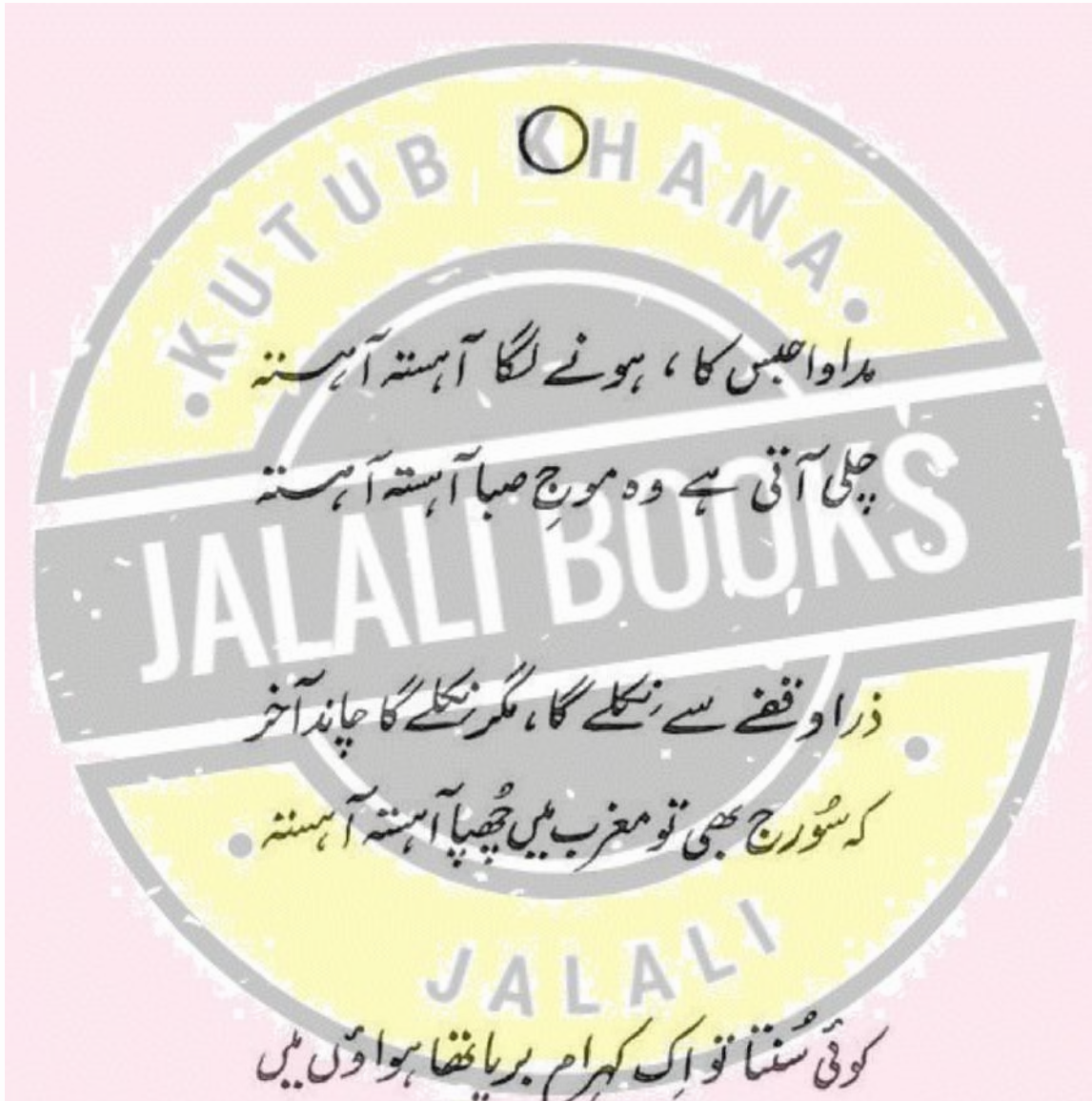
مداوا حبس کا، ہونے لگا آہستہ آہستہ
چلی آتی ہے وہ موجِ صبا آہستہ آہستہ

ذرا وقفے سے نکلے گا، مگر نکلے گا چاند آخر
کہ سُورج بھی تو مغرب میں چُھپا آہستہ آہستہ

کوئی سُنتا تو اِک کہرام برپا تھا ہواؤں میں
شجر سے ایک پتّا جب گرا آہستہ آہستہ

تعجّب میرے جل بجھنے پہ کیوں ہے میرے پیاروں کو
مَیں اپنی آنچ میں تپتا رہا آہستہ آہستہ

ابھی سے حرفِ رخصت کیوں جب آدھی رات باقی ہے
گُل و شبنم تو ہوتے ہیں جُدا آہستہ آہستہ

مجھے منظور، گر ترکِ تعلّق ہے رضا تیری
مگر ٹوٹے گا رشتہ درد کا آہستہ آہستہ

غرورِ مدّعا، شرمندۂ اظہار کیوں ہوتا
میں اشکوں ہی میں سب کچھ کہہ گیا آہستہ آہستہ

پھر اس کے بعد شب ہے جس کی حد صبحِ ابد تک ہے
مغنّی! شام کا نغمہ سنا آہستہ آہستہ

شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر بھی ڈوب جاتا ہے
اُترتا ہے مرے دل میں خدا آہستہ آہستہ

میں شہرِ دل سے نکلا ہوں سب آوازوں کو دفنا کر
ندیم اب کون دیتا ہے صدا آہستہ آہستہ

جانے کس سمت سے آیا ہوں، کدھر جاتا ہوں
کوئی پُوچھے تو یہ کہتا ہوں کہ گھر جاتا ہوں

میں جو ظلمات سے ڈرانہ گزر جاتا ہوں
برگِ گُل خاک پہ گرتا ہے تو مر جاتا ہوں

میں فرشتوں کو بھی خاطر میں نہ لاؤں لیکن
اپنا جب سامنا کرتا ہوں تو ڈر جاتا ہوں
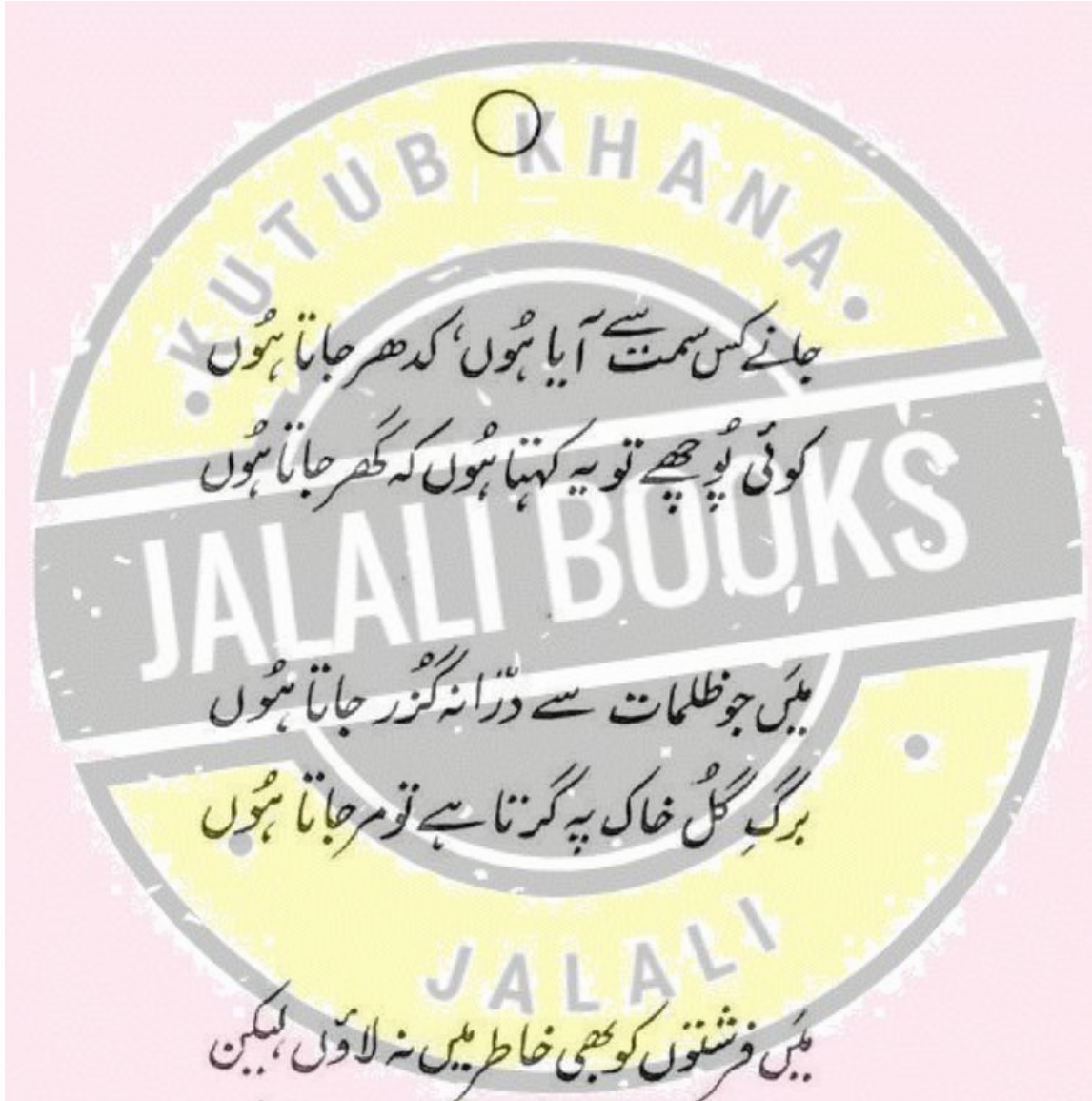
ساری دُنیا سے الگ ہے مرا رستا نا بھی
خار چُبھتا ہے تو پَل بھر کو ٹھہر جاتا ہوں

مجھ پہ تہمت ہے کہ مَیں کچھ بھی نہیں کر پاتا
چیخ کر، دشت کو سنسان تو کر جاتا ہُوں

مَیں سمندر ہُوں، جو کرتا نہیں توہینِ وفا
چاند کے ساتھ ہی، ساحل سے اُتر جاتا ہُوں

پھُول سا میرا مقدّر ہے، کہ مَیں بھی تو ندیمؔ
صُبح کِھلتا ہُوں مگر شام بکِھر جاتا ہُوں

ستمبر ۱۹۸۰ء

بگڑ کے مجھ سے، وہ میرے لیے اُداس بھی ہے
وہ زود رنج تو ہے، پر وفا شناس بھی ہے

تقاضے جسم کے اپنے ہیں، دل کا اپنا مزاج
وہ مجھ سے دُور ہے، اور میرے آس پاس بھی ہے

نہ جانے کون سے چشمے ہیں ماورائے بدن
کہ پا چکا ہوں جسے، مجھ کو اس کی پیاس بھی ہے

وہ ایک پیکرِ محسوس، پھر بھی نامحسوس
مرا یقین بھی ہے اور مرا قیاس بھی ہے

حسیں بہت ہیں مگر میرا انتخاب ہے وہ
کہ اُس کے حُسن پہ باطن کا انعکاس بھی ہے

ندیمؔ اُسی کا کرم ہے، کہ اس کے در سے ملا
وہ ایک دردِ مسلسل جو مُجھ کو راس بھی ہے

ستمبر ۱۹۸۰ء

○
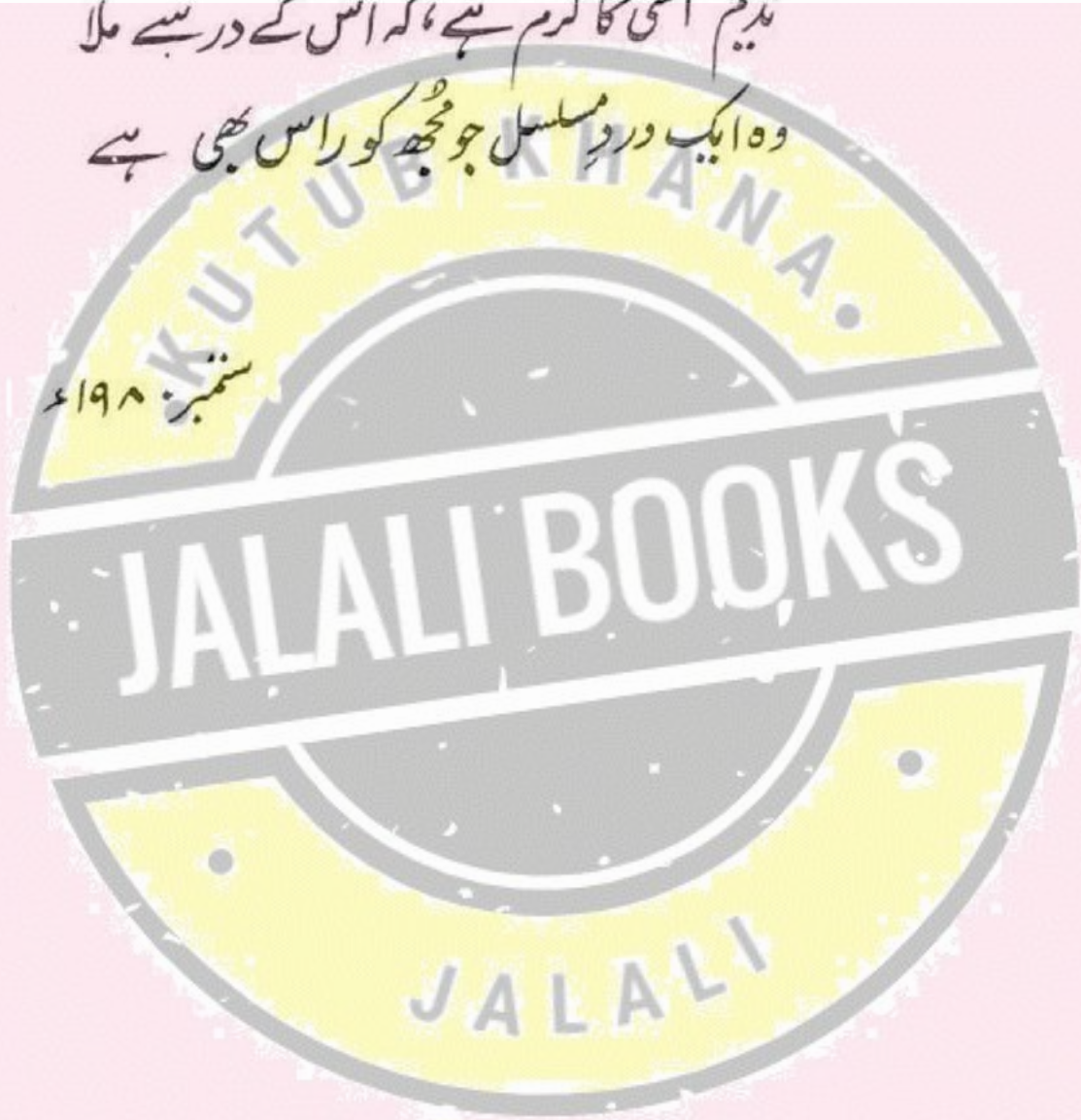
مرے سوال کا، یارب! کوئی جواب ملے
زمیں پہ کیوں مجھے اتنے فلک مآب ملے

یہ روزِ حشر ہے، لیکن مرے حساب سے قبل
مجھے خدا کی عنایات کا حساب ملے

وفورِ تشنہ لبی تھا کہ نقصِ دیدہ وری
مجھے تو جتنے سمندر ملے، سراب ملے

عظیم شہر حقیقت میں کتنا چھوٹا تھا
تمام قصر نشیں خانماں خراب ملے

کوئی بتا نہ سکا مجھ کو مدعائے حیات
جو گُل کِھلا تو کئی راز بے حجاب ملے

نہ میں طلسم کا ماہر، نہ مجتہد، نہ رسول
مگر مجھے سفرِ شب میں آفتاب ملے

اگر نہیں ہے خدا کا کوئی شریک ندیمؔ
تو مجھ غریب کو بھی ہجر کا ثواب ملے

ستمبر ۱۹۸۰ء

نہ جانے ترجماں ہیں کس قیامت کے اشاروں کی
دلِ افلاک میں اُتری ہوئی نوکیں ستاروں کی

اَنا کی آندھیوں میں ٹوٹ جاتے ہیں شجر کتنے
نہیں ہوتی خبر دریاؤں کو، کٹتے کناروں کی

میں آنکھیں کھول کر کچھ دیکھنا چاہوں تو بے بس ہوں
کہ تاریخِ جہاں گردِ سفر ہے شہ سواروں کی

یہیں سے کاروانِ رنگ و بُو اِک روز گزرا تھا
چمن کے زرد پتّے یادگاریں ہیں بہاروں کی

میں راہِ زندگی میں جب بھی ٹھوکر کھا کے گرتا ہوں
بدل لیتی ہے تیور دوست داری میرے یاروں کی

محبت میں تو غم بھی نفع ہے، دُکھ بھی کمائی ہے
محبّت میں کبھی گنتی نہیں ہوتی خساروں کی

یہ نخلستان ہے تنہائیوں کے ریگزاروں کا
مرے اندر جو بستی بس رہی ہے میرے پیاروں کی

گریزاں ہے ابھی تک آدمی نورِ حقیقت سے
ابھی تک رسم ہے اربابِ فن میں استعاروں کی

اگر سچ بولنا چاہو تو شعروں میں بھی سچ بولو!
کہ اب اس عہد کو حاجت نہیں جادو نگاروں کی

زمیں پر حضرتِ انساں کی جوہر آفرینی سے
ندیمؔ اب آسماں کو بھی ضرورت ہے سہاروں کی

جولائی
۱۹۸۰ء

عشق میں ضبط کا یہ بھی کوئی پہلو ہوگا
جو مری آنکھ سے ٹپکا، ترا آنسو ہوگا

ایک پل کو تری یاد آئے تو میں سوچتا ہوں
خواب کے دشت میں بھٹکا ہُوا آہُو ہوگا

تجھ کو محسوس کروں، مَس نہ مگر کر پاؤں
کیا خبر تھی کہ تو اِک پیکرِ خوشبو ہوگا
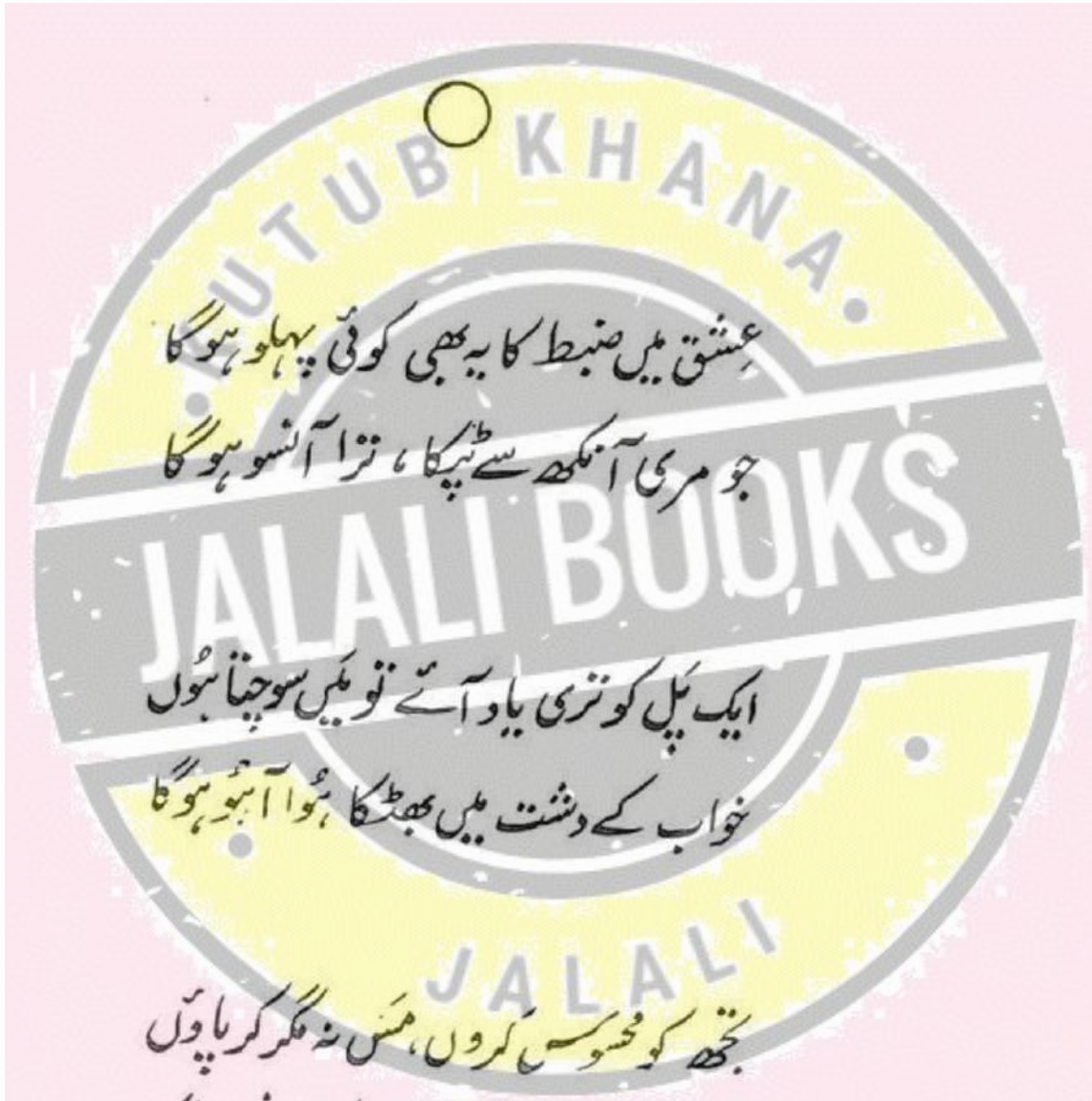
اب سمیٹا ہے تو پھر مُجھ کو ادھورا نہ سمیٹ
زیرِ سرِ سنگ نہ ہوگا، مرا بازُو ہوگا

مُجھ کو معلوم نہ تھی ہجر کی یہ رمز، کہ تُو
جب مرے پاس نہ ہوگا تو بہر سُو ہوگا

اِس توقّع پہ مَیں اب حشر کے دن گِنتا ہُوں
حشر میں اور کوئی ہو کہ نہ ہو — تُو ہوگا

جولائی ۱۹۸۰ء

زیست آزار ہوئی جاتی ہے
سانس تلوار ہوئی جاتی ہے

جسم بیکار ہوا جاتا ہے
رُوح بیدار ہوئی جاتی ہے

کان سے دل میں اُترتی نہیں بات
اور گفتار ہوئی جاتی ہے
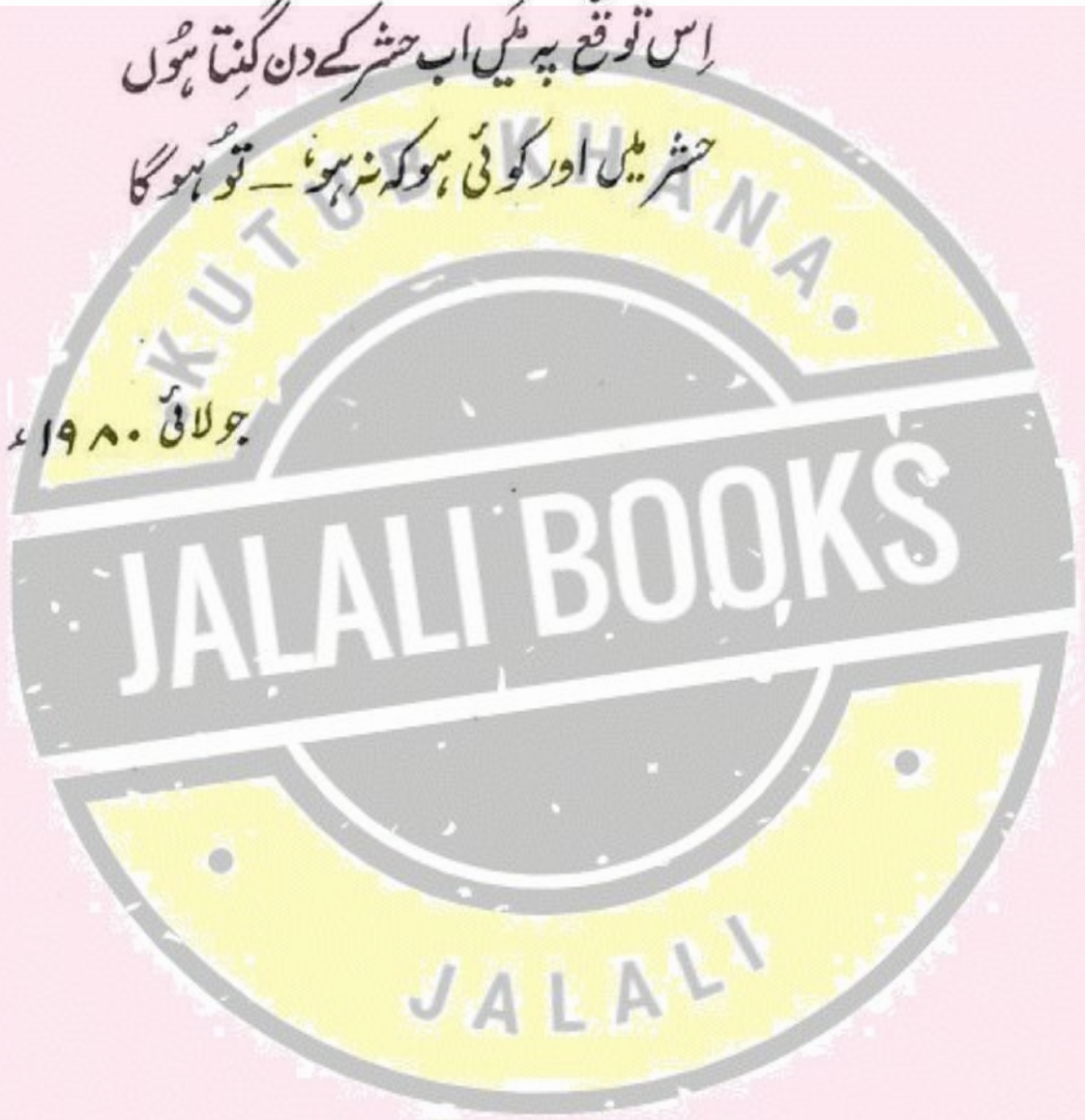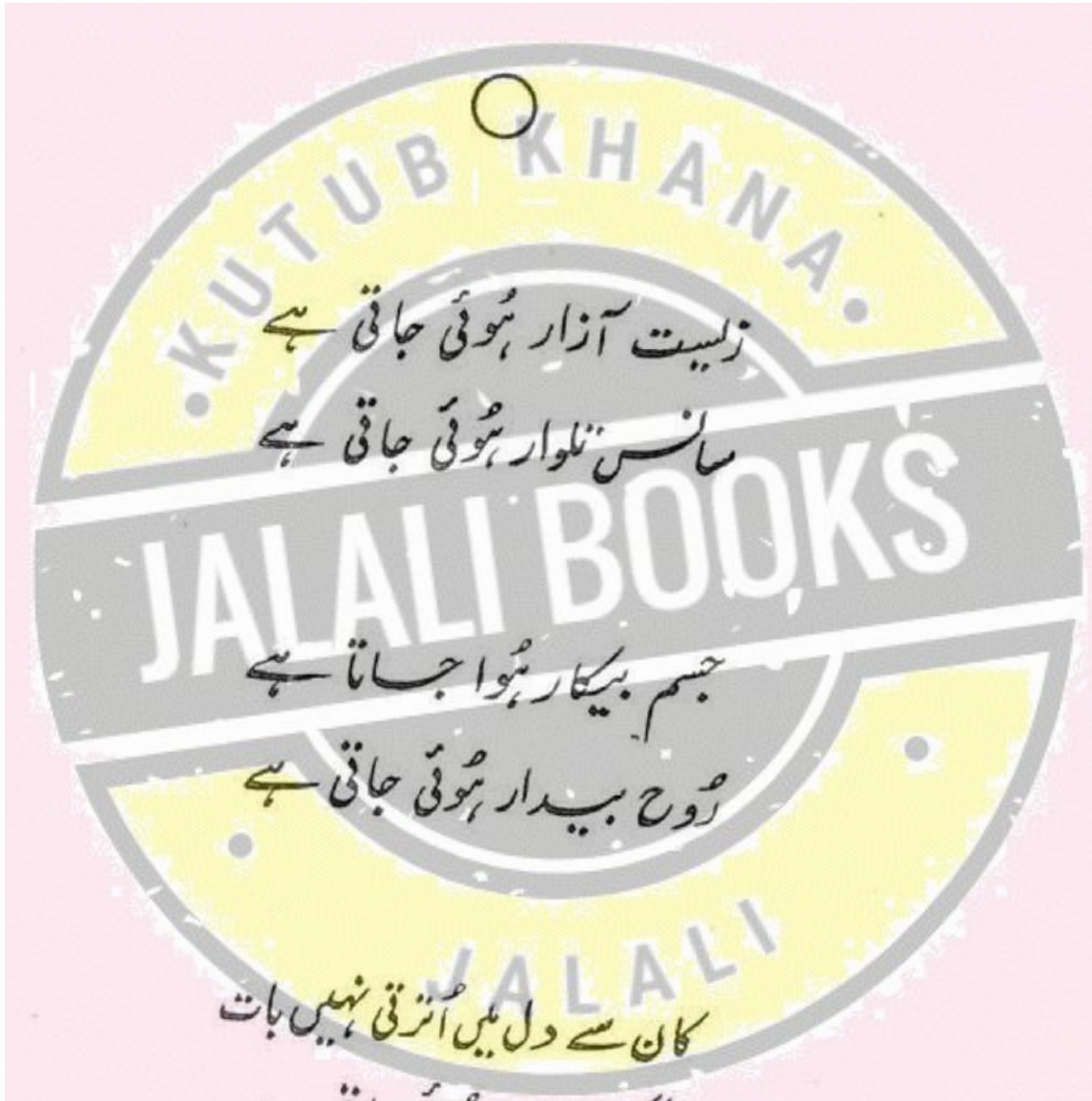
دُھل کے نکھری ہے حقیقت جب سے
کچھ پُراسرار ہوئی جاتی ہے

اب تو ہر زخم کی منہ بند کلی
لبِ اظہار ہوئی جاتی ہے

پھول ہی پھول ہیں ہر سمت ندیمؔ
راہ دشوار ہوئی جاتی ہے

جولائی ۱۹۸۰ء

○
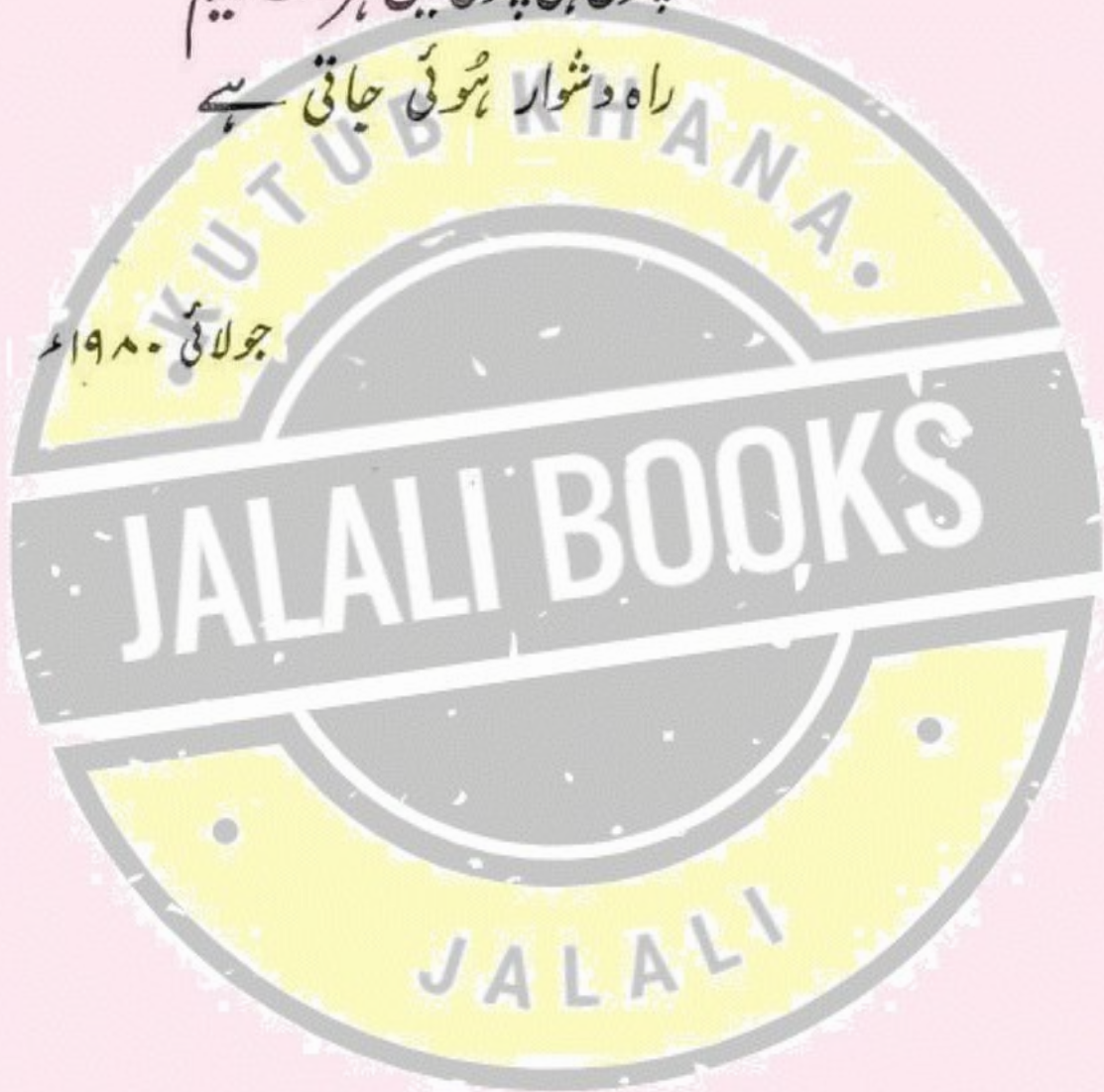
پیار کے دائرے کو تنگ کروں
یعنی اپنی اَنا سے جنگ کروں

جب مرا خون میرے کام نہ آئے
ریگِ صحرا کو رنگ رنگ کروں

آندھیوں میں چراغ لے کے چلوں
اور عناصر کو دنگ دنگ کروں

حمدِ ربِّ جمال ہے یہ بھی
ذکرِ حسنِ درونِ سنگ کروں

عشق کرنا ہے زہر خند ندیمؔ
جب بھی احساسِ نام و ننگ کروں

جولائی ۱۹۸۰ء

○

زہر کے بعد جو شرمندۂ تریاق ہوئے
آج وہ لوگ بھی منجملۂ عشاق ہوئے

زندگی بھر کوئی ہمراز نہ پایا ہوگا
درد کو سب سے چھپانے میں جو مشتاق ہوئے

جو فرشتے تھے، وہ تا حشر فرشتے ہی رہے
اور جو خاک کے پیکر تھے، وہ خلّاق ہوئے

غوطہ زنِ حرف کبھی شعر نہ بننے پائے
لفظ جو سطح پہ تھے، زینتِ اوراق ہوئے

دُور و نزدیک کا محور تھی مری ذات ندیمؔ
دائرے میری نظر کے، مرے آفاق ہوئے

جولائی ۱۹۸۰ء
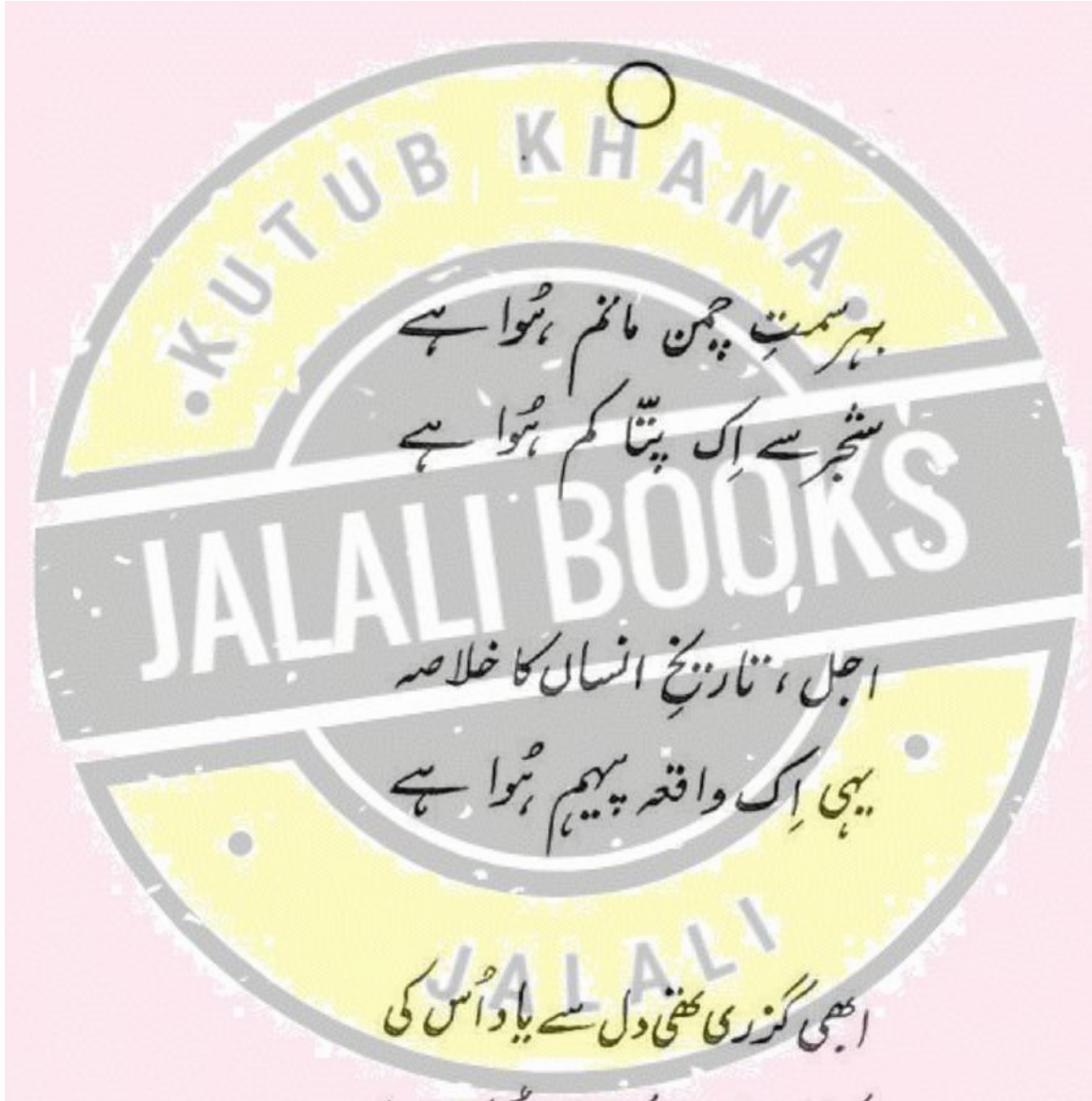
بہر سمتِ چمن ماتم ہُوا ہے
شجر سے اِک پتّا کم ہُوا ہے

اجل، تاریخِ انساں کا خلاصہ
یہی اِک واقعہ پیہم ہُوا ہے

ابھی گزری تھی دل سے یاد اُس کی
کہ صحرا میں ہرن کا رم ہُوا ہے

نئی امید کیوں دل کو دلاؤں
بڑی مشکل سے مستحکم ہُوا ہے

ابھی "کُن" کہتے کہتے رہ گیا ہُوں
محبّت میں عجب عالم ہُوا ہے
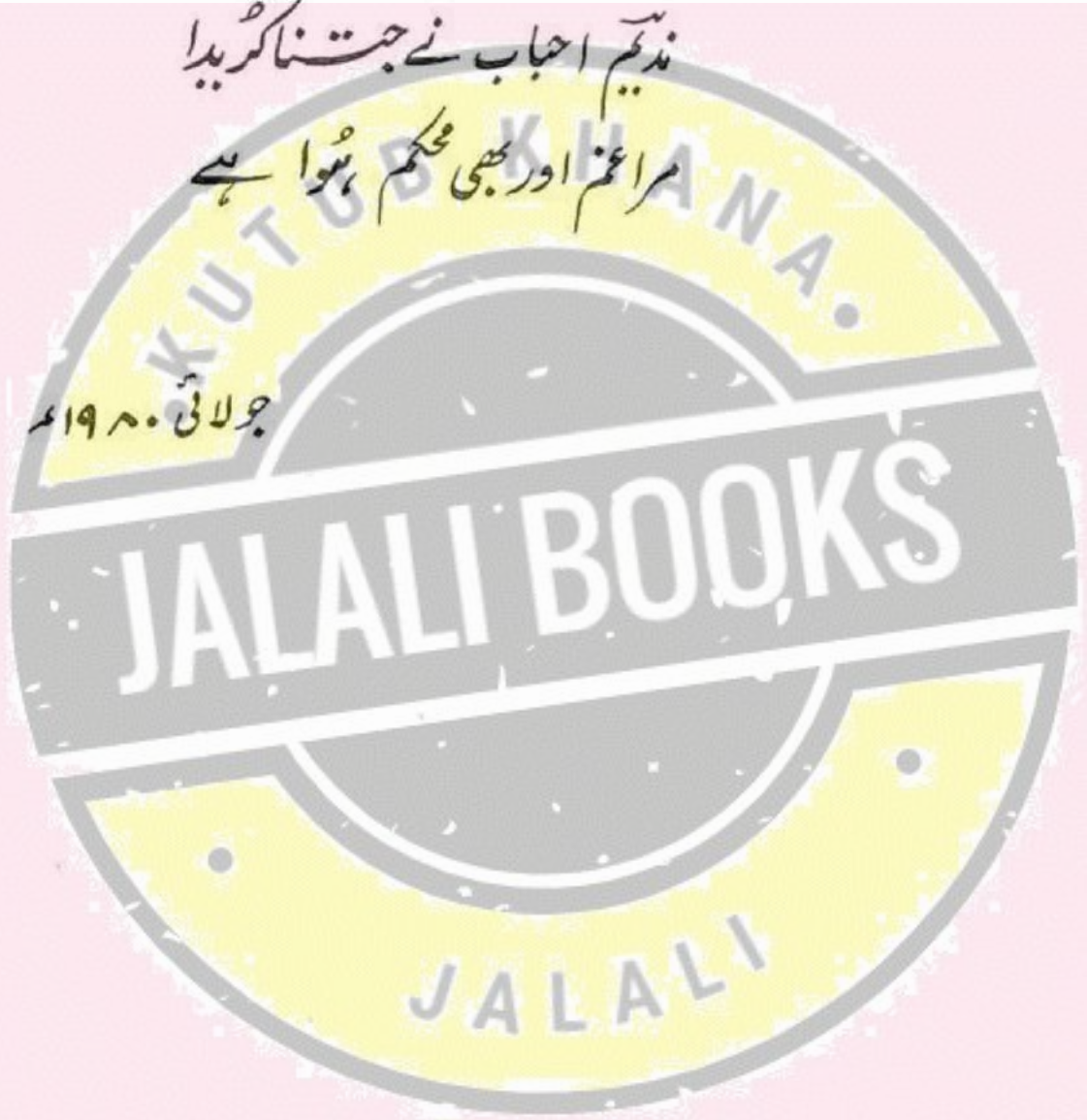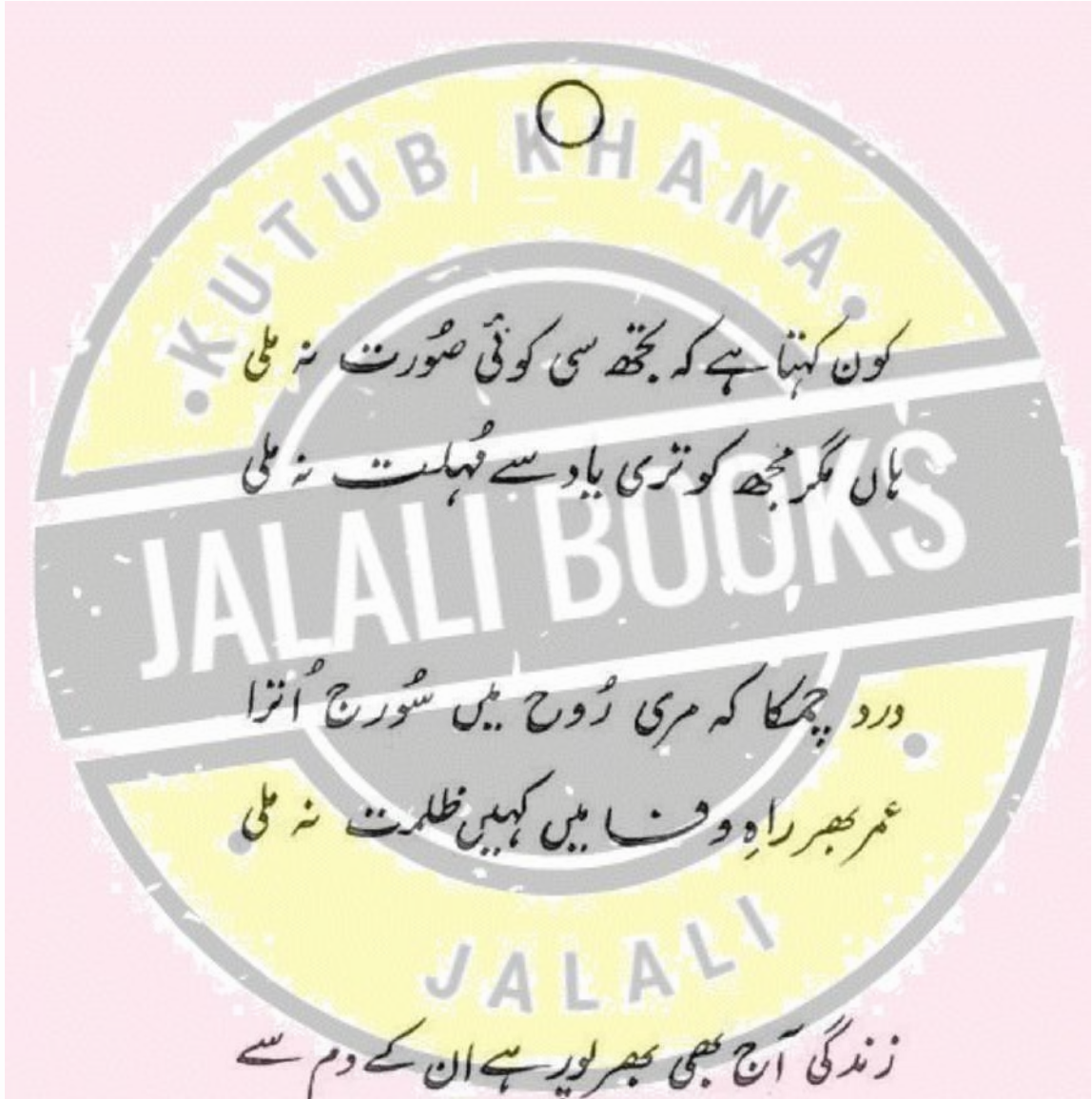
کون کہتا ہے کہ تجھ سی کوئی صورت نہ ملی
ہاں مگر مجھ کو تری یاد سے مُہلت نہ ملی

درد چمکا کہ مری رُوح میں سُورج اُترا
عمر بھر راہِ وفا میں کہیں ظلمت نہ ملی

زندگی آج بھی بھرپور ہے ان کے دم سے
جن کو فرہاد کے انجام سے عبرت نہ ملی

مجھ کو اس شخص کے افلاس پہ رحم آتا ہے
جس کو ہر چیز ملی، صرف محبّت نہ ملی

وہ بھی کیا عِلم — کہ جس سے تجھے — اے بحرِ علوم!
دل کی وسعت نہ ملی، غم کی دیانت نہ ملی

سرِ بازار کہیں جُرم نہ ہو ہنسنا بھی
سرِ دربار تو رونے کی بھی رخصت نہ ملی

مار ڈالے گا اُسے جُرم کا احساس ندیمؔ
قتل کر کے جسے، مقتول پہ سبقت نہ ملی

جولائی ۱۹۸۰ء

ہونٹوں پہ تبسّم لانے کو ہم کتنے خراب و خوار ہوئے
لیکن جو تبسّم جمع کیے، سب نذرِ اُمیدِ بہار ہوئے

برسوں کی خموشی نے ہم سے بدلہ بھی لیا تو بلا کا لیا
گفتار کی آزادی جو ملی، الفاظ ہی بے اظہار ہوئے
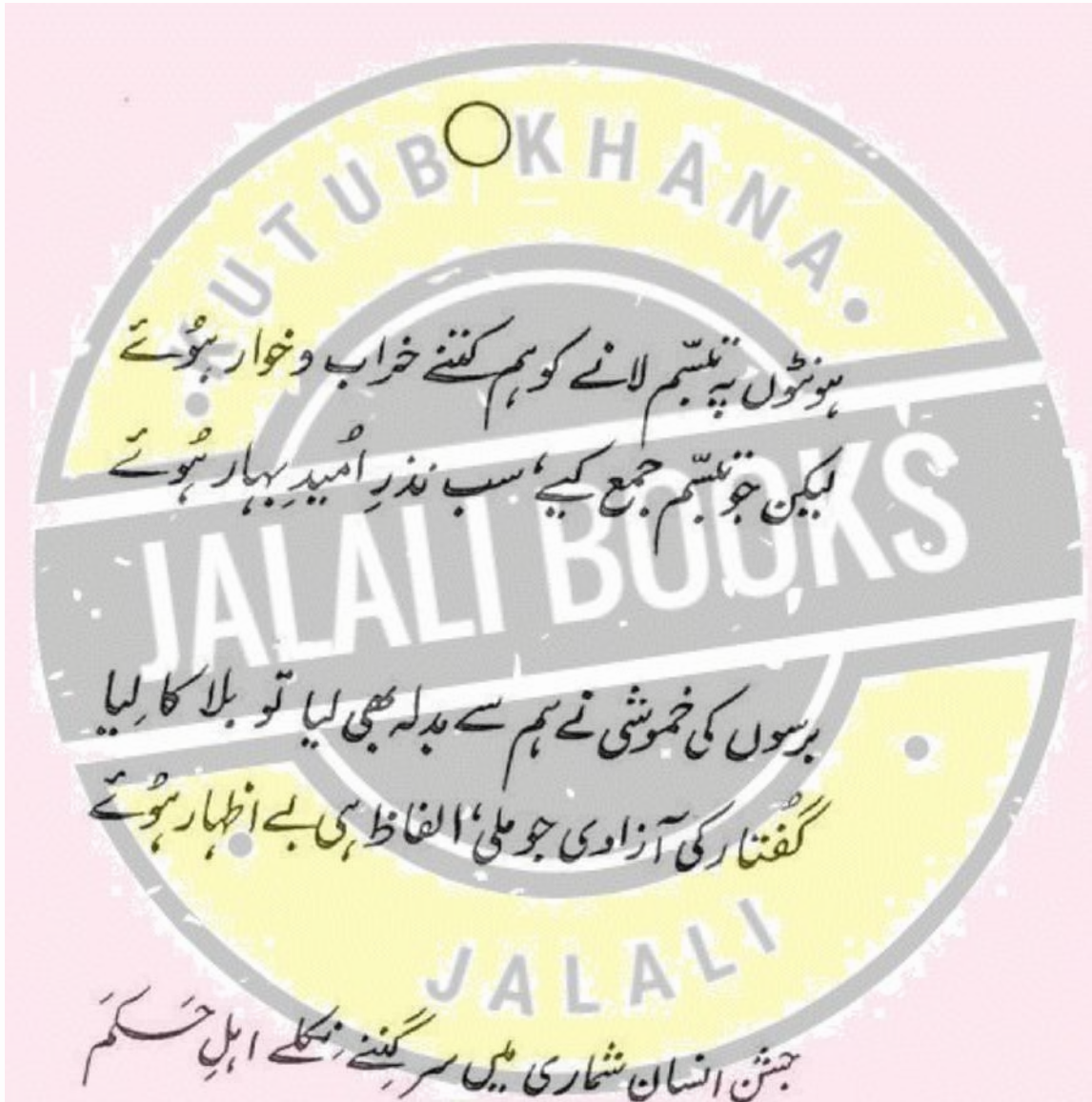
جشنِ انساں شماری میں سر گننے نکلے اہلِ حکم
مژدہ ہو کہ ان کی ضرورت سے ہم بھی زندوں میں شمار ہوئے

اِک چیخ بھی جو سر کر نہ سکے، محفوظ تھی ان کے دہن میں زباں
وہ سب ہی بریدہ زباں ہوں گے، گویا جو سرِ دربار ہوئے

ہر دَور کے فن کاروں نے سدا، جو کام کیا، اُلٹا ہی کیا
مقبول تھا سنگ زنی کا چلن، یہ لوگ مگر گُل بار ہوئے

اِک قصرِ منقّش میں آخر ہم نے بھی ندیمؔ قیام کیا
میدان بنے اس کے آنگن، کہسار اُس کی دیوار ہوئے

جولائی ۱۹۸۰ء

عجب جہانِ طلسمات میرے اندر تھا
میں مُشتِ خاک سہی، رُوح کا سمندر تھا

اب آئے اور زرِ دل سمیٹ کر لے جائے
جو میرا دوست تھا، جو میرا کیمیا گر تھا
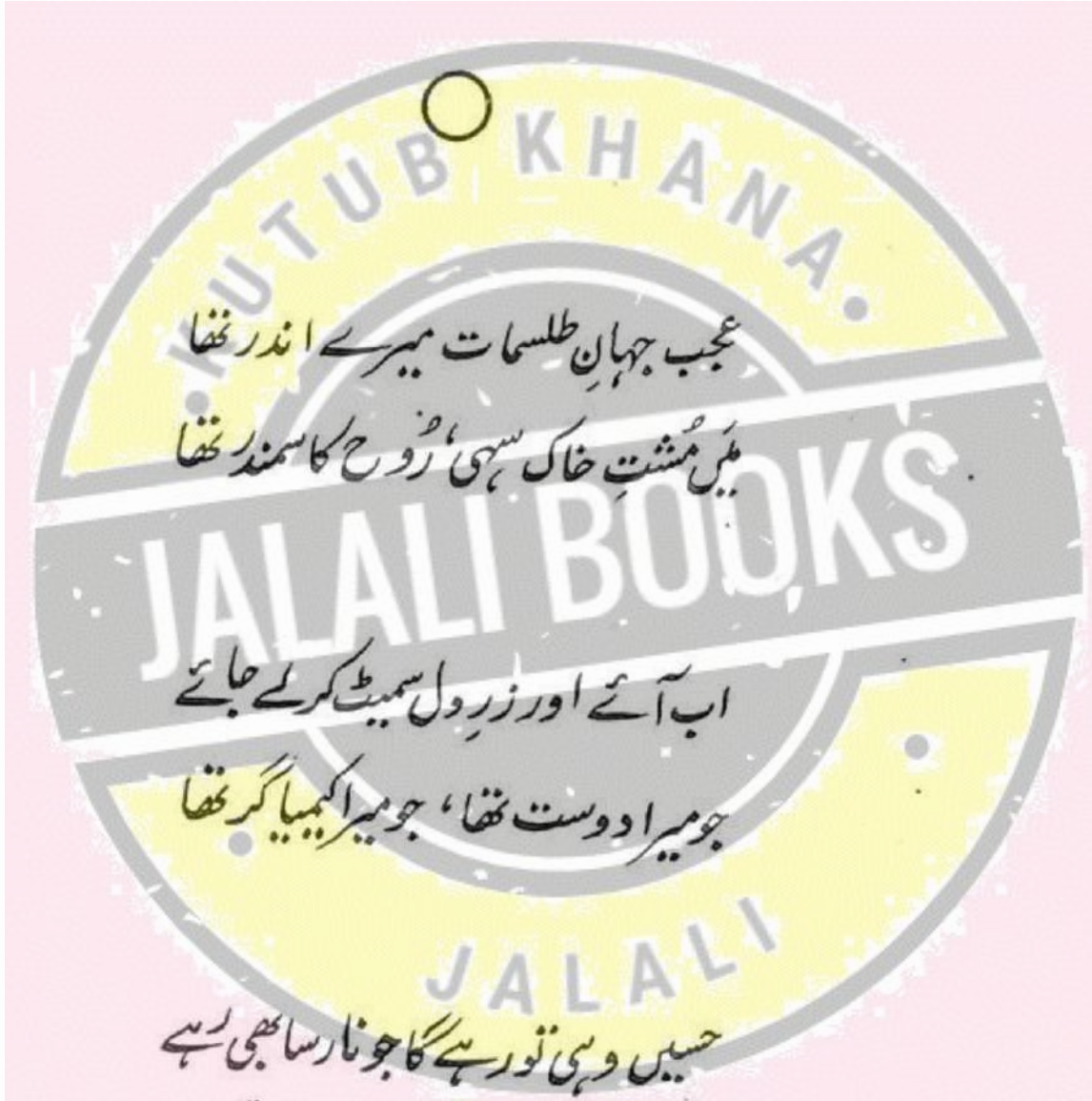
حسیں وہی تو رہے گا جو نارسا بھی رہے
قریب جا کے جو دیکھا، ستارہ پتھّر تھا

نرالا عذر تراشا تھا مسخ چہروں نے
کہ اس دیار کا ہر آئنہ مکدّر تھا

کچھ ایسے ختم ہوئی عمر بھر کی تنہائی
کہ میرے چار طرف دشمنوں کا لشکر تھا

گماں یہ تھا کہ وہ تھک کر شجر پہ اُترا ہے
اُڑا تو پنجۂ شاہین میں کبوتر تھا

ندیمؔ چشمِ فلک سے ٹپک رہے تھے نجوم
شبِ فراق بڑا اشک بار منظر تھا

جون ۱۹۸۰ء
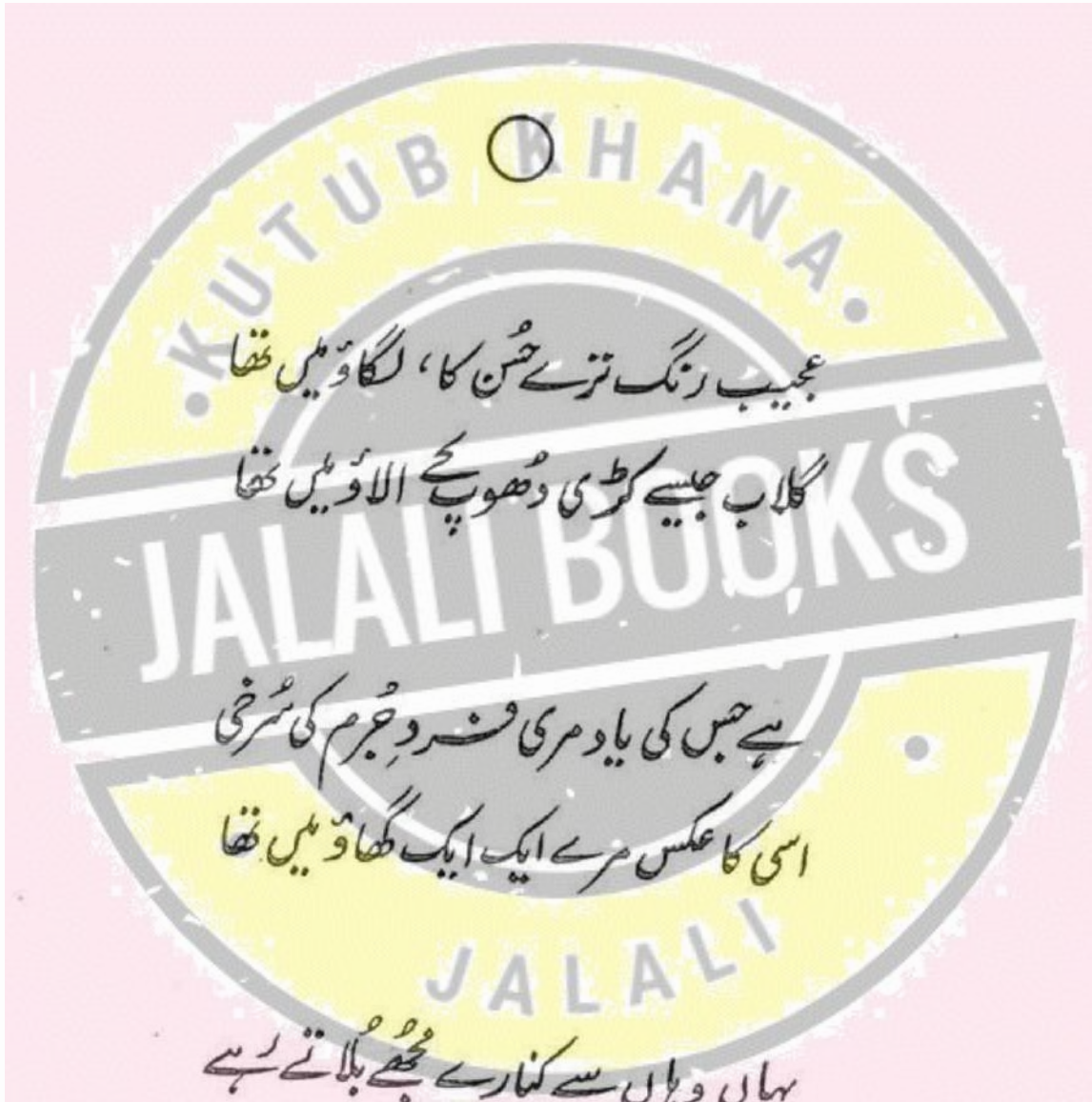
عجیب رنگ ترے حُسن کا، لگاؤ میں تھا
گلاب جیسے کڑی دھوپ کے الاؤ میں تھا

ہے جس کی یاد مری فردِ جُرم کی سُرخی
اسی کا عکس مرے ایک ایک گھاؤ میں تھا

یہاں وہاں سے کنارے مجھے بُلاتے رہے
مگر میں وقت کا دریا تھا اور بہاؤ میں تھا

عروسِ گُل کو صبا جیسے گدگدا کے چلے
کچھ ایسا پیار کا عالم ترے سبھاؤ میں تھا

میں پُرسکوں ہُوں، مگر میرا دل ہی جانتا ہے
جو انتشار محبّت کے رکھ رکھاؤ میں تھا

غزل کے رُوپ میں تہذیب گا رہی تھی ندیمؔ
مرا کمال، مرے فن کے اس رچاؤ میں تھا

اپریل ۱۹۸۰ء

○
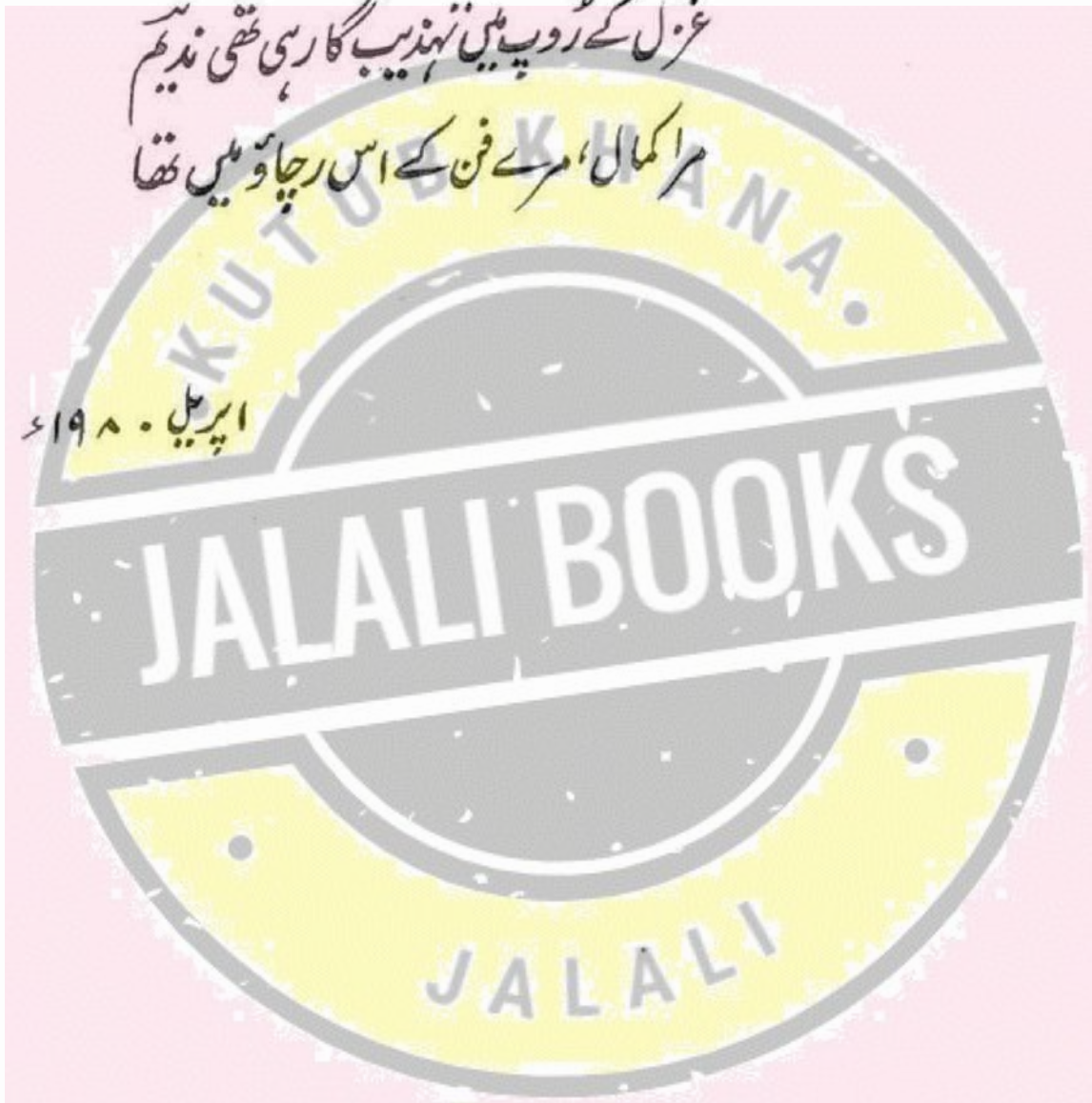
سطح پر آج تو پتھّر بھی اُبھرنا چاہیں
اِک ہم انسان ہیں جو ڈُوب کے مرنا چاہیں

اپنے سر پھوڑ لیں، یا موم کریں پربت کو
لوگ جلدی میں ہیں، کچھ فیصلہ کرنا چاہیں

سرِ گلزار لیے بیٹھے ہیں چھلنی تلوے
ہم، جو کلیوں پہ کبھی پاؤں نہ دھرنا چاہیں

مادرِ خاک کی آغوش سے بچھڑے ہُوئے پھُول
سینۂ خاک پہ گر گر کے بکھرنا چاہیں

کتنے فن کار ہیں وہ لوگ جو پیارے ہیں ندیمؔ
شعر کی طرح لہو تک میں اُترنا چاہیں
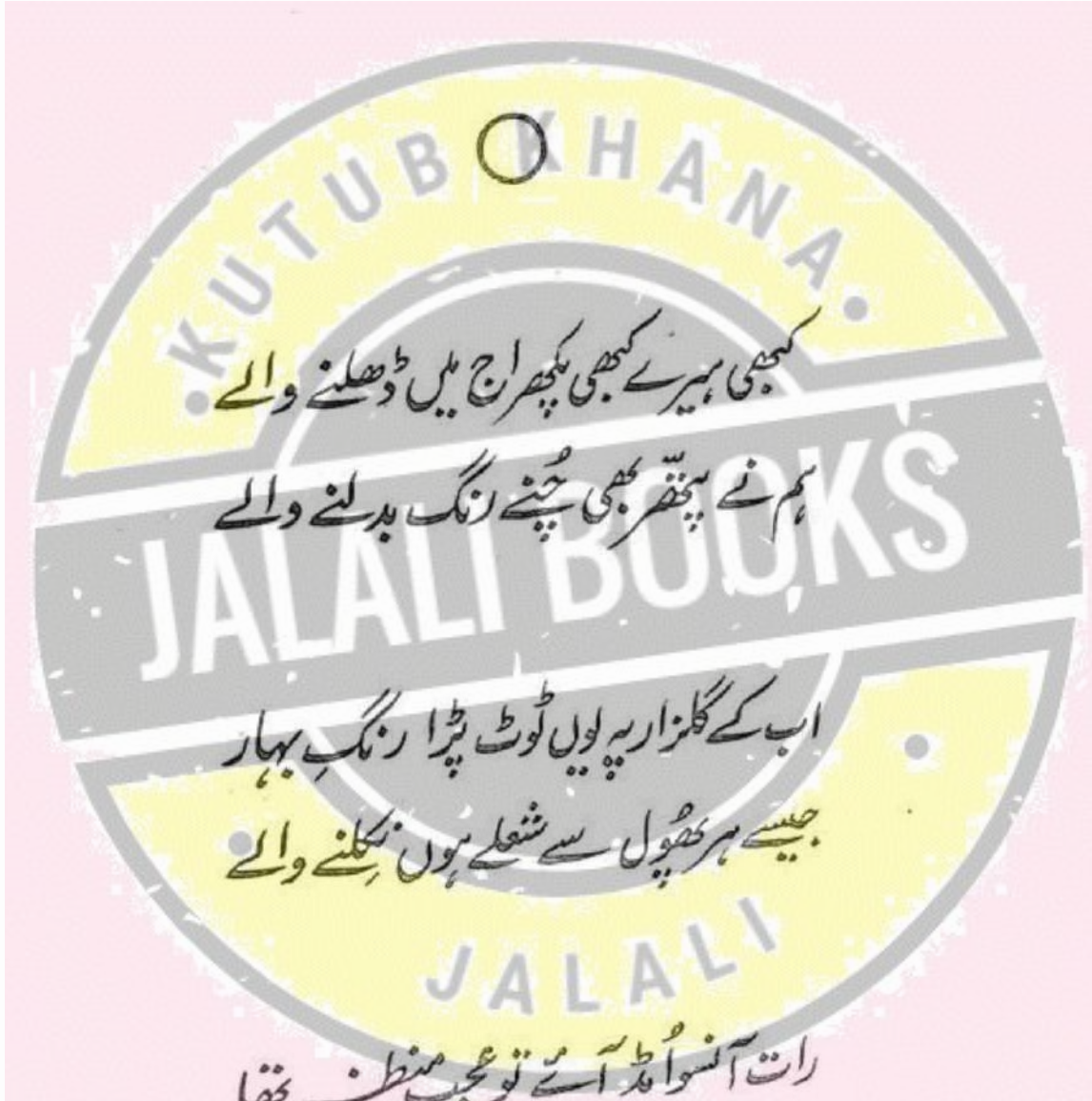
کبھی ہیرے کبھی پکھراج میں ڈھلنے والے
ہم نے پتھر بھی چُنے رنگ بدلنے والے

اب کے گلزار پہ یوں ٹوٹ پڑا رنگِ بہار
جیسے ہر پھول سے شعلے ہوں نکلنے والے

رات آنسو اُمڈ آئے تو عجب منظر تھا
ہم نے دیکھے مہ و انجم بھی پگھلنے والے

نارِ نمرود کی کیا ان کو ضرورت ہو گی
اپنی حدّت ہی میں جل جاتے ہیں جلنے والے

تھک کے ٹیلوں پہ اُتر آئی ہیں پیاسی چڑیاں
جیسے صحراؤں میں چشمے ہوں اُبلنے والے

وقت احکام سے زنجیر نہیں ہو سکتا
آنے والے ہیں جو لمحے، نہیں ٹلنے والے

کبھی خورشیدِ قیامت بھی تو نکلے گا ندیمؔ
دھوپ سے ڈرتے رہیں سائے میں چلنے والے

فروری ۱۹۸۰ء
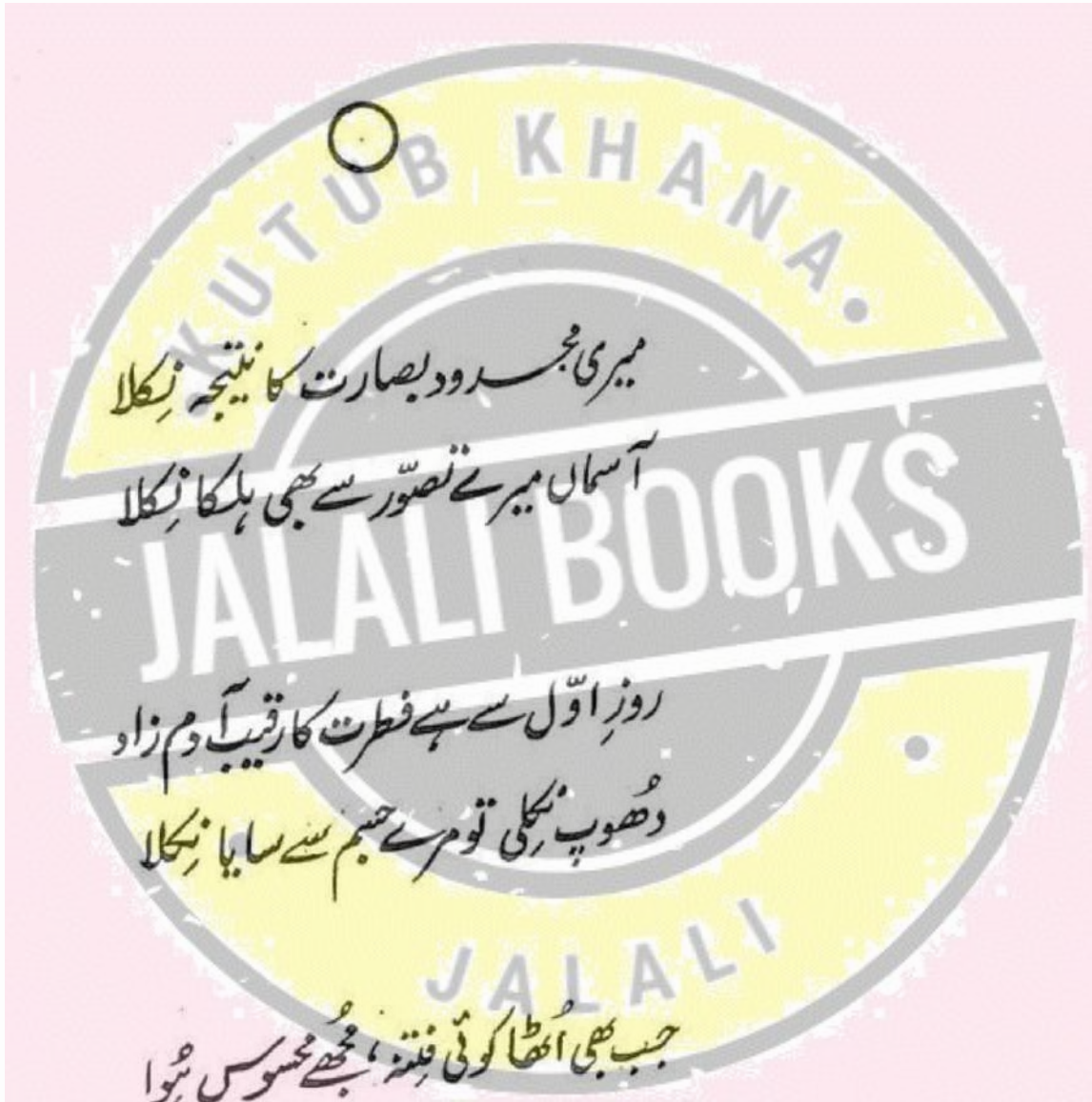
میری محدود بصارت کا نتیجہ نِکلا
آسماں میرے تصوّر سے بھی ہلکا نِکلا

روزِ اوّل سے ہے فطرت کا رقیب آدم زاد
دُھوپ نِکلی تو مرے جسم سے سایا نِکلا

جب بھی اُٹھا کوئی فِتنہ، مُجھے محسوس ہُوا
کہ جو ابلیس کا دعویٰ تھا، وہ سچّا نِکلا

سرِ دریا تھا چراغاں کہ اجل رقص میں تھی
بلبلا جب کوئی ٹوٹا تو شرارا نِکلا

بات جب تھی کہ سرِ شام فروزاں ہوتا
رات جب ختم ہوئی، صبح کا تارا نکلا

مدّتوں بعد جو رویا ہوں، تو یہ سوچتا ہوں
آج تو سینۂ صحرا سے بھی دریا نکلا

کچھ نہ تھا۔ کچھ بھی نہ تھا، جب مرے آثار کھدے
ایک دل تھا، سو کئی جگہ سے ٹوٹا نکلا

لوگ شہپارۂ یک جائی جسے سمجھے تھے
اپنی خلوت سے جو نکلا تو بکھرتا نکلا

میرا ایثار مرے زعم میں بے اجر نہ تھا
اور میں اپنی عدالت میں بھی جھوٹا نکلا

وہی بے انت خلا ہے، وہی بے سمت سفر
میرا گھر میرے لیے عالمِ بالا نکلا

زندگی ریت کے ذرّات کی گنتی تھی ندیم
کیا ستم ہے! کہ عدم بھی وہی صحرا نکلا

نومبر ۱۹۷۹ء

○
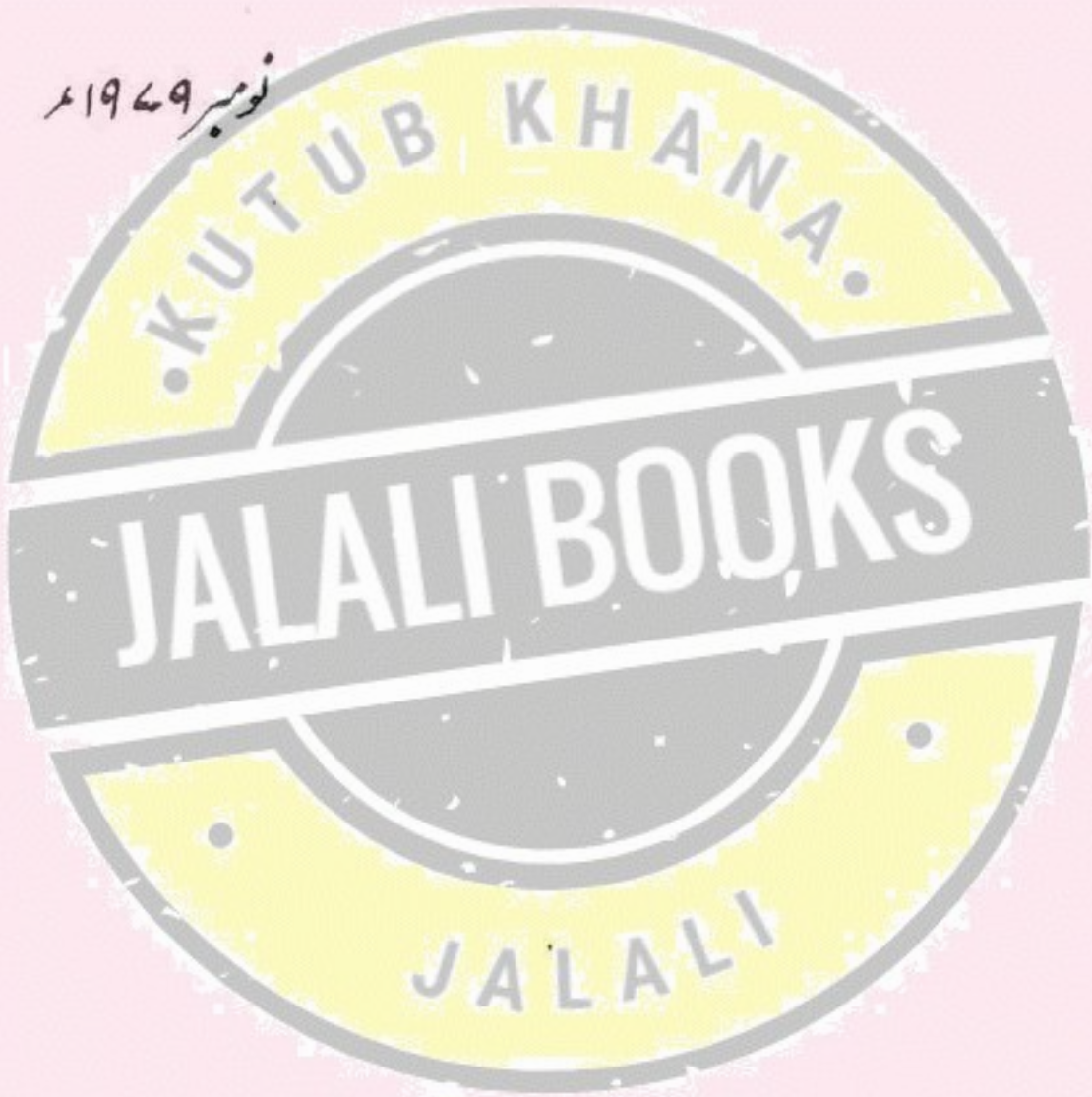
اِتنا دشوار نہیں موت کو ٹالے رکھنا
سر جو کٹ جائے تو دستار سنبھالے رکھنا

چوٹ کھانا، مگر اس طرح کہ لَو دے اُٹھے
ظلمتِ غم اسی تارے سے اُجالے رکھنا

اپنے احباب کو سینے سے لگائے پھرنا
ایک خنجر بھی مگر جیب میں ڈالے رکھنا

میری پہچان مرے پیرہنِ زخم سے ہے
اب بھی اعزاز یہی شال دوشالے رکھنا

دشتِ احساس کی حدّت بھی قیامت ہے ندیمؔ
کچھ ضروری تو نہیں پاؤں میں چھالے رکھنا

اکتوبر ۱۹۷۹ء

اپنے ماحول سے بھٹے قیس کے رشتے کیا کیا
دشت میں آج بھی اُٹھتے ہیں بگولے کیا کیا

عشق معیارِ وفا کو نہیں کرتا نیلام
ورنہ ادراک نے دکھلائے بھٹے رستے کیا کیا
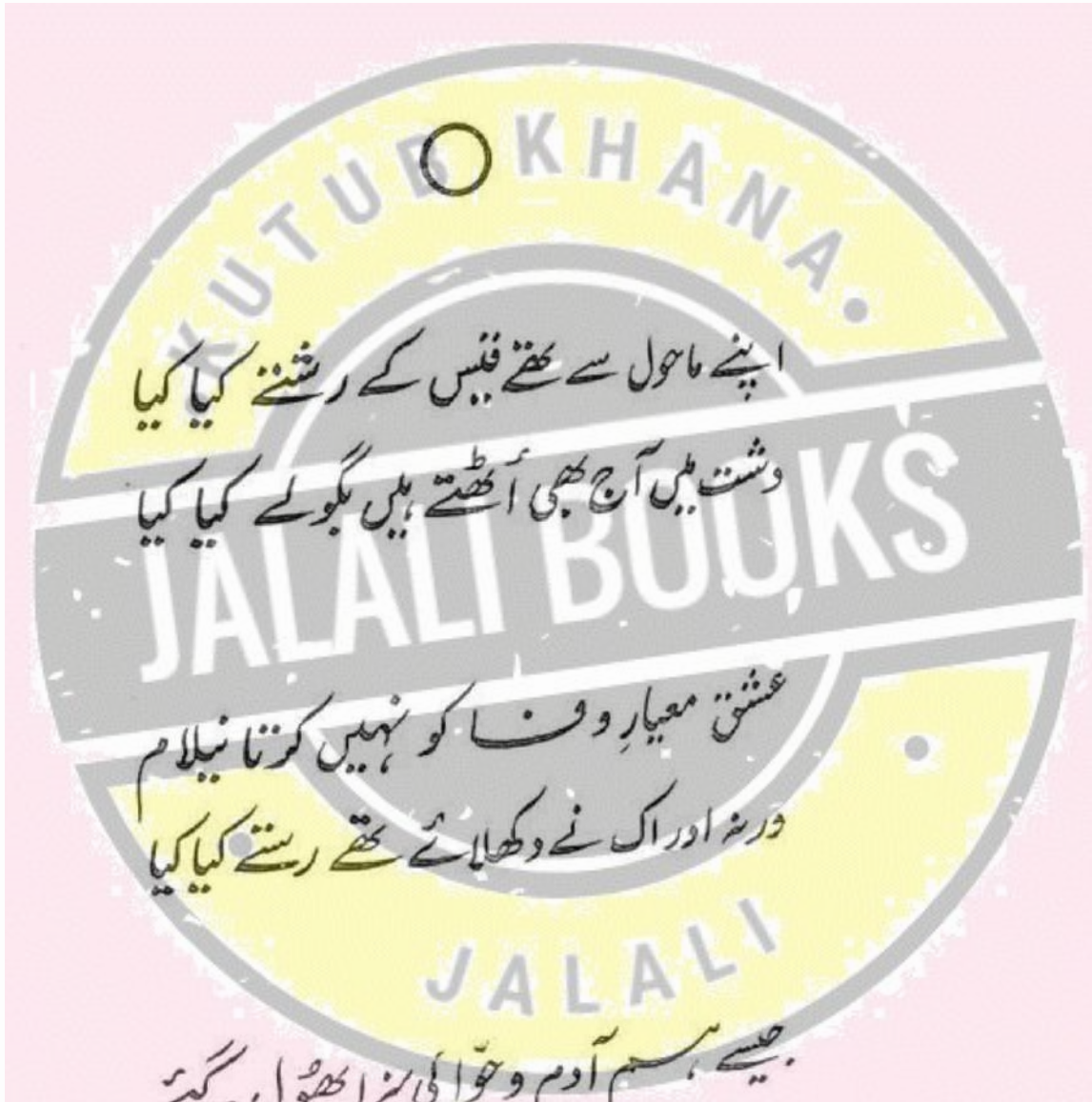
جیسے ہم آدم و حوّا کی سزا بھول گئے
ورغلاتے رہے جنّت کے نظّارے کیا کیا

سائے کا ساتھ بھی جب چھوٹ گیا ظلمت میں
یاد آتے رہے مجھ کو مرے پیارے کیا کیا

یہ الگ بات کہ برسے نہیں، گرجے تو بہت
ورنہ بادل مرے صحراؤں پہ اُمڈے کیا کیا

آگ بھڑکی تو در و بام ہوئے راکھ کے ڈھیر
اور دیتے رہے احباب دلاسے کیا کیا

کسی بدبخت سے جب دل کا دیا بھی نہ جلے
آسمانوں سے اُترتے ہیں اندھیرے کیا کیا

لوگ اشیاء کی طرح بِک گئے اشیاء کے لیے
سرِ بازار تماشے نظر آئے کیا کیا

کہیں قبروں کے نشاں ہیں، کہیں قدموں کے نشاں
کارواں زیست کی شاہراہ سے گزرے کیا کیا

گونج اُٹھنا دلِ انساں، تو کوئی بات بھی تھی
گوشِ انساں میں انڈیلے گئے دعوے کیا کیا

لفظ کِس شان سے تخلیق ہُوا تھا، لیکن
اُس کا مفہوم بدلتے رہے نُقطے کیا کیا

اک کرن تک بھی نہ پہنچی مرے باطن میں ندیمؔ
سرِ افلاک دمکتے رہے تارے کیا کیا

اگست ۱۹۷۹ء
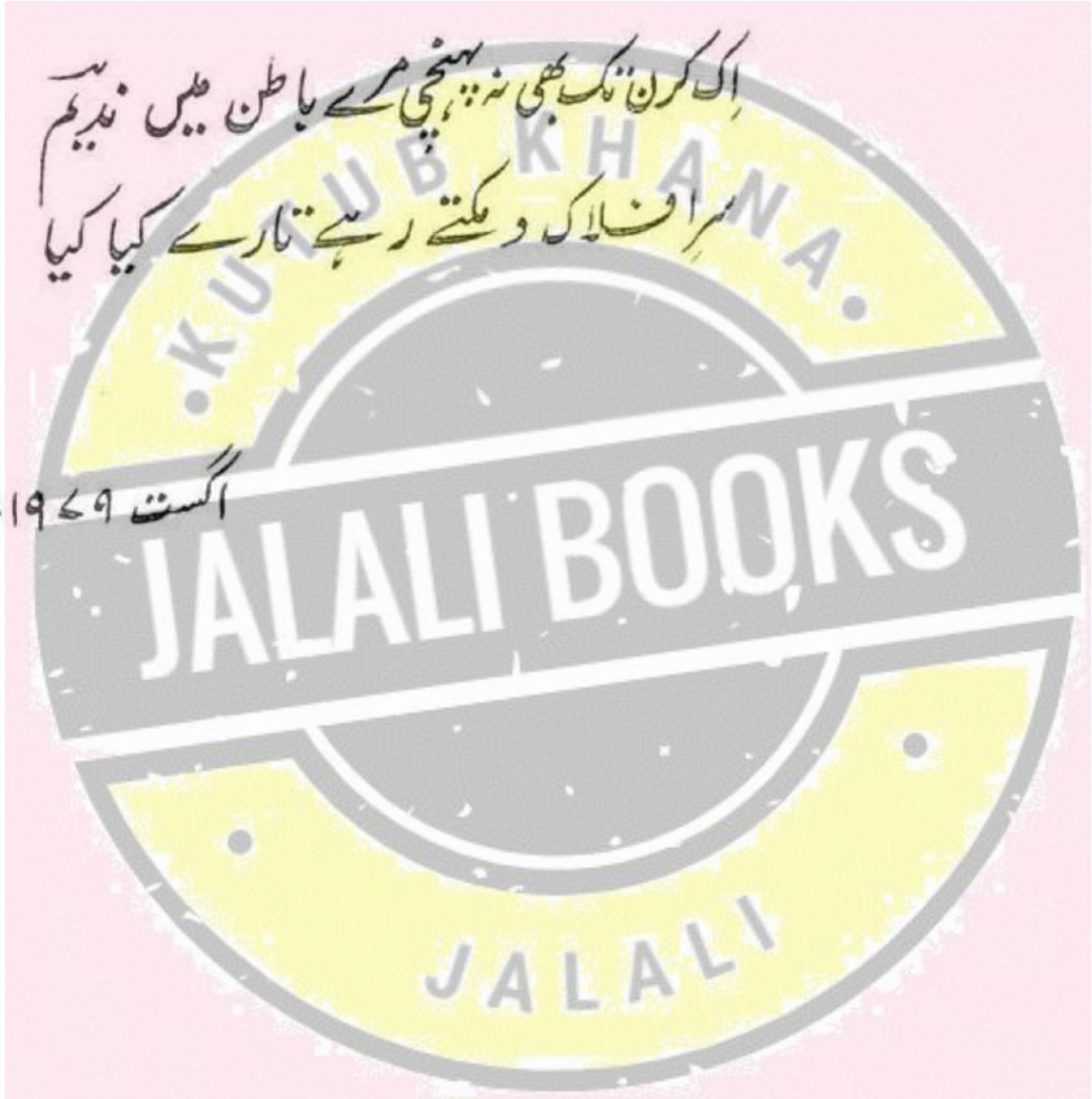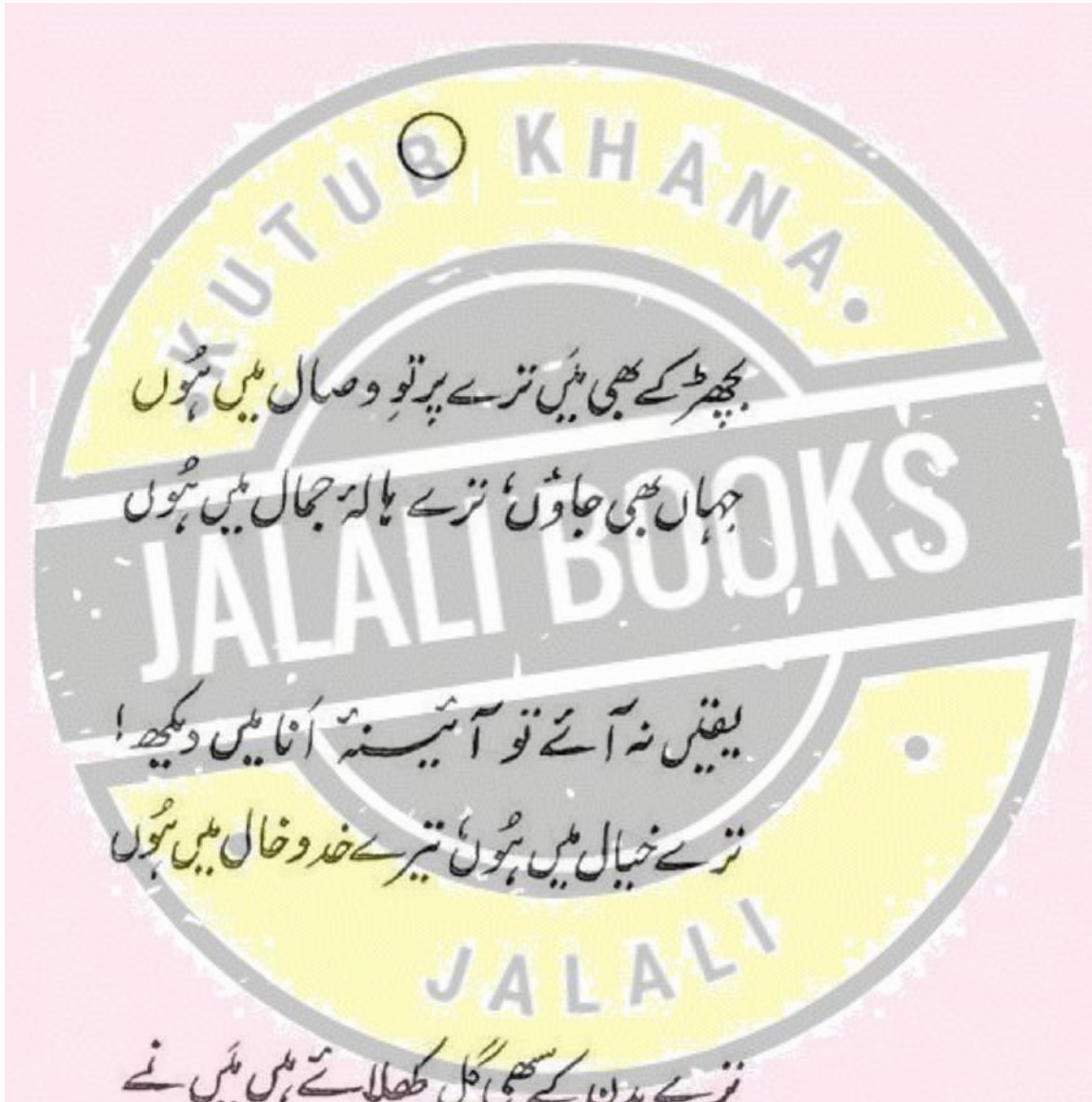
بچھڑ کے بھی میں ترے پرتوِ وصال میں ہوں
جہاں بھی جاؤں، ترے ہالۂ جمال میں ہوں

یقیں نہ آئے تو آئینۂ انا میں دیکھ!
ترے خیال میں ہوں، تیرے خدوخال میں ہوں

ترے بدن کے سبھی گل کھلائے ہیں میں نے
لہو کی طرح رواں تیری ڈال ڈال میں ہوں

تری تلاش میں عالم عجب نشاط کا تھا
جو تُو ملا تو ترے ہجر کے ملال میں ہوں

سدا کی طرح تری آرزو کمال پہ ہے
یہ اور بات کہ میں عمر کے زوال میں ہوں

کھلی فضا کے لیے خاک کا قفس توڑا
مگر ندیم ابھی آسماں کے جال میں ہوں

۱۰ اگست ۱۹۷۹ء

نیئے انساں کے عجب تیور ہیں
نغمہ برلب، مگر آنکھیں تر ہیں

لوگ بے چہرہ ہیں، گھر بے در ہیں
عصرِ نو کے بھی وہی منظر ہیں
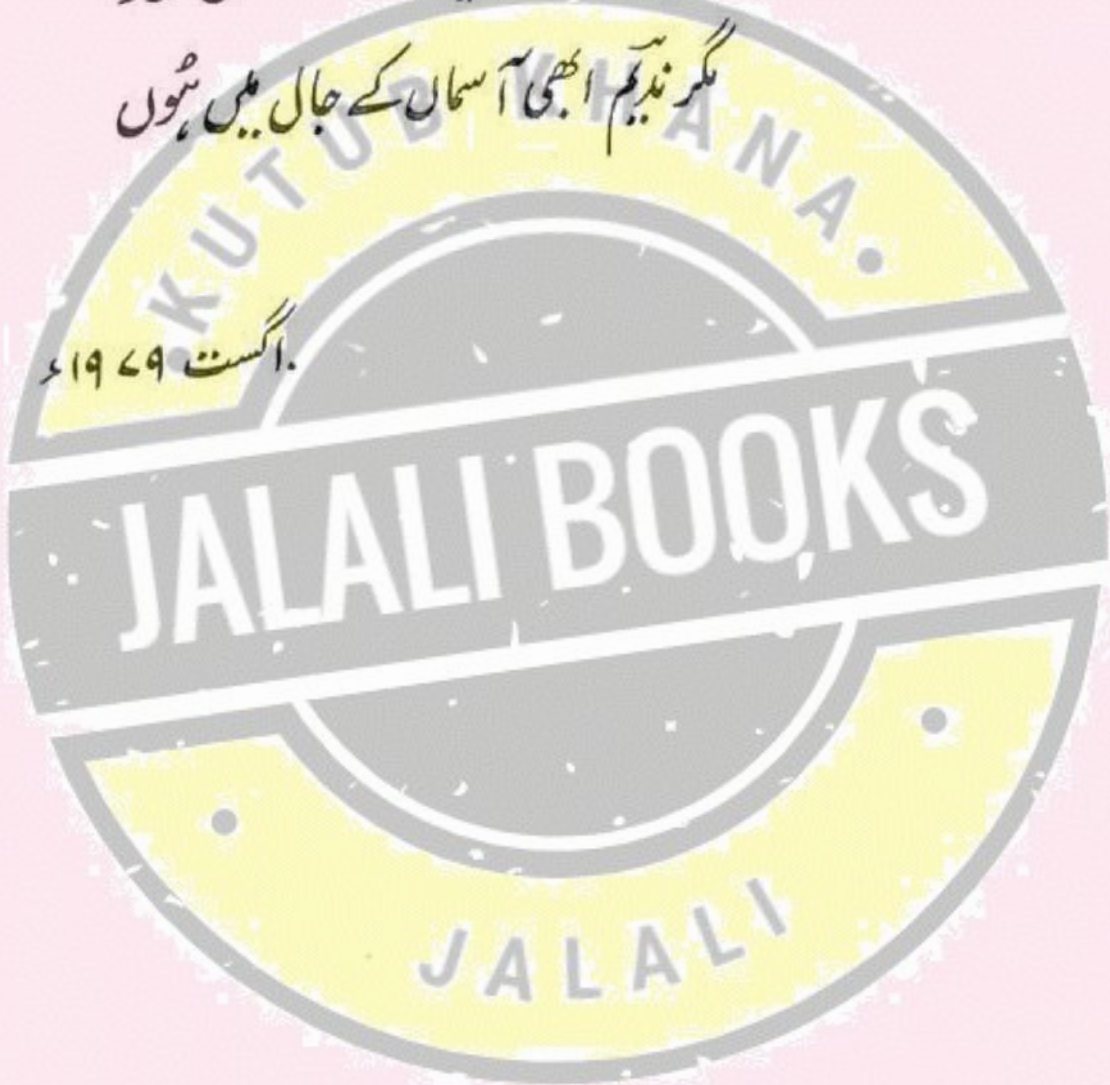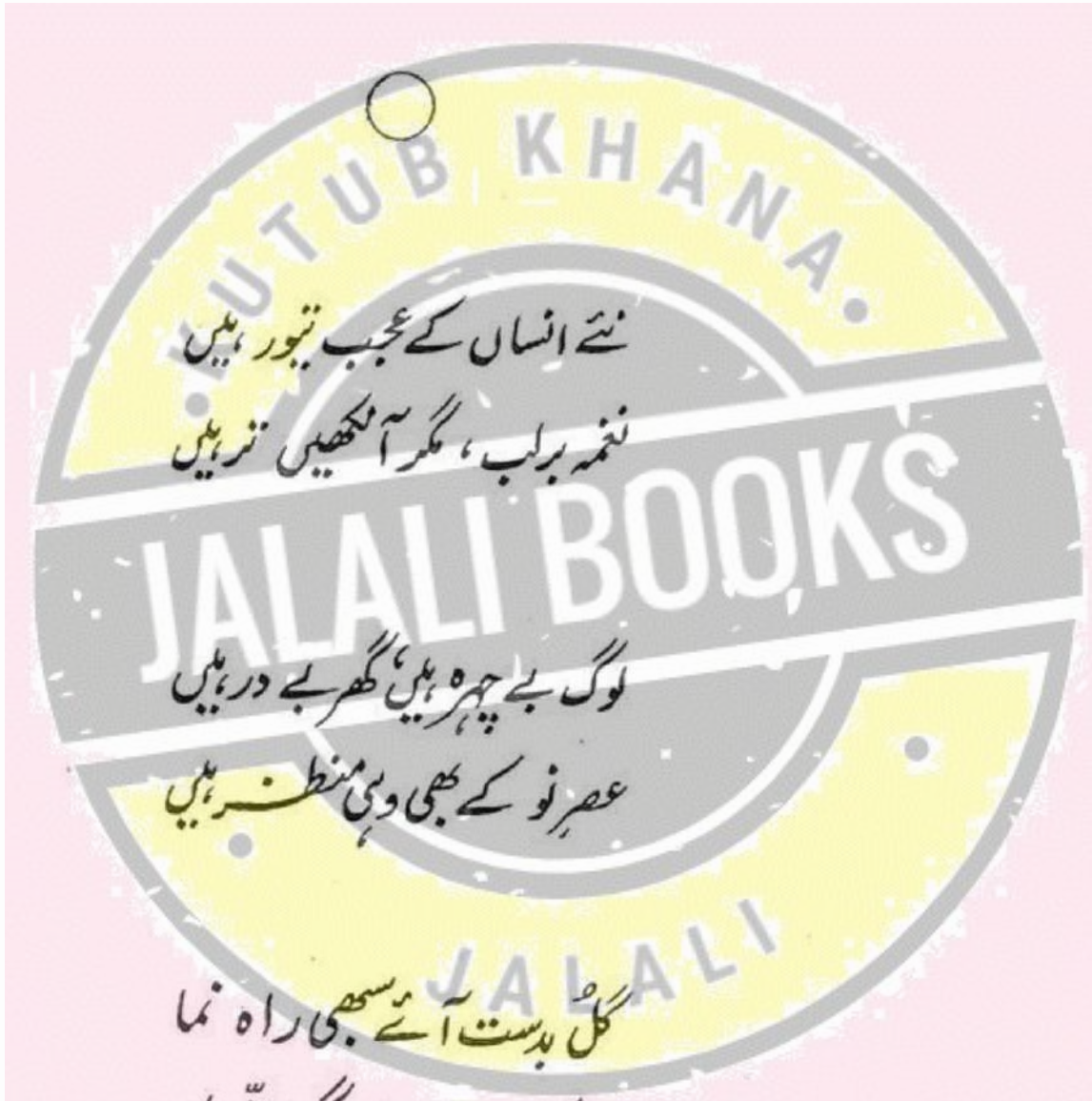
گل بدست آئے سبھی راہ نما
ان کے ذہنوں میں مگر پتھر ہیں

یہ بھی اک طرح کی محکومی ہے
کہ ہم آزاد ہیں۔ اور بے پر ہیں

کوئی جینے کا سلیقہ بھی سکھائے
مجھ کو مرنے کے سبق از بر ہیں

رائیگاں جائے گا سورج کا عتاب
سبز اشجار مرے اندر ہیں

اُس کو کیا خوف نہ ہونے کا ندیمؔ
جس کو ہونے کے ہزاروں ڈر ہیں

جولائی ۱۹۷۹ء

قلم دل میں ڈبویا جا رہا ہے
نیا منشور لکھا جا رہا ہے

اُجالے بٹ رہے ہیں فاش در فاش
اندھیروں کو سنوارا جا رہا ہے

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے
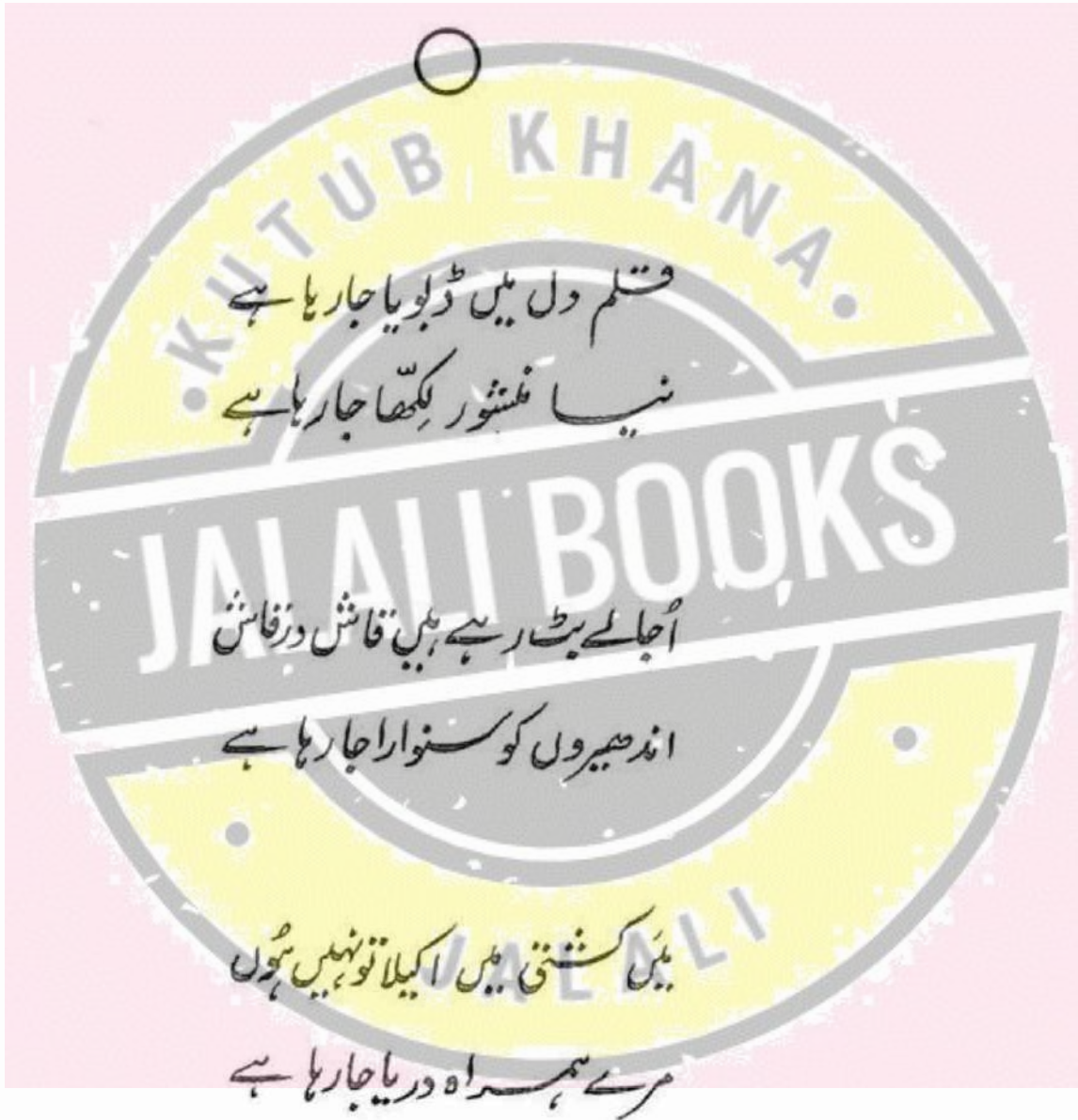
کہیں جمتی نہیں چشمِ تماشا
جو نظّارہ ہے، گزرا جا رہا ہے

سلامی کو جھکے جاتے ہیں اشجار
ہوا کا ایک جھونکا جا رہا ہے

قیامت سی بپا ہے شاخ در شاخ
شجر سے ایک پتا جا رہا ہے

مسافر ہی مسافر ہر طرف ہیں
مگر ہر فرد تنہا جا رہا ہے

شبِ فرقت کے تارے بجھ رہے ہیں
صدی کا ساتھ چھوٹا جا رہا ہے

میں اِک انساں ہوں یا سارا جہاں ہوں
بگولا ہے کہ صحرا جا رہا ہے

رواں ہوں میں ستارہ در ستارہ
زمیں پر میرا سایہ جا رہا ہے

ندیم اب آمد آمد ہے سحر کی
ستاروں کو بجھایا جا رہا ہے

جولائی ۱۹۷۹ء
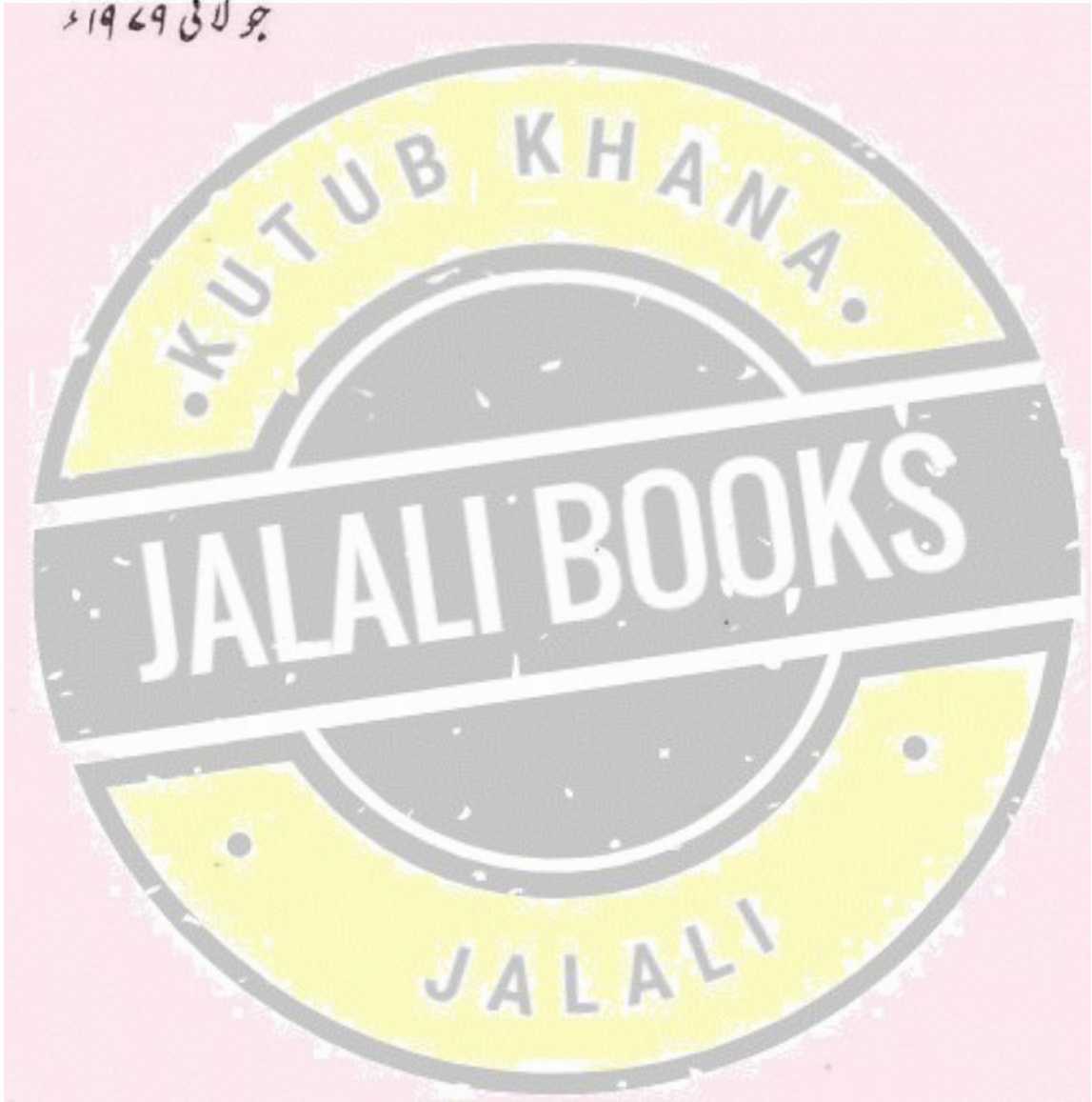
اگر فرشتہ مرے غم سے آشنا ہو جائے
زمیں، مدار سے ہٹ کر کہیں ہوا ہو جائے

تنا ہُوا ہے مرے چار سُو وہ سنّاٹا
کہ جس میں سانس بھی بھونچال کی صدا ہو جائے

یہ معجزہ ہے مرا، یا مرے ضمیر کا زہر
میں شاخِ گُل کو جو چھُو لوں تو اژدہا ہو جائے

بہت سا قرض مشیّت کا ہے مرے سر پر
میں سر ہی کیوں نہ کٹا دُوں کہ کچھ ادا ہو جائے

بقا اسی کو تو کہتے ہیں، جب کوئی انساں
برائے عظمتِ انسانیت، فنا ہو جائے

نہ ہو سکا کبھی عریاں کوئی دریدہ لباس
خود اپنا خون ہی منصور کی قبا ہو جائے

وفورِ فصلِ بہاراں کا ہے شہید وہ پھول
کہ جس سے بو کی طرح، رنگ بھی جدا ہو جائے

دیا جلے تو کرے گھر کے بام و در روشن
جو گھر جلے تو اندھیرے کی انتہا ہو جائے

مرض ہی حریتِ فکر کا کچھ ایسا ہے
کہ جو بھی فکر کرے، اس میں مبتلا ہو جائے

اگر بتاؤں کہ میں سوچتا ہوں کیا کیا کچھ
نظامِ کون و مکاں، جانے کیا سے کیا ہو جائے

تنہا ہے تا بہ ابد میرا دشتِ تنہائی
ندیمؔ اب تو مرا ہمسفر خدا ہو جائے

مئی ۱۹۷۹ء
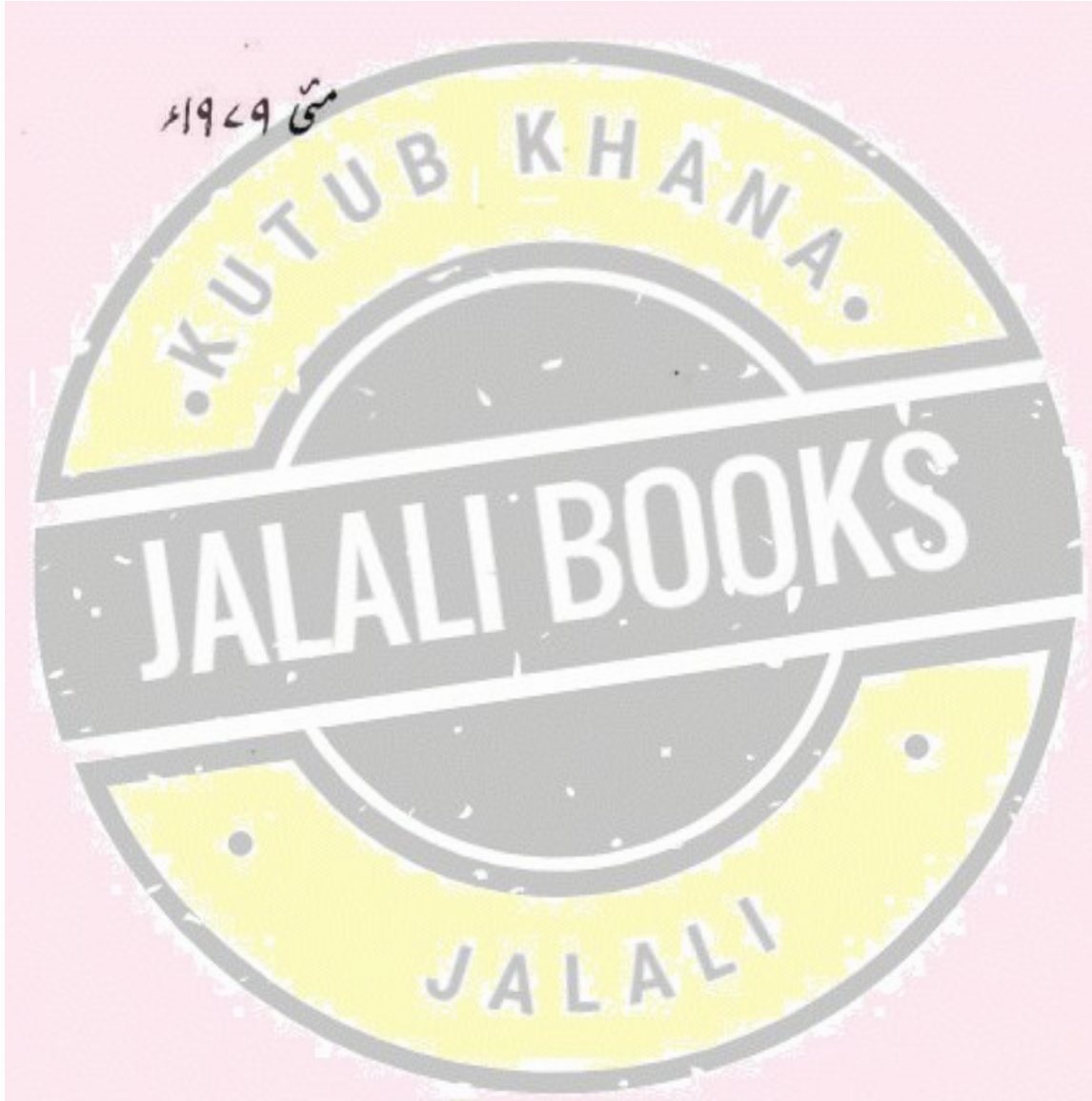
صرف اک عزمِ سفر، زادِ سفر اپنا تھا
کبھی صحرائے تمنّا میں گزر اپنا تھا

بس اگر دشت سے گزرا، تو وطن سے گزرا
گھر جو بے در نظر آیا، وہی گھر اپنا تھا

میرے حصّے میں فقط نکہتِ آوارہ تھی
نہ چمن، اور نہ کوئی گلِ تر اپنا تھا

خود کو آئینے میں دیکھا تو مَیں مانندِ چراغ
اپنے ہی ہاتھ پہ رکھے ہوئے سر اپنا تھا

حُسن سے یُوں تو فرشتے بھی اثر لیتے ہیں
فرق یہ ہے ــــــ مرا اندازِ نظر اپنا تھا

سب پہ طاری تھا طلسمِ رُخِ زیبا، لیکن
مَیں جو بے چین تھا اتنا، مجھے ڈر اپنا تھا

یُوں تو تا حدِّ نظر اوج پہ تھی شعلہ زنی
جس نے اس گھر کو جلایا، وہ شرر اپنا تھا

آج وہ مجھ پہ بڑھا طعن بہ لب، سنگ بدست
اور اِک روز وہی آئنہ گر اپنا تھا

جو بھی سُنتا ہے، سمجھتا ہے، وہ خود بولا ہے
بات اس طرح سے کہنا ہی ہُنر اپنا تھا

پیش غیروں کی طرح آئے ہیں اپنے بھی ندیمؔ
کوئی اپنا تھا تو اندر کا بشر اپنا تھا

مارچ ۱۹۷۹ء

طوفاں ہے اگر گھر کے در پے، یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو!
کھڑکی کے شکستہ شیشے پر کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو

انسان کے قبضۂ قدرت میں اک نطق نہیں ہے، بہت کچھ ہے
ہونٹوں سے نہ نکلے بات اگر، آنکھوں سے سناؤ، کچھ تو کرو

محرومِ تمنّا رہنے کا سنّاٹا کھا جائے گا تمھیں
مایوسی کے سکتے سے بچو، آنسو ہی بہاؤ، کچھ تو کرو

سلطان کے قصرِ مرمر کا دروازۂ آہن بند سہی
گر توڑ نہیں سکتے اس کو، زنجیر ہلاؤ، کچھ تو کرو

اے جلتے ہُوئے گھر کے لوگو! شعلوں میں گھرے کیا سوچتے ہو
جب آگ بجھانا مشکل ہے، باھر نکل آؤ، کچھ تو کرو

یہ کھیت جو چُپ ہیں، بولیں گے، اور اکھوے آنکھیں کھولیں گے
بارش نہ سہی، بجلی ہی سہی، کچھ تو برساؤ، کچھ تو کرو

مارچ ۱۹۷۹ء
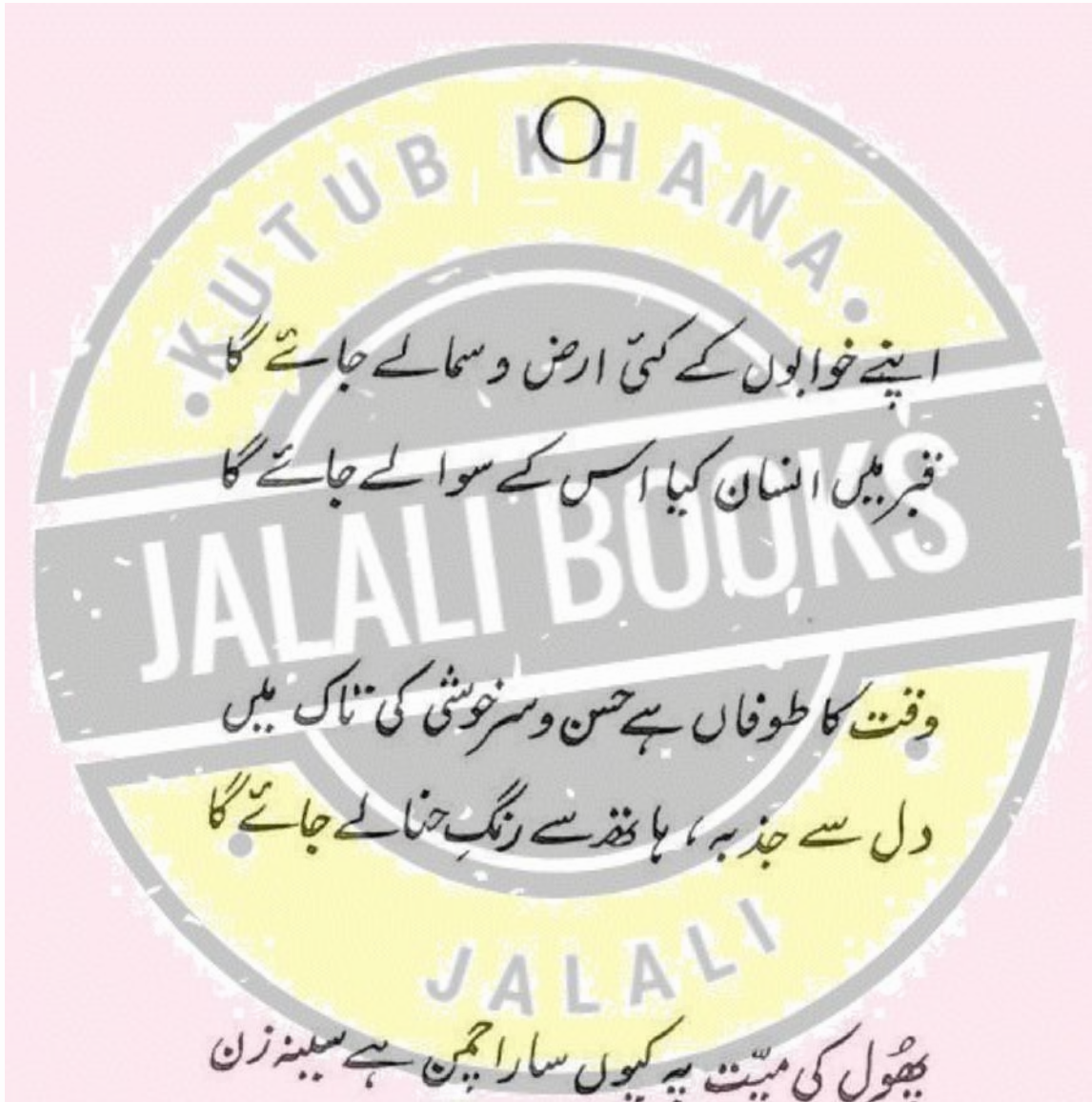
اپنے خوابوں کے کئی ارض و سما لے جائے گا
قبر میں انسان کیا اس کے سوا لے جائے گا

وقت کا طوفاں ہے حسن و سرخوشی کی تاک میں
دل سے جذبہ، ہاتھ سے رنگِ حنا لے جائے گا

پھول کی میت پہ کیوں سارا چمن ہے سینہ زن
کوئی جھونکا آئے گا، اس کو اُٹھا لے جائے گا

آدمی کے دَم سے آئینِ مشیت زندہ ہے
مر گیا تو ساتھ ہی اپنا خدا لے جائے گا

موجۂ بادِ صبا کی ہمسری اچھی — مگر
یہ تو ہر جانب تری آوازِ پا لے جائے گا

کوئی دیوانہ بکارِ خویش دیوانہ نہیں
نقشِ پا دے جائے گا اور آبلہ لے جائے گا

داورِ محشر کے ہاں، عصرِ رواں کا حکمراں
خون میں ڈوبی ہوئی اک فاختہ لے جائے گا

اپنی بستی میں تو ہیں سب لوگ خوابیدہ ندیمؔ
اور کس کے در پہ کشکولِ صدا لے جائے گا؟

فروری ۱۹۷۹ء

طیور سے نظر آتے ہیں جو درختوں پر
فضا کے پھول ہیں جو کھل رہے ہیں شاخوں پر

عجیب حسنِ مساوات ہے، کہ یکساں ہے
نوازش اوس کی، پھولوں پر اور پتّوں پر
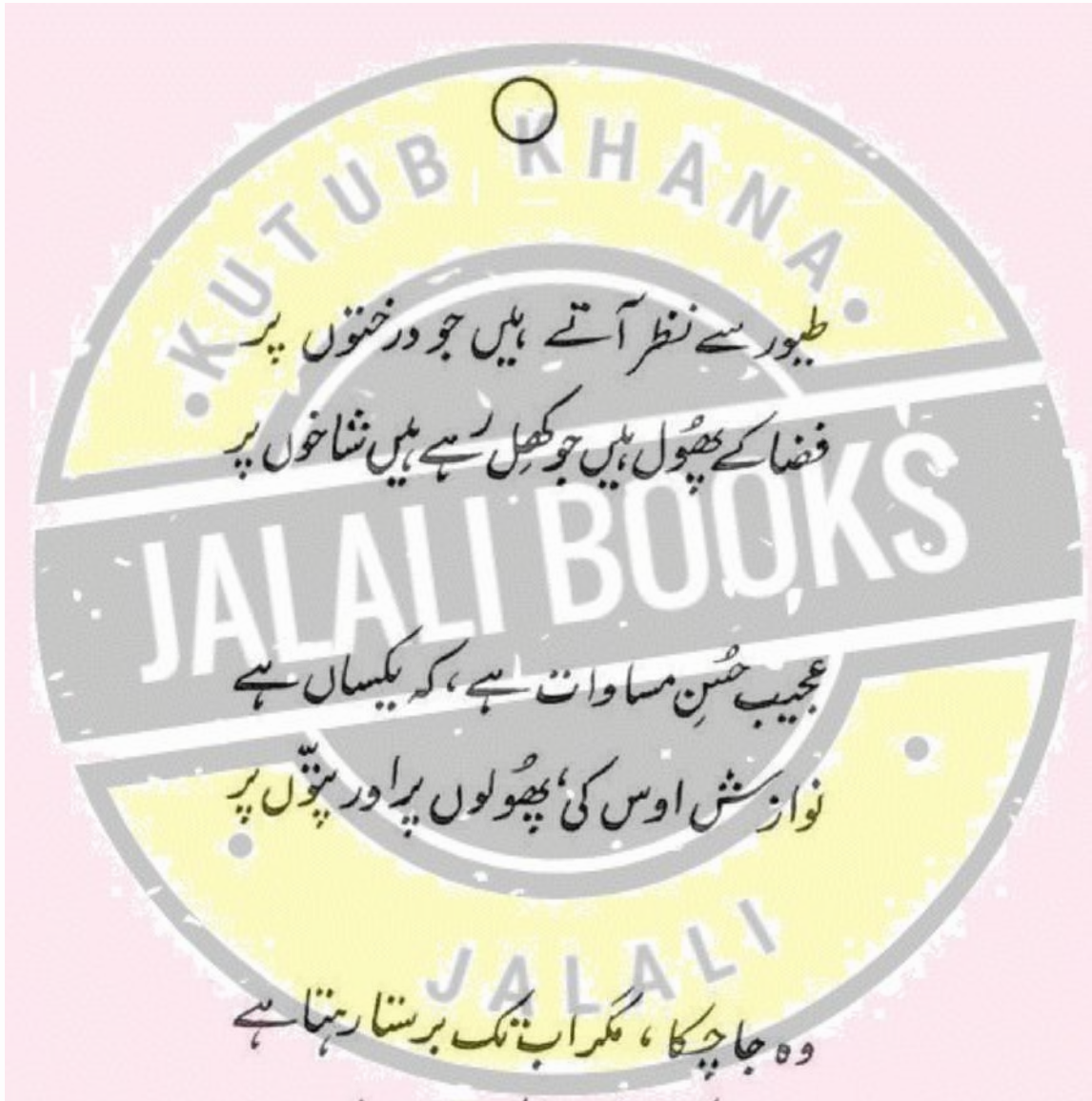
وہ جا چکا، مگر اب تک برستا رہتا ہے
اسی کا عکسِ شفق رنگ میری شاموں پر

مَیں ایک پَل بھی جو بھولوں اسے تو مر جاؤں
اسی کے پیار کا پہرہ ہے میری سانسوں پر

زمیں کے غنچہ و گُل ہی تو ماہ و انجم ہیں
ستارے کس نے اُتارے کسی کے قدموں پر

ندیم مجھ کو فرشتے سمجھ نہ پائیں گے
میں مشتعل ہُوں ہزاروں لطیف جذبوں پر

عجیب وقت پڑا، اب کے باضمیروں پر
لبوں پہ پھول ہیں لیکن پہاڑ سینوں پر

خدا کرے، سفرِ عشق شب کو بھی نہ کٹے
اندھیرا ہاتھ نہ رکھ پائے میری آنکھوں پر

میں روشنی کی گزرگاہیں کیوں کروں مسدود
غلاف کون چڑھاتا پھرے دریچوں پر

عجیب چیز ہے انساں! عجیب اس کا خمیر!
عجیب رنگ کا سبزہ اُگا ہے قبروں پر

یہ کائنات — بغیرِ حیات — بے مفہوم
قدم زمین پہ رکھو، نظر ستاروں پر

ابھی خزاں مرے آنگن میں خیمہ زن ہے ندیمؔ
مگر پڑوس میں پھول اُگ رہے ہیں بیلوں پر

دسمبر ۱۹۷۸ء

خوش ہوا ہوں تو مجھے اشک فشاں ہونے دو
برف پگھلی ہے تو دریا کو رواں ہونے دو

صبح کے عشق میں طے کرنا ہے دشتِ شب بھی
آگ درکار اگر ہے، تو دھواں ہونے دو

کچھ نہ بولو گے تو گھل جاؤ گے شمعوں کی طرح
اپنی سوچوں کو زباں سے بھی بیاں ہونے دو
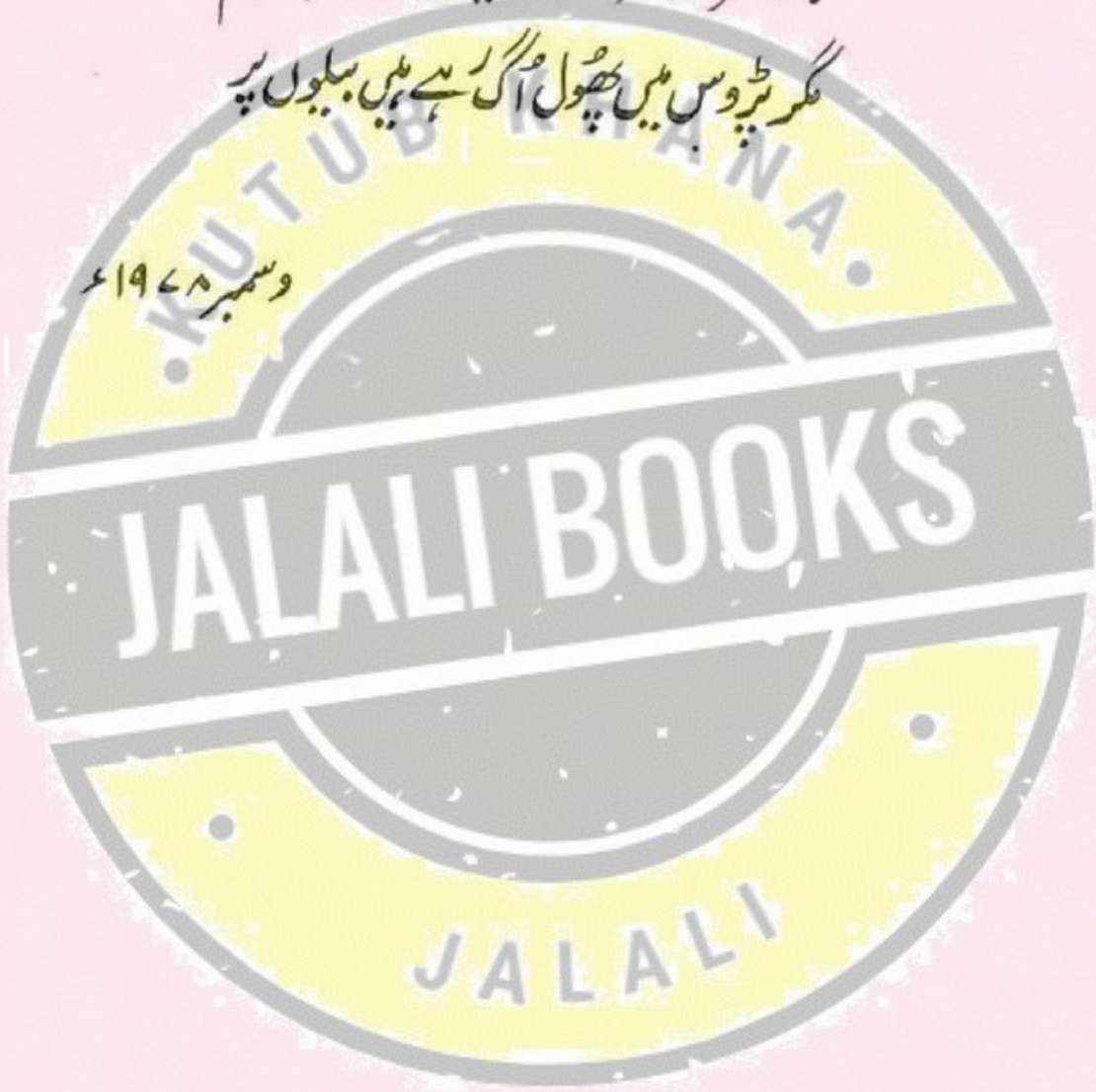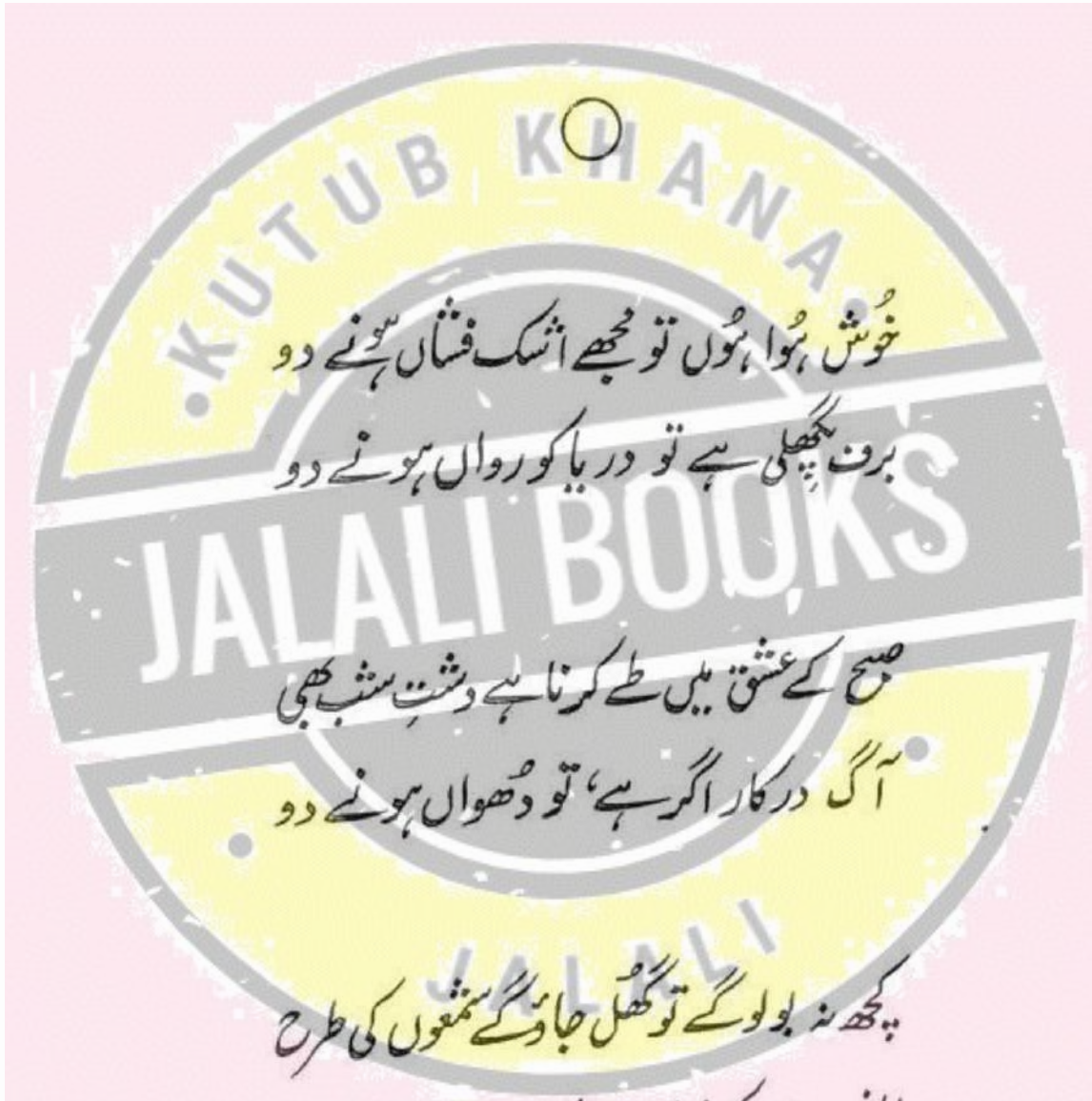
سہہ نہ پاؤ گے تو خود اس کو جھٹک ڈالو گے
غم کی سِل کو ابھی کچھ اور گراں ہونے دو

تم نہ ہو گے اگر اپنے ہی، تو کس کے ہو گے
اپنے وجدان پہ یہ راز عیاں ہونے دو

حاکموں سے نہیں، اللہ سے مانگے کی حقوق
میرے گھر کی نئی نسلوں کو جواں ہونے دو

پھول پت جھڑ میں جو کھلتا ہے تو کھِلنے دو ندیمؔ
جو بھی ہونا ہے وہ ہوگا، مری جاں، ہونے دو

دسمبر ۱۹۷۸ء

ٹوٹتے جاتے ہیں سب آئینہ خانے میرے
وقت کی زد میں ہیں، یادوں کے خزانے میرے

زندہ رہنے کی ہو نیّت تو شکایت کیسی
میرے لب پر جو گِلے ہیں، وہ بہانے میرے

رخشِ حالات کی باگیں تو مرے ہاتھ میں تھیں
صرف میں نے کبھی احکام نہ مانے میرے
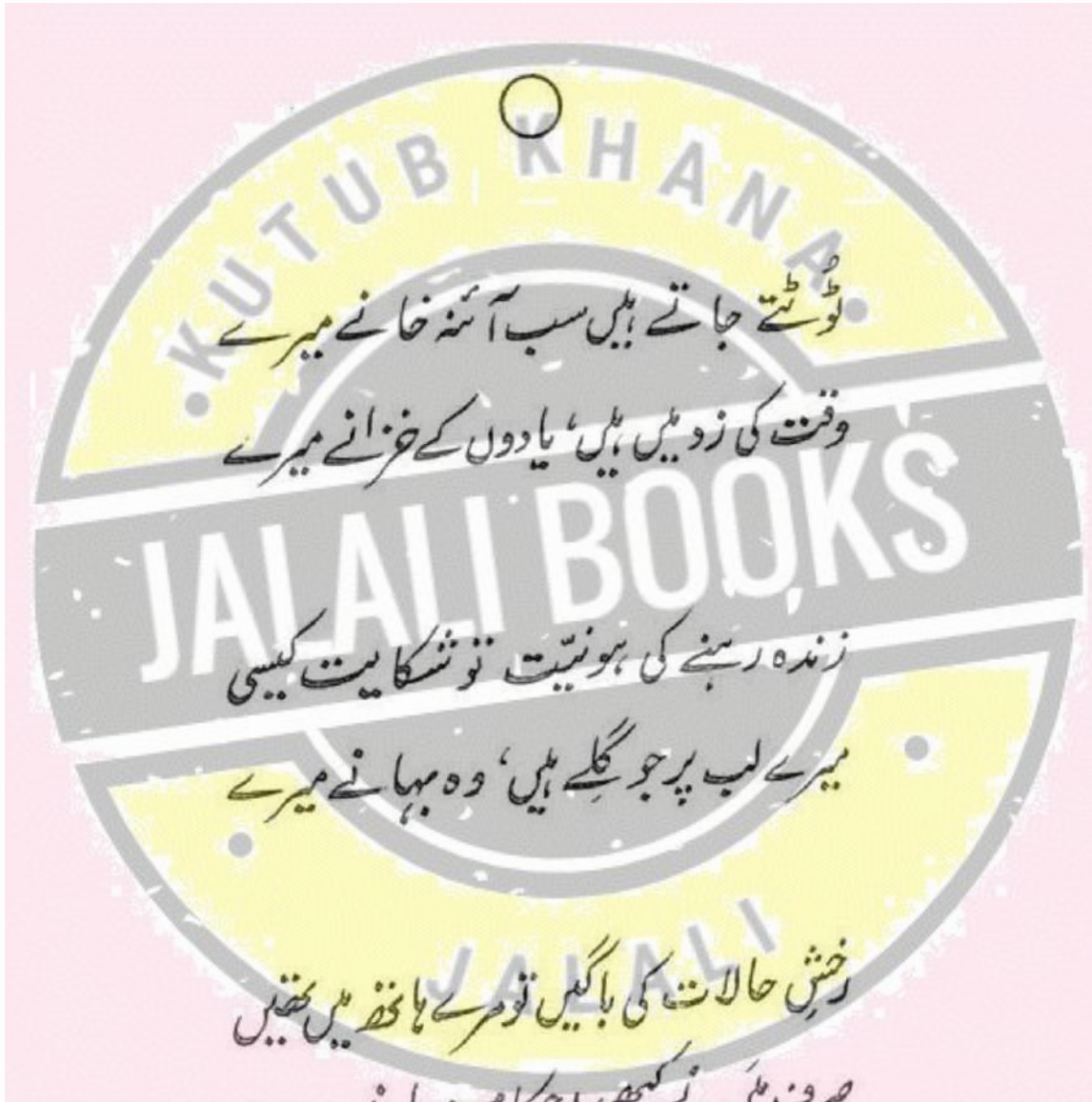
میرے ہر درد کو اس نے ابدیّت دے دی
یعنی کیا کچھ نہ دیا مجھ کو خدا نے میرے

میری آنکھوں میں چراغاں سا ہے مستقبل کا
اور ماضی کا ہیولیٰ ہے سرہانے میرے

تُو نے احسان کیا تھا، تو جتایا کیوں تھا
اس قدر بوجھ کے لائق نہیں شانے میرے

راستہ دیکھتے رہنے کی بھی لذّت ہے عجیب
زندگی کے سبھی لمحات سہانے میرے

جو بھی چہرہ نظر آیا، ترا چہرہ نکلا
تو بصارت ہے مری، یار پرانے میرے!

سوچتا ہُوں، مری مٹی کہاں اُڑتی ہوگی
اِک صدی بعد جب آئیں گے زمانے میرے

صرف اک حسرتِ اظہار کے پرتو ہیں ندیمؔ
میری غزلیں ہوں کہ نظمیں کہ فسانے میرے

دسمبر
۱۹۷۸ء

دوام

نہ جانے خال و خد کیوں چِھن گئے ہیں خوش جمالوں سے
ہیولے سے نظر آتے ہیں صحرا میں غزالوں کے

اِک ایسے دَور میں تخلیقِ فن کی مجھ کو سُوجھی ہے
اگر سوچوں تو پر کٹنے لگیں میرے خیالوں کے

زمیں کے در پہ دستک دُوں تو شاید خاک بول اُٹھے
جواب آتے نہیں افلاک سے، میرے سوالوں کے

یہ وقت ایسا ہے جب جذبے کا سِکّہ چل نہیں سکتا
کہ دیوانے بھی طالب ہیں دلیلوں کے، حوالوں کے

مجھے نابُود ہو جانے سے روکا اِس حقیقت نے
زوالوں کے کھنڈر پر قصر اُٹھتے ہیں کمالوں کے

ندیمؔ اب اِک قصیدہ اس گروہِ حُسن کاراں کا
فسانے تو بہت لکھے ہیں تُو نے گاؤں والوں کے

نومبر ۱۹۷۸ء

ذرّے ذرّے میں جو نایابیِ جوہر دیکھیں
وہی، انساں کو فرشتے کا بھی ہمسر دیکھیں

یہ نہ دیکھیں کہ زمیں خود بھی ہے اِک سیّارہ
لوگ حسرت سے فلک پر مہ و اختر دیکھیں

یہ قلندر ہیں — مگر نام میں کیا رکھا ہے
آؤ، اس دور کے دارا و سکندر دیکھیں
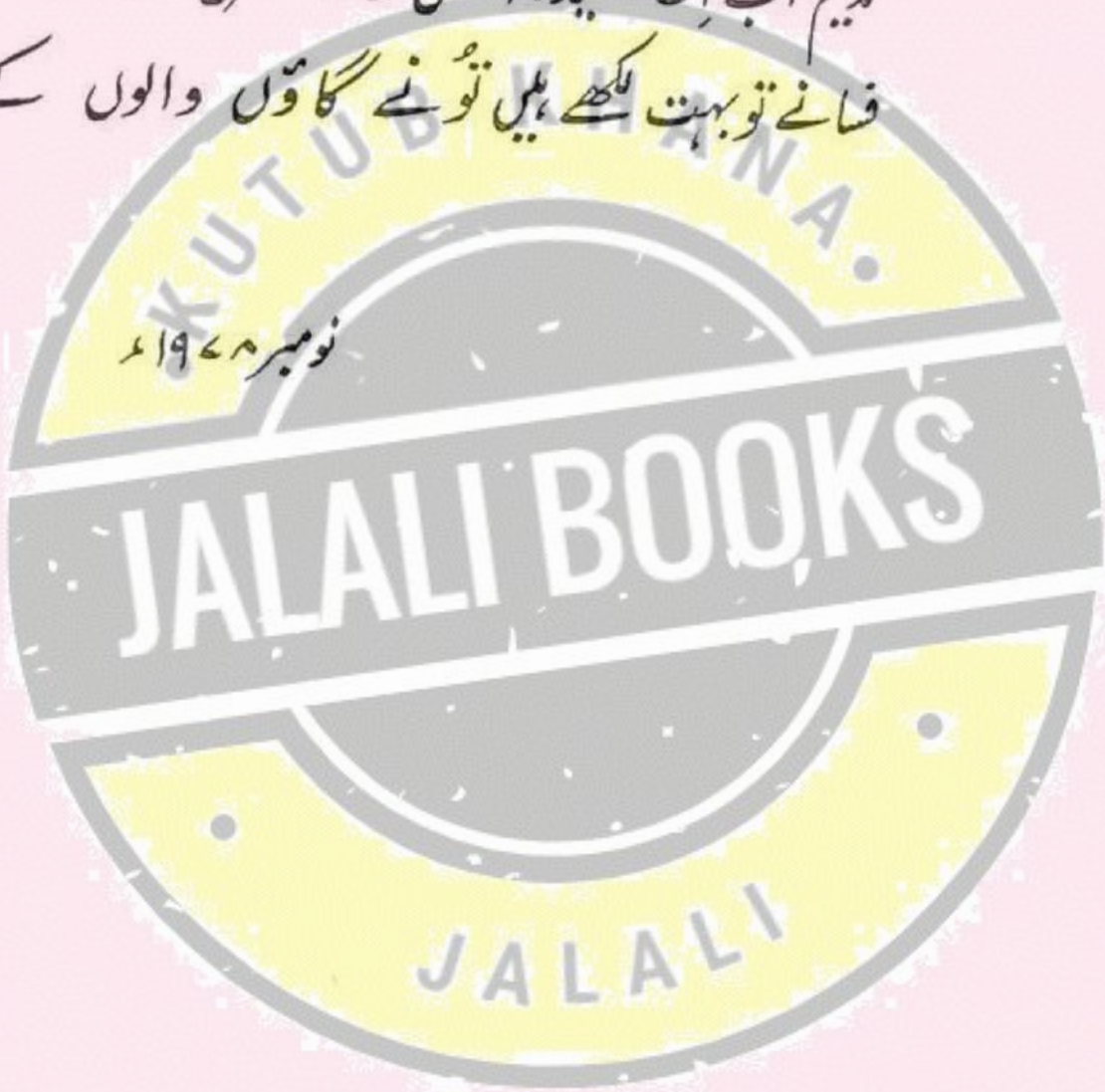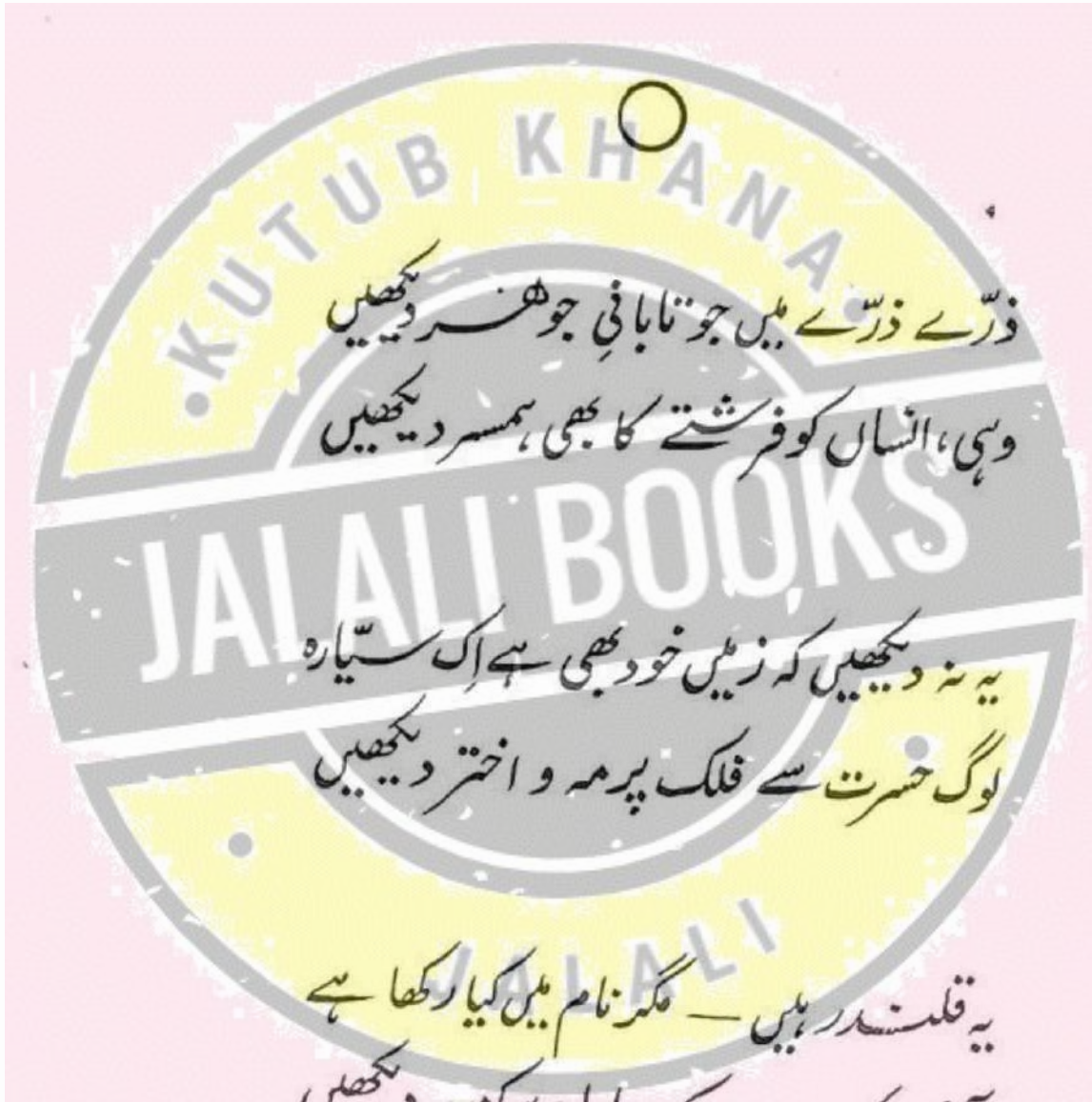
دھوپ سے جن کو گِلہ ہے کہ جلا ڈالے گی
اپنے اندر کے اندھیروں سے نہ باہر دیکھیں

ذات کو کھوجنے والوں سے شکایت کیسی
خود کو جو ڈھونڈ نہ پائیں، ہمیں کیونکر دیکھیں

ہم تو وہ دشت نوردانِ محبت ہیں ندیمؔ
ایک ہی گُل سے دو عالم کو معطّر دیکھیں

نومبر ۱۹۷۸ء
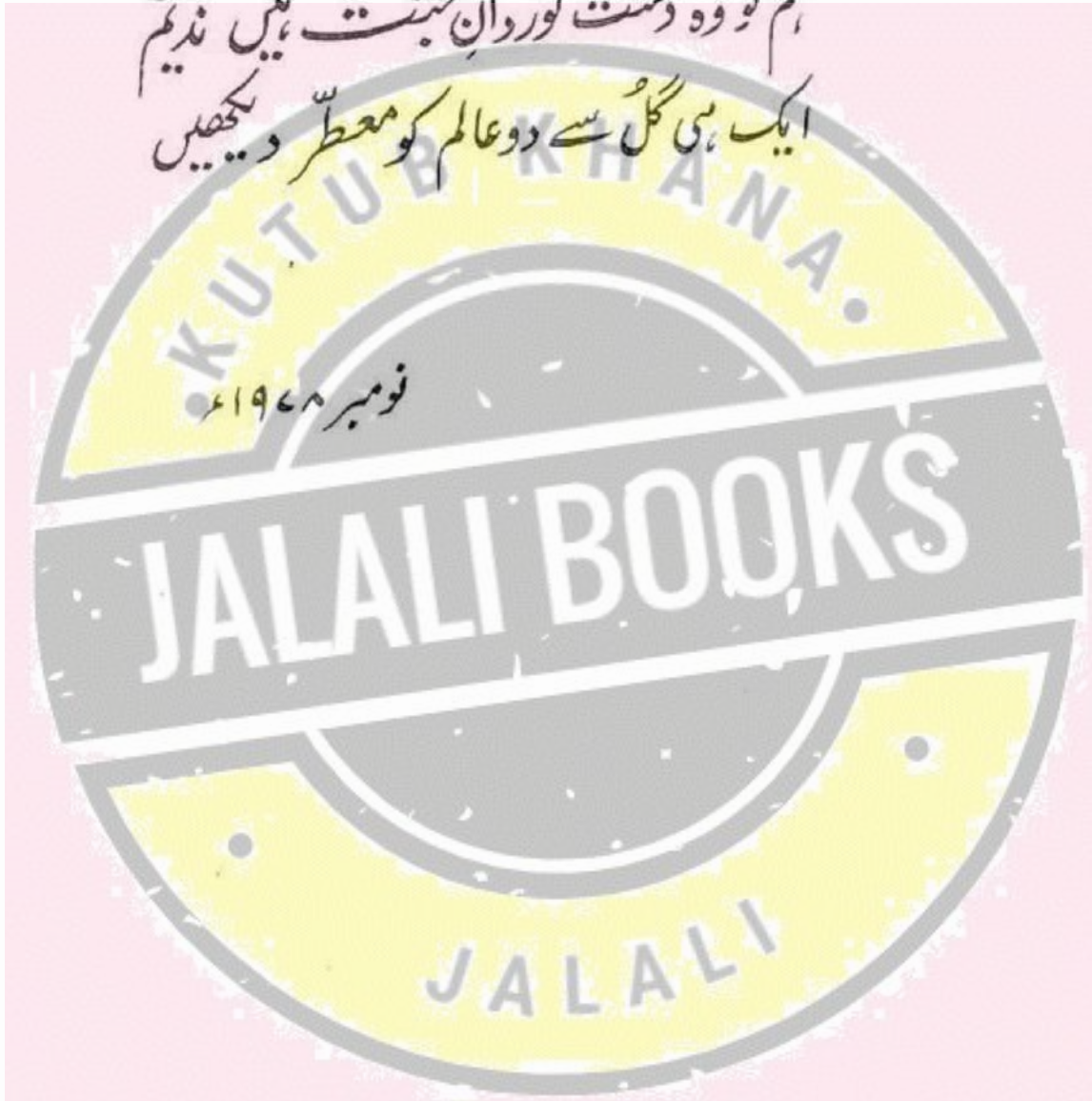
ہم کو چاند اور تاروں سے بڑھ کر، یہ منظر سُہانے لگے
آنسوؤں سے ہو بھیگا ہُوا جس کا چہرہ، وہی مُسکرانے لگے

رات بھر ہم نے تیرے کُھلے گیسوؤں میں تری چاند صُورت کو ڈھونڈا
صبح کو تیرے جانتے ہی، ہر سُو، ترے خال و خد جگمگانے لگے

موسمِ گُل جب آیا تو گُلزار و صحرا کی ساری تمیز اُٹھ گئی
خُشک شاخوں سے ٹُوٹے ہُوئے زرد پتّے، دفیں سی بجانے لگے

دن چُھپا تو مُسافر سحر کے لیے کِتنی تاریک صدیوں سے گُزرا
ایک سُورج کے بعد ایک سُورج نِکلنے میں کِتنے زمانے لگے

جانے ان بے زبانوں نے کیسی قیامت کے آثار اُفق پار دیکھے
شام سے قبل ہی اب پرندوں کے غول آشیانوں کو جانے لگے

جس نے جس دَور میں بھی مسیحائی کی اُس کو مصلوب ہونا پڑا
لوگ مُردوں کو زندہ کرانے کے بعد اس کو مقتل میں لانے لگے

ستمبر ۱۹۷۸ء

دستِ تقدیر نے یُوں نقش اُبھارا میرا
میری پلکوں پہ اُتارا ہے ستارا میرا

پیار سے دست کشی کا نہیں یارا میرا
اس کا پیارا ہُوں کہ جو شخص ہے پیارا میرا

وہ نہیں ہے تو سرِ دشتِ تمنّا کس نے
اس کی آواز میں پھر نام پُکارا میرا
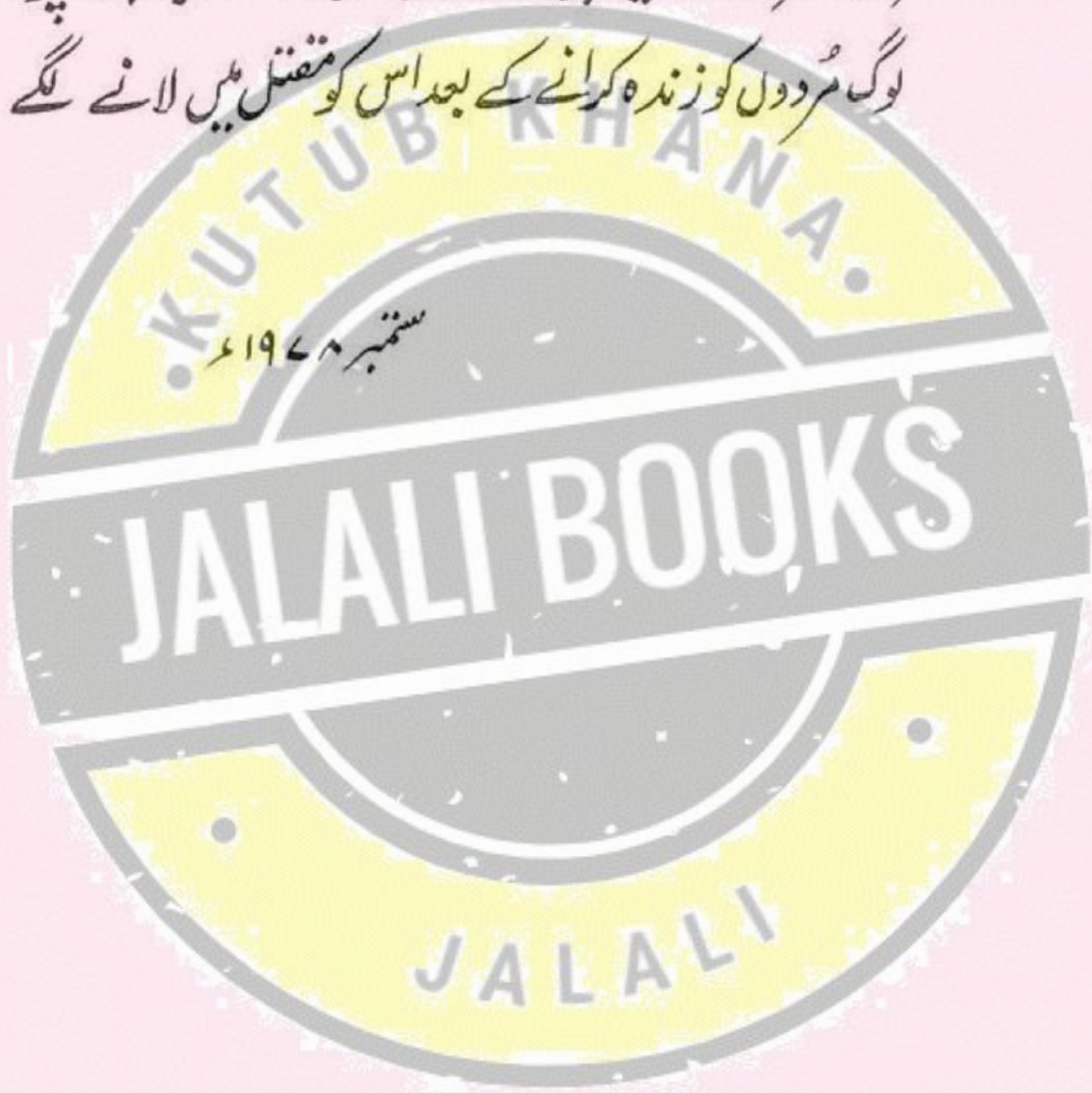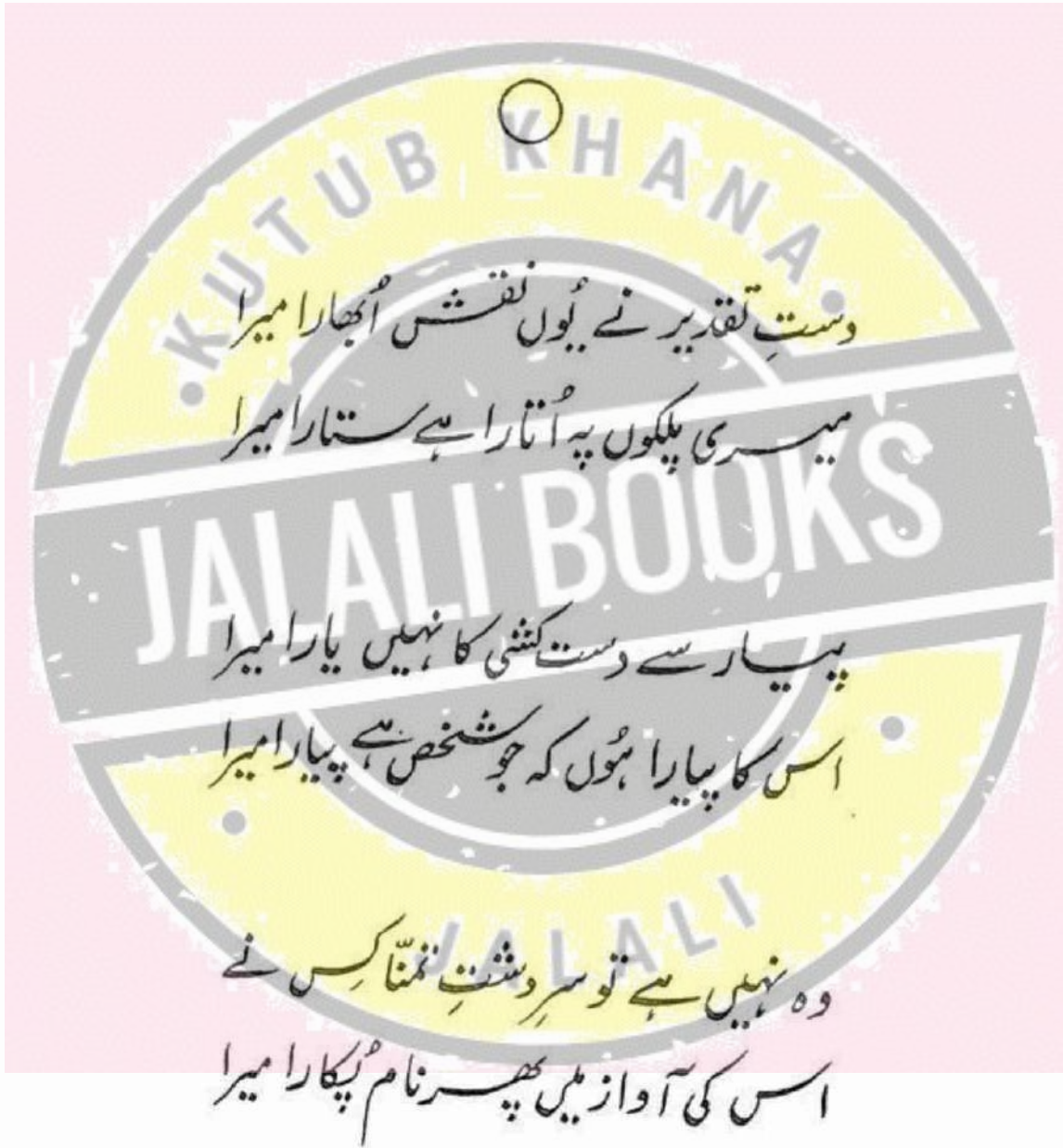
راہیں، ہاتھوں کی لکیروں کی طرح روشن ہیں
اس کی یادیں، سفرِ شب میں سہارا میرا

مَیں تو سمجھا تھا کہ دن بھر کی رفاقت ہو گی
رات کے ساتھ گیا صُبح کا تارا میرا

وہ سمندر ہُوں جو ملّاحوں سے شرمندہ ہے
اتنا گہرا ہُوں کہ پاتال، کنارا میرا

تیر سینے میں جو اُترا تو لہُو کیوں نہ بہا
امتحاں لینے چلے ہیں وہ دوبارہ میرا

مَیں کہ فن کار ہُوں، کیوں داد نہ دیتا فن کی
دستِ قاتل نے اگر زخم سنوارا میرا

ستمبر ۱۹۷۸ء

درِ کسریٰ پہ صدا کیا کرتا
اک کھنڈر مجھ کو عطا کیا کرتا

جس اندھیرے میں ستارے نہ جلے
ایک مٹی کا دِیا کیا کرتا

ریت بھی ہاتھ میں جس کے نہ رُکی
وہ تہی دست، دُعا کیا کرتا
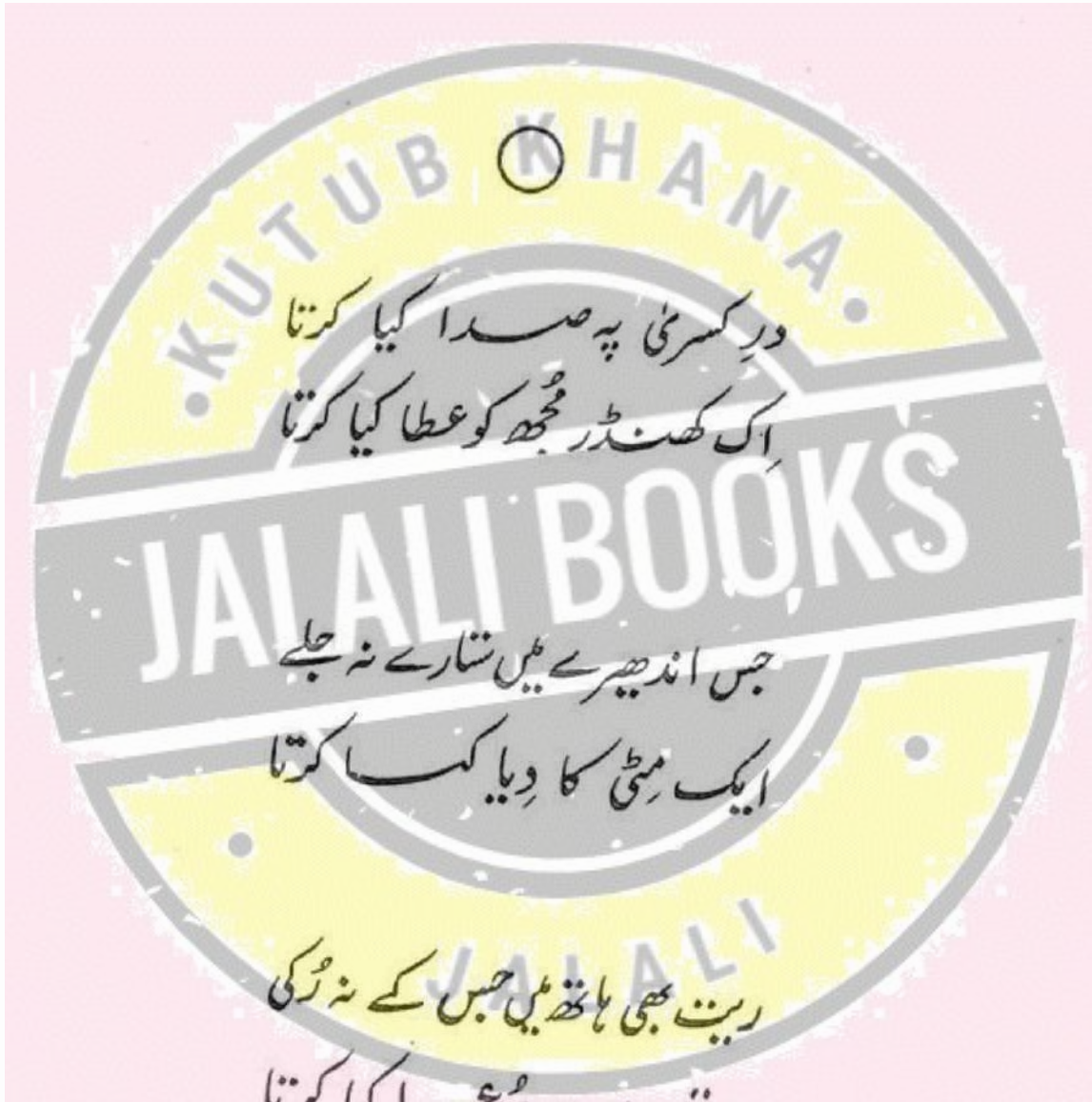
ڈھب سے جینا بھی نہ آیا جس کو
اپنے مرنے کا گِلہ کیا کرتا

اس کا ہونا ہے مرے ہونے سے
مَیں نہ ہوتا تو خُدا کیا کرتا

تُو نے کب مجُھ کو دیے میرے حقوق
مَیں ترا فرض ادا کیا کرتا

ایک دُھتکار تو جھولی میں پڑی
تُو نہ ہوتا تو گدا کیا کرتا

جو نہ سمجھا کبھی مفہومِ وفا
اپنا وعدہ بھی وفا کیا کرتا

تشنہ لب آئے مگر ڈوب گئے
چشمۂ آبِ بقا کیا کرتا

نگہت و رنگ کا پیاسا تھا ندیمؔ
صرف اِک لمسِ ہَوا کیا کرتا

اگست ۱۹۷۸ء

عشق بے دم ہے تو فردوسِ وفا مت ڈھونڈو
ریت پھانکی ہے تو گندم کا مزا مت ڈھونڈو

سر سے پا تک ہوں جب اُتری ہوئی سرسوں کی رُتیں
پھر کسی ہاتھ پہ نیرنگِ حنا مت ڈھونڈو

دھجیاں اپنی حمیّت کی، چھپاؤ گے کہاں
سر سے نوچی ہوئی، بیٹی کی ردا مت ڈھونڈو

جُرم کے بوجھ سے دبتا ہے تو روتا ہے ضمیر
ہر طرف سے جو اُمڈتی ہے صدا، مت ڈھونڈو

حضرتِ خضر کو بھی زحمتِ خیرات نہ دو
تن کے جینا ہے تو پھر آبِ بقا مت ڈھونڈو

اپنے ایمان کو آوارہ نہ ہونے دو کبھی!
ایک مِل جائے تو ایک اور خُدا مت ڈھونڈو

اس سے پُوچھو، سفرِ حبسِ شبی کیسے کٹا
دامنِ صبح میں گُل ہائے صَبا مت ڈھونڈو

افقِ حُسن سے اِک پل بھی نگاہیں نہ ہٹیں
عِشق کرنا ہے تو کچھ اس کے سوا مت ڈھونڈو

تم جب انساں ہو، تو انساں کی جبلت میں ندیم
خیر کے پھُول چُنو اور خطا مت ڈھونڈو

جولائی ۱۹۷۸ء

روشنی کا، افقِ شب پہ اشارہ کیوں ہے؟
رات اُمڈی ہے مگر ساتھ ستارا کیوں ہے؟

وہ جو گرداب سے لرزاں ہیں، ذرا غور کریں
ہر بپھرتے ہوئے دریا کا کنارا کیوں ہے؟

برف پگھلی ہے تو کیوں اس میں ہے تلوار کی کاٹ
راکھ ٹھنڈی ہے تو پھر اس میں شرارہ کیوں ہے؟
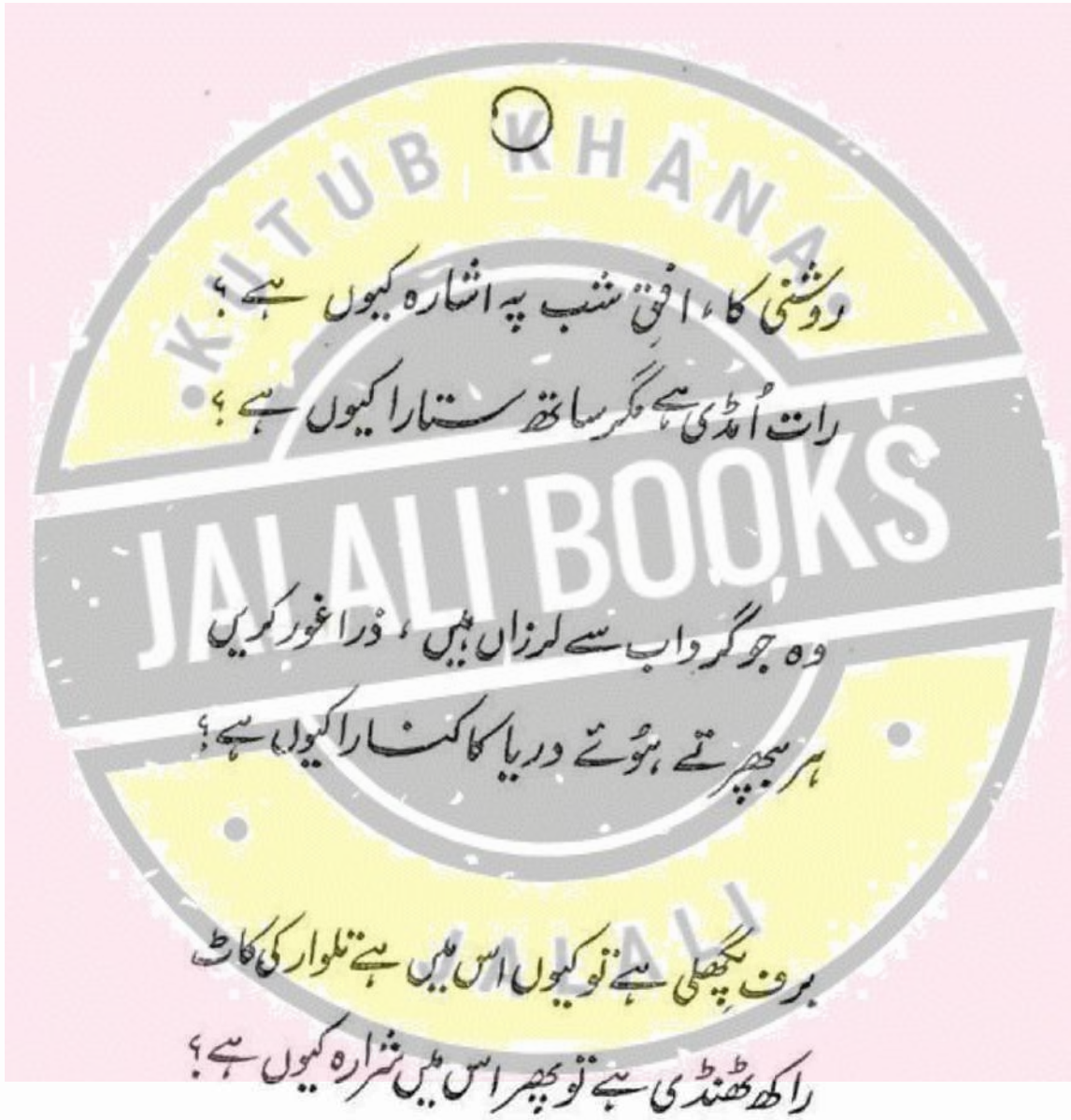
زرِ محنت جو ہمارا ہے، وہ سب کا ہے اگر
قصرِ مرمر جو تمھارا ہے، تمھارا کیوں ہے؟

راہ گر کوئی نہ سُوجھی تھی تو ہم سے کہتا
رہنما نے ہمیں دورا ہے پہ مارا کیوں ہے؟

یہ تصرّف ہے ترا، یا مرا معیارِ وفا
ترکِ اُلفت پہ بھی تُو اتنا ہی پیارا کیوں ہے؟

عشق اگر کچھ بھی نہیں جز ہوسِ جسمِ ندیم
اس نے الہام مرے دل میں اُتارا کیوں ہے؟

جولائی ۱۹۷۸ء

○
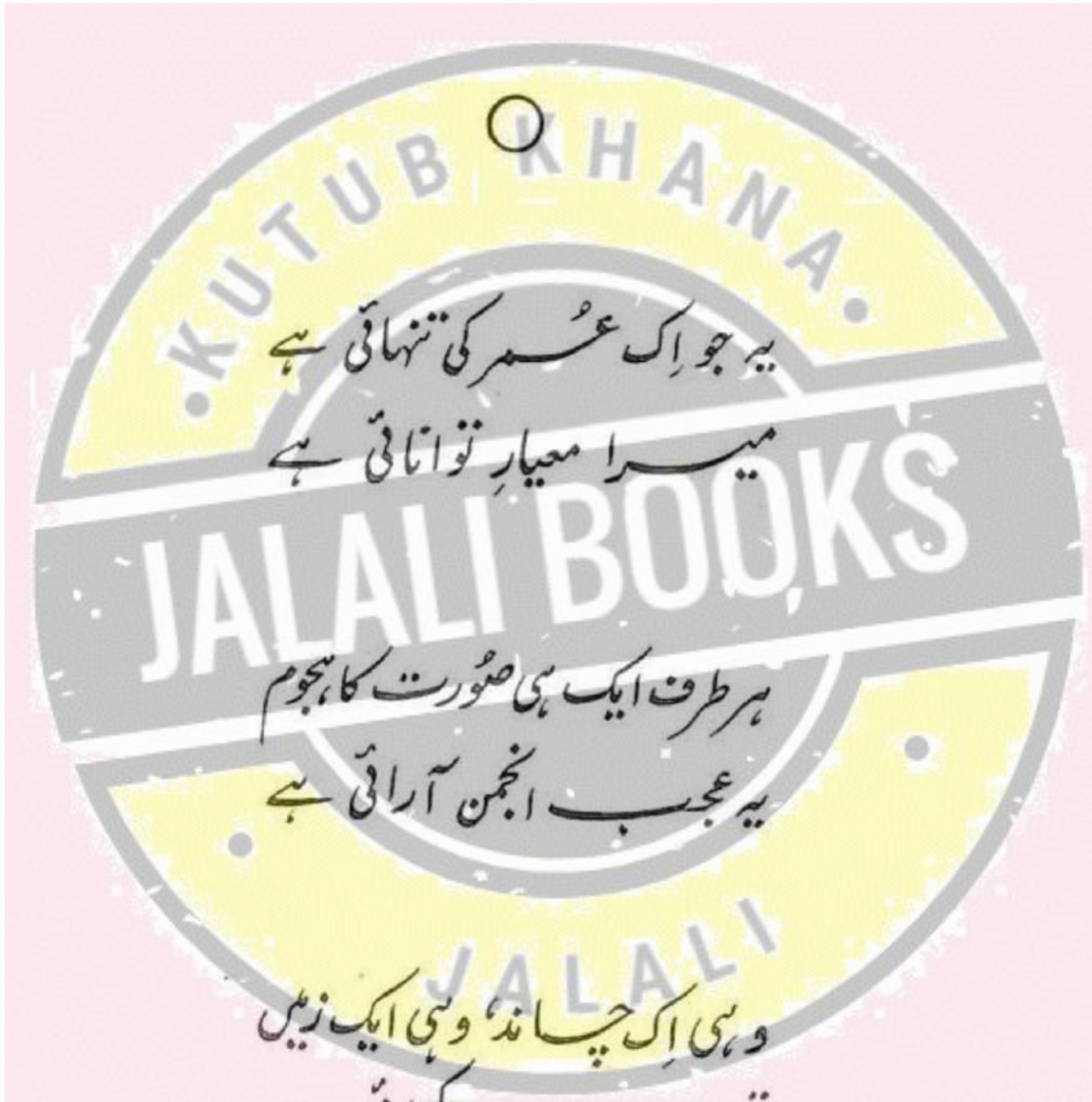
یہ جو اِک عُمر کی تنہائی ہے
میرا معیارِ توانائی ہے

ہر طرف ایک ہی صُورت کا ہجوم
یہ عجب انجمن آرائی ہے

وہی اِک چاند، وہی ایک زمیں
تیری میری یہی یکجائی ہے

شب کو جلتا ہے وہی مثلِ چراغ
دن کو جو لالۂ صحرائی ہے

عِشق پتّھر سے نمی مانگتا ہے
عقل کہتی ہے، یہ دانائی ہے

بول سکتے ہیں، مگر سب چُپ ہیں
یہ بھی اِک طرح کی گویائی ہے

نوکِ خنجر سے سِلے زخم ندیمؔ
یہ نیا طرزِ مسیحائی ہے

جولائی ۱۹۷۸ء

عالمِ ہجر میں سویا ہوں، نہ سونا چاہوں
میں تری ذات سے مایوس نہ ہونا چاہوں

گُل ترے دل میں کھلیں، اور مہک جاؤں میں
اِسی رشتے میں ہر انساں کو پرونا چاہوں

کیوں گوارا ہو ترے درد میں بھی شرکتِ غیر
تو جو یاد آئے تو تنہائی میں رونا چاہوں
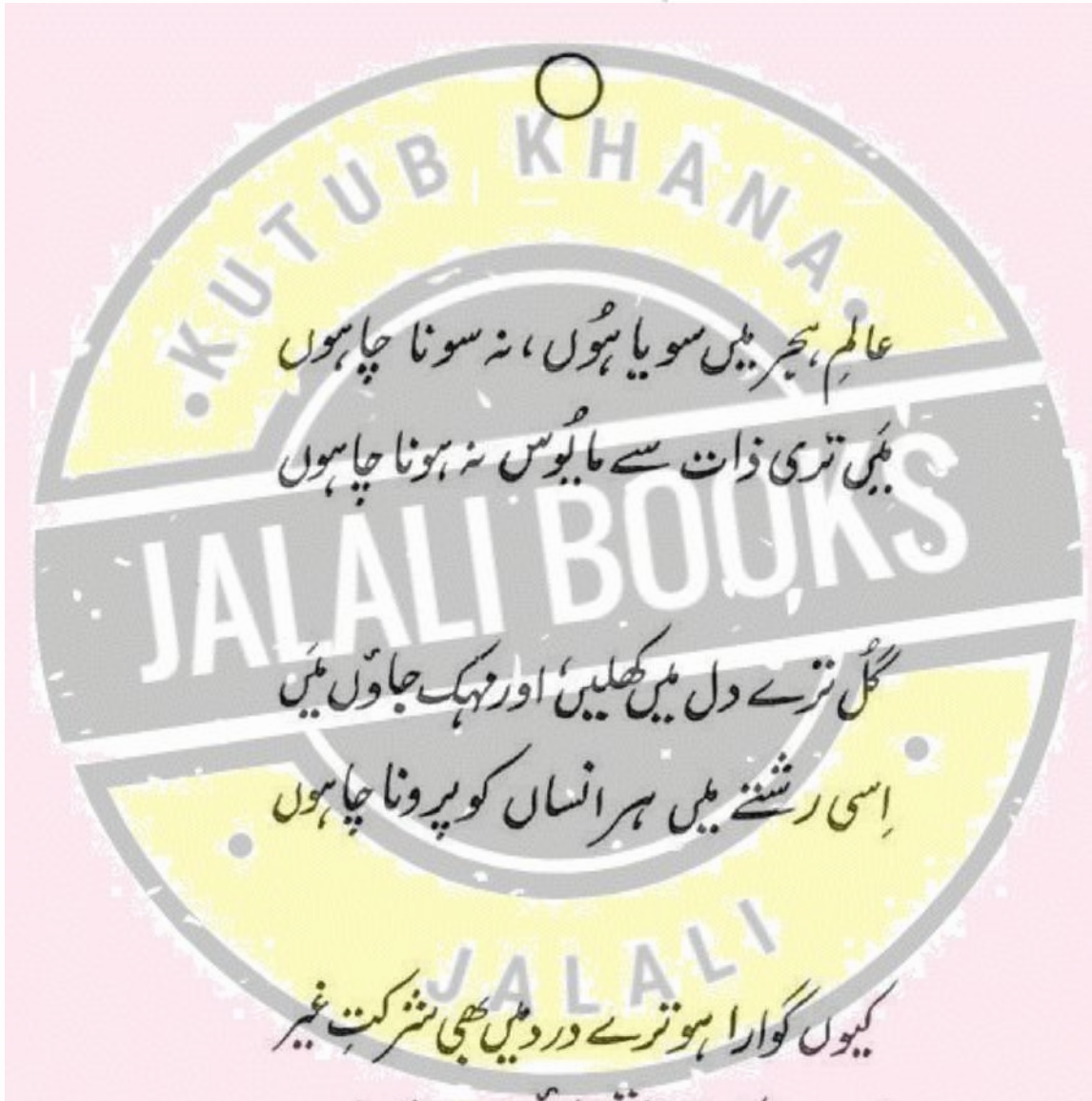
جستجو کے لیے رہتا ہے بہانہ درکار
کھو کے پایا جسے، پا کر اسے کھونا چاہوں

چھا رہا ہے مرے اندر غمِ انجام کا ابر
خوش بھی ہوتا ہوں تو آنکھوں کو بھگونا چاہوں

مَیں ہُوں اِک طرفہ بھکاری، کوئی میری بھی سنو
رات کے فرش پہ کرنوں کا بچھونا چاہوں

یُوں تو اِک پھُول کی پتّی سے بہل جاتا ہوں
مَیں مچل جاؤں تو صحرا کا کھلونا چاہوں

میرا منصب نہیں پیغمبرِ فن بننے کا
مَیں تو احساس کو لفظوں میں سمونا چاہوں

اس زمانے کا عجب طرزِ تصوّف ہے ندیمؔ
کہ مَیں قطرے میں سمندر کو ڈبونا چاہوں

جولائی ۱۹۷۸ء

رات کے ساتھ ہی رخصت ہُوا مہتاب اپنا
اب کسے ڈھونڈتا ہے دیدۂ بے خواب اپنا

ہم وہ دریا، کہ تجھے پار لگانے کے لیے
توڑ بیٹھے ہیں بھپرتا ہُوا گرداب اپنا

تہ بہ تہ تیرگیوں سے جو نمٹنا چاہا
جل گیا آگ میں اپنی، دلِ شب تاب اپنا

ہائے یہ حسنِ نظر، وائے یہ رعنائیِ فن
ہم تو بھوکے ہیں مگر کھیت ہے شاداب اپنا

عمر بھر ہم نے بہایا اگر آنکھوں سے لہُو
مطمئن ہیں کہ وطن تو ہُوا سیراب اپنا

ایک دُنیا نے یہاں پیاس بُجھائی ہے ندیمؔ
اِس سخاوت میں سمندر ہُوا پایاب اپنا

جون ۱۹۷۸ء

ہر شے اپنی اپنی زباں میں اظہارِ حالات کرے
صبح کو چڑیا پیڑ پیڑ سے شب بھر ہی کی بات کرے

انساں یوں تو نفس نفس میں طے بحرِ ظلمات کرے
عشق اگر بس جائے لہو میں، کارِ آبِ حیات کرے

کسی وجود، کسی جذبے سے پیار ہی ہے اثباتِ حیات
پیار نہ ہو تو اس دنیا میں کون گزر اوقات کرے

ایک محبت سے ڈر تھا، سو اس کو عالمگیر کیا
کون ہے اب جو بھرے جہاں میں ہم کو اسیرِ ذات کرے

ہم پیاسوں کی پیاس نہ دیکھو، ہم تو دل کے سمندر ہیں
شب ظلمت میں عمر گزارے اور سحر سوغات کرے

گنگ ہوئیں حرفوں کی زبانیں، سنگ ہوئے لفظوں کے لب
اب تو ہماری خاموشی ہی ترسیلِ جذبات کرے

موت کو اپنی نافہمی میں دے جو فنا کا نام ندیمؔ
خاکِ لحد سے سبزہ پھوٹے اور اعلانِ ثبات کرے

جون ۱۹۷۸ء

○

(نذرِ غالبؔ)

ہاتھ میں تیشہ ہے یا نسخہ کوئی اکسیر کا
کم نہیں ہوتا کھنڈر میں بھی جنوں تعمیر کا

چند جھنکاریں ہیں جن کی گونج ہے آفاق گیر
اور کیا سرمایہ ہوتا خانۂ زنجیر کا

دل سے لب تک حرف کا سارا سفر برزخ میں ہے
شوقِ حق گوئی کا، لیکن خوف ہے تکفیر کا

بھید یہ مجھ پر کھلا اس شہرِ عزّت مند میں
بے گناہی بھی ہے اِک پہلو مری تقصیر کا

درحقیقت دل میں گھر کرنا ہے پربت کاٹنا
تم نے افسانہ بنا ڈالا ہے جوئے شیر کا

خواب دیکھا تھا کہ ہم افسوں کی زد میں آتے تھے
عمر بھر پھر خواب دیکھا خواب کی تعبیر کا

شب، تصوّر نے تری یادوں کی جب تجسیم کی
ایک جھونکے پر بھی دھوکا سا ہوا تصویر کا

ہجر سے موسوم کرلی اپنی کوتاہی ندیمؔ
اور بھلا سا نام اس کو دے دیا تقدیر کا

مئی ۱۹۷۸ء
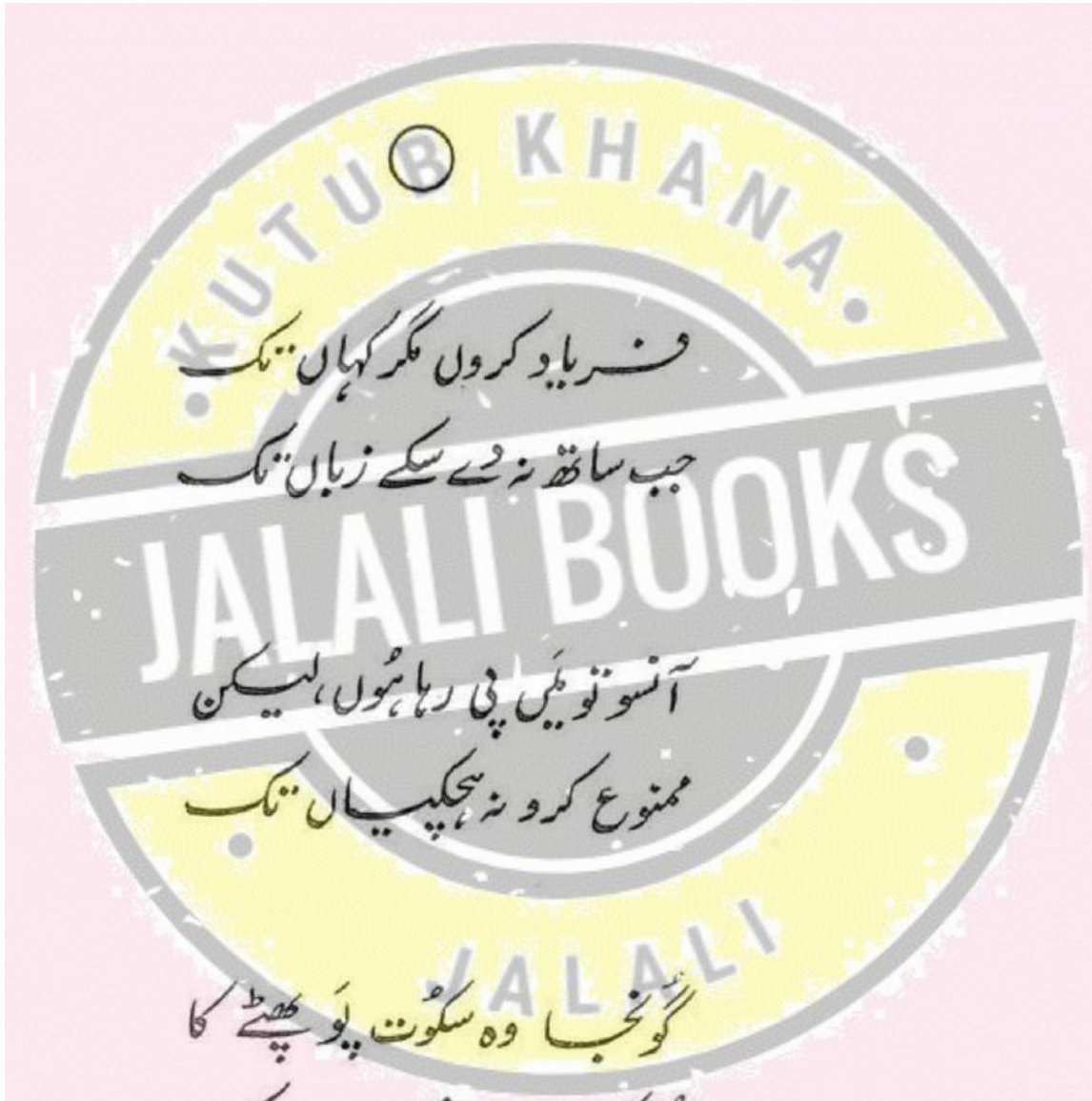
فریاد کروں مگر کہاں تک
جب ساتھ نہ دے سکے زباں تک

آنسو تو میں پی رہا ہوں، لیکن
ممنوع کرو نہ ہچکیاں تک

گونجا وہ سکوت پوچھئے کا
مجھ کو نہ سنائی دی اذاں تک

انسان، خدا کی جستجو میں
بھٹکا ہے زمیں سے آسماں تک

پھیلا دیا ایک دامِ ابہام
پھولوں نے قفس سے آشیاں تک

اِک اور فلک، پسِ فلک تھا
پہنچی ہے مری نظر جہاں تک

یہ ضبط نہیں ہے، خودکشی ہے
جب دل سے نہ اُٹھ سکے دھواں تک

زندہ ہیں ہنر، ہنروروں کے
قبروں کے تو مِٹ گئے نشاں تک

مئی ۱۹۷۸ء

درد کو جب دلِ شاعر میں زوال آتا ہے

جو بھی شعر آتا ہے، پتھر کی مثال آتا ہے

تیری آنکھوں میں کسی یاد کی لَو چمکی ہے

چاند نکلے تو سمندر پہ جمال آتا ہے

اِک نظر تُو نے جو دیکھا تو صدی بیت گئی

مُجھ کو بس اتنا حسابِ مہ و سال آتا ہے

بجلیاں جیسے چمکتے ہی کہیں کھو جائیں

اب کچھ اس طرح خیالِ خد و خال آتا ہے

اپنے ہی حُسن سے ہیں لرزہ بر اندام طیور
جو بھی آتا ہے، اُٹھائے ہُوئے جال آتا ہے

آندھیاں میرے چراغوں کے تعاقب میں چلیں
یُوں بھی بے وجہ، عناصر کو جلال آتا ہے

جب بھی تصویرِ بہاراں میں بھروں رنگ ندیمؔ
شاخ سے ٹُوٹتے پتّوں کا خیال آتا ہے

اپریل ۱۹۷۸ء

نہ شکستہ حرف ہیں اجنبی ، نہ فگار لفظ پرائے ہیں
وہی غم ہیں میری متاعِ فن، مرے تجربے میں جو آئے ہیں

گو سفر تو دھوپ نگر کا ہے، یہ طلسم حُسنِ نظر کا ہے
کہیں چھاؤں قربِ جمال کی، کہیں فیضِ عشق کے سائے ہیں

تری ایک جنبشِ چشم سے ہوئیں نغمہ نغمہ بصارتیں
ہوئیں غنچہ غنچہ سماعتیں، ذرا لب جو تُو نے ہلائے ہیں

تو گیا تو بزمِ خیال سے ترے خد و خال کہاں گئے
مرے پھول کس نے جلائے ہیں، مرے چاند کس نے بجھائے ہیں

ترا انتظار نہیں رہا، ترا اعتبار نہیں رہا!
مرے اعتماد کی شاخ سے یہ طیور کس نے اُڑائے ہیں

مرے شوق پر یہ گرفت کیوں، اے خدا یہ نفیِ سرشت کیوں
یہ وہ نشّہ ہے جسے آدمی ترے آسمان سے لائے ہیں

جو خلا کے جبر میں قید تھا، وہ خلا کے پار نکل گیا
جو گرا تھا بامِ بہشت سے، یہ حصار اسی نے گرائے ہیں

یہ غزل ندیمؔ کی ہے مگر ترا لطف عام ہے کس قدر
کہ اسے یقین ہے سربسر، ترے شعر اس نے سُنائے ہیں

اپریل ۱۹۷۸ء
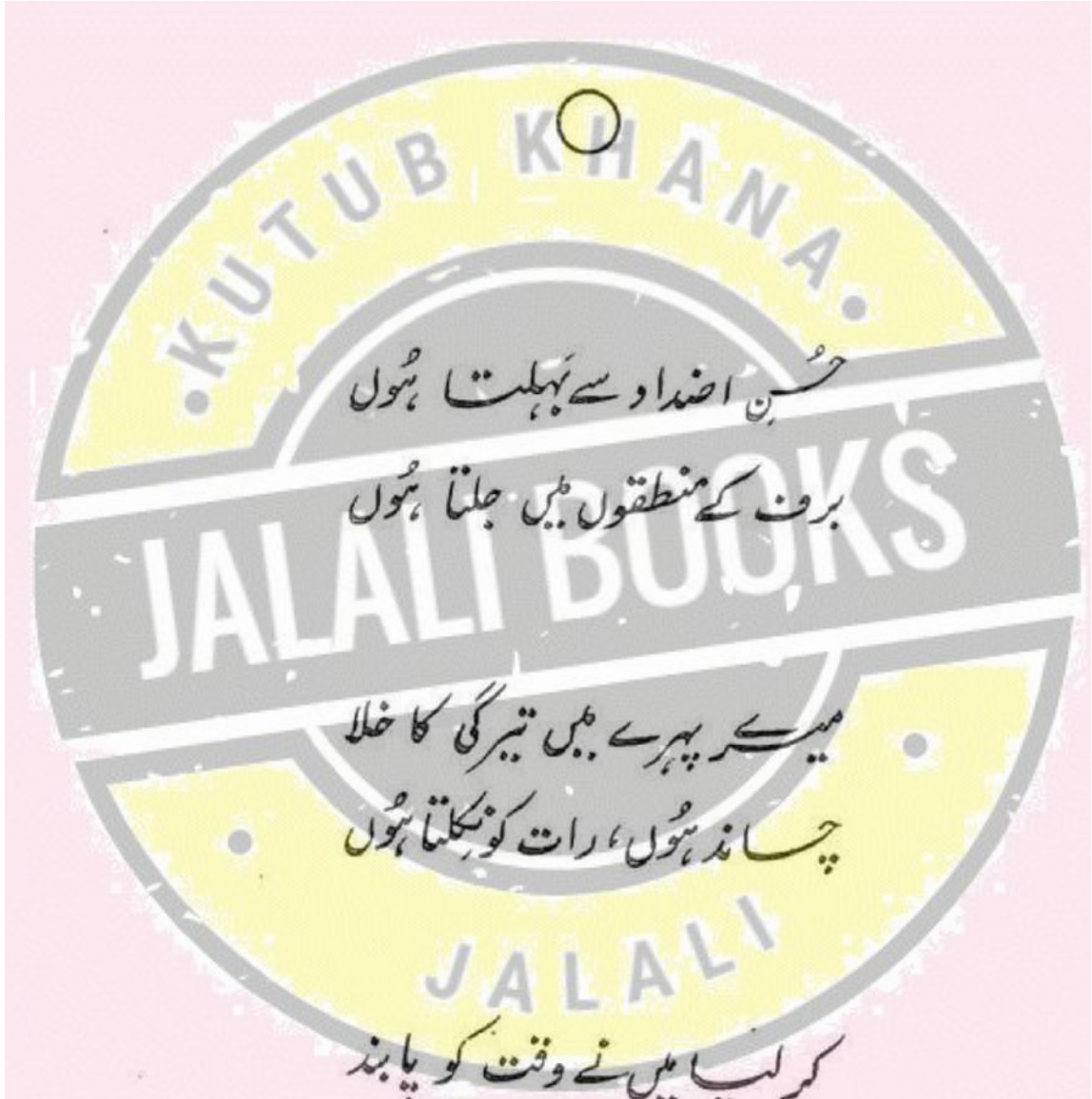
حُسنِ اضداد سے بہلتا ہُوں
برف کے منطقوں میں جلتا ہُوں

میرے پہرے میں تیرگی کا خلا
چاند ہُوں، رات کو نکلتا ہُوں

کر لیا میں نے وقت کو پابند
وقت کے ساتھ چلتا ہُوں

کب مرا ذوقِ جُستجو بدلا!
مَیں فقط راستہ بدلتا ہُوں

کتنے محکم ہیں درد کے رشتے
شمع جلتی ہے، مَیں پگھلتا ہُوں

قبر میں اپنا جسم بو کے ندیمؔ
تا ابد پھولتا ہُوں، پھلتا ہُوں

اپریل ۱۹۷۸ء

ہیں آپ اپنا جواب اور آپ اپنی نظیر
خود اپنے شہر میں تنہا، خود اپنے گھر میں فقیر

گماں جلوس کا ہوتا ہے، جب بھی چلتا ہے
مرے جلو میں، مری حسرتوں کا جمِّ غفیر

بکھر گیا ہوں کچھ اس طرح سطحِ عالم پر
کہ میری خاک ہی ہوتی ہے میری دامن گیر
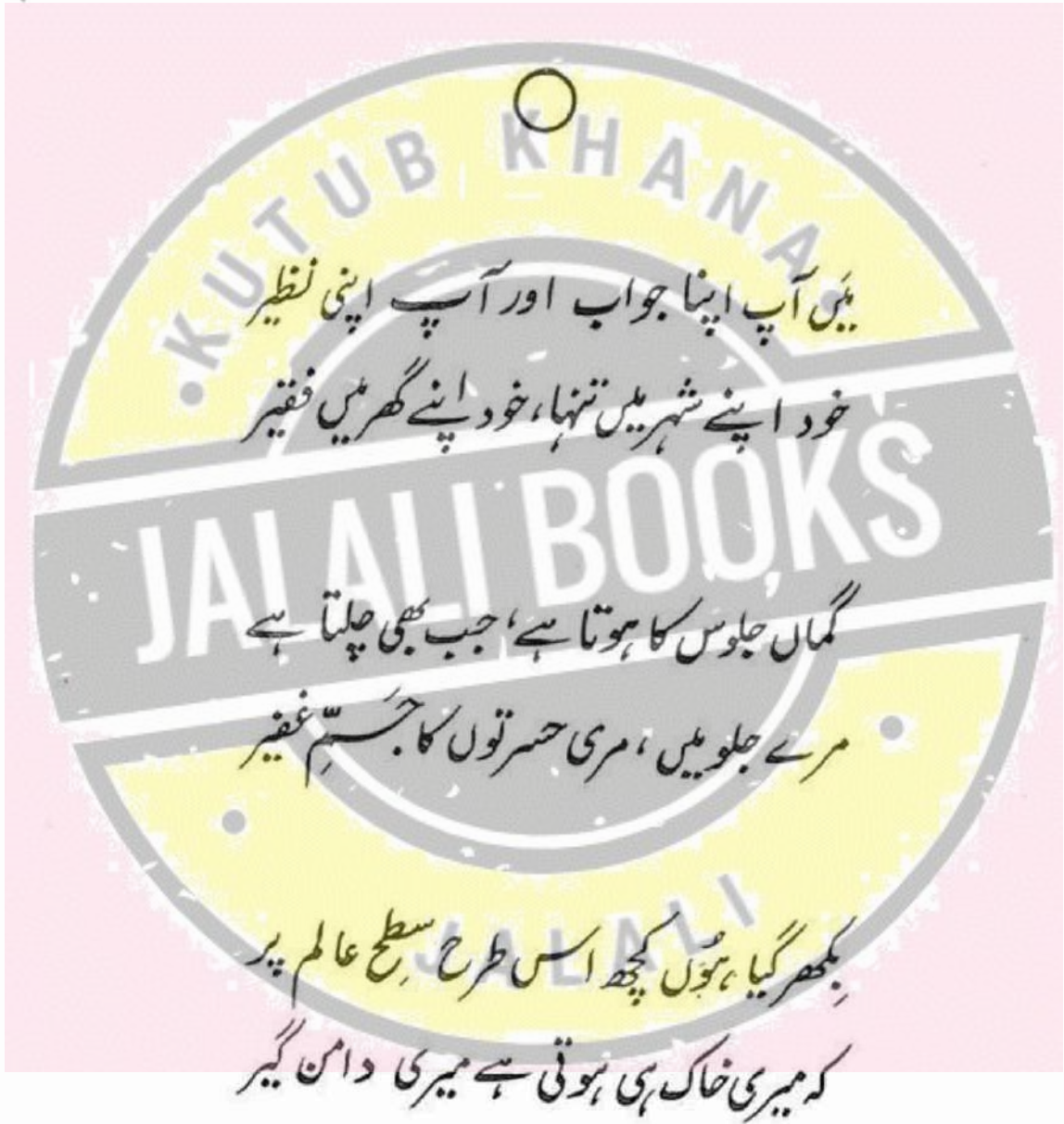
تمام صحنِ چمن آگ کی لپیٹ میں ہے
کہ رنگِ گُل بھی ہوا اس صدی میں آتش گیر

مَیں پھیل جاؤں گا چاروں طرف خلا کی طرح
ابھی وجُود ہے میرا فصیلِ جاں میں اسیر

کسی سے زیر نہ ہو پائے فکر و فن کے دیار
کہ مُلک فتح ہوئے، پر ہوئے نہ دل تسخیر

مَیں لُٹ تو جاؤں کہ لُٹنا ہے مقتدر ہونا
مگر یہ میرا اثاثہ! مگر یہ میرا ضمیر!

تمام زاویۂ ذہن کے کرشمے ہیں
کہ رُخ بدل کے جو دیکھا، بدل گئی تقدیر

کبھی تو پھُول کھِلائیں گے ضمیرِ آدم میں
اگر یہ سچ ہے کہ مٹّی ہے آدمی کا خمیر

فسادِ خلق کے ڈر سے ندیمؔ اپنی غزل
نہ پڑھ سکا تو وہ دیوار پر ہُوئی تحریر

مارچ ۱۹۷۸ء

خلق تکمیل کی ہے دیوانی
میرا سرمایہ میری حیرانی

علم نے کربِ اضطراب دیا
کس قدر پُرسکون تھی نادانی
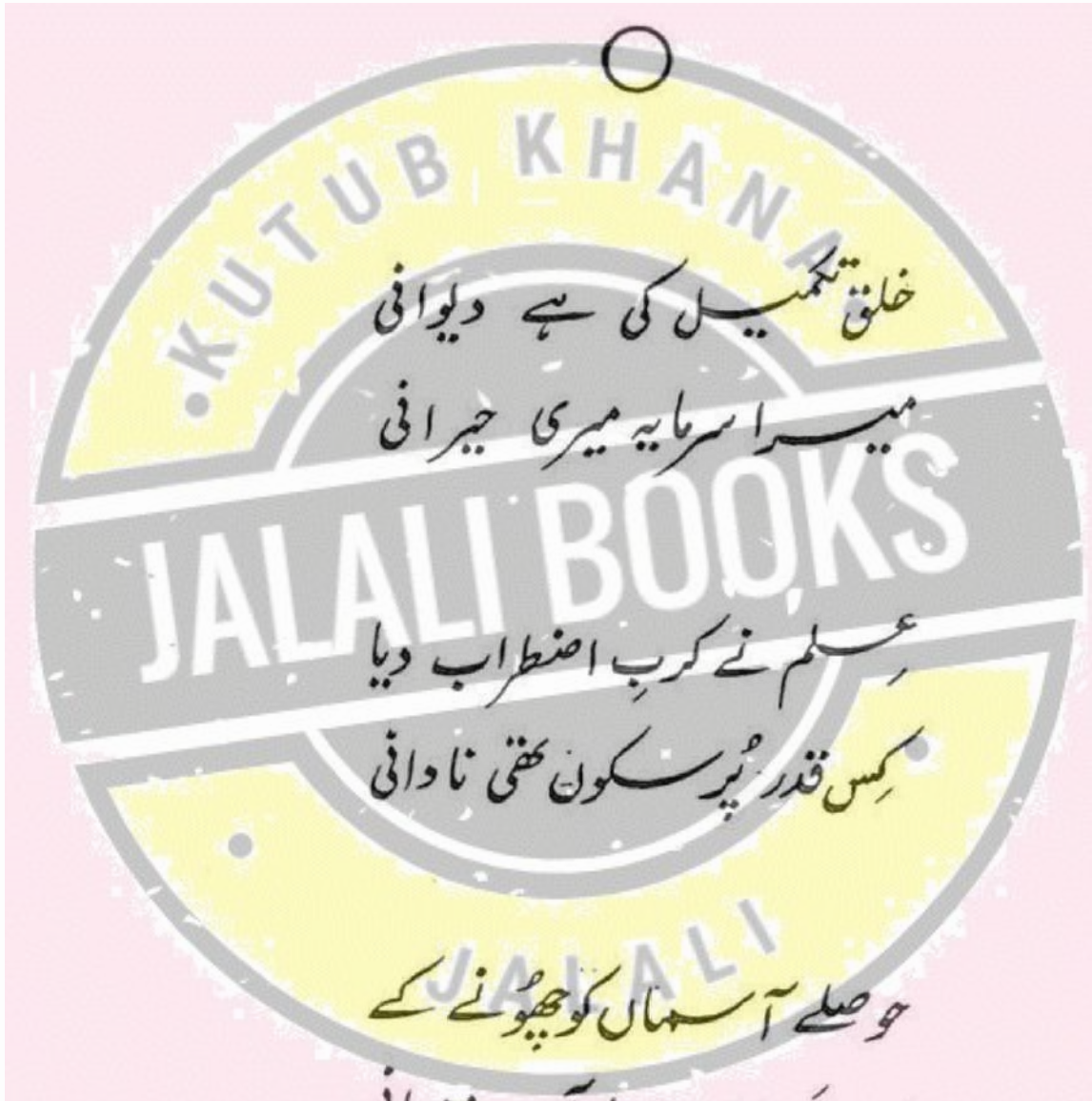
حوصلے آسماں کو چھونے کے
اور میں اپنا آپ زندانی

چاند سے بڑھ کے لطف دے شاید
چاند پر سے زمیں کی تابانی

پیڑ کو توڑ کر بہت خوش ہیں
اتھلی اتھلی ہوائیں طوفانی

تیز بارش نے چھت پہ دستک دی
جب مرے گھر میں بھر گیا پانی

خود پشیماں کے کام آتی ہے
بعد از وقت کی پشیمانی

اس کڑی دھوپ میں بھی جاری ہے
چند یادوں کی شبنم افشانی

جنوری ۱۹۷۸ء

○

سجتی ہے چاندنی کو روایت حجاب کی
یہ روشنی ہے ڈوبے ہوئے آفتاب کی

خوشبو اسیرِ رنگ، تغزّل اسیرِ حرف
ہر پیکرِ جمال کو لت ہے نقاب کی

سمجھا ہے کون وقت کی رفتار کا مزاج
لمحوں میں کٹ گئیں کئی صدیاں شباب کی
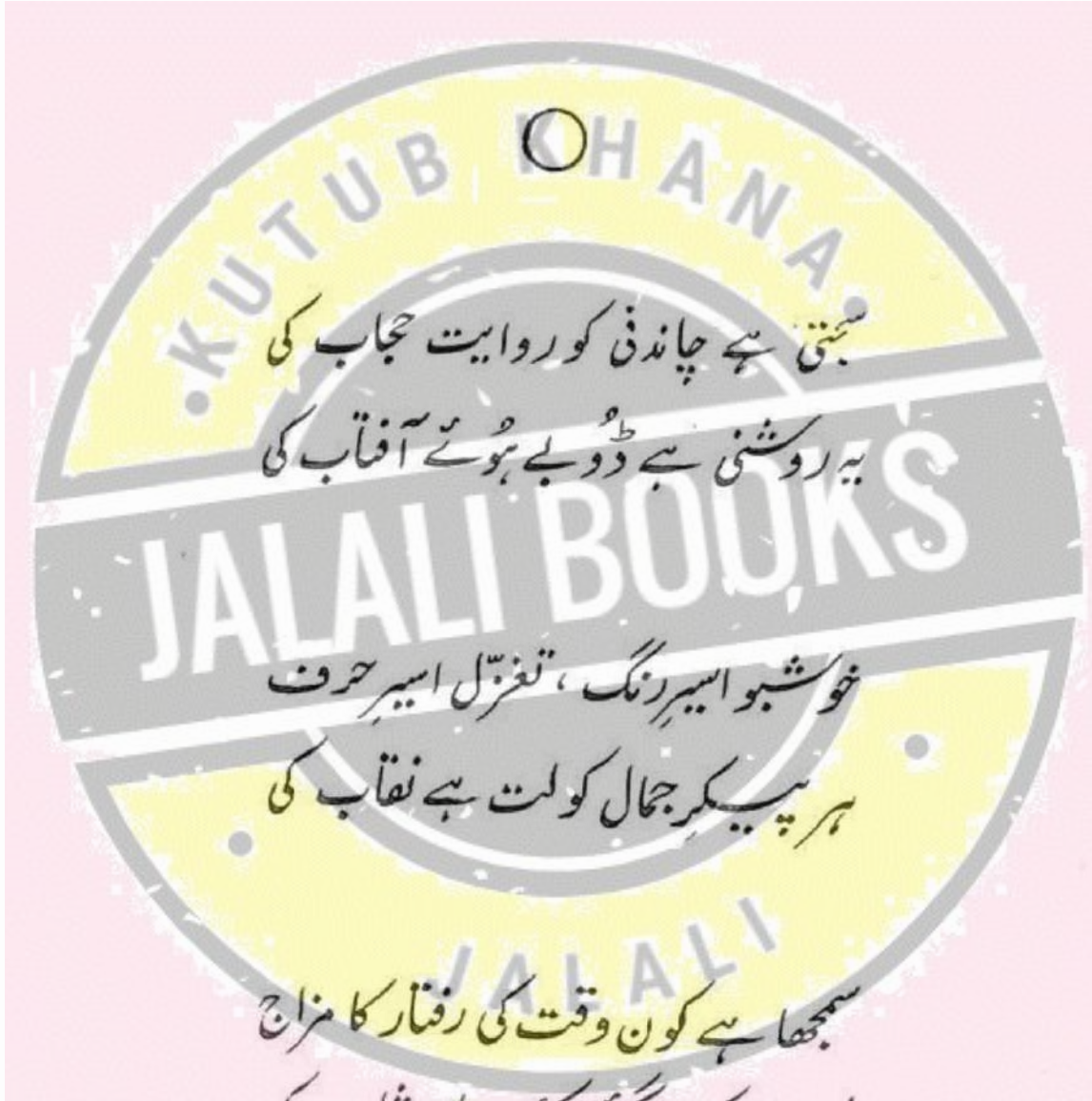
اعجازِ خاک سے ہیں وہ کس درجہ بے خبر
پتھّر سے ڈھالتے ہیں جو کلیاں گلاب کی

خالی پڑی رہیں گی جہنّم کی وسعتیں
یاد آئے گی نہ حسنِ کرم کو حساب کی

اللہ! تُو نے موت کو بھی ساتھ کر دیا!
مَیں نے تو زندگی ہی فقط انتخاب کی

پُوچھا تھا اِک سوال ازل میں ندیمؔ نے
اب تک اسے طلب ہے، خدا سے جواب کی

دسمبر ۱۹۷۷ء

○

(نذرِ اقبال)

کبھی جو حدِّ نظر تک پروں کو پھیلا دُوں
میَں اپنے آپ میں تحلیل ہونے لگتا ہُوں

الٰہی، جب بھی مروں میَں تو اِس ادا سے مروں
کرن کی طرح، گلُوں میں نفوذ کر جاؤں

تو آدمی کا ہے معبود، اور عظیم و جلیل
میَں قدسیوں کا ہوں مسجُود، اور خوار و زبوں

وہ درد مجھ کو ملا، جس سے اجنبی ہیں سبھی
کہوں تو کس سے کہوں اور سہوں تو کیسے سہوں

تمام حشر ہوں، لیکن سکون ہے چہرے پر
مَیں جب بھی آئنہ دیکھوں، بہت عجیب لگوں

مَیں وہ ہَوا ہُوں، گھٹا جس کی ہمسفر نہ ہُوئی
سو اب مَیں آگ کی مانند جنگلوں میں چلوں

شعاعیں چُننے چلا تھا مَیں آشیاں کے لیے
فلک کے گنبدِ بے در میں پھڑپھڑاتا پھروں

خدا نہیں تو کوئی آدمی کہیں مِل جائے
مَیں کیا کروں اگر اتنی بھی آرزو نہ کروں

طنابِ خیمۂ گردوں ہوں، اے فرشتۂ موت!
مَیں آسمان کی خاطر زمین میں اُتروں

ندیمؔ جبر ہے یا اختیار ہے میرا
کہ جس کو مرتا ہُوا پاؤں، اُس کو مرنے دُوں

مَیں روشنی کے تسلسل کو ٹوٹنے ہی نہ دوں
مَیں شمع بن کے بجھوں، آفتاب بن کے جلوں

شمیمِ گل ہوں تو کوندے کی طرح کیوں لپکوں
مَیں سہج سہج فضاؤں میں حلول کرتا رہوں

مری فنا میں بقا کے ہزار تیور ہیں
مَیں خون ہو کے دلِ کائنات میں دھڑکوں

چراغِ آخرِ شب ہوں، مگر تمنّا ہے
مسافروں کو اُفق پر دکھائی دوں تو بجھوں

مَیں آدمی ہوں عجب طرح کا ستارہ مزاج
کہ بار بار سرِ اوجِ آسماں ٹوٹوں

مری اکائی کو جب بھی غنیم للکارے
مَیں برق بن کے گروں، مَیں بگولا بن کے اٹھوں

مرے وجود کا مفہوم اجتماع میں ہے
خدا کرے کہ میں انسان سے خدا نہ بنوں

وہی جو دن کو سُنی اَن سُنی کیے جائے
تمام رات میں سرگوشیاں اُسی کی سُنوں

ہوا مجھے بھی لگی ہے نئے زمانے کی
کہ میں بھی اپنے گریباں کے چاک خود سی لوں

خدا مِلا تو ہوئی جستجو تمام ندیم
سو طے کیا کہ اب اپنی تلاش میں نِکلوں

نومبر ۱۹۷۷ء
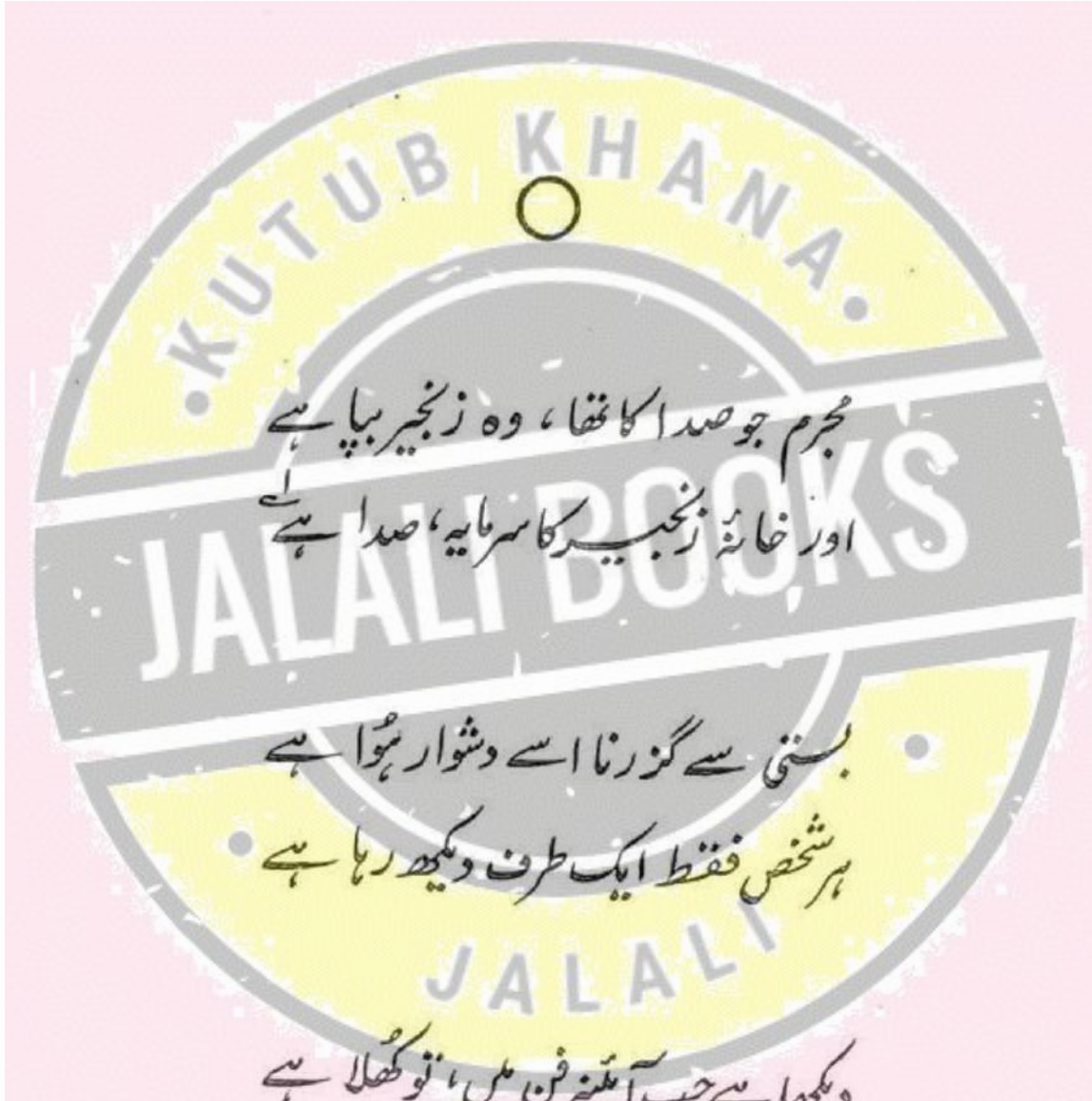
مجرم جو صدا کا تھا، وہ زنجیر بپا ہے
اور خانۂ زنجیر کا سرمایہ، صدا ہے[1]

بستی سے گزرنا اسے دشوار ہوا ہے
ہر شخص فقط ایک طرف دیکھ رہا ہے

دیکھا ہے جب آئینۂ فن میں، تو کھلا ہے
ہر حسن کو انسان نے تخلیق کیا ہے

---

[1] : متاعِ خانۂ زنجیر، بجز صدا معلوم — غالبؔ

ساحل کی چٹانوں کے اگر سبز ہیں چہرے
پتھر میں بھی اِک سلسلۂ نشو و نما ہے

گھبرایا ہُوں جب بھی میں گرانباریٔ شب سے
مشرق سے تجلّی کا دریچہ سا کُھلا ہے

نکلا ہُوں میں جب جھانک کے آئینۂ جاں میں
جس شخص کو دیکھا، مجھے اپنا سا لگا ہے

انسان کو انسان سمجھنا بھی تو سیکھو
اچھا ہے سو اچھا ہے، بُرا ہے سو بُرا ہے

مفہوم میں کچھ فرق ہے، الفاظ وہی ہیں
دیوار پہ لکھا ہُوا میں نے بھی پڑھا ہے

یہ عین بیاباں میں شجر میری اَنا کا
باہر سے اگر خشک ہے، اندر سے ہرا ہے

گر جبر کرے کوئی تو مَیں جبر سہوں کیوں
جو اُس کا خدا ہے، وہی میرا بھی خدا ہے

زندہ ہُوں کہ شاید اُسے احساسِ وفا ہو
صد شکر کہ مثبت مرا آئینِ وفا ہے

اِک عمر سے مَیں تیرے تعاقب میں رواں ہُوں
اے وقت! ترے کیسۂ تقدیر میں کیا ہے

ستمبر ۱۹۷۷ء

○

(نذرِ اقبال)

اللہ! قیامت اگر آئی ہے تو ٹل جائے
پھولی ہے جو برسوں میں وہ اک شاخ تو پھل جائے

مُرجھائے کوئی گُل نہ ستارہ کوئی ٹوٹے
انسان سنبھل جائے تو کیا کچھ نہ سنبھل جائے

کیوں عشق کی اس آنچ سے دل موم نہ ہو پائے
پتھر کو بھی جب آنچ پہ رکھو تو پگھل جائے

دشوار ہے انکار کو انکار سمجھنا
انکار سے چہرے کا اگر رنگ بدل جائے

غنچوں کو تو درکار ہے آئینہ سحر کا
شبنم کو یہ ڈر ہے کہ کہیں رات نہ ڈھل جائے

ہر موڑ پہ بیٹھا ہے یہ خونخوار درندہ
جو لمحہ گزر جائے اسے وقت نگل جائے

چپکے سے ہوا میرے خرابے میں جب آئے
گو ضبط کرے لاکھ مگر چیخ نکل جائے

انسان ہے اِک جسم کی، اِک جاں کی شراکت
ادراک جھلس جائے تو وجدان بھی جل جائے

شاعر کو یہ ضد، چاند سے کم کچھ نہیں لے گا
پھولوں پہ مگر اوس کو دیکھے تو بہل جائے

ستمبر ۱۹۷۷ء

○

سلسلے بند بھی کر، ہول بھری راتوں کے
گُنگ ہونے لگے الفاظ مناجاتوں کے

کوئی پل اس کی جُدائی کا، تہی دست نہ تھا
مَیں تو انبار لیے پھرتا ہُوں سوغاتوں کے

چھت ٹپکتی ہے تو لگ جاتی ہے یادوں کی قطار
جتنے احسان ہیں، دوگونہ ہیں، برساتوں کے

نہ ملے زہر تو اپنا ہی لہُو پیتے ہیں
جام خالی نہیں رہتے کبھی سقراطوں کے

سفرِ عشق میں گردشت سُلگتے ہیں ندیمؔ
اہلِ دل کے لیے یہ فرش ہیں باناتوں کے

اگست ۱۹۷۷ء

○

جو حقیقت میں سخن ور ہو گا
وہی اندر سے منوّر ہو گا

جس نے موجوں سے بغاوت کی ہے
اس صدف میں کوئی گوہر ہو گا

مبتلا کرب میں ہیں ارض و سما
نئی تخلیق کا چکّر ہو گا
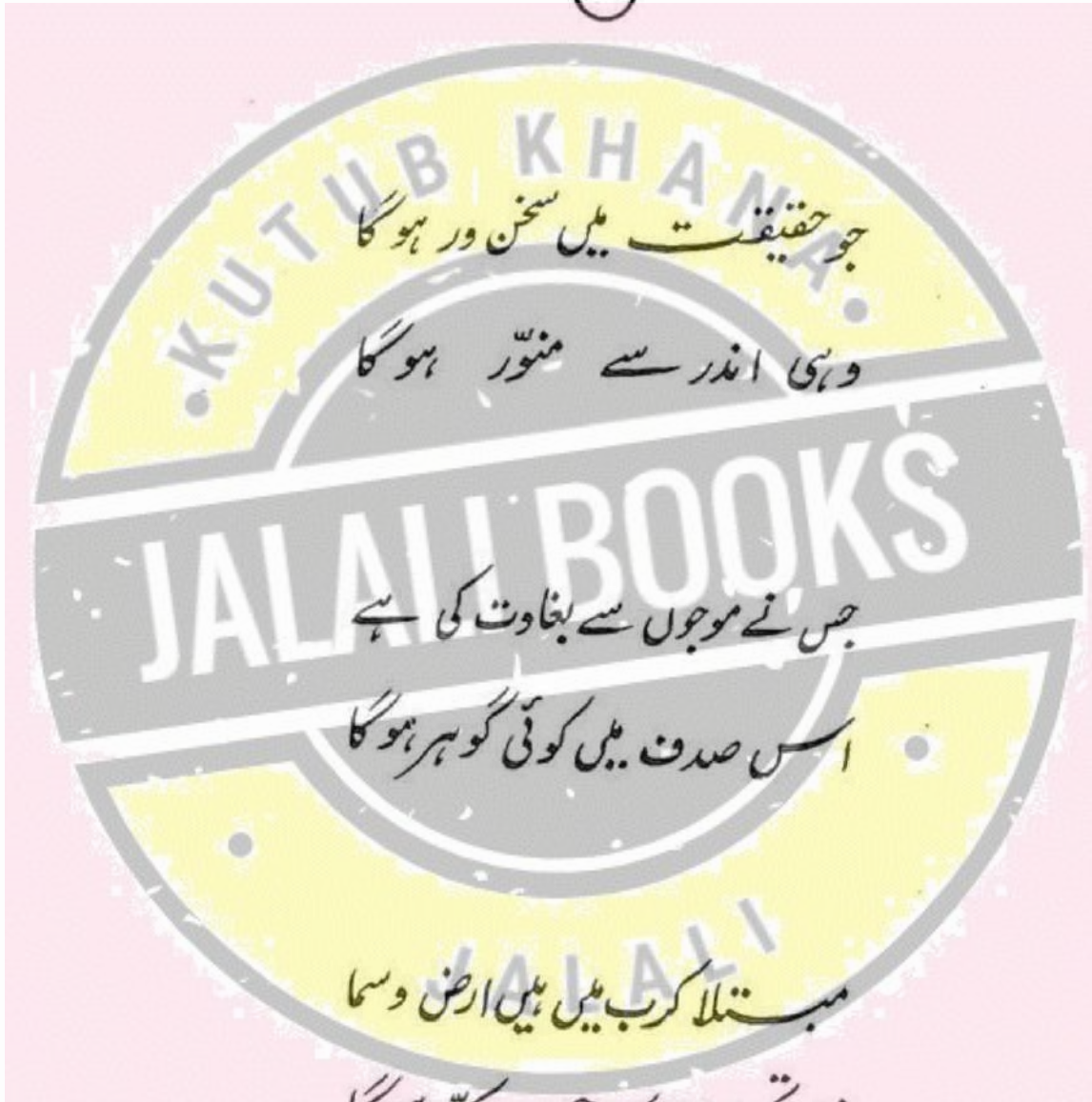
مَیں نے جب بُوند کے در کھول دیے
سامنے ایک سمندر ہو گا

چارہ گر دل پہ رکھے ہاتھ، آیا
آستیں میں کوئی خنجر ہوگا

بحث کرنے کا جب آئے گا مزا
سامنے داورِ محشر ہوگا

چھوٹے دشمن پہ ترس آتا ہے
اصل دشمن مرا ہمسر ہوگا

مدّتوں بعد یہ دستک کیسی!
ہو نہ ہو، کوئی گداگر ہوگا

مَیں بٹا جاتا ہُوں بوٹی بوٹی
یہ تماشا یونہی دن بھر ہوگا

امن کا عہد تب آئے گا ندیمؔ
جب نہ دارا نہ سکندر ہوگا
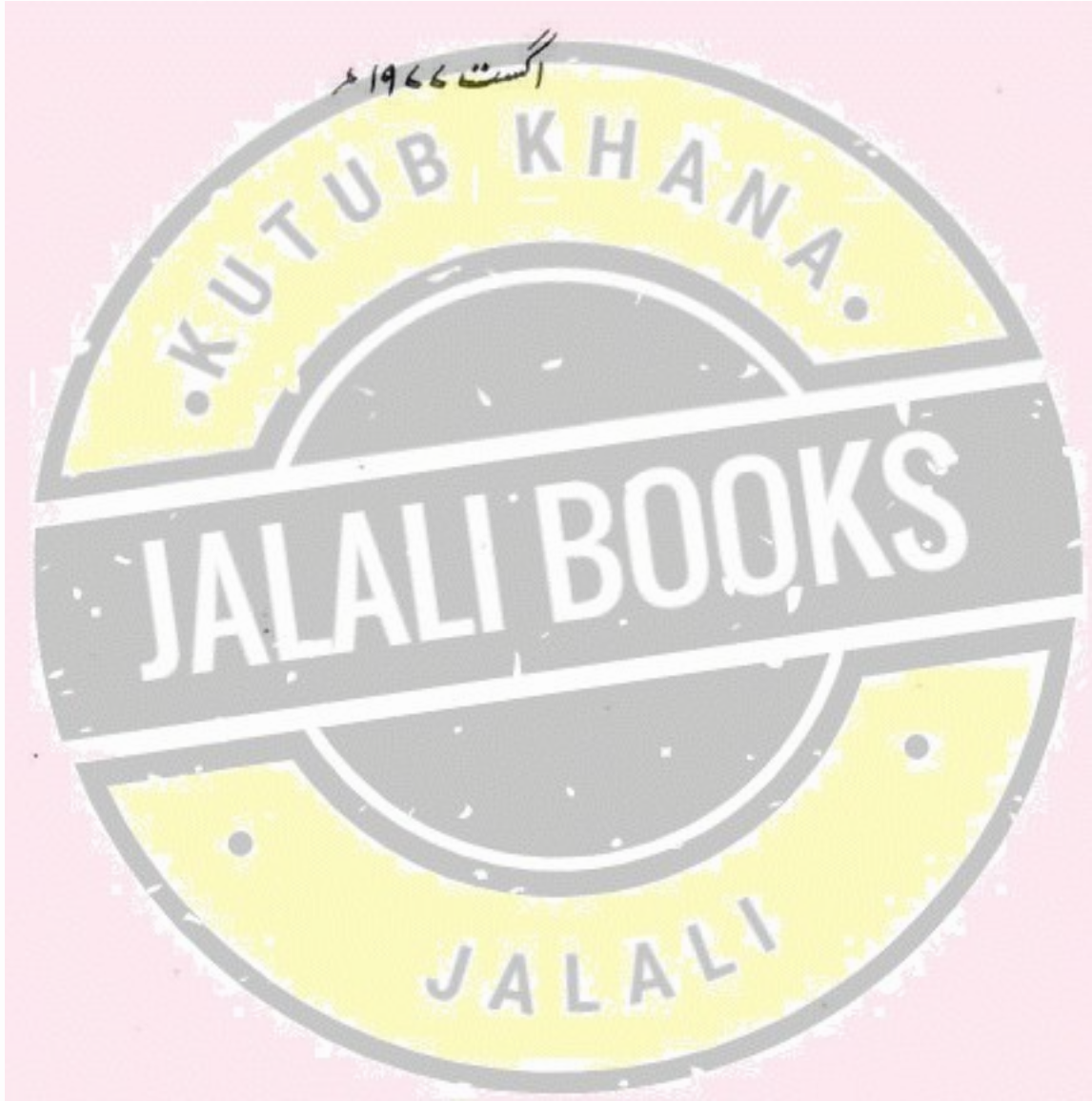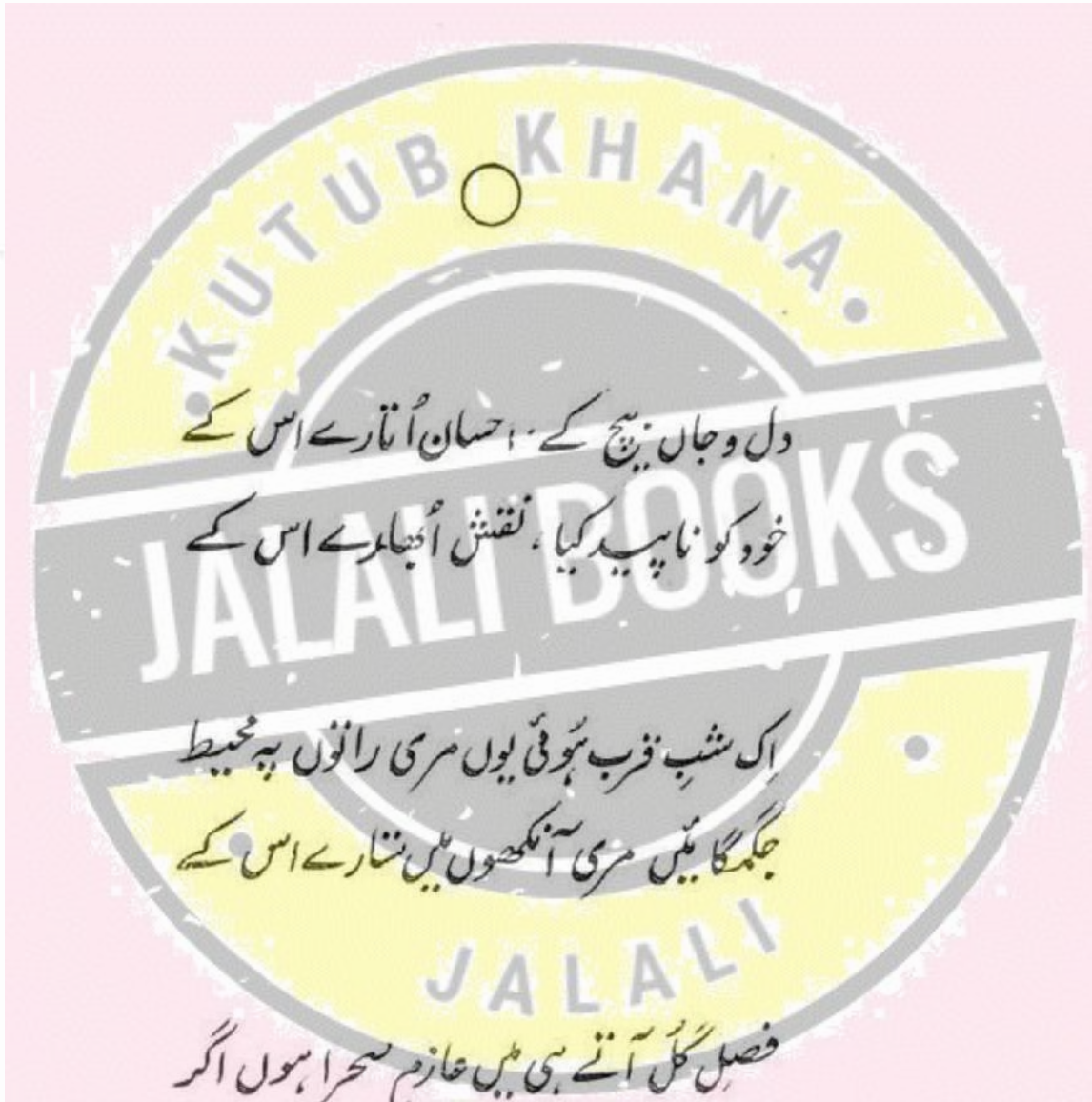
دل و جاں بیچ کے، احسان اُتارے اس کے
خود کو ناپید کیا، نقش اُبھارے اس کے

اک شبِ قرب ہُوئی یوں مری راتوں پہ محیط
جگمگائیں مری آنکھوں میں ستارے اس کے

فصلِ گُل آتے ہی میں عازمِ صحرا ہوں اگر
مجھ سا وحشی ہی سمجھتا ہے اشارے اس کے

کس قدر مادرِ گیتی ہے کشادہ آغوش
جتنے انسان ہیں، سب راج دُلارے اس کے

وہ تو یکتا ہے، مگر عالمِ تنہائی میں
مَیں نے گھبرا کے، کئی نام پکارے اس کے

مَیں تو اس عزم سے طے کرتا رہا دشتِ حیات
اِک نیا شہر بساؤں گا کنارے اس کے

موت بھی آئے گی اب اس کے حوالے سے ندیمؔ
کہ مَیں زندہ بھی رہا ہوں تو سہارے اس کے

جولائی ۱۹۷۷ء
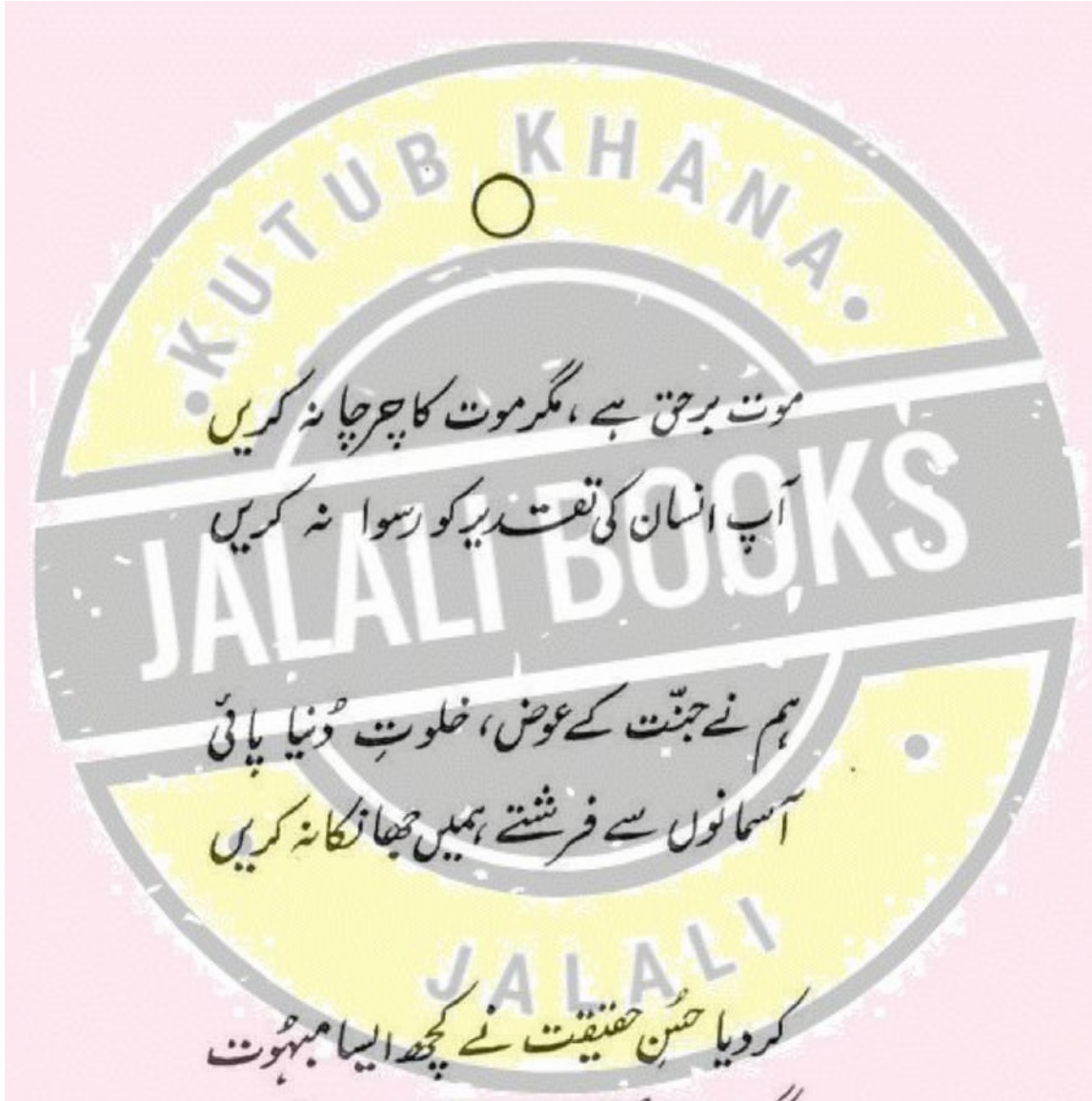
موت برحق ہے، مگر موت کا چرچا نہ کریں
آپ انسان کی تقدیر کو رسوا نہ کریں

ہم نے جنّت کے عوض، خلوتِ دُنیا پائی
آسمانوں سے فرشتے ہمیں جھانکا نہ کریں

کر دیا حسنِ حقیقت نے کچھ ایسا مبہوت
لوگ اب حسنِ تصوّر کا تقاضا نہ کریں

حال و ماضی نے ہمیں غم کے سوا کچھ نہ دیا
اور کیا کام کریں، گر غمِ فردا نہ کریں

رہنماؤں سے بس اتنا ہی ہمیں کہنا ہے
کہ وہ الفاظ کے ناموس کو بیچا نہ کریں

ہم نے کس صبر سے ہر جبر سہا ہے، لیکن
اب جو ہم چیخ اُٹھیں، آپ بھی غصّہ نہ کریں

ایک چتون کے بس اِک بل سے بکھر جائیں ہم
اور طوفان بھی آ جائیں تو ٹوٹا نہ کریں

اُڑ نہ جائے کہیں یادوں کی نمی دُھوپ کے ساتھ
آپ شبنم کی طرح ذہن پہ اُترا نہ کریں

آبلے پھوٹتے ہی پھول کھِل اُٹھتے ہیں ندیمؔ
ہم تو بے حرمتیٔ دامنِ صحرا نہ کریں

جون ۱۹۷۷ء

(نذرِ اقبال)

سورج کو نکلنا ہے، سو نکلے گا دوبارا
اب دیکھیے کب ڈوبتا ہے صبح کا تارا

جب ایشیا جاگے گا تو رہنے نہیں دیں گے
اس دھوپ کی نگری پہ اندھیروں کا اجارا
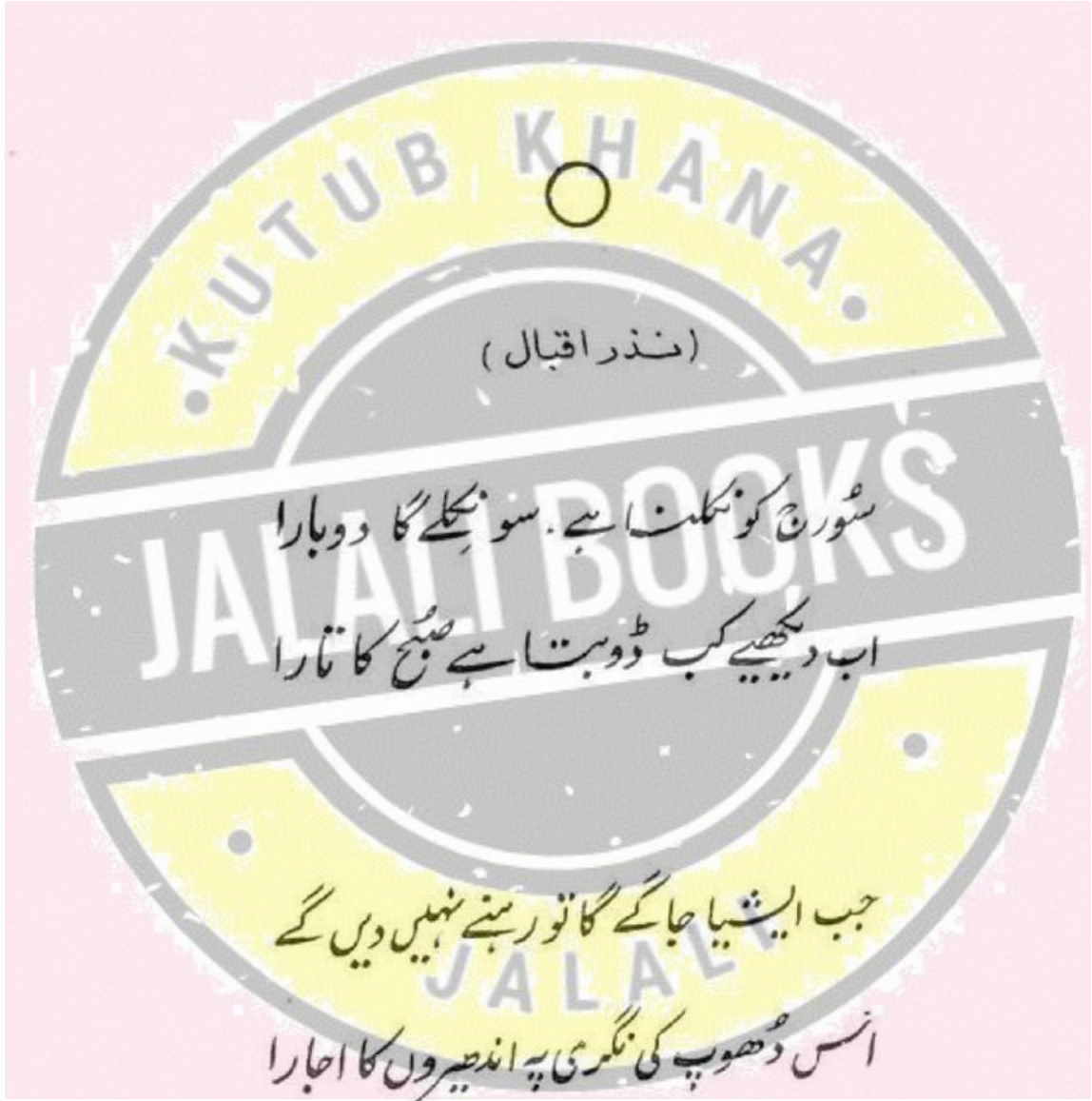
مغرب میں جو ڈوبے، اسے مشرق ہی نکالے
میں خوب سمجھتا ہوں مشیّت کا اشارا

پڑھتا ہوں جب اس کو تو ثنا کرتا ہوں رب کی
انسان کا چہرہ ہے کہ قرآن کا پارا

جس ہاتھ نے تنہائی میں آنسو مرے پونچھے
پھولوں پہ اسی ہاتھ نے شبنم کو اُتارا

جی ہار کے تم پار نہ کر پاؤ ندی بھی
ویسے تو سمندر کا بھی ہوتا ہے کنارا

اِس وقت ضرورت ہے دوا کی، نہ دُعا کی
صرف اہلِ وطن اپنے وطن کا ہیں سہارا

جنّت ملی جھوٹوں کو اگر جھوٹ کے بدلے
سچّوں کو سزا میں ہے جہنّم بھی گوارا

یہ کون سا انصاف ہے، اے عرش نشینو!

بجلی جو تمھاری ہے تو خرمن ہے ہمارا

مستقبلِ انسان نے اعلان کیا ہے

آئندہ سے بے تاج رہے گا سرِ دارا

جون ۱۹۷۷ء

ہم اُٹھ کے کِس کی انجمن سے
بیٹھے ہیں وطن ہیں بے وطن سے

اب عام کرو جمال اپنا
سُورج کا وجُود ہے کرن سے

تم لاکھ چھُپاؤ فصلِ گل کو
مہکار اُمڈ پڑے چمن سے
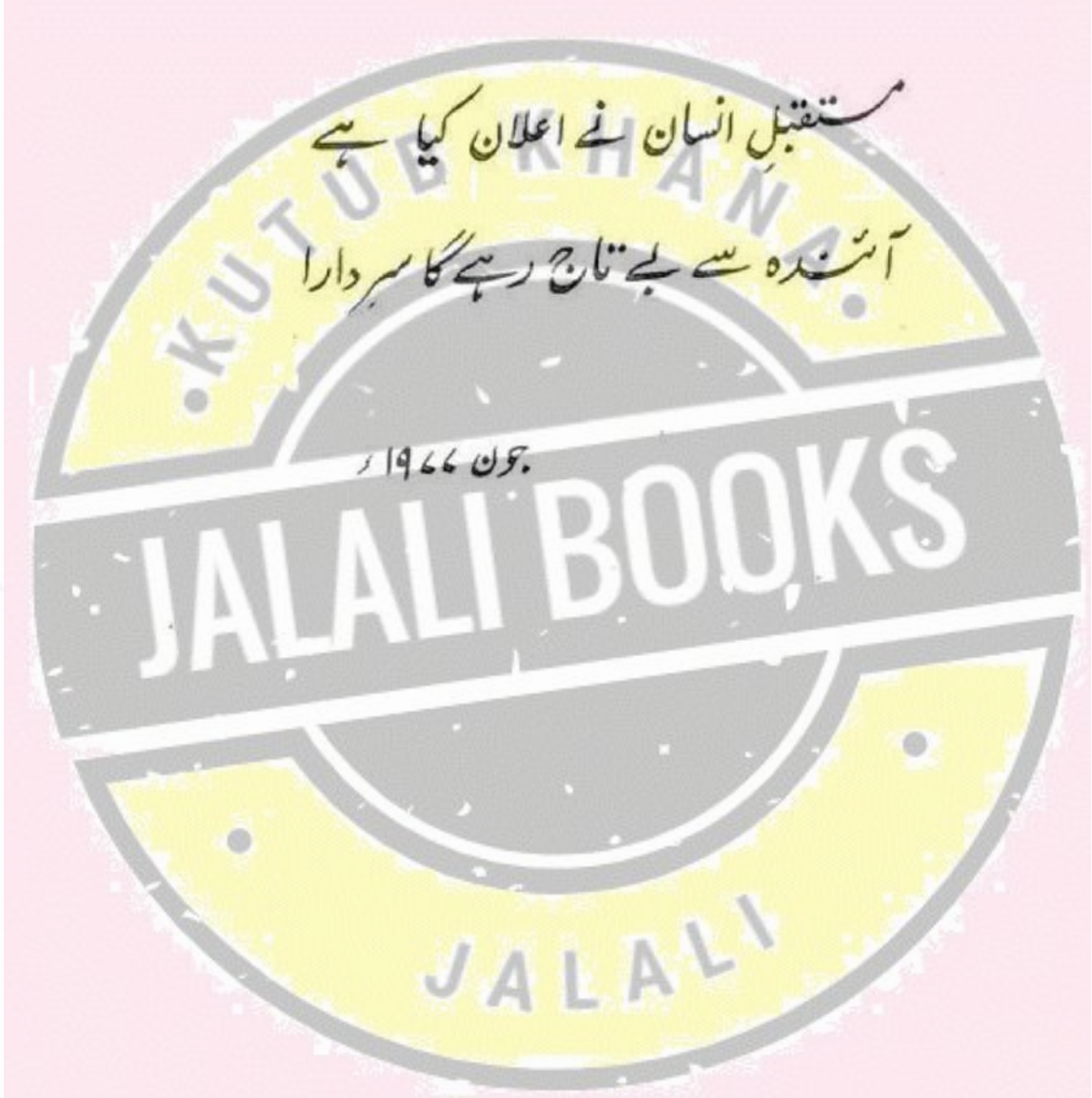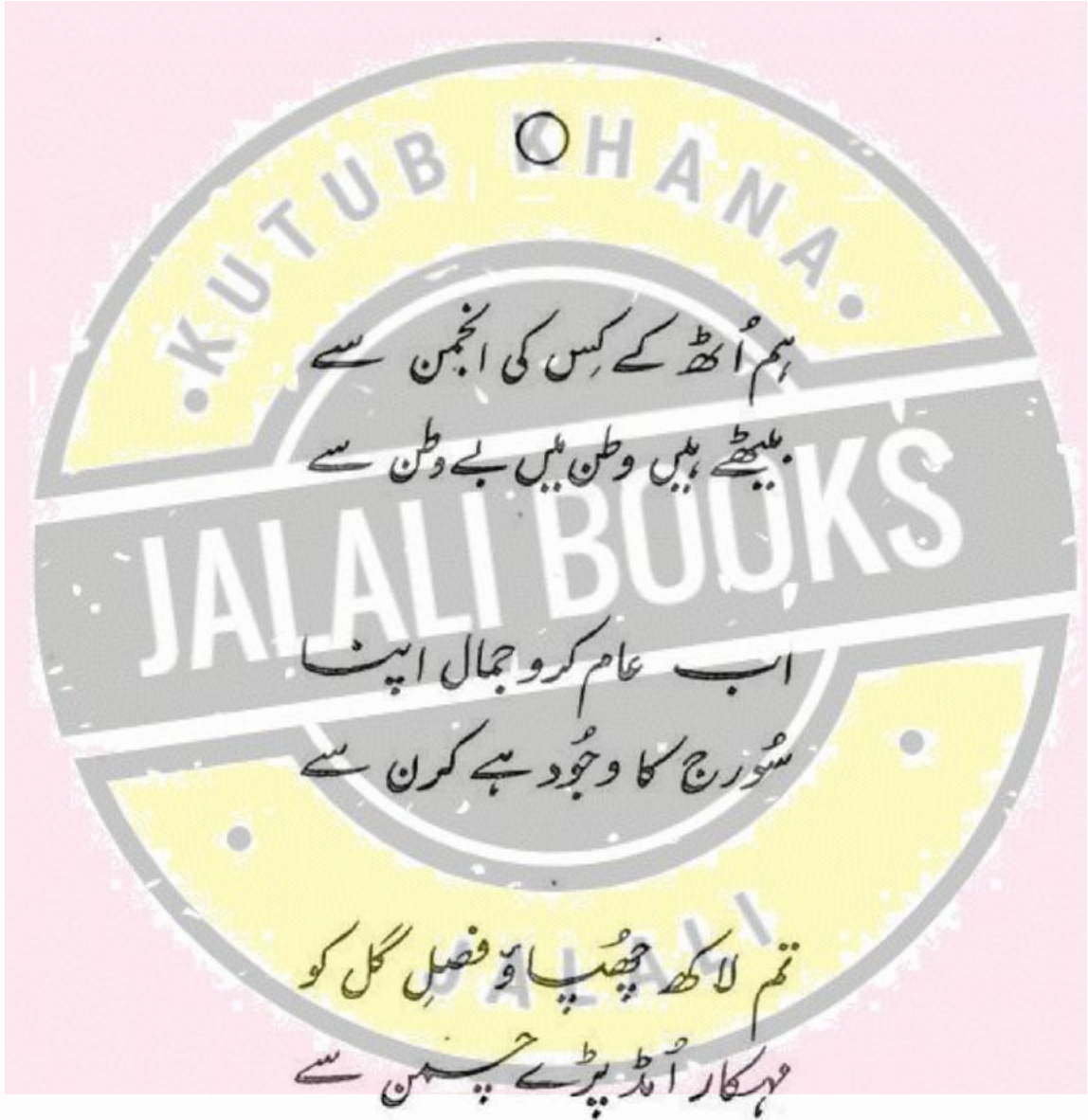
ممکن ہی نہیں، بدن نہ بولے
آواز رُکے نہ پیرہن سے

انعام سمجھ کے زخم کھائے
سیکھا یہی زندگی کے فن سے

تربت سے گلاب بن کے پھوٹا
جو حسن نہ چھپ سکا کفن سے

مئی ۱۹۷۷ء

اہلِ محفل کا تماشا دیکھوں
جس کو دیکھوں اسے تنہا دیکھوں

ہر گزرتے ہوئے پل کے پیچھے
ایک فردا پسِ فردا دیکھوں

جب بھی دیکھوں کوئی مٹتا ہوا شہر
وقت کا نقشِ کفِ پا دیکھوں
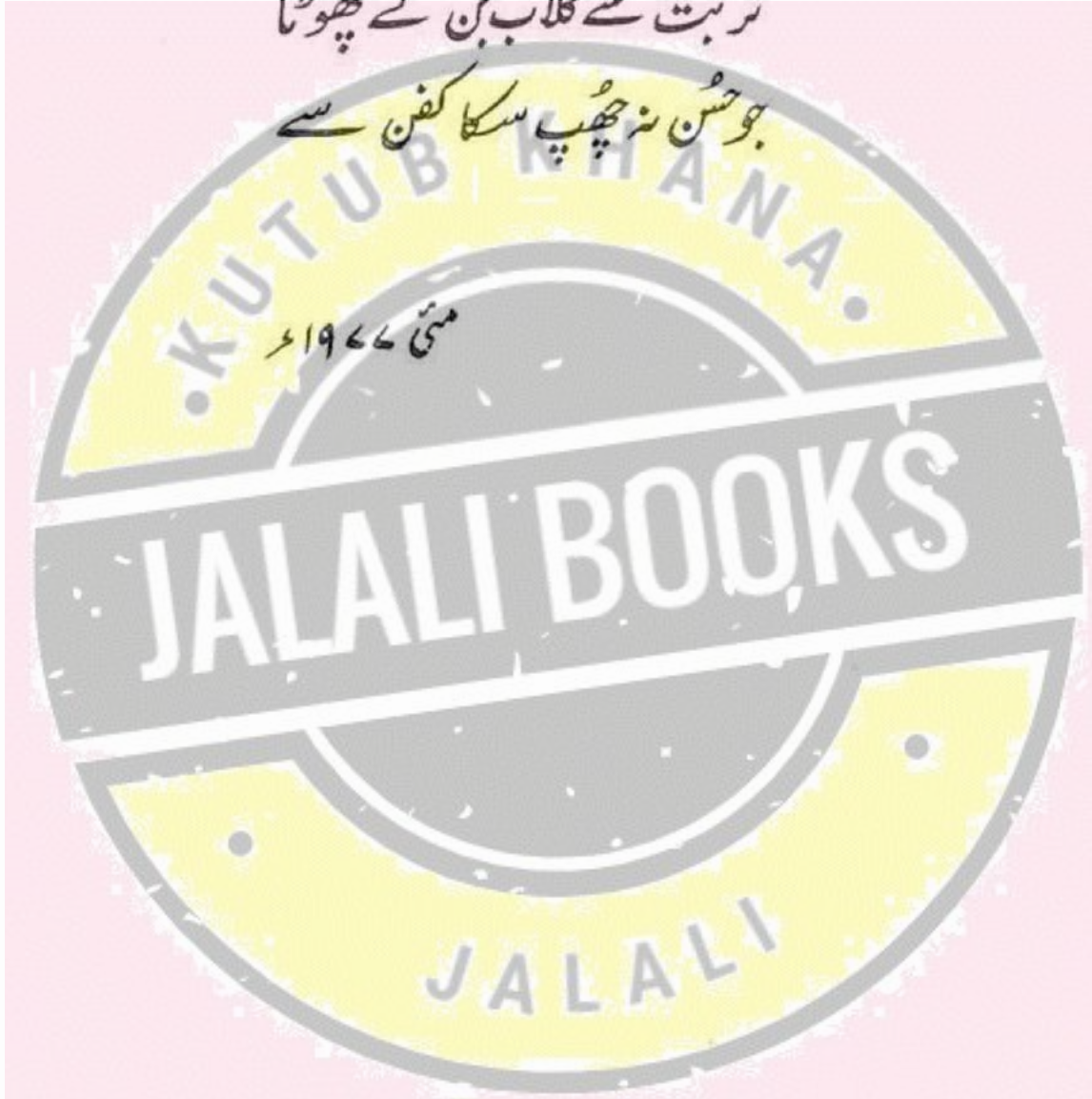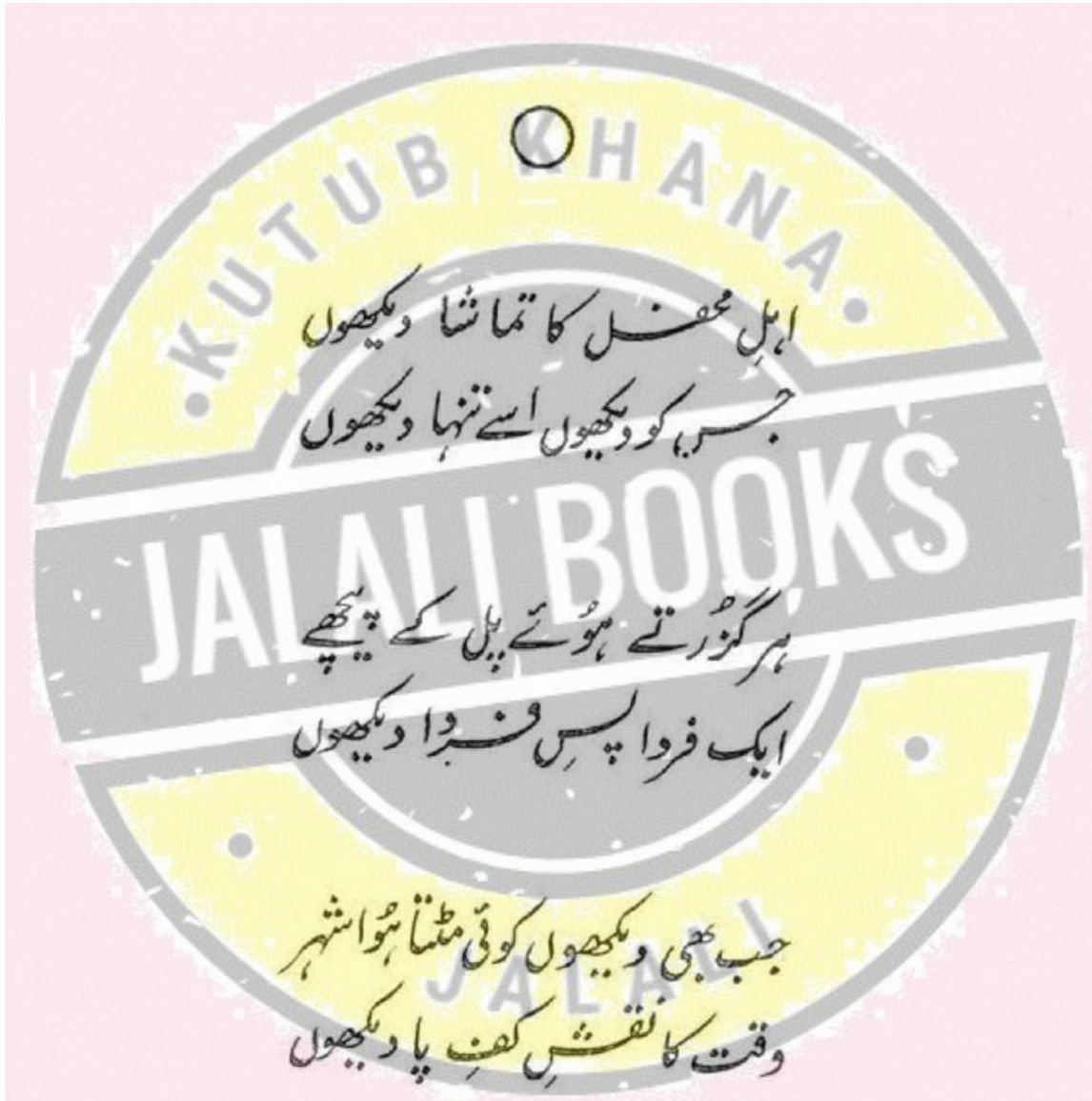
قعرِ دریا میں سفینہ ڈھونڈوں
کفِ دریا سرِ دریا دیکھوں

جب بھی سوچوں کہ حقیقت کیا ہے
رقص میں ایک بگولا دیکھوں

وہ تو انساں کی صدا بھی نہ سُنیں
اور میں پتھّر کو بھی گویا دیکھوں

وہ فقط ہیبتِ صحرا دیکھیں
اور میں لالۂ صحرا دیکھوں

کیا بتاؤں کہ میں کیا کیا دیکھوں
تجھ میں تجسیمِ تمنّا دیکھوں

تیری بیگانہ روی کی سوگند
میں تجھے آج بھی اپنا دیکھوں

جب ترا لمحۂ رخصت یاد آئے
ٹوٹتا ایک ستارا دیکھوں

عمر بھر کے سفرِ ظلمت میں
روشنی کا وہی نقطہ دیکھوں

دُور سے میں تری پلکیں گن لوں
پاس جاؤں تو ہیولیٰ دیکھوں

اب تو اس ابر سے بُوندیں برسیں
کب تک اڑتا ہُوا سایہ دیکھوں

ساری دُنیا کے حسینوں میں ندیمؔ
مَیں تو بس ایک ہی چہرہ دیکھوں

مئی ۱۹۷۷ء

○

جانے کس کی قسمت میں تکمیلیں ہیں
اتنے سائے ہیں، جتنی قندیلیں ہیں

ظلم و ستم کی جتنی بھی تاویلیں ہیں
بودی منطق ہے اور پوچ دلیلیں ہیں

ہم سب اپنا آپ چھپاتے پھرتے ہیں
ہم انسان، فرشتوں کی تمثیلیں ہیں

کتنی سکڑ گئی ہے جد و جہدِ حیات
یا احکام ہیں، یا اُن کی تاویلیں ہیں

حل نہ ہُوا مغرب کا یہ سفّاک تضاد
پاؤں تلے لاشیں، سر پر انجیلیں ہیں

مئی ۱۹۷۷ء
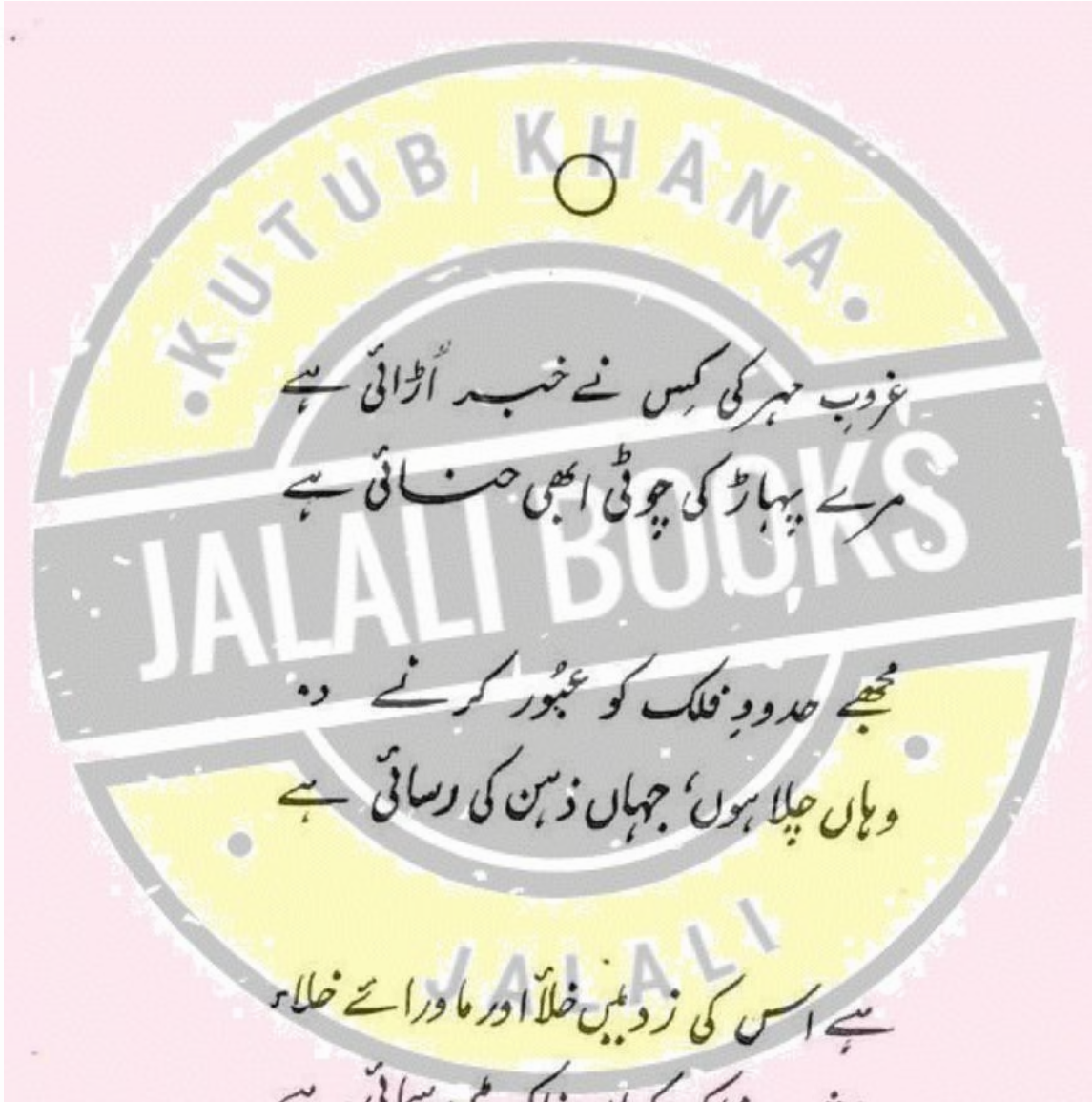
غروبِ مہر کی کس نے خبر اُڑائی ہے
مرے پہاڑ کی چوٹی ابھی حنائی ہے

مجھے حدودِ فلک کو عبور کرنے دو
وہاں چلا ہوں، جہاں ذہن کی رسائی ہے

ہے اس کی زد میں خلا اور ماورائے خلا
یہ مشتِ خاک کہاں خاک میں سمائی ہے

مرے خدا نے کیا تھا مجھے اسیرِ بہشت
مرے گنہ نے رہائی مجھے دلائی ہے

چمک رہے ہیں شبستانِ شاہ کے گنبد
سیاہ وقت نے تقریبِ شب منائی ہے

اُتر سکو تو نشیبِ حیات میں اُترو
فرازِ دار پہ جانا تو خود نمائی ہے

بہت عجیب سی ہے رہروؤں کی گمراہی
عجیب تر مگر اندازِ رہنمائی ہے

امیر دوست کے ٹھنڈے مصافحے سے کھلا
کہ اس کا گھر ہی نہیں، جسم بھی طلائی ہے

ہے شیخِ شہر کو عمامہ و قبا کا جنوں
اگرچہ زہد کی پہچان بے ریائی ہے

پھٹے پھٹے سے ہیں کیوں ہونٹ میرے کھیتوں کے
اگر خدا کے تصرّف میں سب خدائی ہے

اسے قبول نہ کر پائیں گے مرے نقّاد
بہت عجیب مرا طرزِ غزل سرائی ہے

ندیمؔ لالۂ صحرا ثبوت ہے اس کا
کہ آسماں نے زمیں سے شکست کھائی ہے

مئی ۱۹۷۷ء
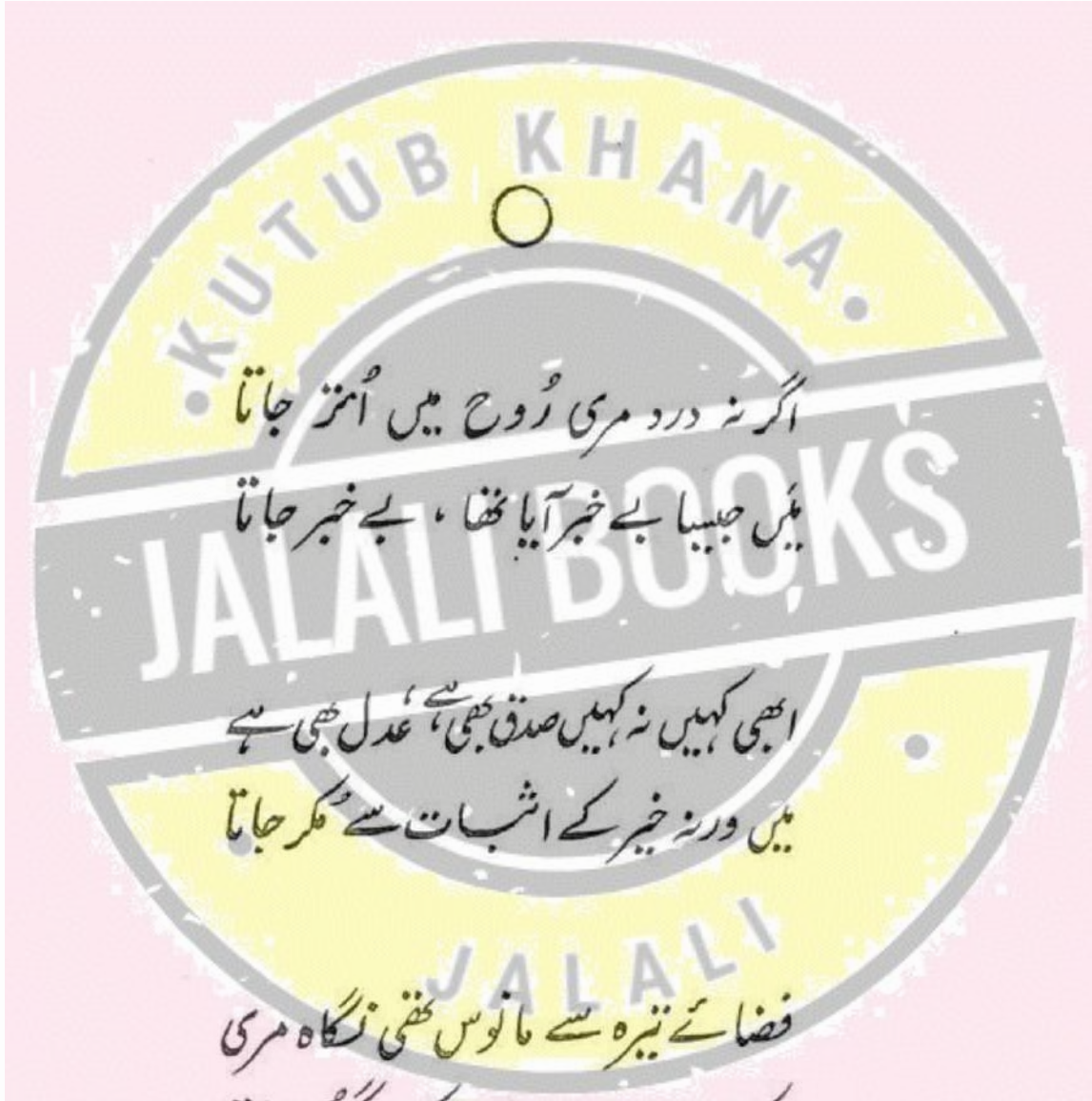
اگر نہ درد مری رُوح میں اُتر جاتا
مَیں جیسا بے خبر آیا تھا ، بے خبر جاتا

ابھی کہیں نہ کہیں صدق بھی ہے ، عدل بھی ہے
میں ورنہ خیر کے اثبات سے مکر جاتا

فضائے تیرہ سے مانوس تھی نگاہ مری
فلک سے ورنہ میں ڈرانہ کیوں گزُر جاتا

کہیں خلاؤں میں آدم کی لاش کھو جاتی
زمیں پہ آ کے اگر زندگی سے ڈر جاتا

ہر ایک ڈوبنے والا یہ سوچتا ہے، کہ میں
بھنور سے بچ کے نکلتا تو پار اُتر جاتا

تمام عمر مرا دشت میرے ساتھ رہا
تمام عمر تمنّا رہی کہ گھر جاتا

مرا کوئی بھی نہیں کائنات بھر میں ندیم
اگر خدا بھی نہ ہوتا تو میں کِدھر جاتا

مئی ۱۹۷۷ء

صحیفے پڑھ رہا ہُوں اُونچی نیچی رہگزاروں میں
کئی صدیوں کی گونجیں دفن ہیں ان کوہساروں میں

جنھیں اب روندتا ہے دیوِ ظلمت ارضِ مغرب کا
کبھی پیغمبروں کی روشنی تھی ان دیاروں میں

انھی کے مطلعِ غیرت سے کل خورشید اُبھرے گا
جو اَب شامل ہیں ارضِ ایشیا کے بے وقاروں میں
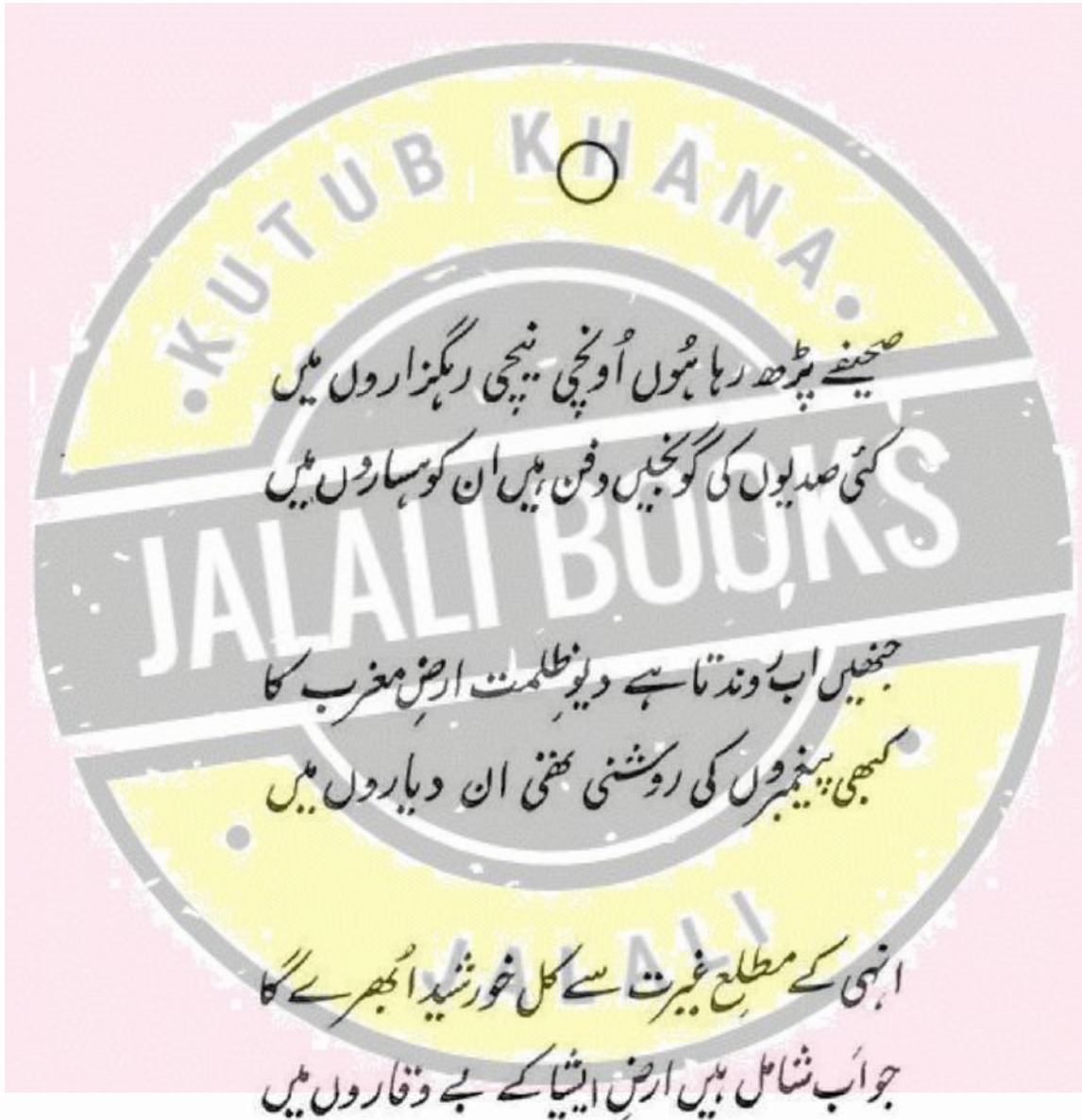
نہ ان کا ہاتھ ہلتا ہے، نہ ان کا پاؤں اُٹھتا ہے
مری بے دست و پائی کے مگر چرچے ہیں یاروں میں

مری نظروں میں یہ آتش فشانوں کے دہانے ہیں
جو مرمر کے محل اُگنے لگے ہیں سبزہ زاروں میں

تمازت اس قدر ہے، دُھوپ چھَن جاتی ہے پتّوں سے
کہیں سایہ نہیں ملتا درختوں کی قطاروں میں

نمازِ صبح کی مہلت میسّر ہو تو کیسے ہو؟
اذانیں سُن کے کھو جاتا ہُوں چڑیوں کی پکاروں میں

میں ان لوگوں کو دعوت دے رہا ہوں سبزِ صحرا کی
جو کھو بیٹھے ہیں اپنی راہ پھولوں کے حصاروں میں

ندیمؔ اب تو سمجھ لو بات قدرت کے علائم کی
ستارے کچھ تو کہتے ہیں اشاروں ہی اشاروں میں

اپریل ۱۹۷۷ء

برہنہ پا، میں سوئے دشتِ درد چلتا ہُوں
میں اپنی آگ میں اپنی رضا سے جلتا ہُوں

مرے مزاج کی چارہ گری کرے گا کون
چمن کی راہ سے صحرا میں جا نکلتا ہُوں

اگر جلا نہ سکا مجھ کو آفتاب کوئی
میں رنگ و بُو کی تمازت میں کیوں پگھلتا ہُوں

مجھے تو پیکرِ محسوس سے محبّت ہے
میں صرف ایک تصوّر سے کب بہلتا ہُوں

سمیٹ لینا ہے باہوں میں میرا عشق مجھے
مَیں جب بھی فکر کی ڈھلوان سے پھسلتا ہُوں

رُتوں کے جبر سے آزاد ہو چکا ہُوں ندیمؔ
خزاں میں پھُولتا ہُوں، آندھیوں میں پھَلتا ہُوں

اپریل ۱۹۷۷ء

○
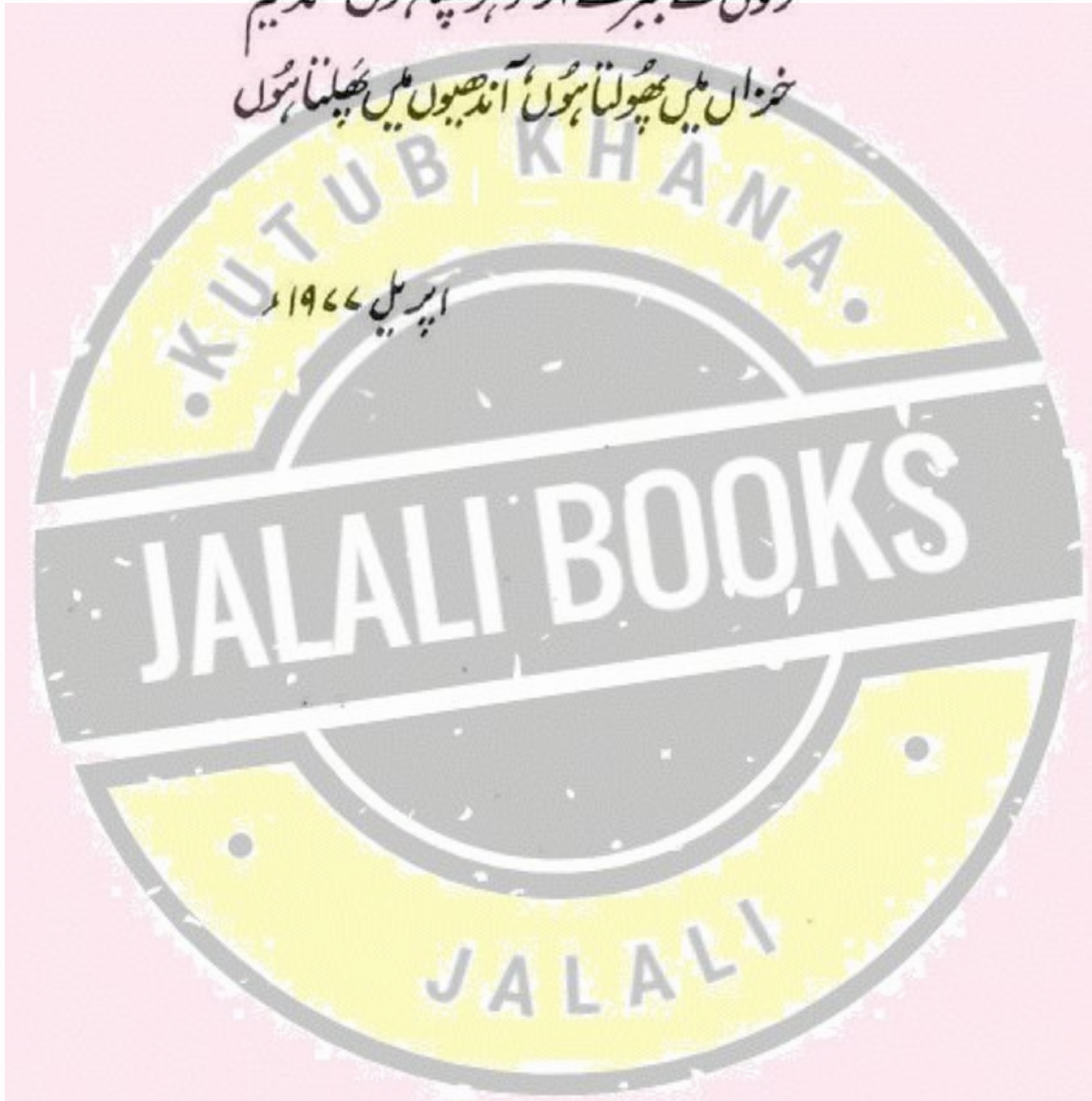
یہ کیا کہ عشق کروں، پاسِ آبرو نہ کروں
مَیں تجھ کو کھو کے، خدا کی بھی جستجو نہ کروں

مَیں انتظارِ طلوعِ سحر میں جیتا ہُوں
مَیں اپنا چاکِ گریباں کبھی رفو نہ کروں

تو صرف جسم نہیں ہے، ورائے جسم بھی ہے
مَیں تجھ کو پا کے بھی کیوں تیری آرزو نہ کروں

غیور ہوں کہ اجارہ پسند ہوں، کیا ہوں!
مَیں تجھ کو اپنے خدا کے بھی روبرو نہ کروں

یہ مشورے تو مرے ترکِ شعر کے ہیں ندیمؔ
کہ جب بھی شعر کہوں، دل لہُو لہُو نہ کروں

اپریل ۱۹۷۷ء

○

(نذرِ اقبال)

محیطِ شام میں جب، بُجھ گئی شفق کی ضَو
تو آفتاب پہ ہنس دی مرے چراغ کی لَو

کسی بھی رات کو مَیں رات یوں نہ مان سکا
کہ میرے دل کے اُفق سے تو پھُوٹتی رہی پَو

جنھیں تلاش نہ ہو آخری حقیقت کی
سمجھ نہ پائیں طلوع و غروب کی تگ و دَو
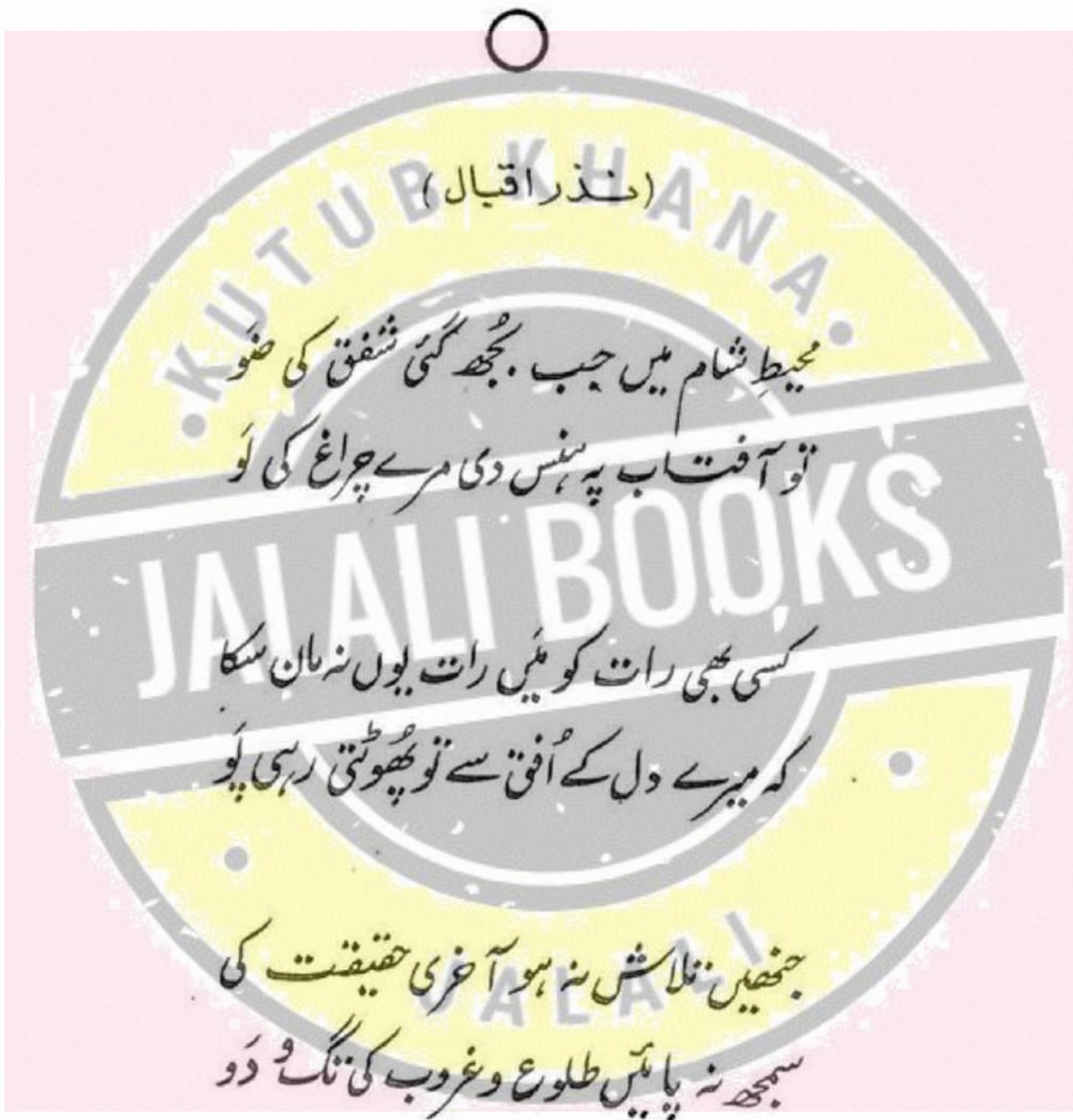
یہ راز مجھ پہ کھُلا اس کی حسن کاری سے
کہ آدمی ہے خُدا کے مزاج کا پرتَو

تمام وقت کی پیمائشوں کے حیلے ہیں
کہ چاند ایک ہے لیکن ہزار ہا مہِ نو

صدف سے تُو نے گُہر تک سفر کیا تو کیا!
گہر کے بطن میں دیکھا نہ تُو نے دانۂ جَو

خدا کے نُور کو چھُو کر یہ سوچتا ہُوں ندیمؔ
کہاں کہاں مجھے لائی مرے خیال کی رَو

اپریل ۱۹۷۷ء

جب اس کے وجود پر نظر کی
تصویر سی کھنچ گئی سحر کی

تم ایک تمازتِ حسیں ہو
سرما میں ہو دھوپ دوپہر کی

چاہے وہ ہزار مختصر ہو
روشن تو ہے زندگی شرر کی
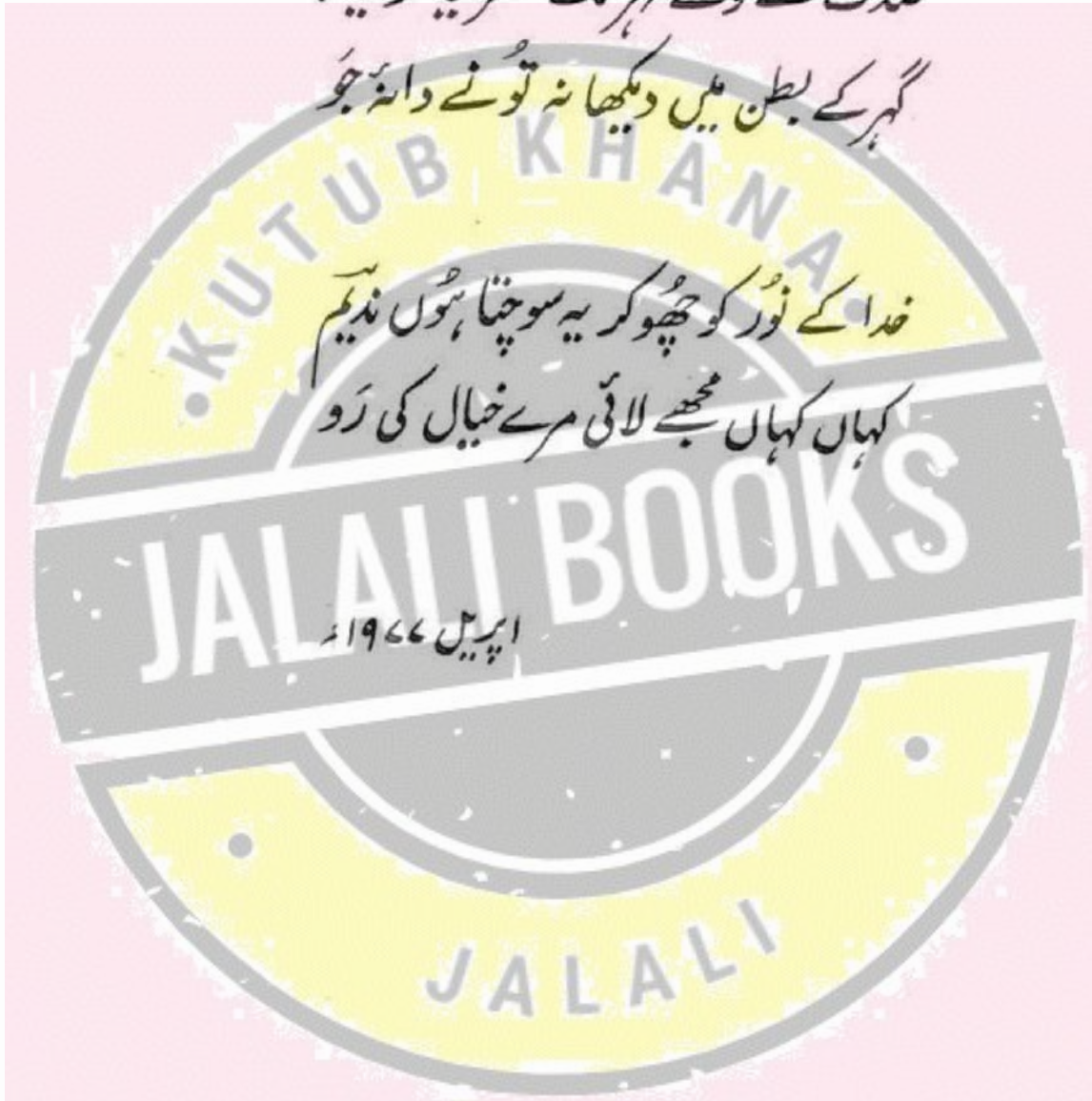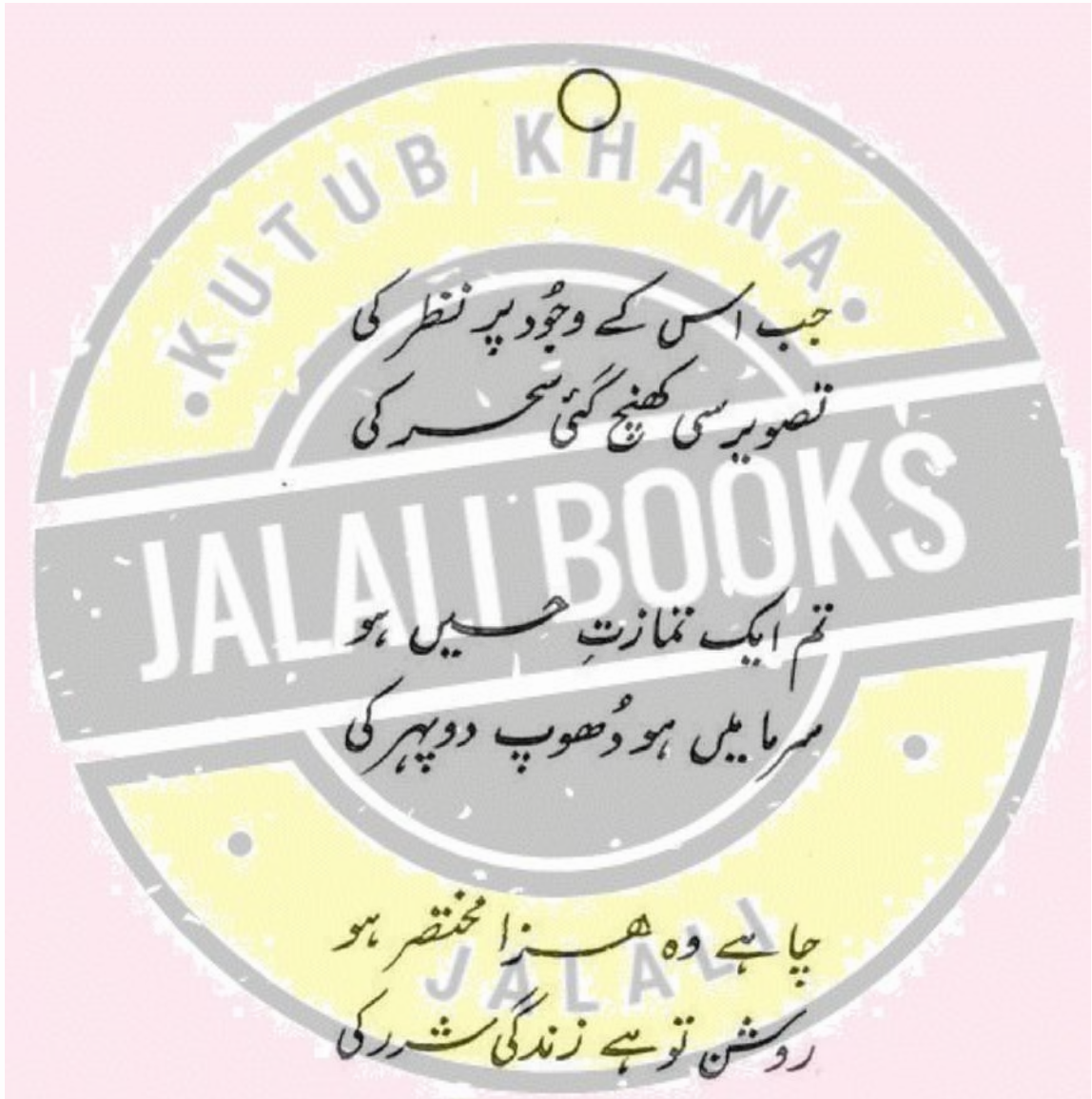
یاروں کی نظر درِ قفس پر
اور مجھ کو تلاش بال و پر کی

بستی کو نگل گیا اندھیرا
جب آگ بجھی ہے میرے گھر کی

سوتے رہے۔ شب کو رونے والے
آواز پلٹ گئی گجر کی

کعبے سے صنم کبھی نہ نکلے
جاری رہی جنگ خیر و شر کی

وقت آئے گا، جب نہیں مرے گا
مرضی نہ ہوئی اگر بشر کی

آئینے اُٹھائے پھر رہے ہو
کچھ فکر کرو ندیمؔ سر کی

مارچ ۱۹۷۷ء

طے کروں گا یہ اندھیرا مَیں اکیلا کیسے
میرے ہمراہ چلے گا مرا سایا کیسے

میری آنکھوں کی چکا چوند بتا سکتی ہے
جس کو دیکھا ہی نہ جائے، اسے دیکھا کیسے

چاندنی اُس سے لپٹ جائے، ہوائیں چھیڑیں
کوئی رہ سکتا ہے دُنیا میں اچھوتا کیسے
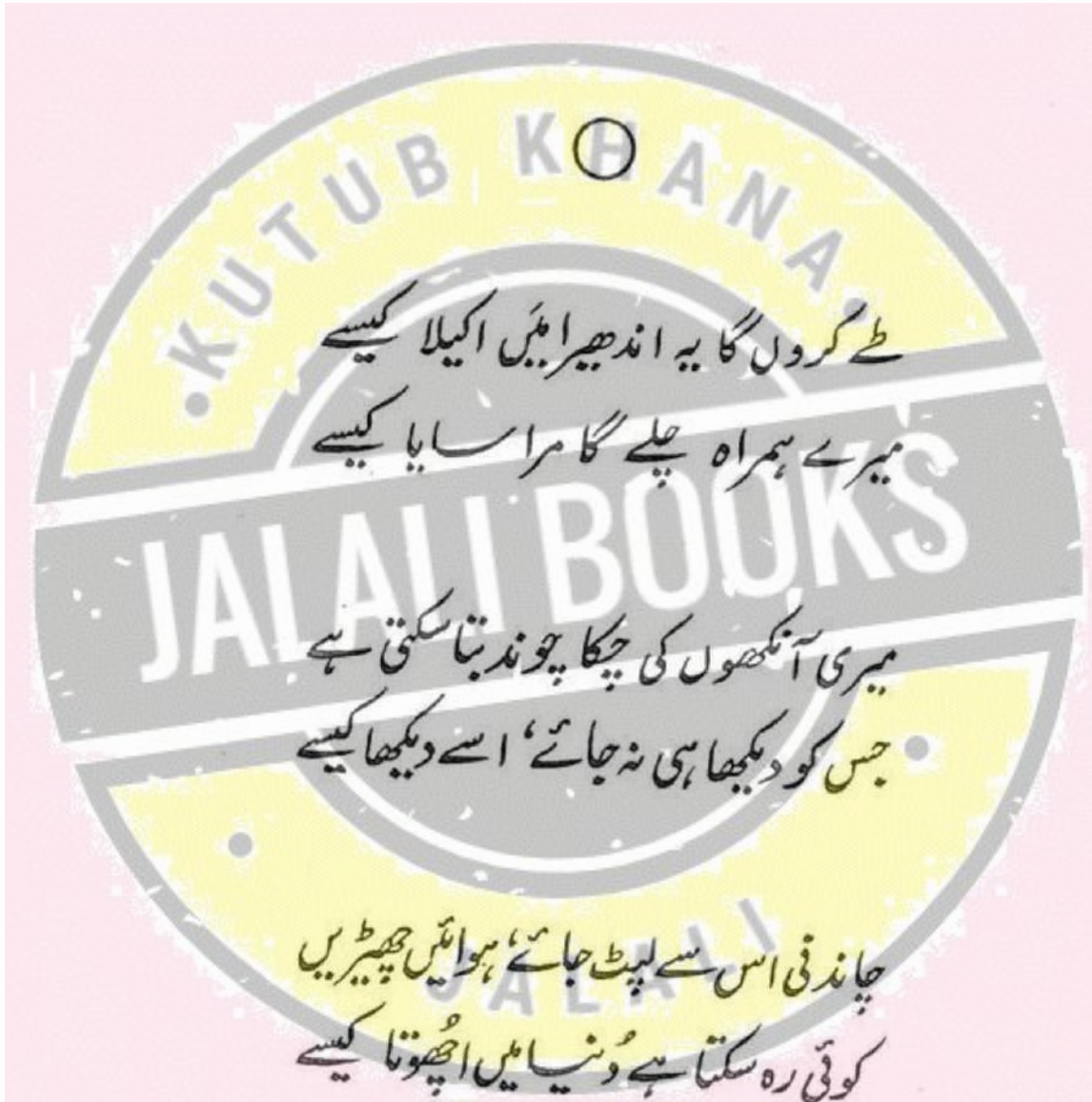
مَیں تو اُس وقت سے ڈرتا ہُوں کہ وہ پُوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

یاد کے قصر ہیں، اُمید کی قندیلیں ہیں
مَیں نے آباد کیے درد کے صحرا کیسے

اس لیے صرف خدا سے ہے تخاطب میرا
میرے جذبات کو سمجھے گا فرشتہ کیسے

ذہن میں نت نئے بُت ڈھال کے یہ دیکھتا ہوں
بُت کدے کو وہ بنا لیتا ہے کعبہ کیسے

اس کی قدرت نے مرا راستہ روکا ہوگا
پُوچھ مجھ سے کہ قیامت ہُوئی برپا کیسے

گر سمندر ہی سے دریاؤں کا رزق آتا ہے
اس کے سینے میں اُتر جاتے ہیں دریا کیسے

ٹوٹتی رات نے سُورج سے یہ سرگوشی کی
مَیں نہ ہوتی تو ترا نُور برستا کیسے

مَیں تو ہر سانس میں آ جاتا ہُوں فردا کے قریب
پھر بھی فردا مجھے دے جاتا ہے دھوکا کیسے

تہ میں ڈُوبے ہُوئے ملّاح سے پوچھے کوئی
موجۂ بحر نے کشتی کو اُچھالا کیسے

لوگ جو خاکِ وطن بیچ کے کھا جاتے ہیں
اپنے ہی قتل کا کرتے ہیں تماشا کیسے

جو مرے دستِ مشقّت کے ہیں محتاج ندیمؔ
چھین لیتے ہیں مرے منہ کا نوالہ کیسے

مارچ ۱۹۷۷ء

گو مجھ سے منسوب تھی انجمن آرائی
اب میں ہوں اور حدِّ نظر کی تنہائی

میں جو کھِلا تو آندھی اس شدّت سے چلی
جیسے توڑ ہی لے گی لالۂ صحرائی

میں نے جنوں کا صرف یہ مطلب سمجھا ہے
سَودائی کو راس نہ آئی دانائی

دُنیا اور خدا کا رشتہ جانے کون
جس کا تماشا ہے، وہ آپ تماشائی

چاند پہ پہنچا لیکن خود سے دُور رہا
ابھی ادھوری ہے انسان کی انگڑائی

سمجھ سکا ہوں زیست کا یہ مفہوم ندیمؔ
گردشِ پیہم میں ہے رازِ توانائی

مارچ ۱۹۷۷ء

نہ وہ سِن ہے فرصتِ عشق کا، نہ وہ دن ہیں کشفِ جمال کے
مگر اب بھی دل کو جواں رکھیں وہی شعبدے خد و خال کے

یہ جو گردِ بادِ حیات ہے، کوئی اس کی زد سے بچا نہیں
مگر آج تک تری یاد کو مَیں رکھوں سنبھال سنبھال کے

مَیں امین و قدر شناس تھا، مجھے سانس سانس کا پاس تھا
یہ جبیں پہ ہیں جو لکھے ہوئے، یہ حساب ہیں مہ و سال کے

وہ کبھی شفق کا فسوں کہیں، کبھی گل کہیں کبھی خوں کہیں
کہ ہیں میری صبحِ عروج میں ابھی رنگ شامِ زوال کے

مری حسرتوں کو ہرا رکھے، مری کشتِ جاں کو بھرا رکھے
یہ یقیں، کہ مجھ پہ کھلیں گے در کسی روز بادِ شمال کے

شبِ تار سے نہ ڈرا مجھے، اے خدا! جمال دکھا مجھے
کہ ترے ثبوت ہیں بیشتر تری شانِ جاہ و جلال کے

کوئی کوہکن ہو کہ قیس ہو، کوئی میر ہو کہ ندیم ہو
سبھی نام ایک ہی شخص کے، سبھی پھول ایک ہی ڈال کے

مارچ ۷۷ ۱۹ء

یہ برزخ، یا قیامت کی گھڑی ہے
جسے دیکھو، اسے اپنی پڑی ہے

اگر مَیں ذہنِ یزداں کو کہوں پھول
تو وہ اُس پھول کی اِک پنکھڑی ہے

وفا کے ہیں عجب معیار میرے
محبّت وقت سے کتنی بڑی ہے

ہے میرے سامنے منظر انوکھا!
خدا ہے اور ساون کی جھڑی ہے

گھڑی پہلی محبت کی عجب تھی
ابھی تک یاد کے در پر کھڑی ہے

عجب گلزار ہے تہذیبِ انساں
کہ اس کے وسط میں سُولی گڑی ہے

مارچ ۱۹۷۷ء
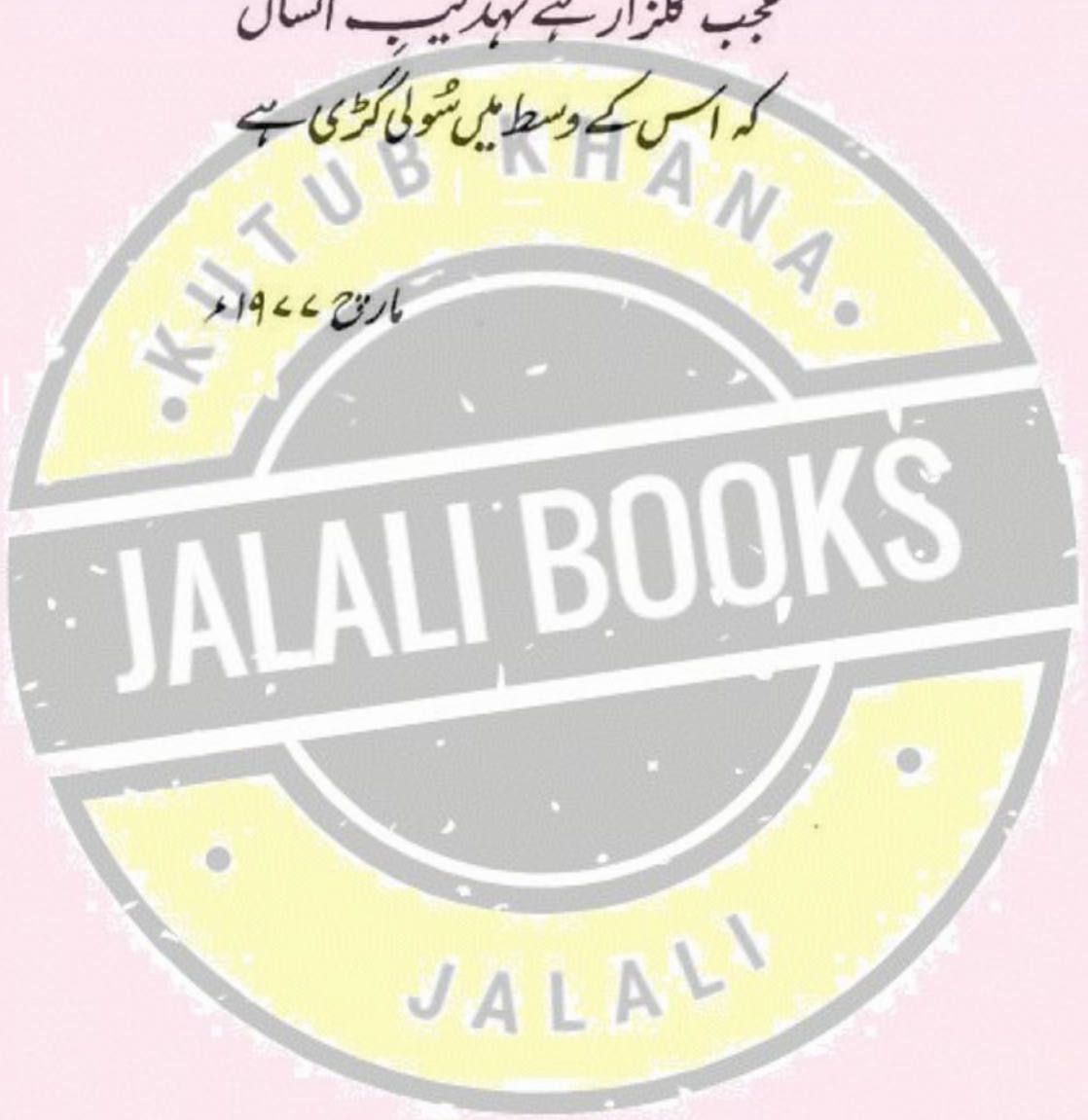
(منذر اقبال)

جانے یہ محبت کیا شے تھی، تڑپا بھی گئی، تھپکا بھی گئی
ایک آدھ افق دھندلا بھی گئی، آفاق نئے چمکا بھی گئی

کیوں کہتے ہو قیس اکیلا تھا جب قریۂ ناپرساں سے گیا
ساتھ اس کے، ردائے لیلیٰ کی خوشبو بھی اور ہوا بھی گئی

جدت سے مجھے انکار نہیں، یاروں سے مگر یہ پوچھنا ہے
یہ کون سا ہے معیارِ وفا، اُمید گئی تو وفا بھی گئی

یہ صدی بظاہر بُری سہی، یہ صدی کچھ ایسی بُری نہ تھی
گو اس نے بجھائے چراغ کئی، قندیلیں نئی جلا بھی گئی

کچھ خال و خد پہچانو تو، یہ لُو کا تھپیڑا وہی نہ ہو
اک موج ہوائے گلشن کی، کہتے ہیں، سوئے صحرا بھی گئی

رحمت پہ ندیمؔ نہ طنز کرو، کھیتوں کو خشک ہی رہنے دو
اب سُوئے فلک کیا دیکھتے ہو، بدلی تو برس برسا بھی گئی

جنوری ۱۹۷۷ء
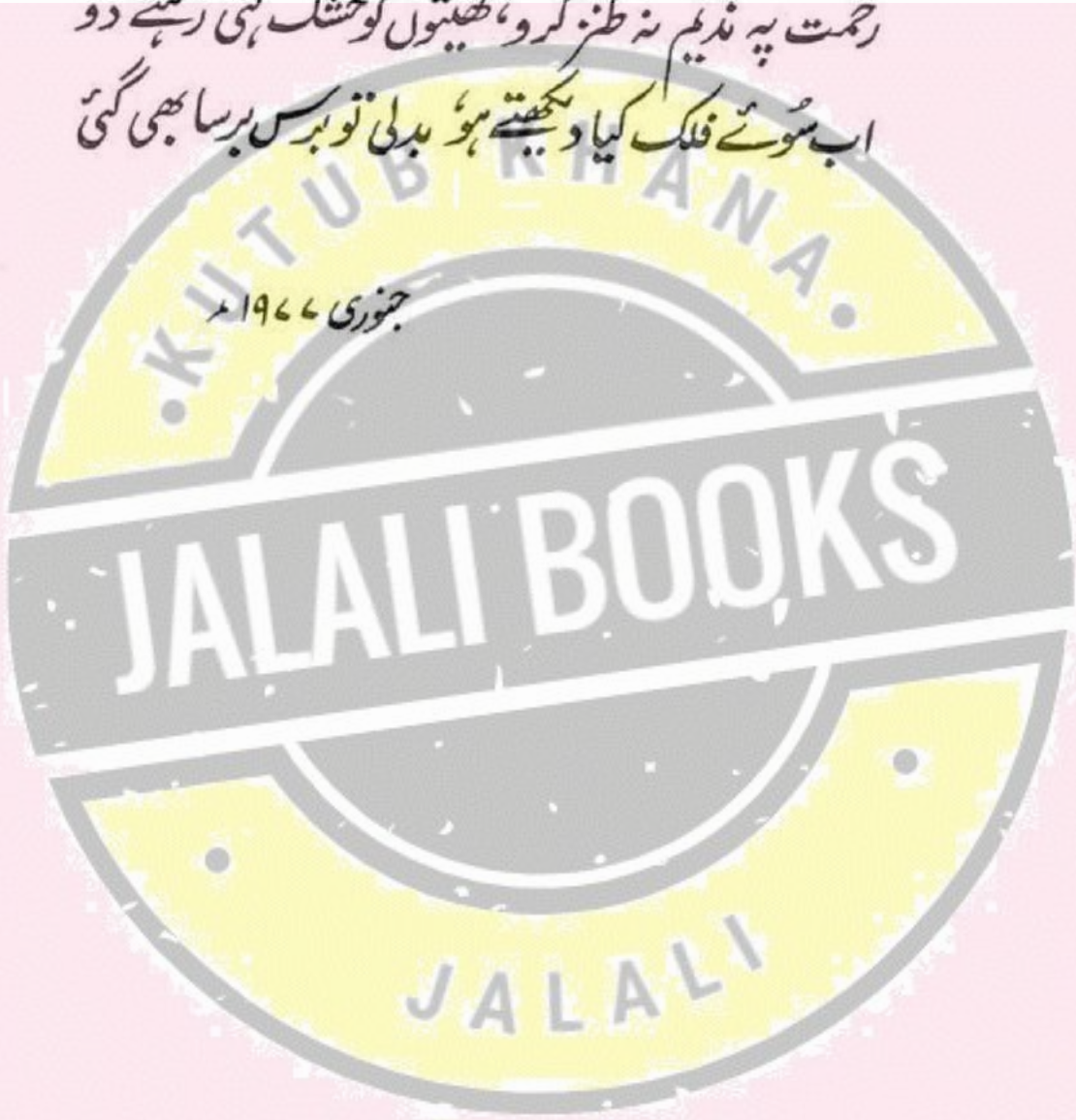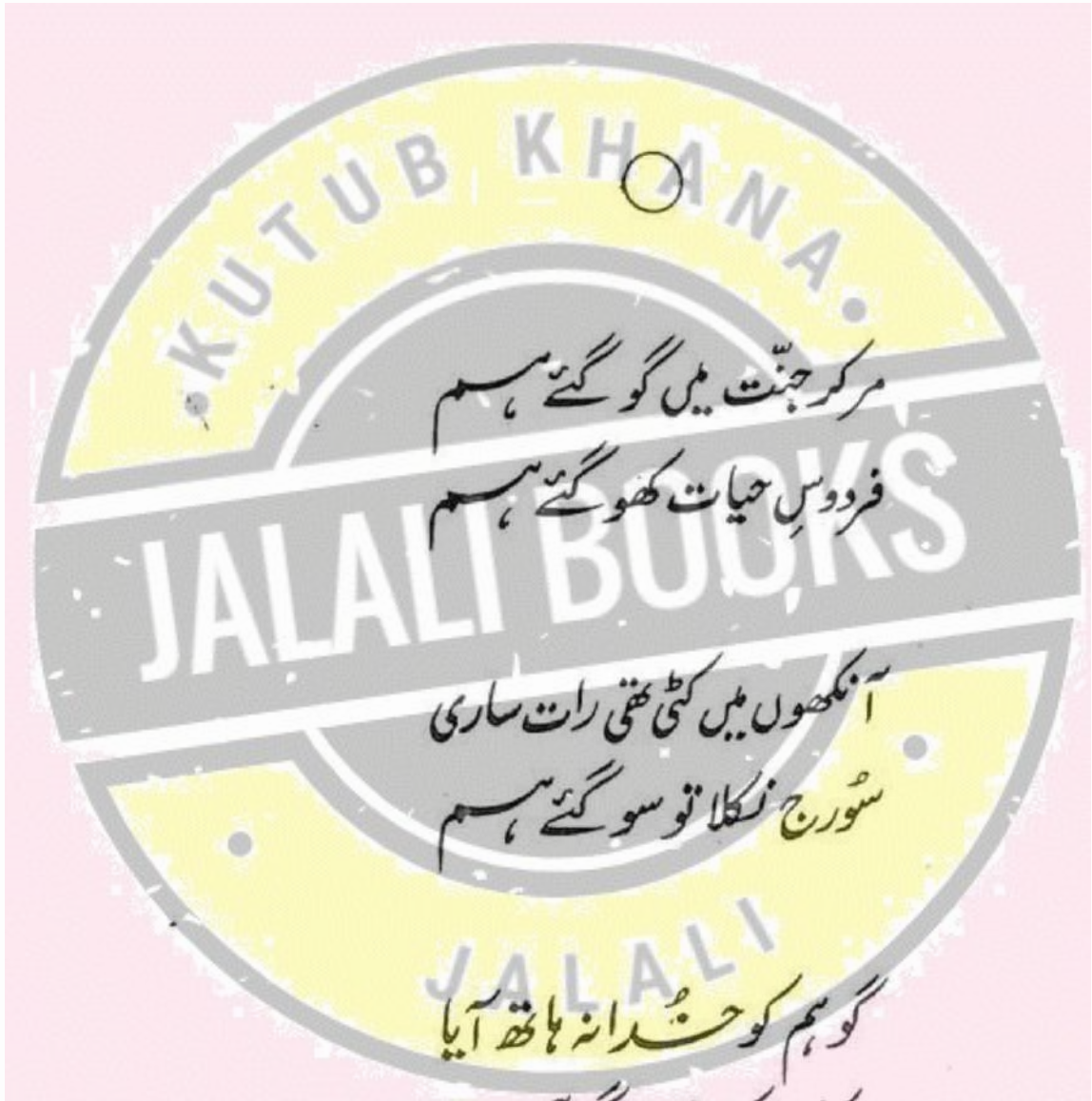
مر کر جنّت میں گو گئے ہم
فردوسِ حیات کھو گئے ہم

آنکھوں میں کٹی تھی رات ساری
سُورج نکلا تو سو گئے ہم

گو ہم کو خُدا نہ ہاتھ آیا
امکان کے بیج بو گئے ہم

تھا ابرِ کرم پہ طنز مقصُود
رو کر صحرا بھگو گئے ہم

اپنی پہچان کے سفر پر
نِکلے تو کِسی کے ہو گئے ہم

یوں ہم نے لیا فنا کا بدلہ
غزلوں میں بقا سمو گئے ہم

جنوری ۱۹۷۷ء
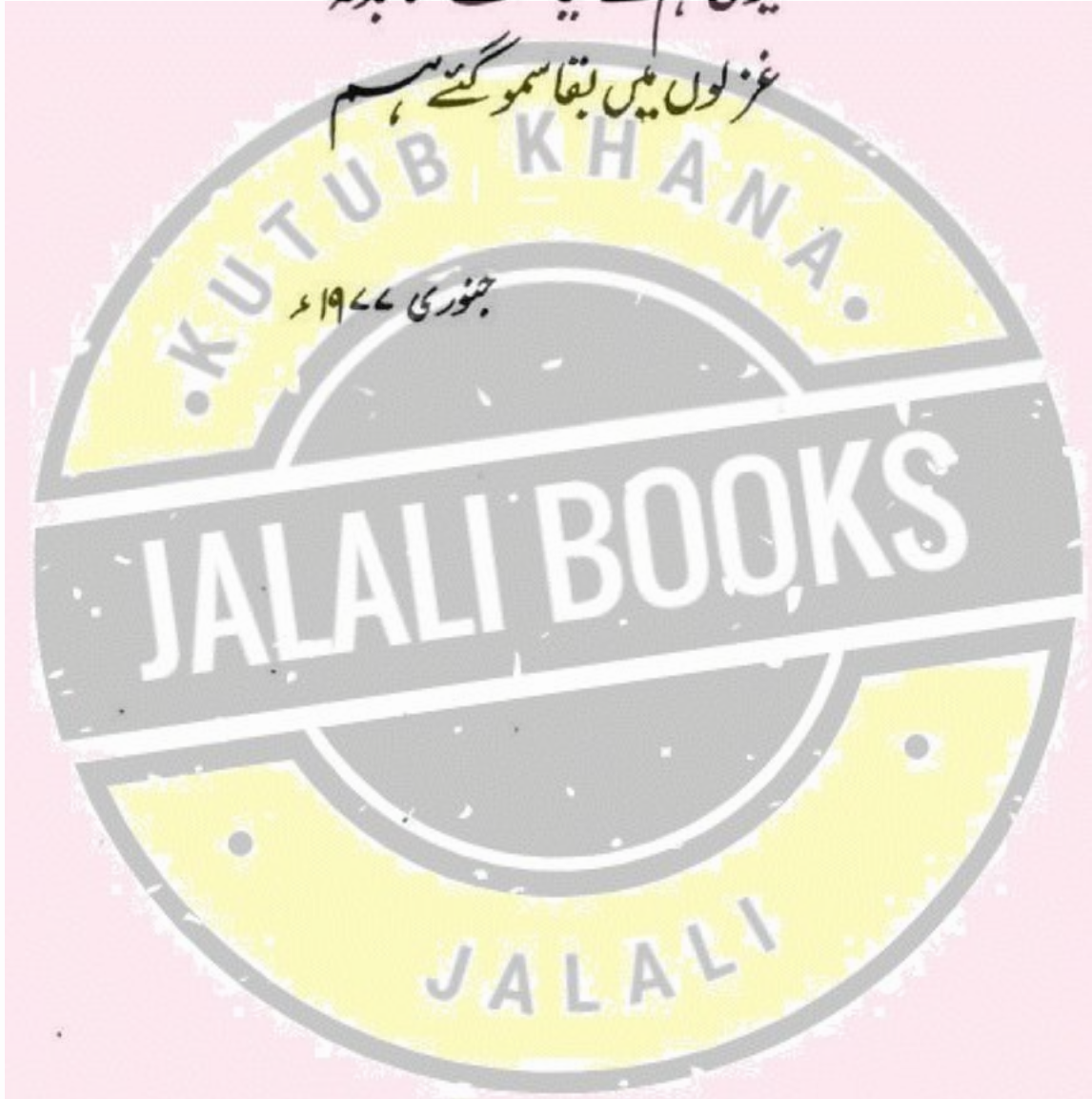
جو لوگ دشمنِ جاں تھے ، وہی سہارے تھے
منافعے تھے محبّت میں ، نہ خسارے تھے

یہ عشق تھا ، کہ فقط عشق جس کا مسئلہ تھا
اِس امتحان میں سجدے ، نہ استخارے تھے

جو لوگ ترکِ طلب پر بضد تھے ، ان کے لیے
جہاں رُکے تھے سفینے ، وہیں کنارے تھے

خود اپنا آپ گنوا کر جنھیں خدا نہ مِلا
وہ تیرگی کے نہیں ، روشنی کے مارے تھے

حضورِ شاہ بس اتنا ہی عرض کرنا ہے
جو اختیار تمھارے تھے، حق ہمارے تھے

یہ اور بات، بہاریں گریز پا نکلیں
گلوں کے ہم نے تو صدقے بہت اُتارے تھے

خدا کرے کہ تری عُمر میں گنے جائیں
وہ دن جو ہم نے ترے ہجر میں گزارے تھے

اب اِذن ہو تو تری زلف میں پرو دیں پھول
کہ آسماں کے ستارے تو استعارے تھے

قریب آئے تو ہر گُل تھا خانۂ زنبور
ندیم دُور کے منظر تو پیارے پیارے تھے

دسمبر ۱۹۷۶ء

بِکھر تو جاؤں گا لیکن اُجڑ نہ جاؤں گا مَیں
حیات کھو کے، بھری کائنات پاؤں گا مَیں

جو گھر کھنڈر ہی کھنڈر ہیں، انھیں بساؤں گا مَیں
جہاں دِیے نہیں جلتے، دِیے جلاؤں گا مَیں

بگڑ چُکی ہیں بہت عادتیں عناصر کی!
گھٹائیں بن کے سرِ ریگزار چھاؤں گا مَیں

تُو میرے دل میں اُترنے کا حوصلہ تو دکھا
یہاں سے عرش کا منظر تجھے دکھاؤں گا مَیں

گزر ہُوا جو کبھی جلوہ زارِ سینا سے
تو طُور پر کِس انسان کو بُلاؤں گا مَیں

چلن خدا کا، مجھ انساں سے نبھ نہ پائے گا
اسے مٹاؤں گا کیسے، جسے بناؤں گا مَیں

نومبر ۱۹۷۶ء

○
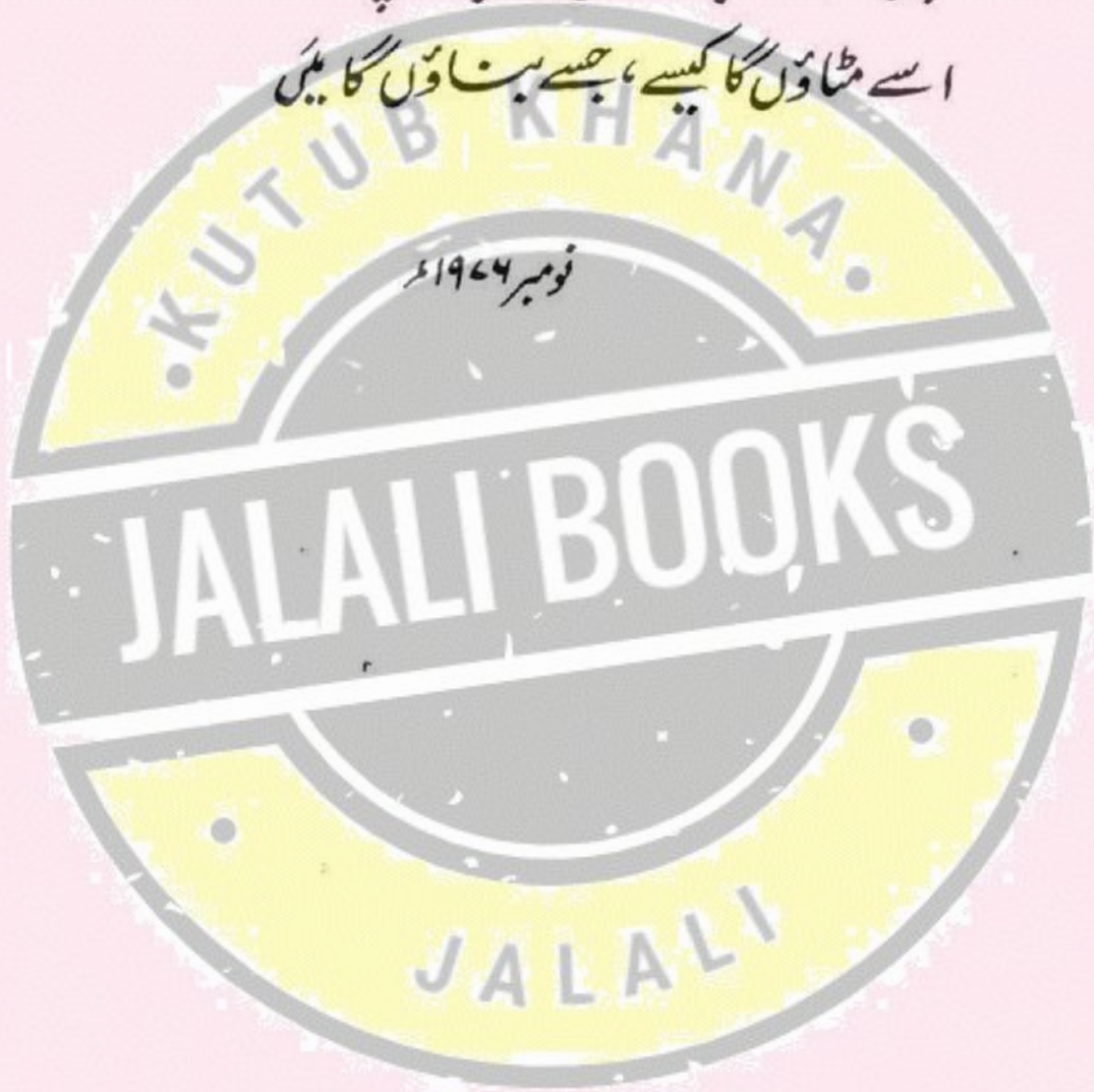
سر سے در دُور نہیں، سنگ سے سر دور نہیں
صاف ظاہر ہے کہ پایانِ سفر دور نہیں

دل میں اُتری چلی جاتی ہے ستارے کی اَنی
ہو نہ ہو، اب شبِ وعدہ کی سحر دور نہیں

کتنا خوش ہوں در و دیوار کی ویرانی سے
اس کا مطلب ہے، یہاں سے مرا گھر دور نہیں

عجز اچھا، مگر اس کی کوئی حد ہوتی ہے
تم دعا رُوٹھ کے مانگو تو اثر دور نہیں

نوعِ انساں کی محبت میں سہولت ہے ندیمؔ
دُور رہتا ہے خدا، اور بشر دور نہیں

اگست ۱۹۷۶ء
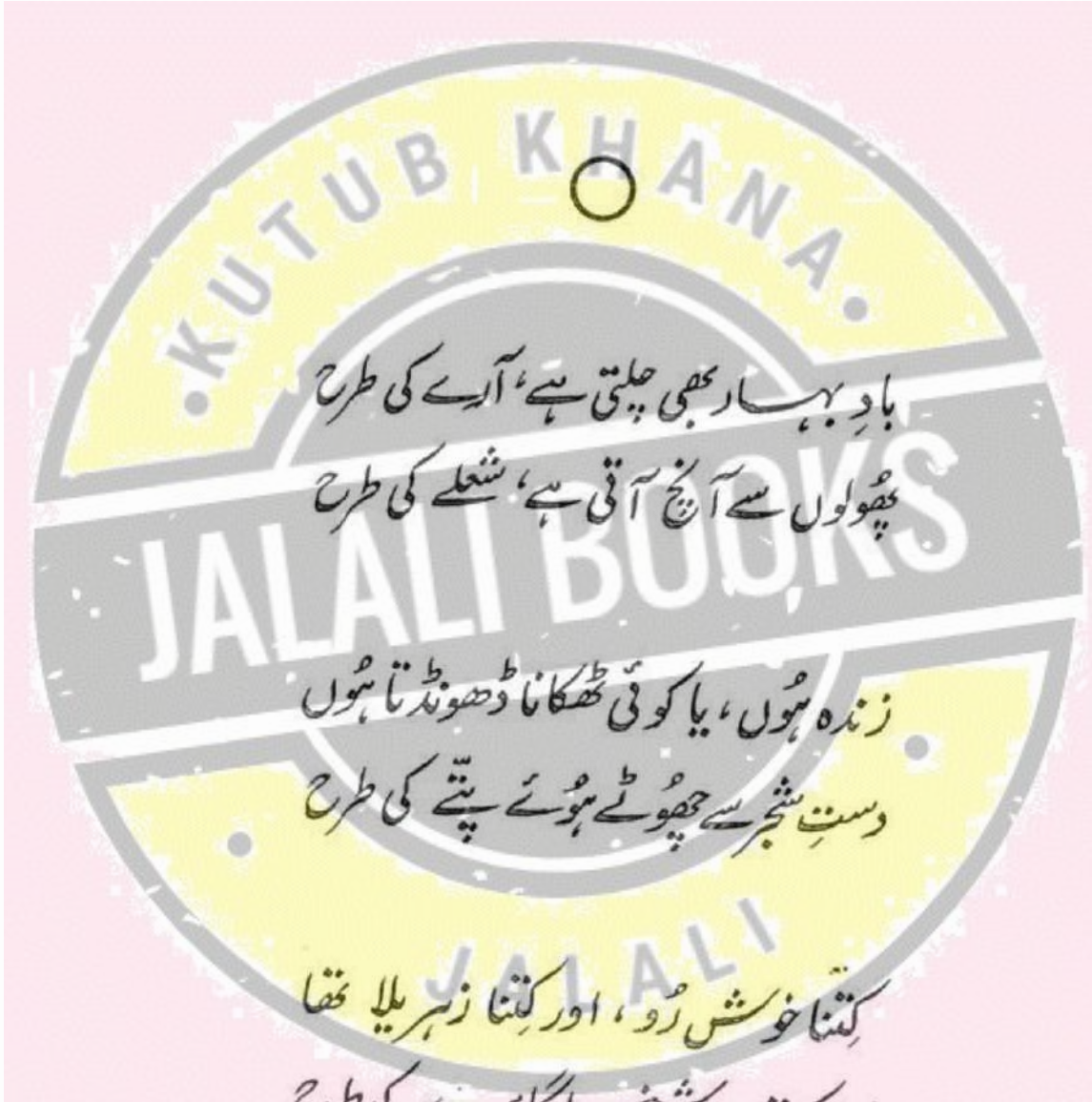
بادِ بہار بھی چلتی ہے، آرے کی طرح
پھولوں سے آنچ آتی ہے، شعلے کی طرح

زندہ ہوں، یا کوئی ٹھکانا ڈھونڈتا ہوں
دستِ شجر سے چھوٹے ہوئے پتّے کی طرح

کتنا خوش رُو، اور کتنا زہریلا تھا
مجھ کو تو وہ شخص لگا ہیرے کی طرح

اس کی یاد سکوں بھی اور بے چینی بھی
ماں کی گود میں روتے ہوئے بچّے کی طرح

جانے کرۂ ارض پہ، یا مریخ پہ ہُوں
چاند لگے چنگاری کے نقطے کی طرح

نئے نئے اوہام، قدیم ایمانوں پر
پھیل رہے ہیں، مکڑی کے جالے کی طرح

اِک اِک رہبر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے
پنجوں کے بَل کھڑے ہُوئے بچّے کی طرح

یہ شاید سچ کہنے کا ہنگام نہ تھا
اب گھبرایا بیٹھا ہُوں، جھوٹے کی طرح

باطل سے ٹکرا کر جب حق پلٹا ہے
سینے پر سے گزرا ہے، پہیّے کی طرح

شاید اس پر صبح کا پرتو پڑتا ہو
رات کا ماتھا روشن ہے، تارے کی طرح

گردش کے آئینے میں بیٹھا ہے خدا
حدِّ نظر تنگ تنے، ہُوئے حلقے کی طرح

میری خاک، بصیرت کی اکسیر بنی
مجھ کو وقت نے پیسا تھا، سُرمے کی طرح

میرے فن کا کام حیات افروزی ہے
صحراؤں کی وسعت میں، لالے کی طرح

اگست ۱۹۷۶ء

اہلِ ثروت پہ خدا نے مجھے سبقت دے دی
اس کی رحمت نے قلم کی مجھے دولت دے دی

خیمہ زن حُسن کو دیکھا افقِ فردا پر
مَیں نے فن میں اسی اِک خواب کو وسعت دے دی

وہ کبھی مہر، کبھی ماہ، کبھی دن، کبھی رات
اتنی کثرت کو مرے ذوق نے وحدت دے دی

اپنے اللہ سے شکوے کا محل ہو تو کروں!
غم دِئے، ساتھ ہی غم سہنے کی راحت دے دی

اس کا احساں، کہ جو نفرت کا ہدف ہیں کب سے
مجھ کو اُن خاک نشینوں کی محبّت دے دی

مجُھ سے کافر پہ فرشتے کا اُترنا ہی غضب
پھر ستم یہ، اسے انسان کی سیرت دے دی

آئینہ دیکھتے ہی، مَیں نے پلٹ کر دیکھا
عشق نے جیسے مجُھے بھی تری صُورت دے دی

اگست ۱۹۷۶ء

وہ جو اک عمر سے مصروفِ عبادات میں تھے
آنکھ کھولی تو ابھی عرصۂ ظلمات میں تھے

صرف آفات نہ تھیں ذاتِ الٰہی کا ثبوت
پھُول بھی دشت میں تھے، حشر بھی جذبات میں تھے

نہ یہ تقدیر کا لکھا تھا، نہ منشائے خُدا
حادثے مجھ پہ جو گزرے، مرے حالات میں تھے

مَیں نے کی حدِّ نظر پار، تو یہ راز کھُلا!
آسماں تھے تو فقط میرے خیالات میں تھے

میرے دل پر تو گریں آبلے بن کر بُوندیں
کون سی یاد کے صحرا تھے جو برسات میں تھے

اس سبب سے بھی تو مَیں قابلِ نفرت ٹھہرا
جتنے جوہر تھے محبّت کے، مری ذات میں تھے

صرف شیطاں ہی نہ تھا منکرِ تکریمِ ندیمؔ
عرش پر جتنے فرشتے تھے، مری گھات میں تھے

جولائی ۱۹۷۶ء
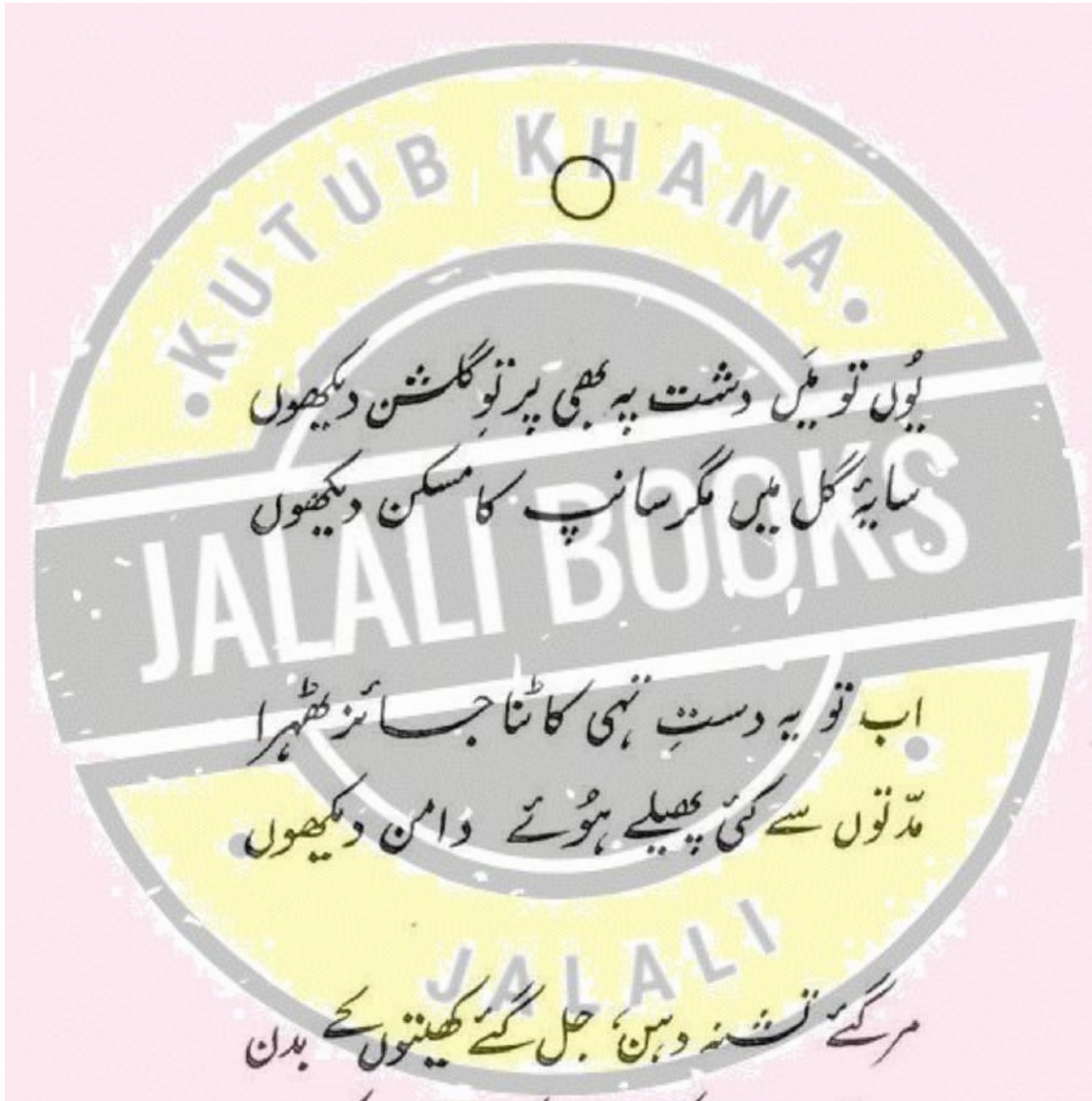
یُوں تو مَیں دشت پہ بھی پرتوِ گلشن دیکھوں
سایۂ گل میں مگر سانپ کا مسکن دیکھوں

اب تو یہ دستِ تہی کاٹنا جائز ٹھہرا
مدّتوں سے کئی پھیلے ہُوئے دامن دیکھوں

مر گئے تشنہ دہن، جل گئے کھیتوں کے بدن
اب تو برسات کے امکان کو روشن دیکھوں

اتنا چسکا مجھے افشائے حقیقت کا پڑا
آسمانوں میں بھی روزن، پسِ روزن دیکھوں

مجھ پہ ہے شیخ کی تکریم تو لازم لیکن
اسے نزدیک سے دیکھوں تو برہمن دیکھوں

کبھی کہسار میں کرتا تھا میں معدن کی تلاش
اب زمینوں میں بھی، سینوں میں بھی آہن دیکھوں

جون ۱۹۷۶ء
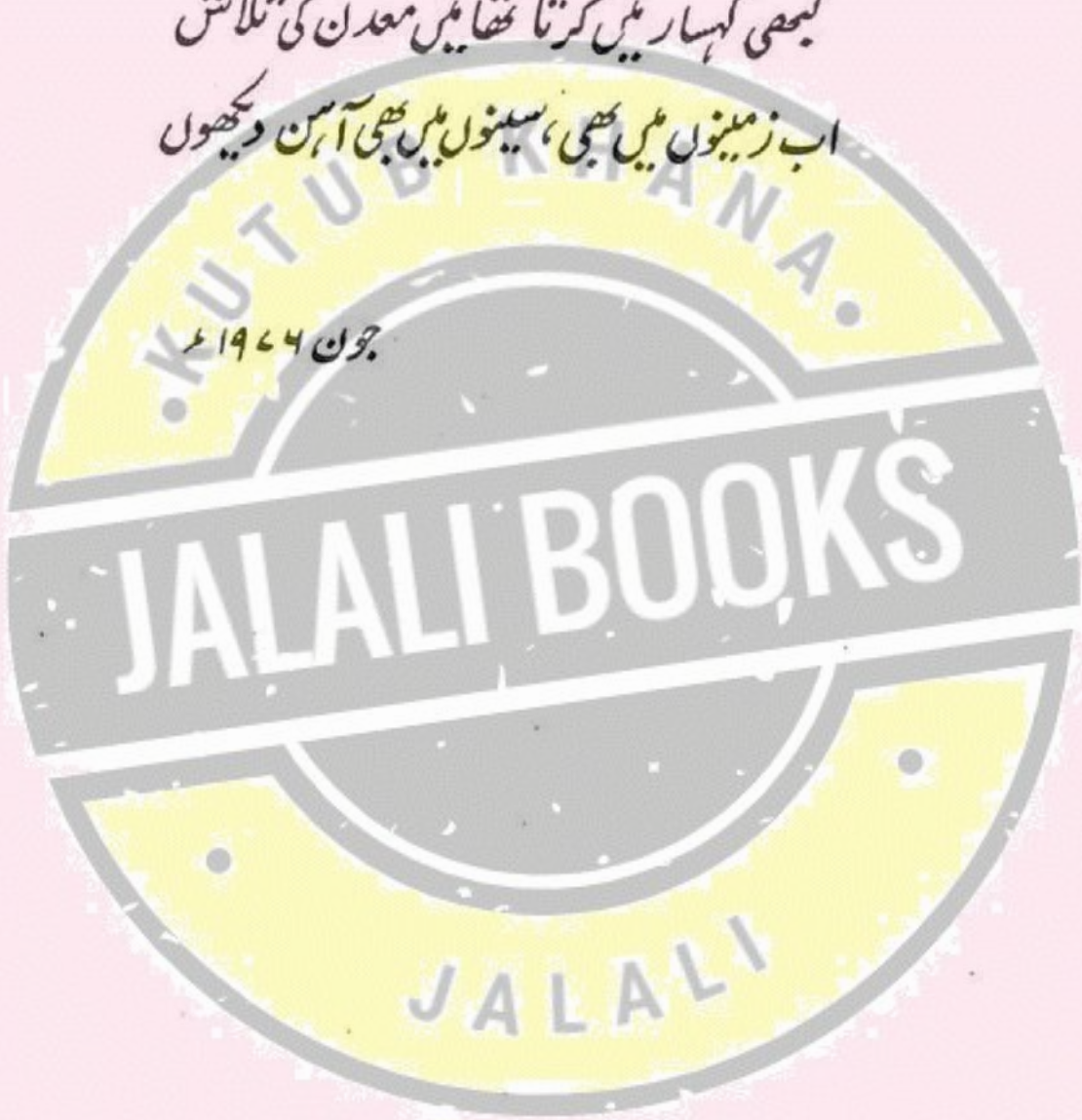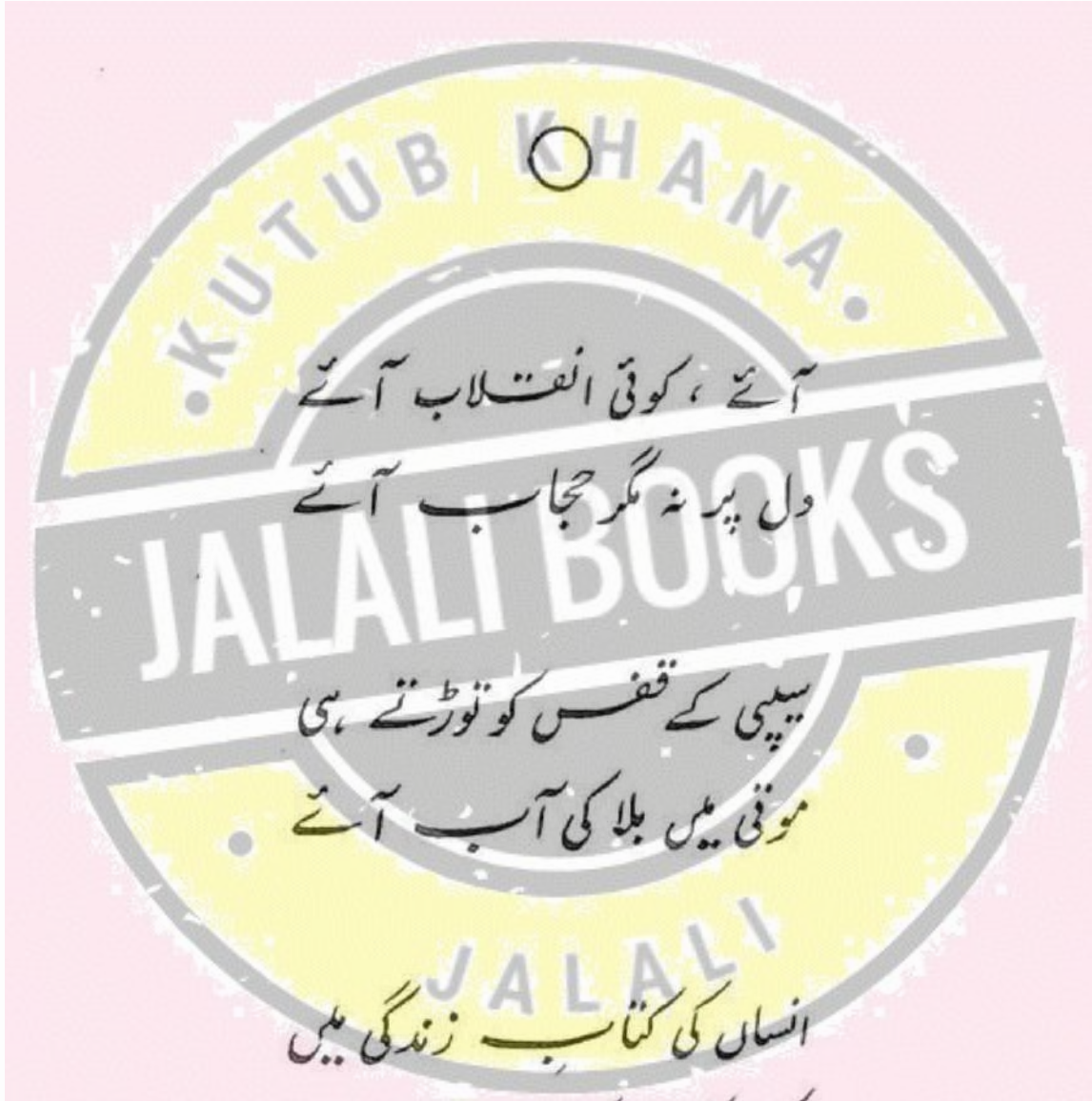
آئے، کوئی انقلاب آئے
دل پر نہ مگر حجاب آئے

سیپی کے قفس کو توڑتے ہی
موتی میں بلا کی آب آئے

انساں کی کتابِ زندگی میں
کیوں کرب کے اِتنے باب آئے

جب میرا سوال ہے زمیں سے
افلاک سے کیوں جواب آئے

ذرّات کا ذکر ہو رہا ہے
کیوں بیچ میں آفتاب آئے

قرنوں پہ محیط علم تیرا
لمحوں کا مجھے حساب آئے

سیلاب خود آگہی جب اُمڈا
کہسار بھی زیرِ آب آئے

زنداں سے تو میں نمٹ چکا ہُوں
اب اور کوئی عذاب آئے

ہر روز نیا جنم لیا ہے
مجھ پر تو کئی شباب آئے

جو شاخ تنے کی نفی کر دے
اس شاخ پہ کیا گلاب آئے

مئی ۱۹۷۶ء

اب ترے رُخ پر محبّت کی شفق پھُولی، تو کیا
حُسن برحق ہے، مگر جب بُجھ چکا ہو جی، تو کیا

جب ترا کہنا ہے، تو تقدیر کا محکوم ہے
تُو نے نفرت کی تو کیا، تُو نے محبّت کی تو کیا

اب کہاں سے لاؤں وہ آنکھیں جو لذّت یاب ہوں
دستِ باراں نے مرے در پہ جو دستک دی، تو کیا

ہجر کی شب، اس تصوّر سے کسے تسکین ہو
سامنے رہتی ہے تیری شکل پیاری سی، تو کیا

جذب ہو جائیں گے خاکِ بے حسی میں سات رنگ
آنسوؤں کے ساتھ ٹپکا ہے اگر خوں بھی، تو کیا

دُھوپ، کرنوں میں پرو لے جائے گی ساری نمی
رات بھر پھُولوں نے دستِ شب سے شبنم پی، تو کیا

اب تو سیلابوں سے جل تھل ہو گئیں آبادیاں
اب مرے کھیتوں کی لاشوں پر گھٹا برسی، تو کیا

چور جس گھر میں پلیں، اس گھر کو کیسے بخش دیں
لُوٹنے آئے ہیں ہم لوگوں کو اپنے ہی، تو کیا

ہم نہیں ہوں گے تو پھر کس کام کی تحسینِ شعر
روشنی اِک روز ان لفظوں سے پھُوٹے گی، تو کیا

دُور کی آہٹ تو آ پہنچی ہے اب سر پر ندیمؔ
آگہی نے مدّتوں کے بعد کروٹ لی، تو کیا

فروری ۱۹۷۶ء
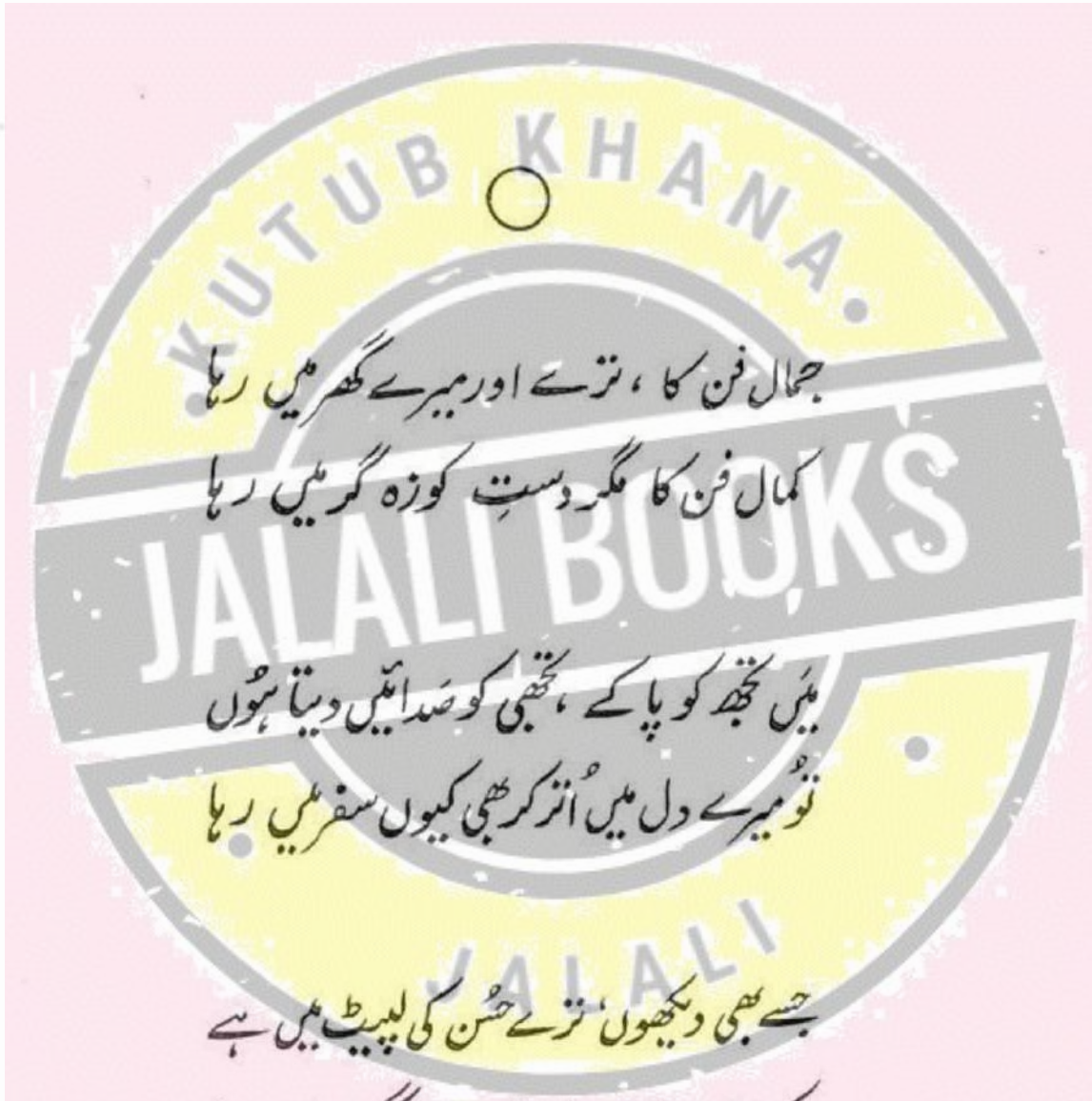
جمالِ فن کا، ترے اور میرے گھر میں رہا
کمالِ فن کا مگر دستِ کوزہ گر میں رہا

مَیں تجھ کو پا کے، تجھی کو صدائیں دیتا ہُوں
تُو میرے دل میں اُتر کر بھی کیوں سفر میں رہا

جسے بھی دیکھوں، ترے حُسن کی لپیٹ میں ہے
کہ جیسے سارا جہاں تیری رہ گزر میں رہا

ترے وصال — تری بارشِ جمال میں بھی
تری جُدائی کا منظر مری نظر میں رہا

رہے نہ دل میں اُڑانوں کے حوصلے باقی
یہ اور بات کہ رعشہ سا بال و پر میں رہا

یہ انکشاف اگر کفر ہے، تو کیا کیجے
فرشتے عرش پہ، لیکن خُدا بشر میں رہا

فروری ۱۹۷۶ء
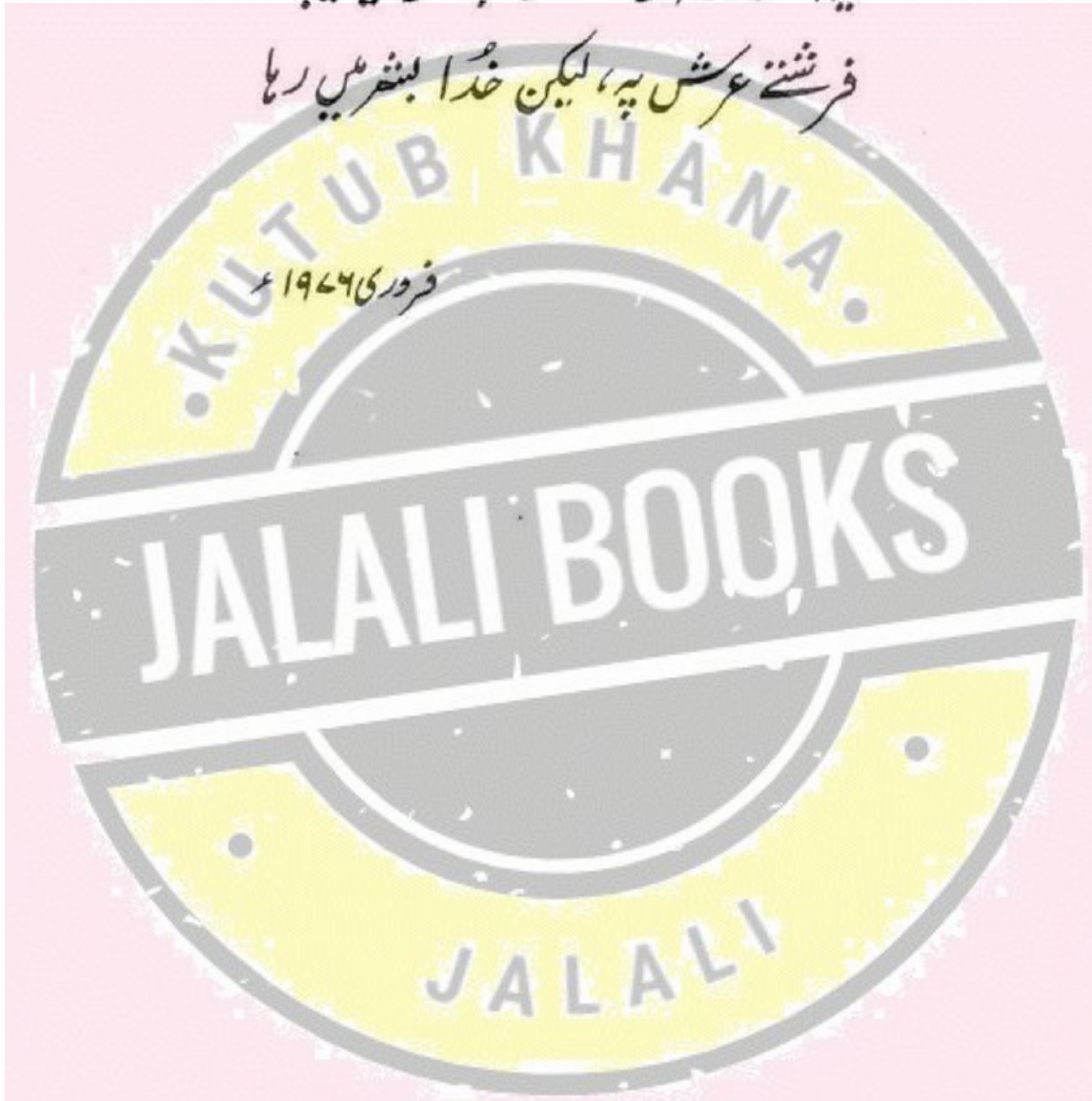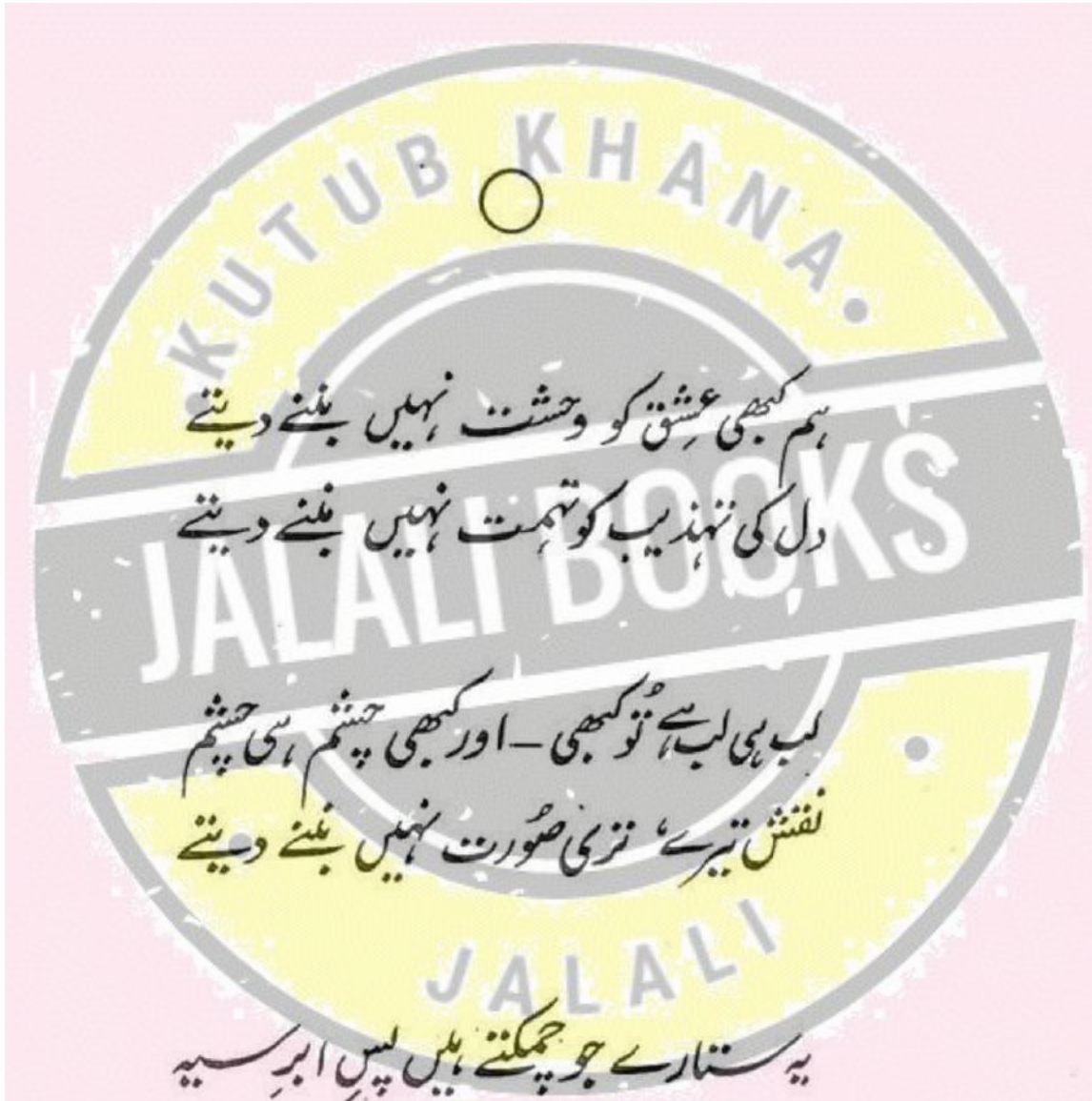
ہم کبھی عشق کو وحشت نہیں بننے دیتے
دل کی تہذیب کو تہمت نہیں بننے دیتے

لب ہی لب ہے تو کبھی - اور کبھی چشم ہی چشم
نقش تیرے، تری صورت نہیں بننے دیتے

یہ ستارے جو چمکتے ہیں پسِ ابرِ سیہ
تیرے غم کو مری عادت نہیں بننے دیتے

تُو کبھی رات، کبھی دن، کبھی ظلمت، کبھی نور
تیرے جلوے، تجھے وحدت نہیں بننے دیتے

اُن کی جنّت بھی کوئی دشتِ بلا ہی ہو گی
زندہ رہنے کو جو لذّت نہیں بننے دیتے

ہاں مسرّت تو ہے برحق، مگر افکارِ حیات
کوئی پیرایۂ راحت نہیں بننے دیتے

فکر، فن کے لیے لازم — مگر اچھے شاعر
اپنے فن کو کبھی حکمت نہیں بننے دیتے

وہ محبّت کا تعلق ہو کہ نفرت کا ندیمؔ
رابطے، زیست کو خلوت نہیں بننے دیتے

فروری ۱۹۷۶ء
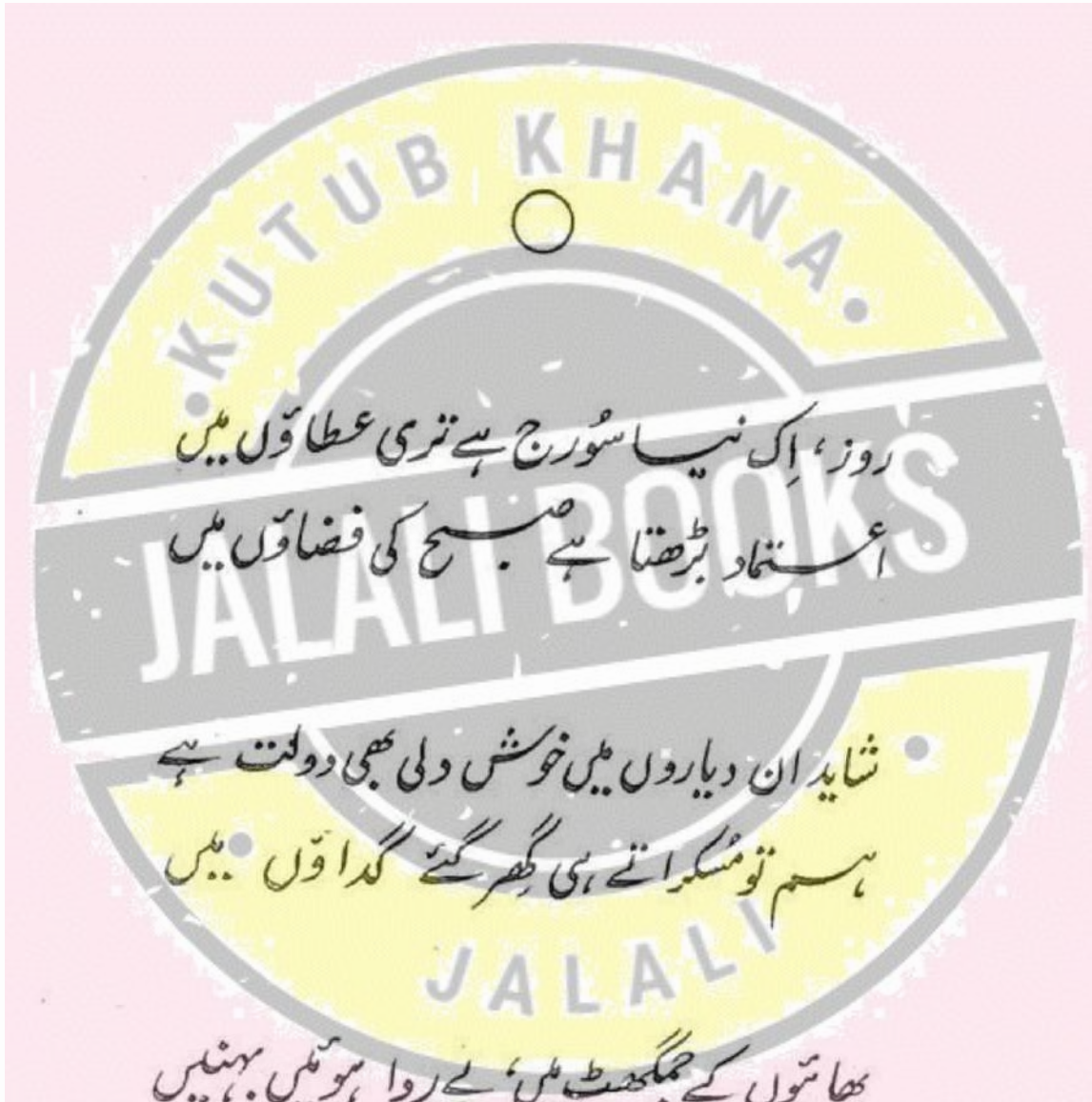
روز، اِک نیا سُورج ہے تری عطاؤں میں
اعتماد بڑھتا ہے صبح کی فضاؤں میں

شاید ان دیاروں میں خوش دلی بھی دولت ہے
ہم تو مسکرانے ہی گھر گئے گداؤں میں

بھائیوں کے جمگھٹ میں، بے ردا ہوئیں بہنیں
اور سر نہیں چھپتے، ماؤں کی دعاؤں میں

بارشیں تو یاروں نے کب کی بیچ ڈالی ہیں
اب تو صرف غیرت کی راکھ ہے ہواؤں میں

سُونی سُونی گلیاں ہیں ، اُجڑی اُجڑی چوپالیں
جیسے کوئی آدم خور ، پھر گیا ہو گاؤں میں

جب کسان ، کھیتوں پر دوپہر میں جلتے ہیں
لوٹتے ہیں سنگ زادے ، کیکروں کی چھاؤں میں

تم ہمارے بھائی ہو — بس ذرا سی دُوری ہے
ہم فصیل کے باہر ، تم محل سراؤں میں

خون رسنے لگتا ہے ، ان کے دامنوں سے بھی
زخم چھپ نہیں سکتے ، ریشمی رداؤں میں

دوستی کے پردے میں ، دشمنی ہُوئی اتنی
رہ گئے فقط دشمن ، اپنے آشناؤں میں

امن کا خدا حافظ — جب کہ نخل زیتوں کا
شاخ شاخ بٹتا ہے ، بھوکی فاختاؤں میں

ایک بے گنہ کا خون، غم جگا گیا کتنے!
بٹ گیا ہے اِک بیٹا، بے شمار ماؤں میں

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

خاک سے جدا ہو کر، اپنا وزن کھو بیٹھا
آدمی معلّق رہ گیا خلاؤں میں

اب ندیمؔ منزل کو ریزہ ریزہ چنتا ہے
بکھر گیا تھا بے چارہ، کتنے رہ نماؤں میں

جنوری ۱۹۷۶ء

محیط

پھول بھی کاغذ کے ہیں، مانگے کی ہے مہکار بھی
فصلِ گل نے میرا دل رکھا ہے اب کی بار بھی

منتظر ہوں میں ترے پندار کے انجام کا
جب ترے پاؤں سے اُلجھے گی تری دستار بھی

کیا عجب، گر دائرے کو توڑ کر نکلا ہوں میں
چلتے چلتے ٹوٹ جاتا ہے خطِ پرکار بھی
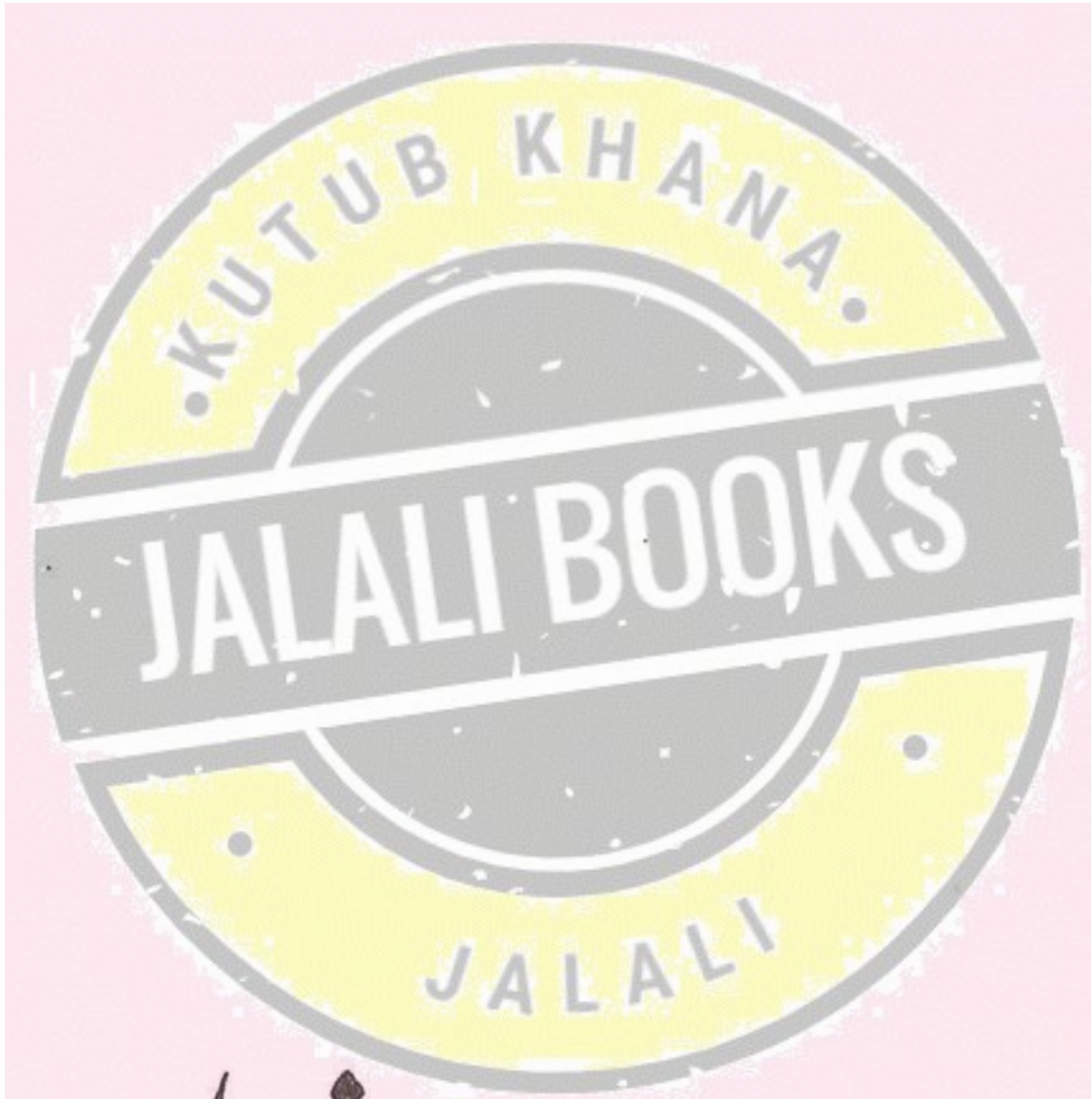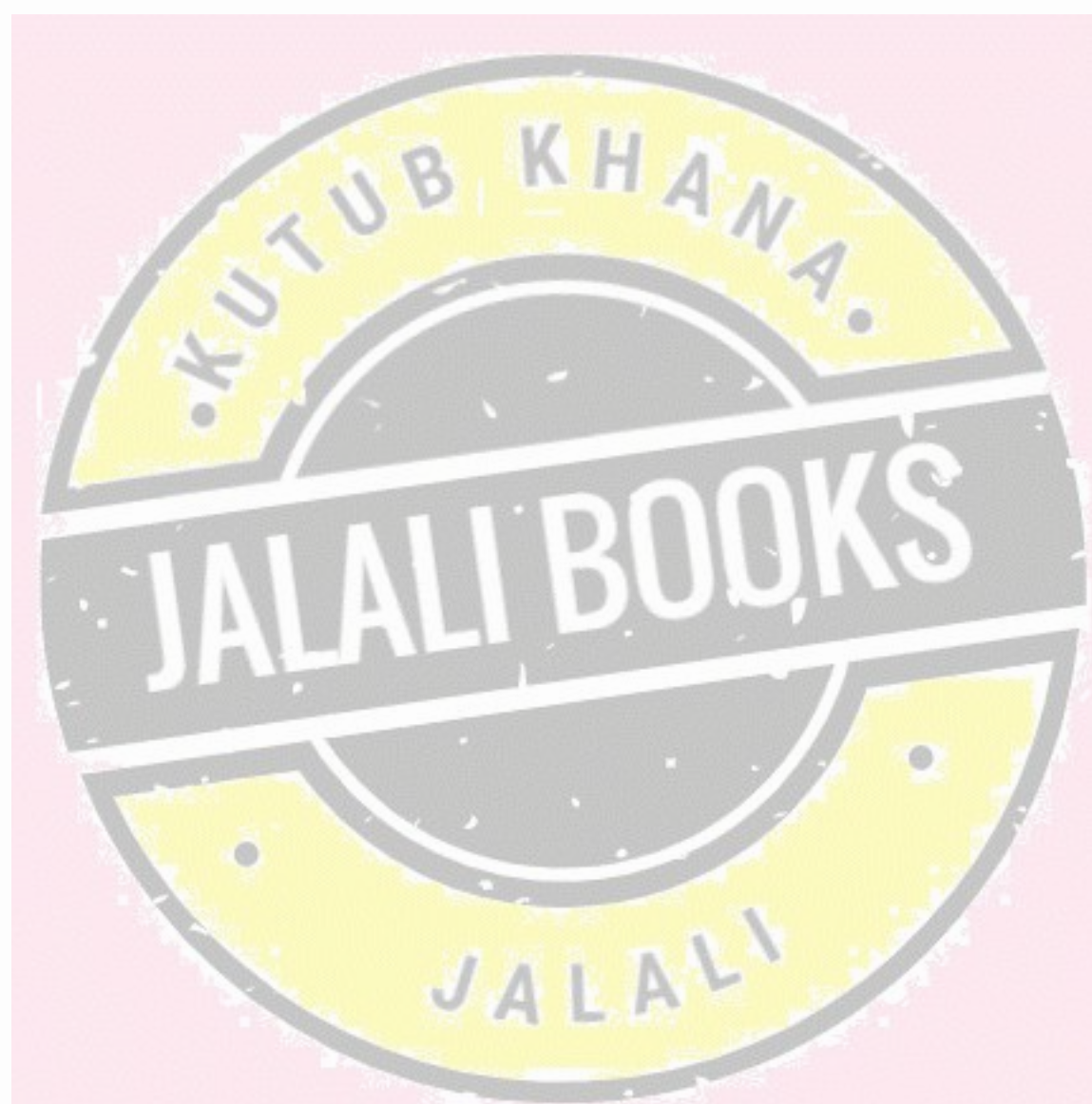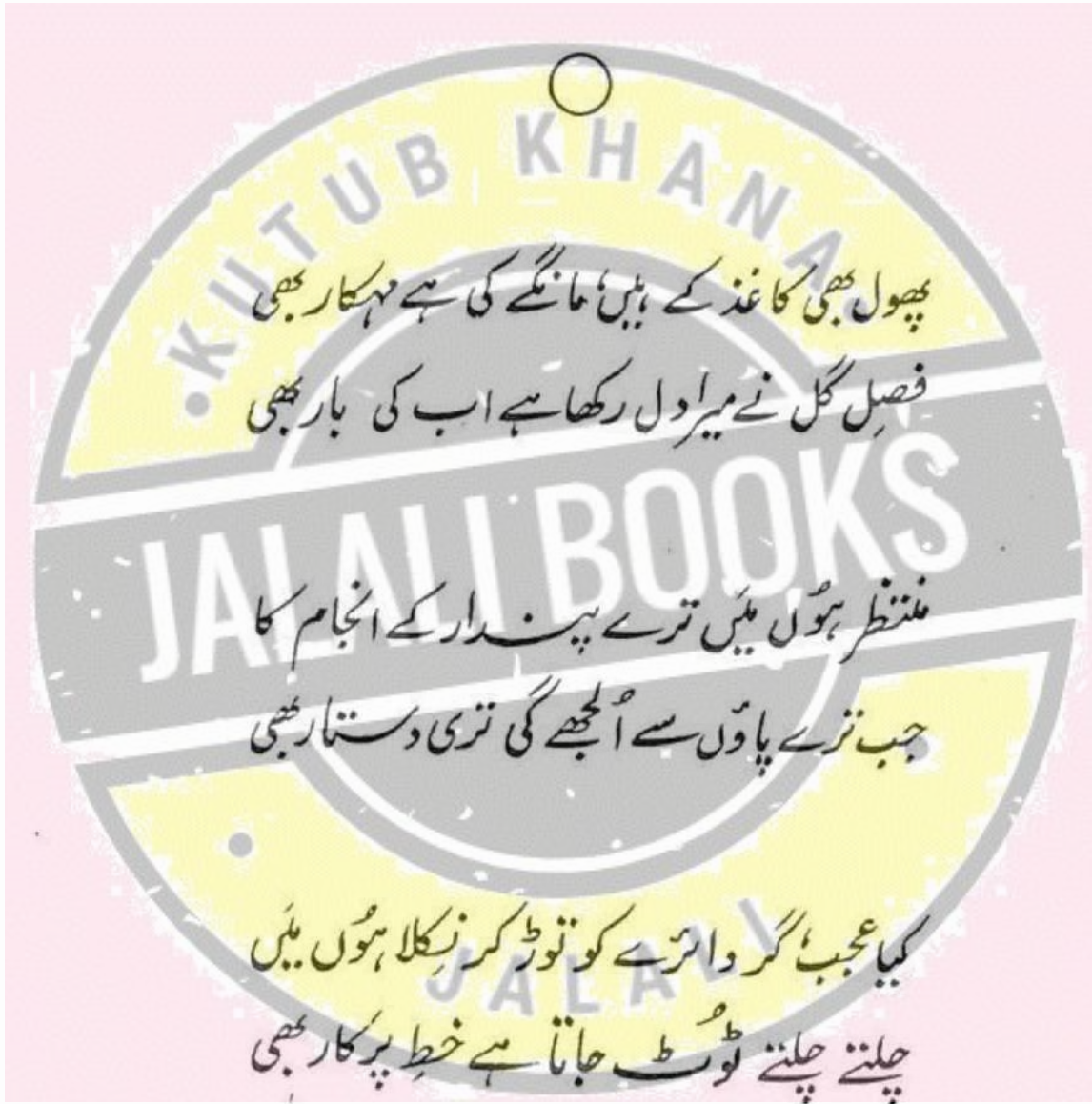
در مرے کچے گھروندے کا، ہوائیں لے اُڑیں،
پھر پڑا چھینٹا تو آدھی رہ گئی دیوار بھی

آنگنوں کے امن کو کیوں کھا گئیں مجبوریاں
کیوں گھروں کے شور سے شرمندہ ہیں بازار بھی

قوم کو تحسینِ فن کا درس دینے کے لیے
فن پہ قرباں ہو گئے شاعر بھی، موسیقار بھی

خواب میں عمریں گنوا دینے کے موسم جا چکے
اب نئی نسلیں ہیں کچھ خوابیدہ، کچھ بیدار بھی

اپنی مٹی کی کسوٹی کو کبھی پرکھو ندیمؔ
جسم کے رشتے سے سمجھو رُوح کے اسرار بھی

دسمبر ۱۹۷۵ء

نہ سہی اور کہیں گھر میرا
دشت میرا ہے، سمندر میرا

اپنے کشکول میں اک پھول لیے
میرا ہمزاد ہے رہبر میرا

یہ زمیں ہے کہ فقط عکسِ زمیں
میرا سایہ ہے کہ پیکر میرا
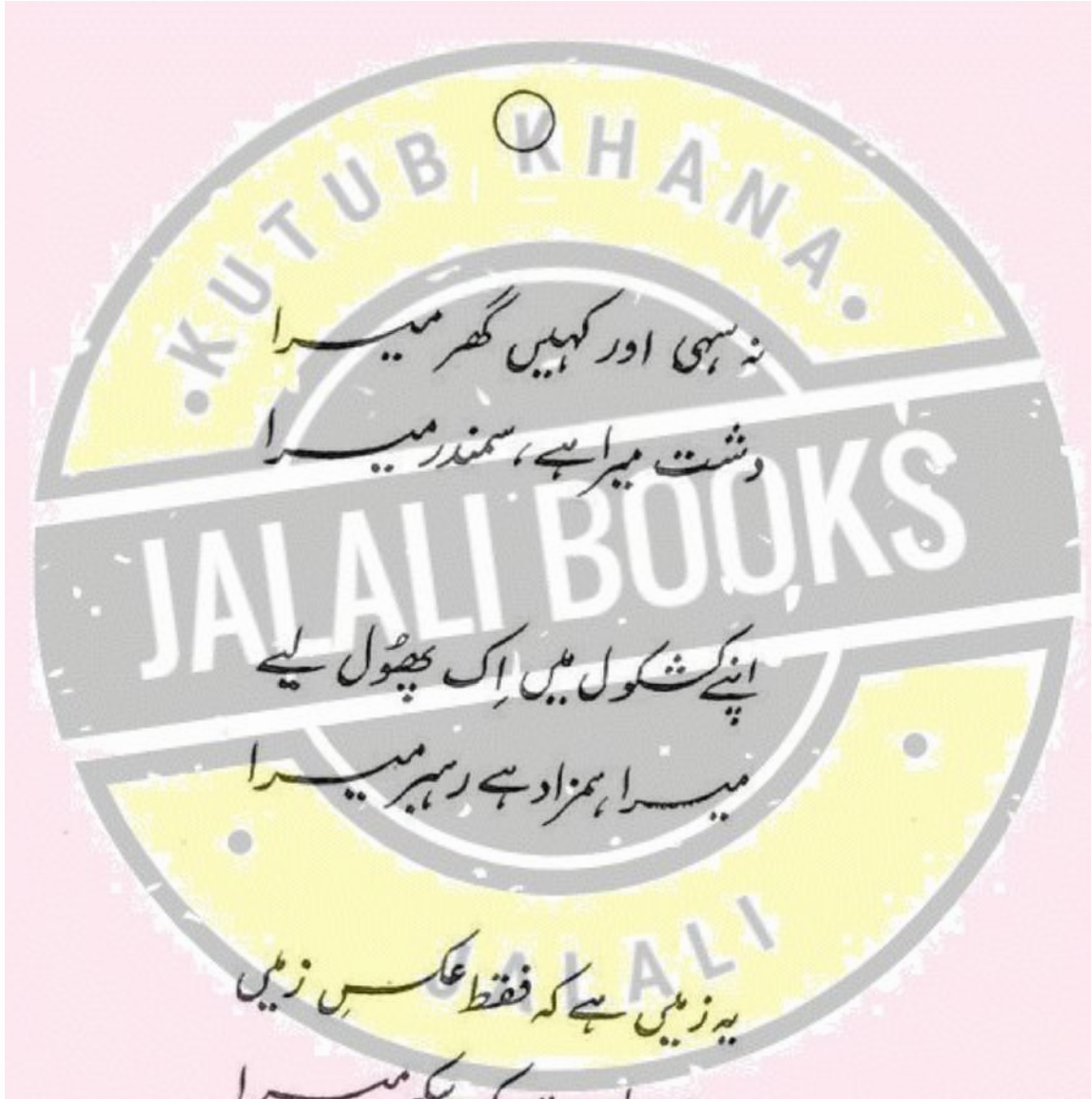
یا تو چہرے ہی بدل کر بگڑے
یا ہے آئینہ مکدّر میرا

کٹ کے بھی، گر کے بھی، نیزے پر بھی
میری گردن پہ رہا سر میرا

روز پر کھا ہے خدا کو مَیں نے
روز برپا ہُوا محشر میرا

اپنے ماضی کے پرستاروں میں
رائیگاں جائے گا جوہر میرا

اے مرے ذہن کے کھلتے ہُوئے در
دل ہُوا جاتا ہے کافر میرا

جرأتِ فکر کی بخشش میں ندیمؔ
نام لیتے ہیں سخن ور میرا

دسمبر ۱۹۷۵ء

وفا میری — متاعِ ناخریدہ
دعا میری — صدائے ناشنیدہ

خدا کو دیکھ لینا چاہتا ہوں
"شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ"

مجھے لمسِ بدن سے رکھ نہ محروم
نہیں میں اس قدر بھی برگزیدہ
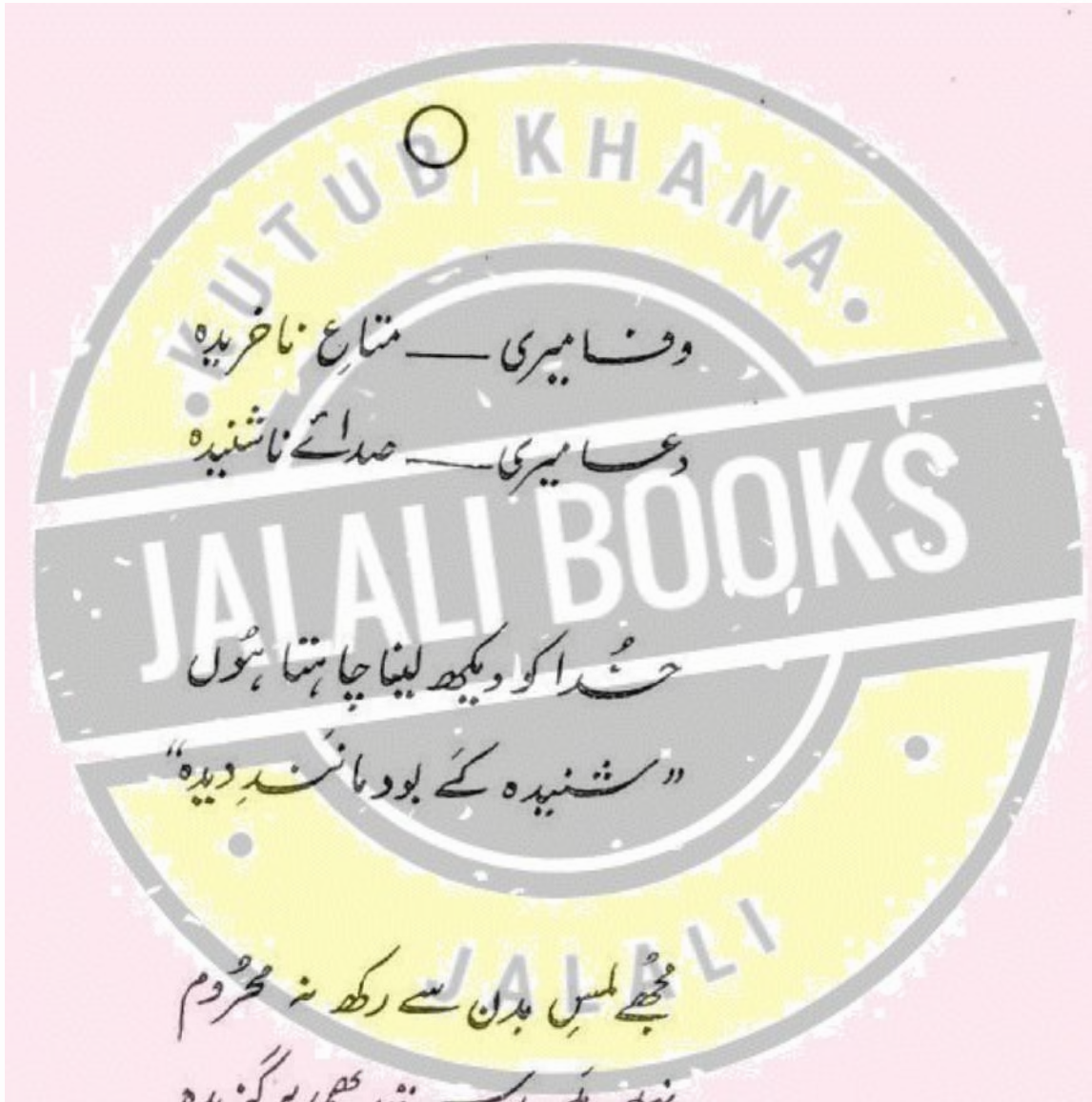
ابھی آدم فلک سے گر رہا ہے
ابھی انسان ہے ناآفریدہ

ذرا آہستہ چل، اے بادِ حالات
بہت نازک ہے نسلِ نو دمیدہ

یہ ہے تہذیب یا آشوبِ تہذیب
بدن ہیں پُرسکوں، رُوحیں دریدہ

شعور اُن کا ذرا بیدار ہو لے
اُڑیں گے طائرانِ پر بریدہ

گھروں میں تھے وہی سر در گریباں
سرِ بازار تھے جو سر کشیدہ

وہ جس کی آدم آزاری ہے مشہور
وہی ابلیس ہے آدم گزیدہ

زوالِ شب کا نوحہ لکھ رہا ہُوں
سحر کا بنتا جاتا ہے قصیدہ

نومبر
۱۹۷۵ء

جی چاہتا ہے فلک پہ جاؤں
سورج کو غروب سے بچاؤں

بس میرا چلے جو گردشوں پر
دن کو بھی نہ چاند کو بجھاؤں

میں چھوڑ کے سیدھے راستوں کو
بھٹکی ہوئی نیکیاں کماؤں
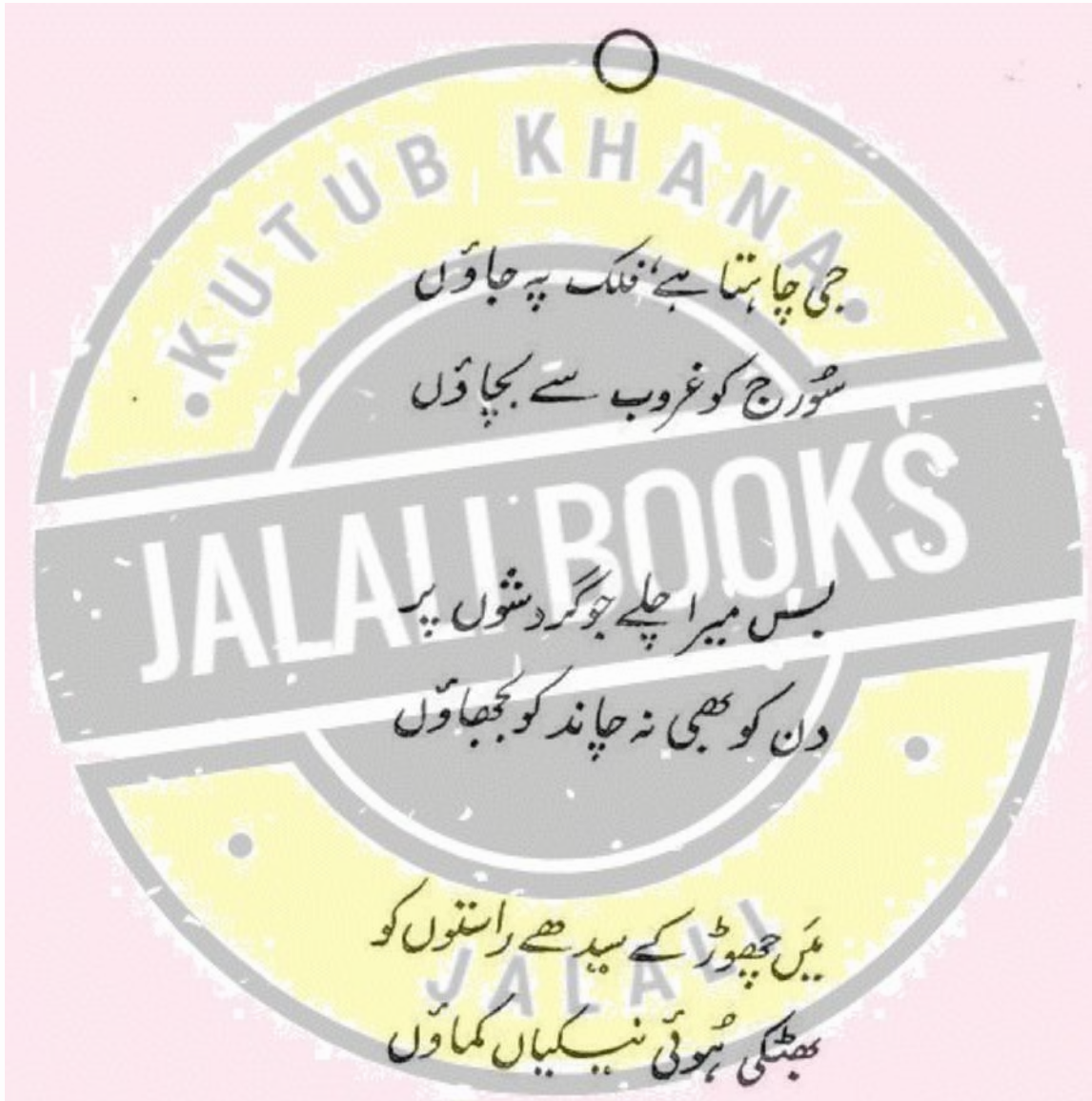
امکان پہ اس قدر یقیں ہے
صحراؤں میں بیج ڈال آؤں

مَیں شب کے مسافروں کی خاطر
مشعل نہ ملے تو گھر جلاؤں

تنہائی ہے، عمر کا سفر ہے
دشمن ہی کو ہمسفر بناؤں

یہ بھی تو نماز کی قضا ہے
جو رُوٹھ گئے، انھیں مناؤں

جب مجھ کو تلاش ہے خدا کی
آفاق میں کس طرح سماؤں

اشعار ہیں میرے استعارے
آؤ تمھیں آئنے دکھاؤں

یوں بٹ کے، بکھر کے رہ گیا ہوں
ہر شخص میں اپنا عکس پاؤں

آواز جو دُوں کسی کے دَر پر
اندر سے بھی خود نکل کے آؤں

اے چارہ گرانِ عصرِ حاضر
فولاد کا دل کہاں سے لاؤں

ہر رات دُعا کروں سحر کی
ہر روز نیا فریب کھاؤں

ہر جبر پہ صبر کر رہا ہُوں
اس طرح کہیں اُجڑ نہ جاؤں

گھر ڈوب رہے ہیں تیرگی میں
قبروں پہ مگر دیے جلاؤں

رونا بھی تو طرزِ گفتگو ہے
آنکھیں جو رُکیں تو لب ہلاؤں

ماحول ہی سازگار کب تھا
حسرت ہی رہی کہ مسکراؤں

خود کو تو ندیم آزمایا
اب مر کے خدا کو آزماؤں

اکتوبر ۱۹۷۵ء

تیرے پیار نے وقت کی تقویمیں ہی بدل دیں
پل پل میں ایک ایک صدی سمٹی بیٹھی تھی

ساری دُنیا دُھوپ میں تھی، مَیں سائے میں تھا
تیری یاد، گھٹا کی صُورت اُمڈ پڑی تھی

پنّے ناحق اُس کے دُکھ پر تڑپ رہے تھے
چڑیا خوشی خوشی بارش میں بھیگ رہی تھی

وقت کی بولی، لفظوں کی محتاج نہیں ہے
شب جتنی خاموش تھی، اُتنی بامعنی تھی

رات کی کھُوری تارا، ماتھے چاند کا جھُومر
افریقہ کی بیٹی دُلہن بنی کھڑی تھی

صرف اِس بات پہ کوندے لپکے، بادل کڑکے
دِیا جلانے کیوں لڑکی مسجد کو چلی تھی

جب بھی مَیں ماضی سے روشنی لینے پہنچا
بُجھے ہُوئے چُولھوں سے نکل کر راکھ اُڑتی تھی

ہر پیارا چہرہ جانا پہچانا سا تھا
جیسے یہ صُورت پہلے بھی کہیں دیکھی تھی

کاش ندیمؔ خدا کو کوئی یاد دلا دے
برسوں پہلے مَیں نے ایک تمنّا کی تھی

اگست ۱۹۷۵ء

صحرا ہُوں، مجھے چمن بنا دے
ہونٹوں پہ گلاب سے کھلا دے

مَیں دُور ہُوں، سُن سکوں تو کافر
تُو تجربتہً مجھے صدا دے
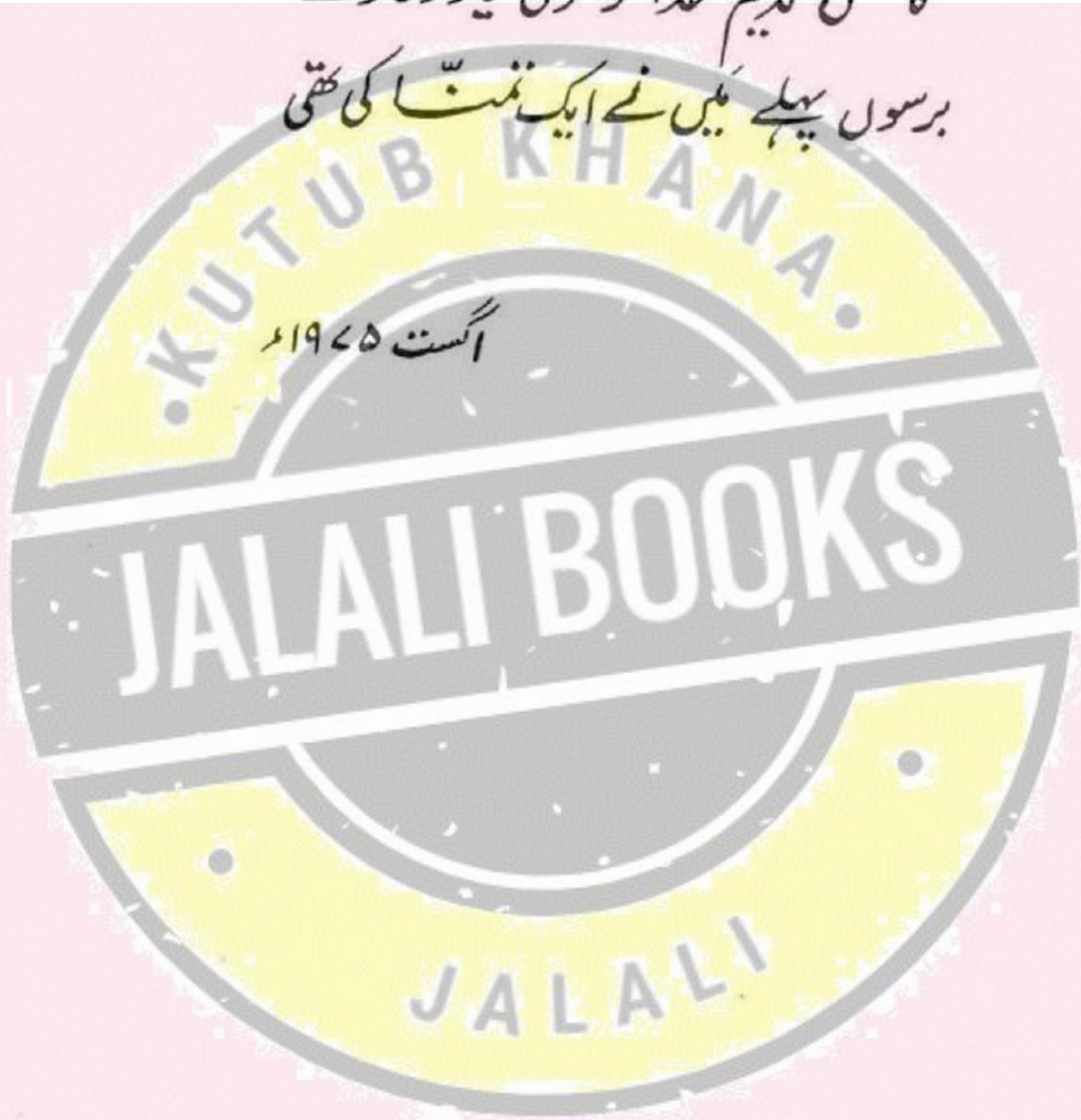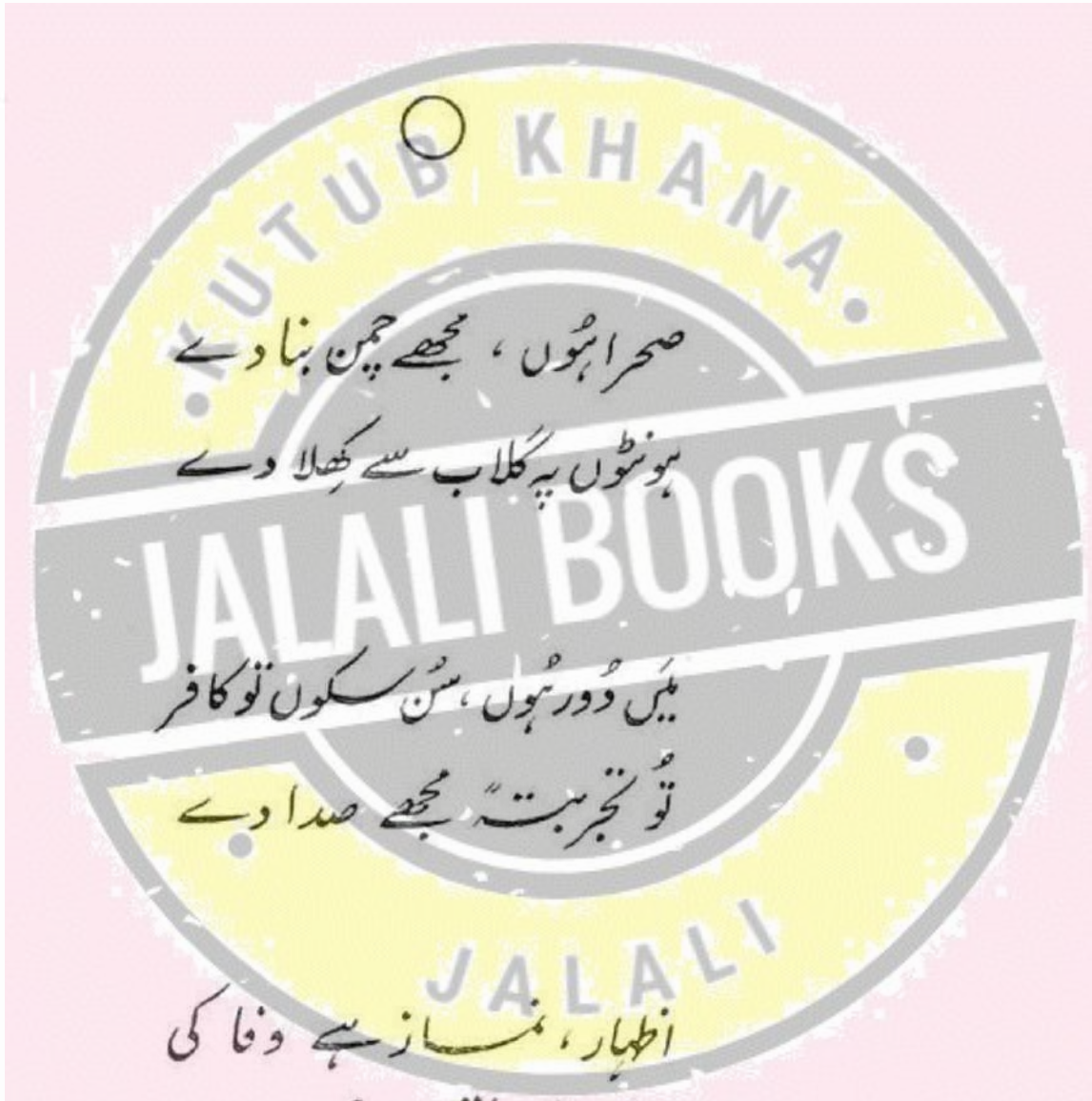
اظہار، نماز ہے وفا کی
توفیق اگر تجھے خُدا دے

یہ تیرا بدن ہے، یہ مرے لب
اب پردۂ معرفت اُٹھا دے

توقیرِ جمال عام کر کے
یارب، مجھے عشق کا صلہ دے

اُس شان سے آئے موسمِ گُل
ویرانوں میں آگ سی لگا دے

مَیں حبس پسند ہو رہا ہُوں
جھونکا، ترا نقشِ پا مٹا دے

چھُٹتی نہیں عُمر بھر کی عادت،
اب وصل بھی ہجر کا مزا دے

تہذیب ہے عشق کی انوکھی
دل دُکھتا رہے، مگر دُعا دے

بُجھ جائے دیا، تو دے اندھیرا
اور بُجھ نہ سکے تو گھر جلا دے

تو کہ نہ سکے جو اپنے دل کی
میری ہی غزل مجھے سُنا دے

یُوں اُس نے ندیمؔ مُجھ کو دیکھا
جیسے کوئی راستہ دکھا دے

جولائی ۱۹۷۵ء

تمھیں جو حُسن فقط فِتنہ گر نظر آئے
مجھے تو عیب بھی اُس کا، ہُنر نظر آئے

وُہ ایک لمحۂ رُخصت مُحیطِ وقت ہُوا
گُزر گیا، مگر آٹھوں پہر نظر آئے

جِسے بھی دیکھوں، ترے خدّ و خال میں دیکھوں
جدھر بھی جاؤں، تری رہگزر نظر آئے
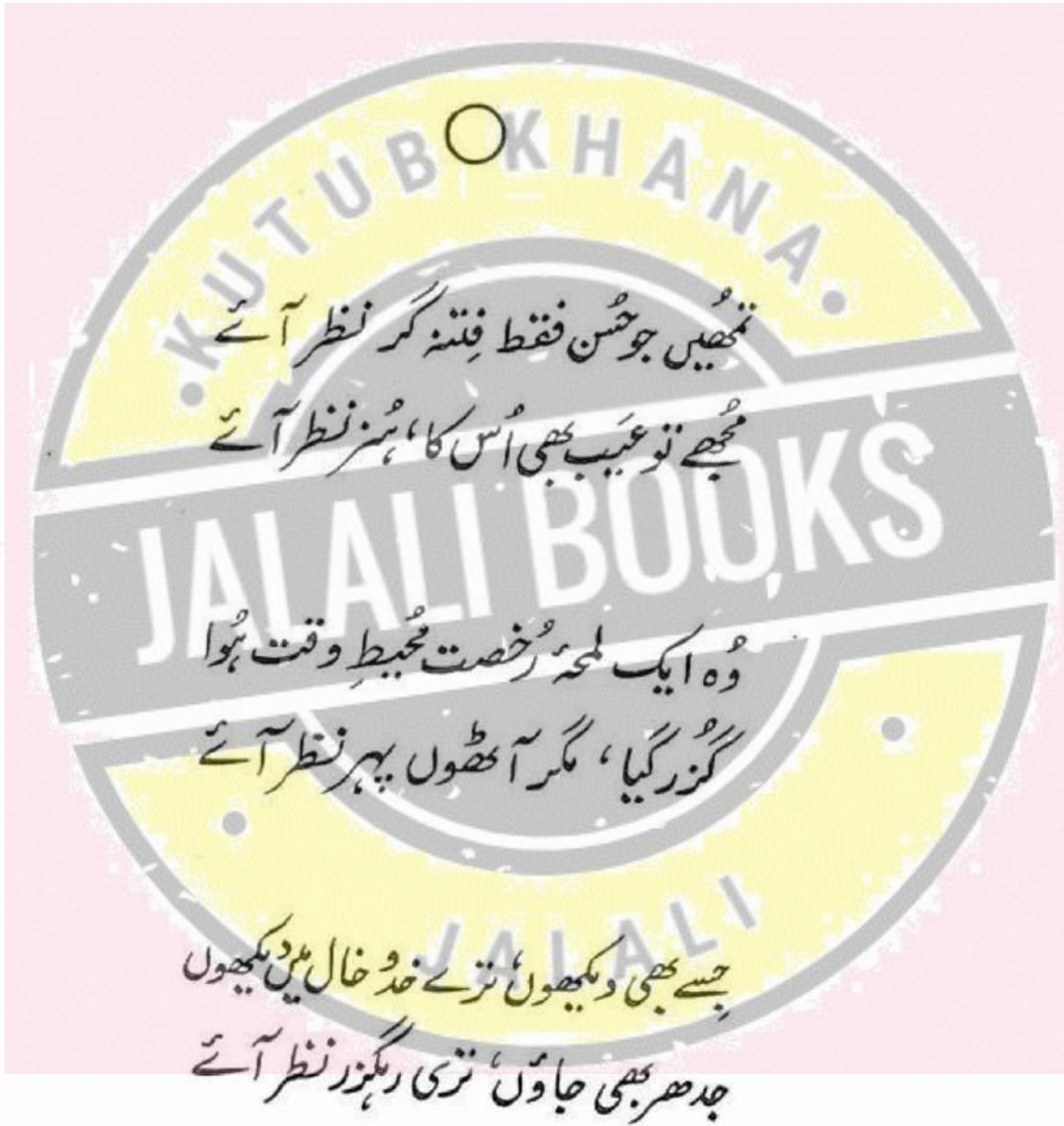
تمام عمر کی تنہائی کے عوض، یارب
وُہ ایک پَل کو ملے، لحظہ بھر نظر آئے

میں جس قدر بھی اسے بھولنے کی فکر کروں
فضائے فکر میں وہ اُس قدر نظر آئے

ہوئی جو شام، تو سائے نے ساتھ چھوڑ دیا
جو شب کٹے تو مرا ہم سفر نظر آئے

جو دُور سے نظر آئے لدے لدے سے ندیمؔ
قریب سے وہ شجر، بے ثمر نظر آئے

جولائی ۱۹۷۵ء

پسِ شفق مجھے خونِ جگر نظر آئے
غروب ہوتا ہوا اک بشر نظر آئے

میں کس زباں سے گہر کو گہر کہوں کہ مجھے
صدف صدف میں ہجومِ شرر نظر آئے

میں جب بھی عالمِ حیرت میں آئنہ دیکھوں
ہزار نیزوں پہ اپنا ہی سر نظر آئے
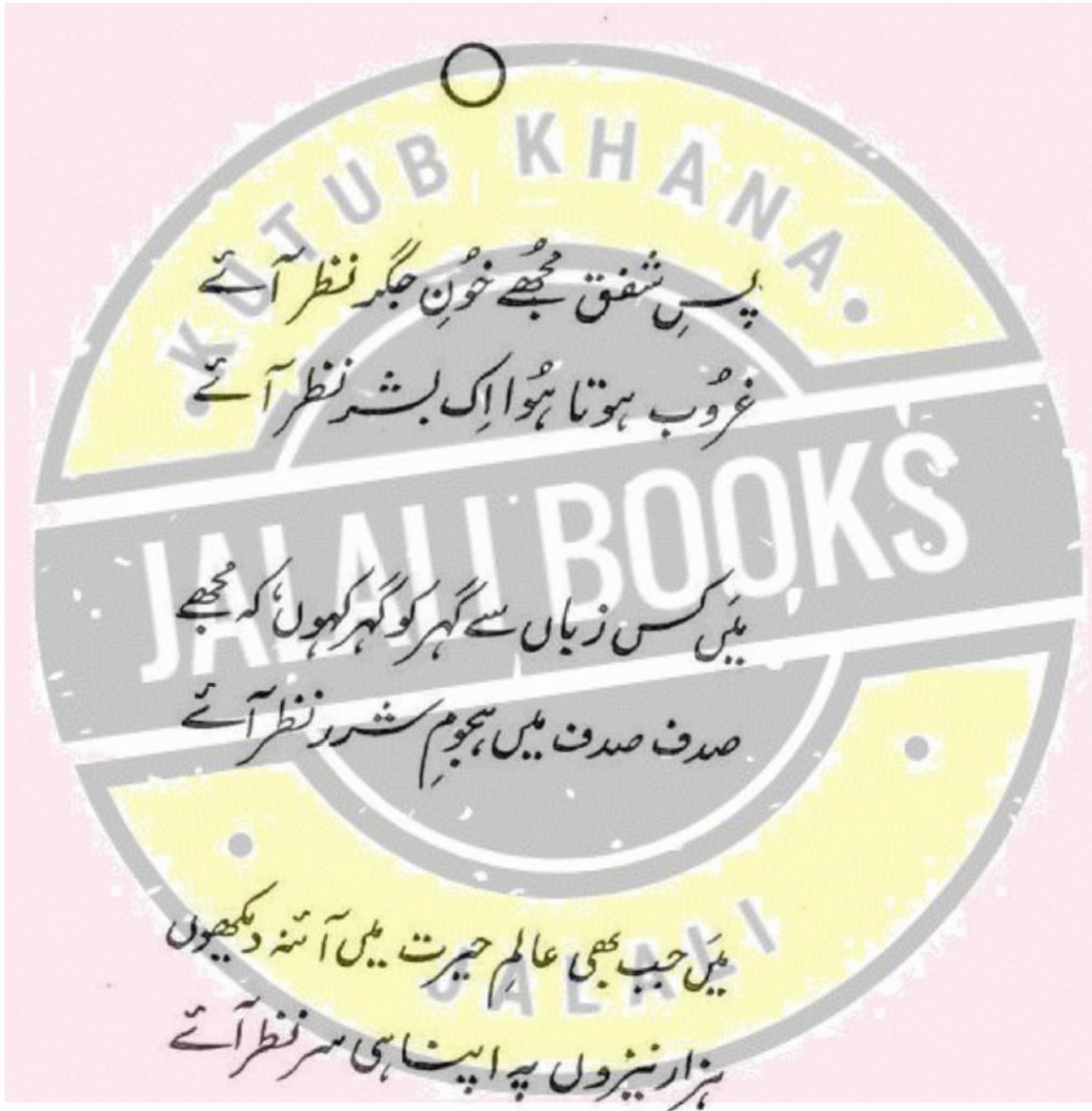
عجیب پیشہ وری کے عجیب تر معیار
جو سنگ زن ہے وہ آئینہ گر نظر آئے

زمیں سے پیچھے کہیں رہ گئے مرے دیہات
وہاں تو آج بھی دورِ حجر نظر آئے

جو سطح پر ہی رہا، فاضلِ اجل ٹھہرا
جو تہ میں ڈوب گیا، بے خبر نظر آئے

وہی خدا، کہ جو افلاک سے اُترتا نہیں
اُسی کا عکس مجھے خاک پر نظر آئے

بُرا نہ مانے اگر محتسب، تو عرض کروں
مجھے گلوں میں فرشتوں کے گھر نظر آئے

میں جب بھی فکر کے پر تول کر روانہ ہُوا
فلک کے گنبدِ بے در میں در نظر آئے

ہبوطِ آدم و حوّا پہ جب بھی غور کروں
تو کہکشاں مجھے گردِ سفر نظر آئے

کبھی تو پونچھ کے آنسو بھی، دیکھ دُنیا کو
کہ چشمِ تر سے تو بس چشمِ تر نظر آئے

مرے نصیب میں چھاؤں اگر نہیں، نہ سہی
کڑکتی دُھوپ میں دُور اک شجر نظر آئے

ندیمؔ میری رجا لا علاج ہے شاید
کہ دِل جلے تو طلوعِ سحر نظر آئے

جولائی ۱۹۷۵ء

کیوں ایک ہی بار آپ انھیں رخصت نہیں کرتے
محنت کا جو پھل کھاتے ہیں، محنت نہیں کرتے

جس پر کسی حق دار کا حق ہم سے سوا ہو
ہم ایسی کسی چیز کی حسرت نہیں کرتے

اے دل، تجھے انجام کی کیا فکر پڑی ہے
ہم عشق کی دنیا میں سیاست نہیں کرتے

ہر ظلم کے منہ پر ہمیں سچ کہنے کی لت ہے
ہم لوگ تو ظالم کی بھی غیبت نہیں کرتے

جو دیکھ چکے ہیں شفقِ شام کا منظر
چڑھتے ہوئے سورج کی عبادت نہیں کرتے

اس عہد کے صحرا میں غزالانِ جواں سال
زنجیر بھی بجتی ہو تو وحشت نہیں کرتے

دیوارِ گلستاں پہ سہی جبر کے پہرے
غنچے بھی تو کھِلنے کی جسارت نہیں کرتے

بیزار ہیں جو جذبۂ حب الوطنی سے
وہ لوگ کسی سے بھی محبّت نہیں کرتے

مئی ۱۹۷۵ء

نہ دل میں درد، نہ آنکھوں میں نُورِ ربطِ قدیم
زمین کے بھی ہیں کچھ لوگ آسماں پہ مقیم

میں کس ثبوت پہ الزام یہ خدا پہ دھروں
لکھے نصیب، تو انساں بھی کر دیے تقسیم

نہ اقتدار، نہ شہرت، نہ زہدِ شب بیدار
کمالِ قلب و نظر ہے جمال کی تفہیم

ہو عقل سر بگریباں، تو عشق کون کرے
دلوں کا ذکر ہی کیا جب دماغ ہوں دو نیم

زمیں پہ سانس بھی لینا ، پہاڑ کاٹنا ہے
مجھے خدا کی قسم ہے کہ آدمی ہے عظیم

مَیں نارِ جبر میں جل کر بھی مسکراتا ہُوں
کہ مَیں اِس آگ میں گُلزار دیکھتا ہُوں ندیمؔ

مارچ ۱۹۷۵ء
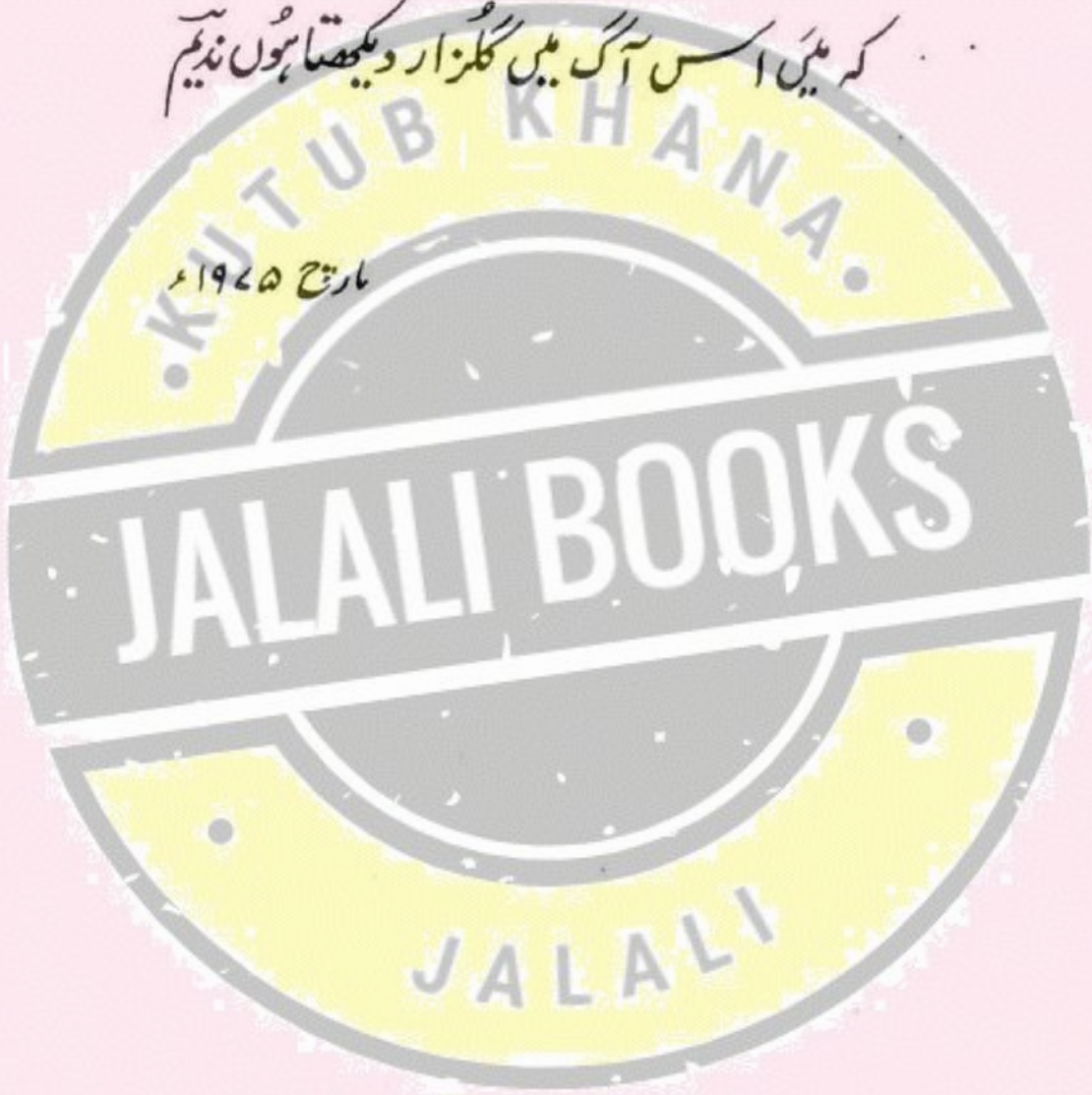
زخمِ نگاہ کے لیے مرہمِ اندمال تھے
تیرے گھٹا سے بال تھے، تیرے شفق سے گال تھے

رات عجیب رات تھی، ہم تھے خدا کی ذات تھی
چاند بھی زرد زرد تھا، تارے بھی خال خال تھے

شرک سہی، مگر یہی اوجِ سجود ہی نہ ہو
لب پہ خدا کا نام تھا، دل میں ترے خیال تھے

اب تری انجمن میں کیوں اجنبی اجنبی سے ہیں
ہم جو ترا شعور تھے، ہم جو ترا جمال تھے

ہم کو ترے غرور نے کم سخنی کی مار دی
ایسا جواب دے دیا، جس میں کئی سوال تھے

تیرا اداس التفات دل کی زمیں نہ چھو سکا
کتنی نحیف تھی کرن، کتنے گھنے ملال تھے

تو نہ ملا، مگر ہمیں دولتِ ہجر مل گئی
ہم جو تباہ حال تھے، درد سے مالا مال تھے

کیسا یہ انقلاب تھا، طفل کا جیسے خواب تھا
پریوں کے لب سیاہ تھے، لاشوں کے ہونٹ لال تھے

ہم پہ بہ فیضِ بے دلی ایسے بھی وقت آئے ہیں
آنکھ نہ تھی عذاب تھی، سانس نہ تھے وبال تھے

عشق کی ابتداء کا دور کتنا عجیب تھا ندیمؔ
لطف بھی بے نظیر تھے، کرب بھی بے مثال تھے

فروری
۱۹۷۵ء

کچھ غلط بھی تو نہیں تھا مرا تنہا ہونا
آتش و آب کا ممکن نہیں یک جا ہونا

سرِ صحرا تو عناصر بھی بھٹک جاتے ہیں
اس سفر میں کسے راس آئے گا دریا ہونا

کیسے بھولوں، وہ شبِ ہجر کے سنّاٹے میں
خشک پتّے کا بھی گرنا تو دھماکا ہونا

میرے آتے ہی ترے رنگ کے فق ہونے سے
میں نے دیکھا ہے بھری بزم کا صحرا ہونا

تُو جو چاہے تو اسے اپنا مقدّر کہ لوں
ساتھ انبوہ کے چلتے ہُوئے، تنہا ہونا

ایک گلزار سے میں راکھ میں بدلا، لیکن
ابھی باقی ہے قیامت کا تماشا ہونا

ایک نعمت بھی یہی، ایک قیامت بھی یہی
روح کا جاگنا اور آنکھ کا بِینا ہونا

جو برائی تھی، مرے نام سے منسُوب ہوئی
دوستو! کِتنا بُرا تھا مرا اچھا ہونا

قعرِ دریا میں بھی آ نکلے گی سُورج کی کرن
مجھ کو آتا نہیں محرُوم تمنّا ہونا

شاعری روزِ ازل سے ہُوئی تخلیق ندیمؔ
شعر سے کم نہیں انسان کا پیدا ہونا

فروری
۱۹۷۵ء

درگزر کرنے کی عادت سیکھو

اے فرشتو! بشریت سیکھو

ربِّ واحد کے پجاری ہو اگر

تم جو کثرت میں ہو، وحدت سیکھو

دشت، جو ابر کے محتاج نہیں
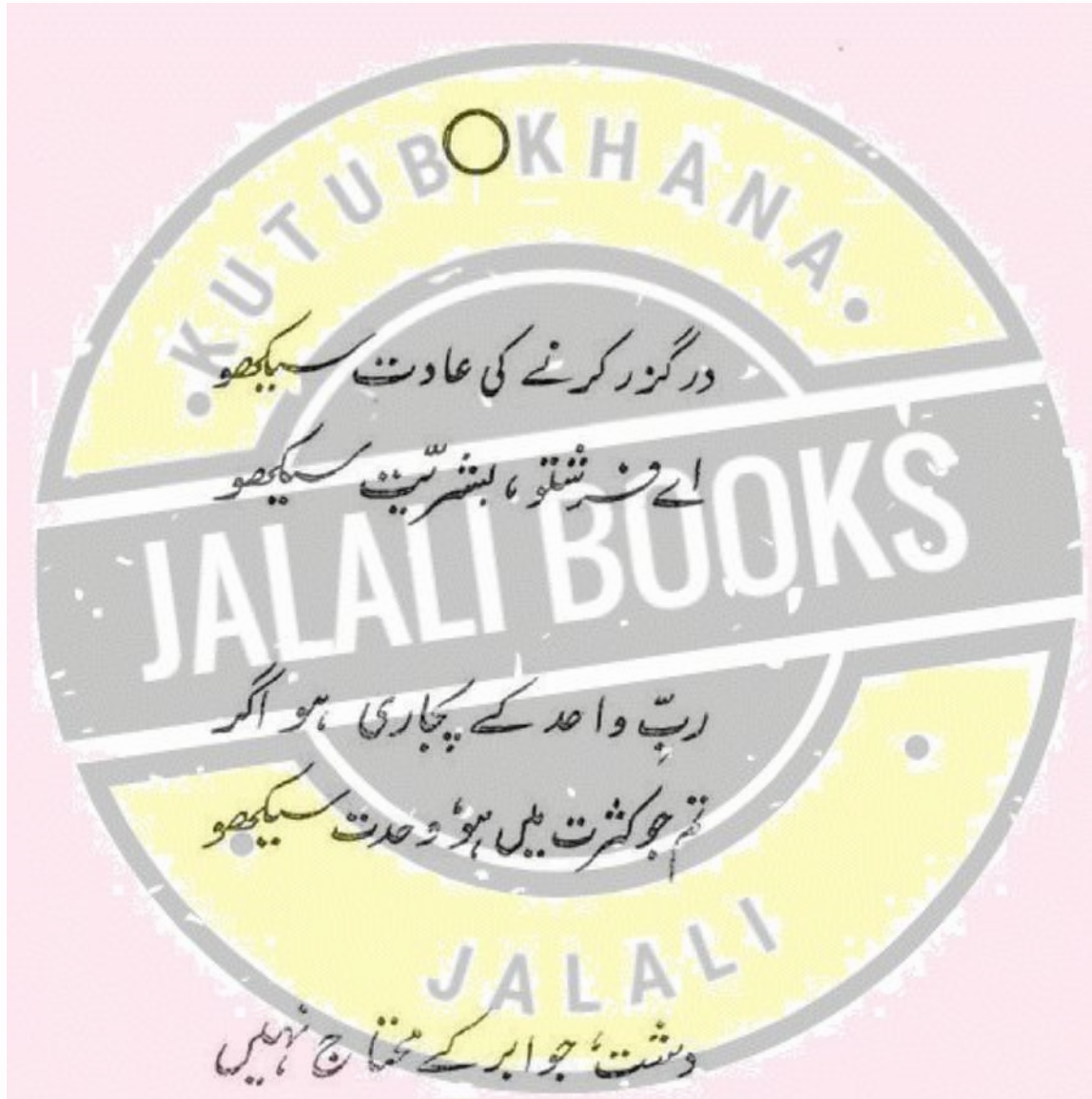
ان سے پیرایۂ غیرت سیکھو

ریزہ ریزہ ہی اگر رہنا ہے

اپنے صحراؤں سے وسعت سیکھو

صرف حیرت ہی نہیں آئنوں میں
ان سے اظہارِ حقیقت سیکھو

صرف رنگت ہی نہیں پھولوں میں
ان سے نکہت کی بھی حکمت سیکھو

ایک آنسو بھی نہ روکو دل میں
اور خوش رہنے کی عادت سیکھو

سامنے آنے سے کیوں ڈرتے ہو
عشق کرنا ہے تو شدّت سیکھو

مجھ کو کیا علمِ ریا کے فن کا
مجھ سے سیکھو تو محبّت سیکھو

درد ہی درد، مگر حُسن ہی حُسن
شاعرو، شعر کی سیرت سیکھو

جنوری
۱۹۷۵ء

مَیں ایک ذرّہ سہی، کائنات بھر میں رہوں
نظر نہ آؤں، کہ اک حلقۂ بشر میں رہوں

تمام دن رہے ایک اور شام کا دھڑکا
تمام رات مَیں اندیشۂ سحر میں رہوں

دعا یہ ہے، مری غیرت پہ کوئی آنچ نہ آئے
اگر رہوں تو ترے حُسن کے اثر میں رہوں

خدا کرے، مجھے دُنیا تجھی سے پہچانے
تری نظر سے گروں یا تری نظر میں رہوں

میں اِک دیا ہُوں، مگر حوصلے ہیں سُورج کے
ہوائے تند میں بھی تیری رہگزر میں رہوں

جو مجُھ سے پیار نہیں، میرا انتظار ہے کیوں
نہیں ہوں دل میں، تو کیوں تیری چشمِ تر میں رہوں

بڑے سکون سے سو کر بھی جسم ٹوٹتا ہے
میں رات کو بھی کسی خواب کے سفر میں رہوں

بہت عجب مرا اندازِ خود فریبی ہے
کہ دشت دشت پھروں، اور اپنے گھر میں رہوں

ندیم، کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہُنر میں رہوں

دسمبر ۷۴ ۱۹ء

مغرب کے افق پہ جو شفق ہے
چھو کر دیکھو تو خونِ حق ہے

اِک عالمِ ہُو ہے اس سے آگے
دھرتی ہے کہ چودھواں طبق ہے
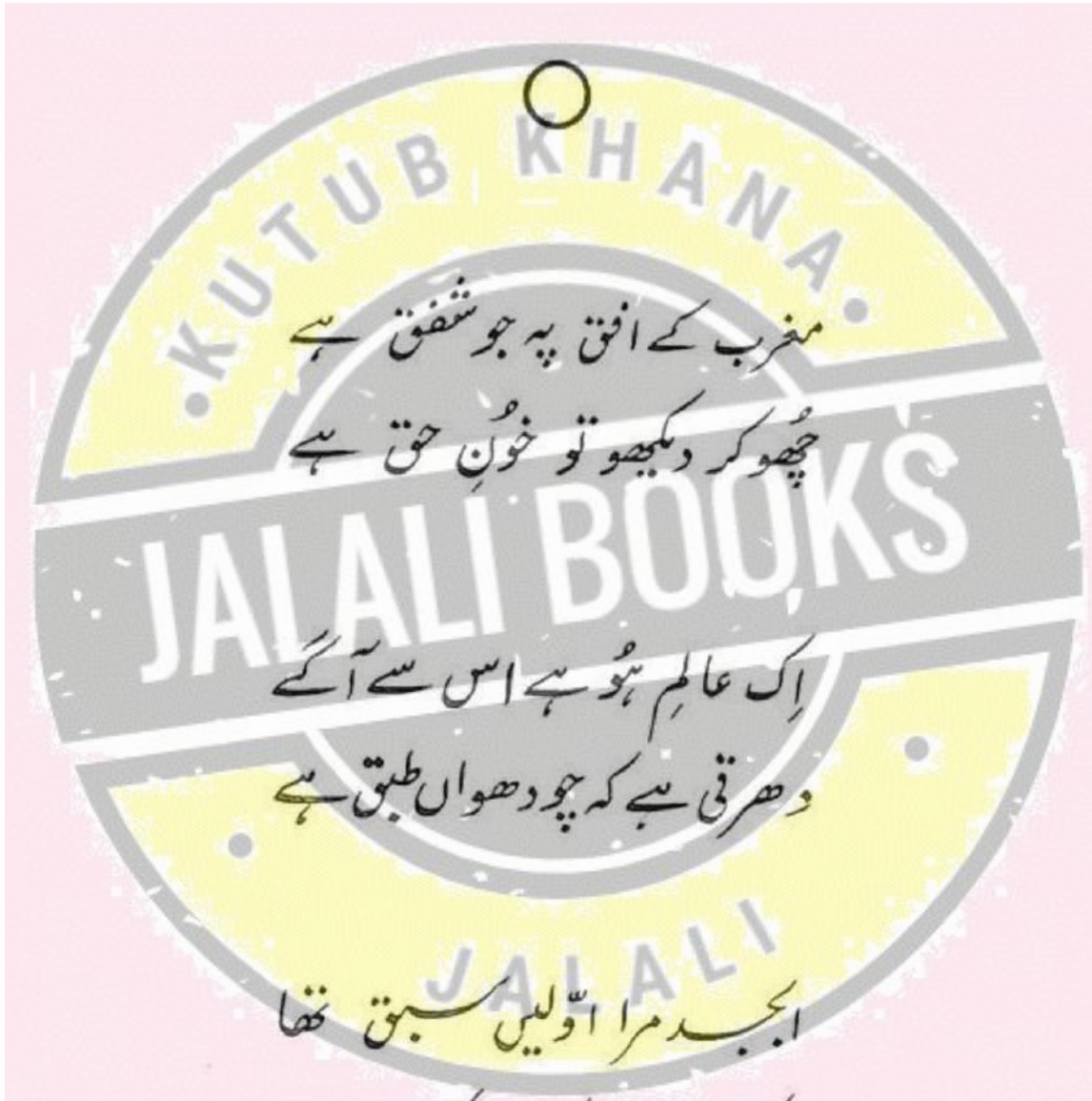
ابجد مرا اوّلیں سبق تھا
ابجد مرا آخری سبق ہے

بم کا ہوا تجربہ زمیں پر
سینہ مگر آسماں کا شق ہے

شاعر ہو کہ حکمراں کہ صُوفی
اس دَور میں سب کا رنگ فق ہے

تہذیب کشی کی آندھیوں میں
شیرازۂ فن ورق ورق ہے

نومبر ۱۹۷۴ء
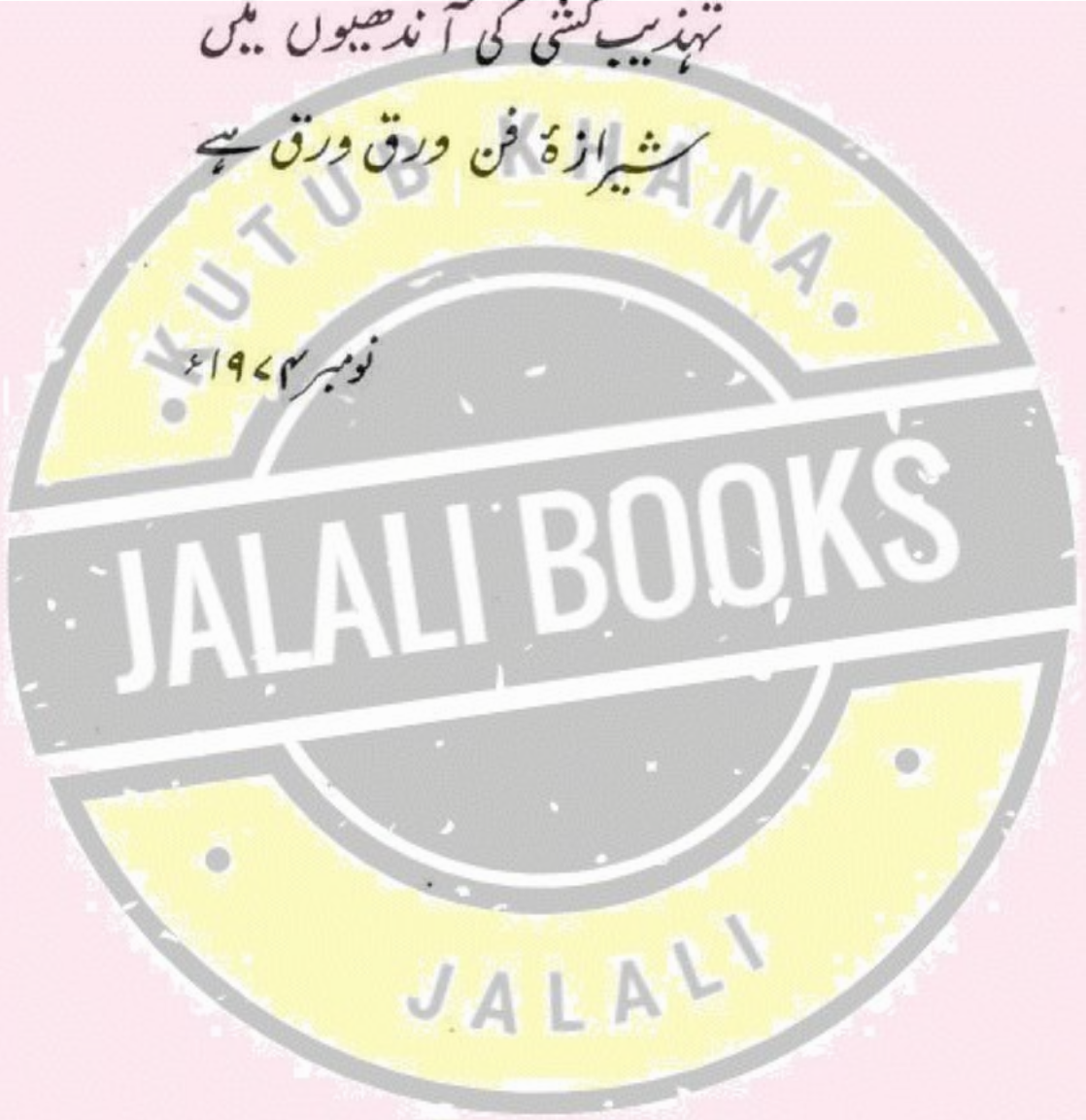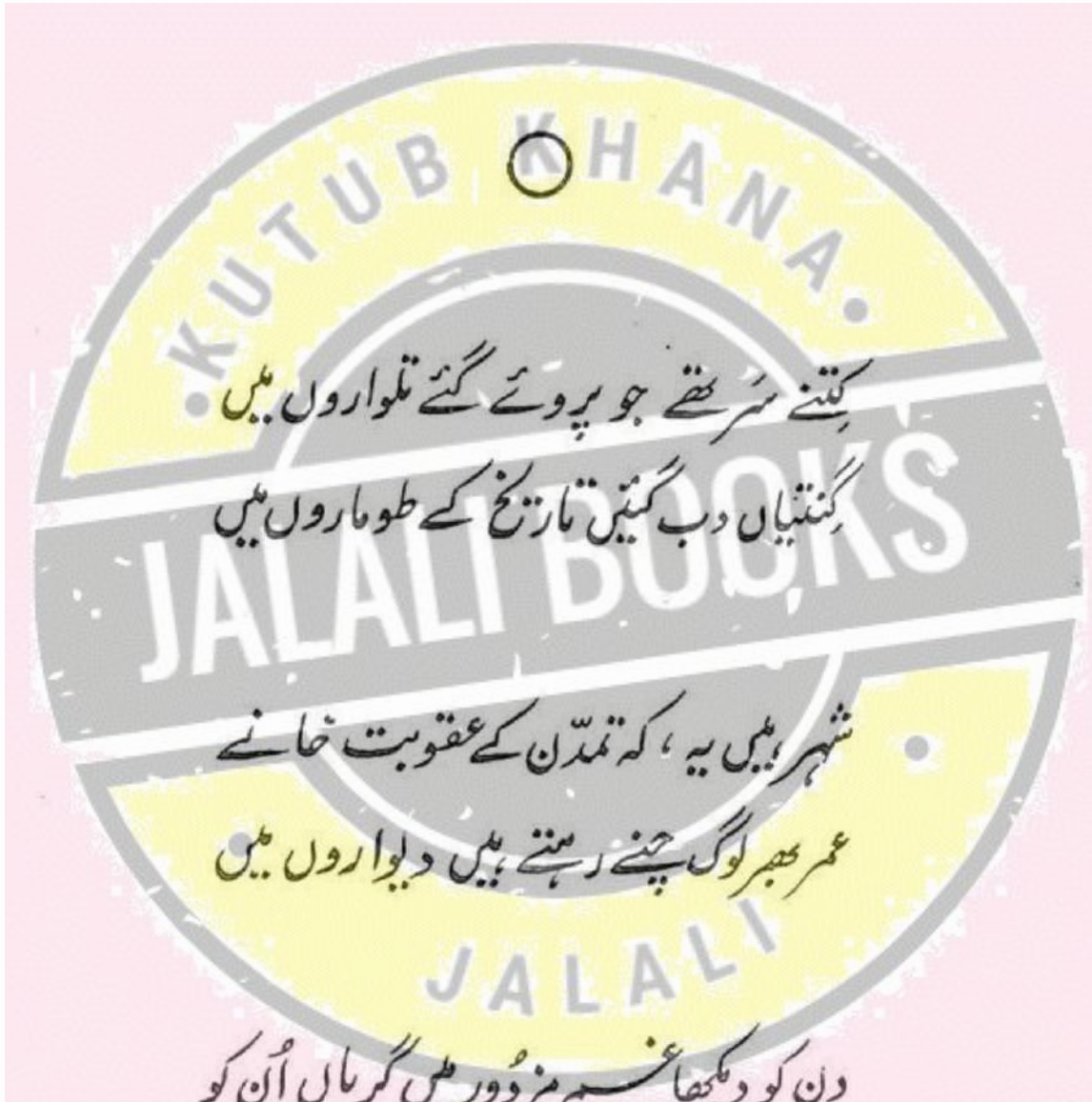
کتنے سر تھے جو پروئے گئے تلواروں میں
گنتیاں دب گئیں تاریخ کے طوماروں میں

شہر ہیں یہ، کہ تمدّن کے عقوبت خانے
عمر بھر لوگ چُنے رہتے ہیں دیواروں میں

دن کو دیکھا غمِ مزدور میں گریاں اُن کو
شب کو جو لوگ سجے بیٹھے تھے درباروں میں

آپ دستار اُتاریں تو کوئی فیصلہ ہو
لوگ کہتے ہیں کہ سر ہوتے ہیں دستاروں میں

آج بھی مِلتے ہیں منصُور ہزاروں ، لیکن
اب انا الحق کی صلابت نہیں کرداروں میں

نہ کرو ظلِ الٰہی کی بُرائی کوئی !
دوستو ! کفر نہ پھیلاؤ نمک خواروں میں

وہی ہر دَور کے نمرُود کے مجرُم ہیں، جنھیں
پھُول کھِلتے نظر آجاتے ہیں انگاروں میں

حشر آنے کی ابھی تو کوئی تقریب نہیں
ابھی کچھ نیکیاں زندہ ہیں گنہگاروں میں

جو بھی آتا ہے وہ ہنستا ہُوا الٹ جاتا ہے
بس گیا ہے کوئی آسیب سا بازاروں میں

انقلاب آنے سے پہلے کا یہ منظر ہے عجیب
دشت میں پھُول ، بگولے ہیں چمن زاروں میں

رُت بدلتی ہے تو معیار بدل جاتے ہیں
بلبلیں خار لیے پھرتی ہیں منقاروں میں

میرے کِیسے میں تو اِک سُوت کی اَنٹی بھی نہ تھی
نام لکھوا دیا یوسف کے خریداروں میں

یُوں تو کہنے کو بس اِک بار ہی مَیں کڑکا تھا
دیر تک کون گرجتا رہا کہساروں میں

چُن لے بازارِ ہُنر سے کوئی بہروپ ندیمؔ
اب تو فن کار بھی شامل ہیں اداکاروں میں

اکتوبر ۱۹۷۴ء
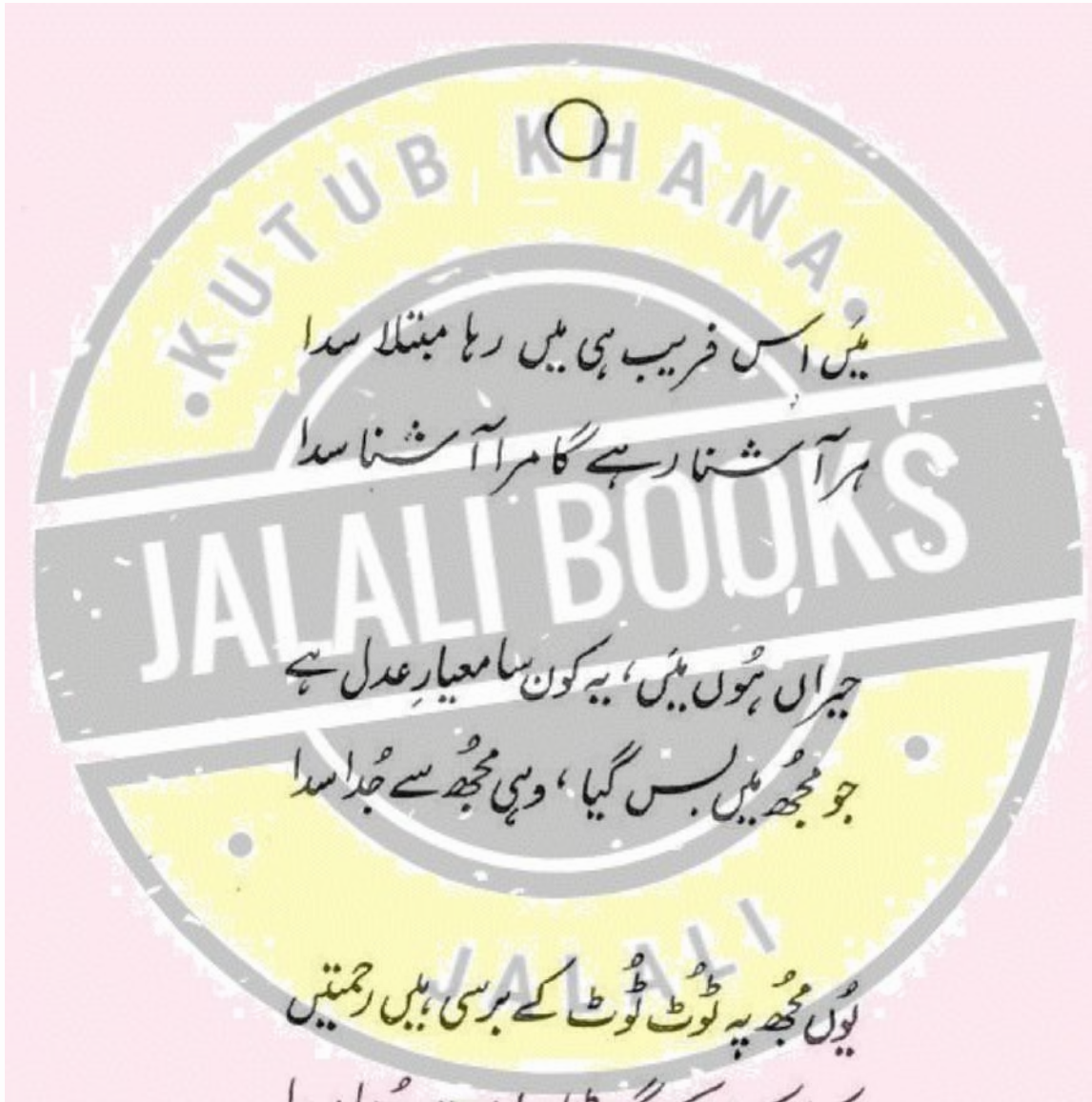
مَیں اُس فریب ہی میں رہا مبتلا سدا
ہر آشنا رہے گا مرا آشنا سدا

حیراں ہُوں مَیں، یہ کون سا معیارِ عدل ہے
جو مجُھ میں بس گیا، وہی مجُھ سے جُدا سدا

یُوں مجُھ پہ ٹُوٹ ٹُوٹ کے برسی ہیں رحمتیں
کٹ کٹ کے گر پڑا مرا دستِ دُعا سدا

مَیں بولتا نہیں ہُوں، مگر دیکھتا تو ہُوں
لب میرے سِل چکے، مگر آنکھیں ہیں وا سدا

یارب، تو اوجِ عرش سے اُترے تو یہ کہوں
اِس عدل گہ میں مارا گیا بے خطا سدا

یہ زندگی تو جیسے فقط مشقِ مرگ ہے
ہیں نوعِ غمِ حیات میں مرتا رہا سدا

مر جاؤں گا، کہ صرف خدا کو ثبات ہے
باقی رہے گا دہر میں حرفِ فنا سدا

صدیوں کے کارواں بھی کہیں آس پاس ہیں
کانوں میں گونجتی ہے صدائے درا سدا

سچّا ہُوں مَیں، کہ مجھ پہ مسلّط ہے سچ کا خوف
لہرائے میرے سامنے یہ اژدہا سدا

کچھ آگے کُفر ہے تو چلو کُفر ہی سہی
کیوں نارسا رہے مری فکرِ رسا سدا

ہر حادثے کے بعد یہ اُلجھن رہی ندیمؔ
بندے سے بے نیاز رہا کیوں خُدا سدا

اکتوبر ۱۹۷۴ء
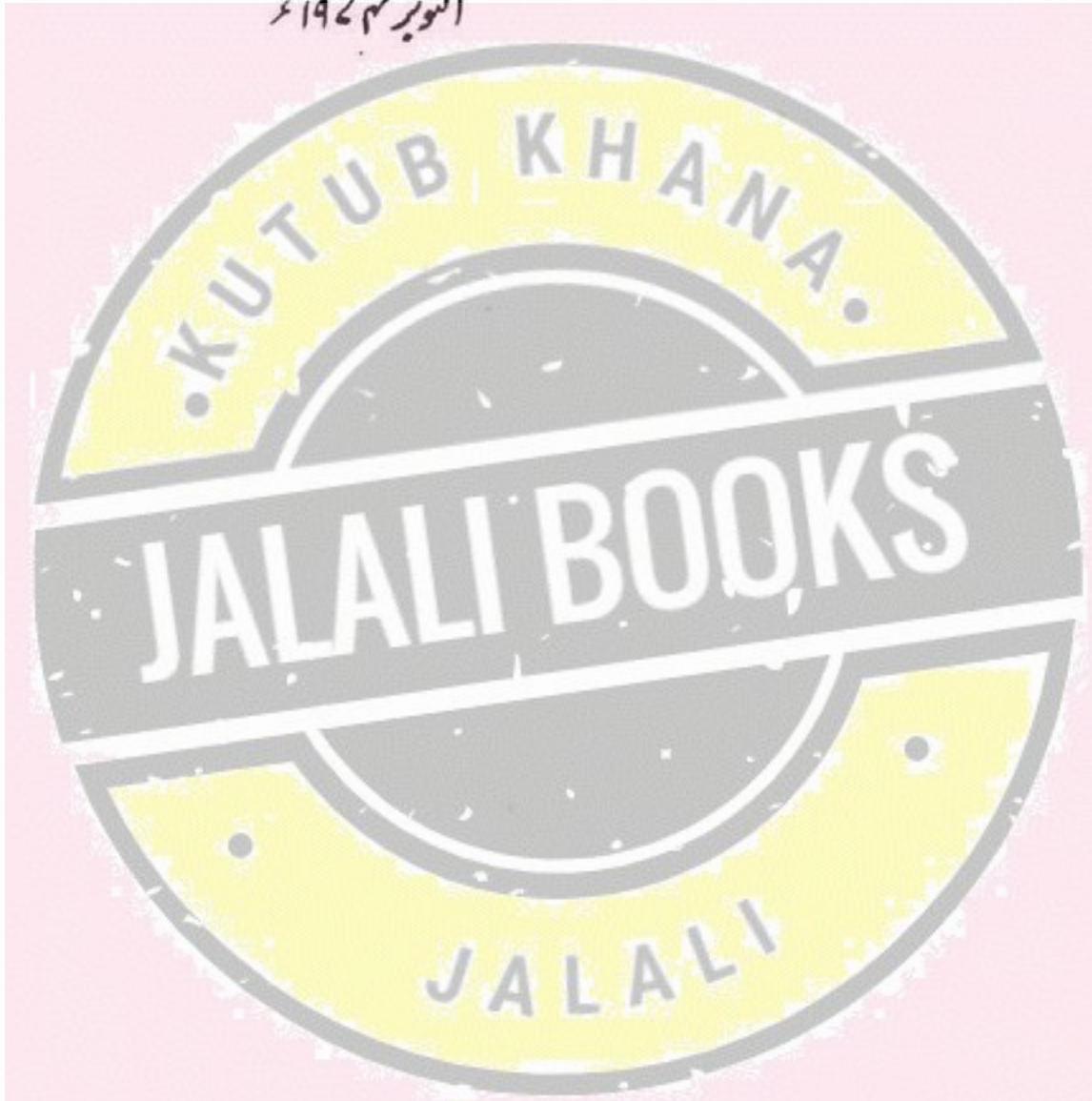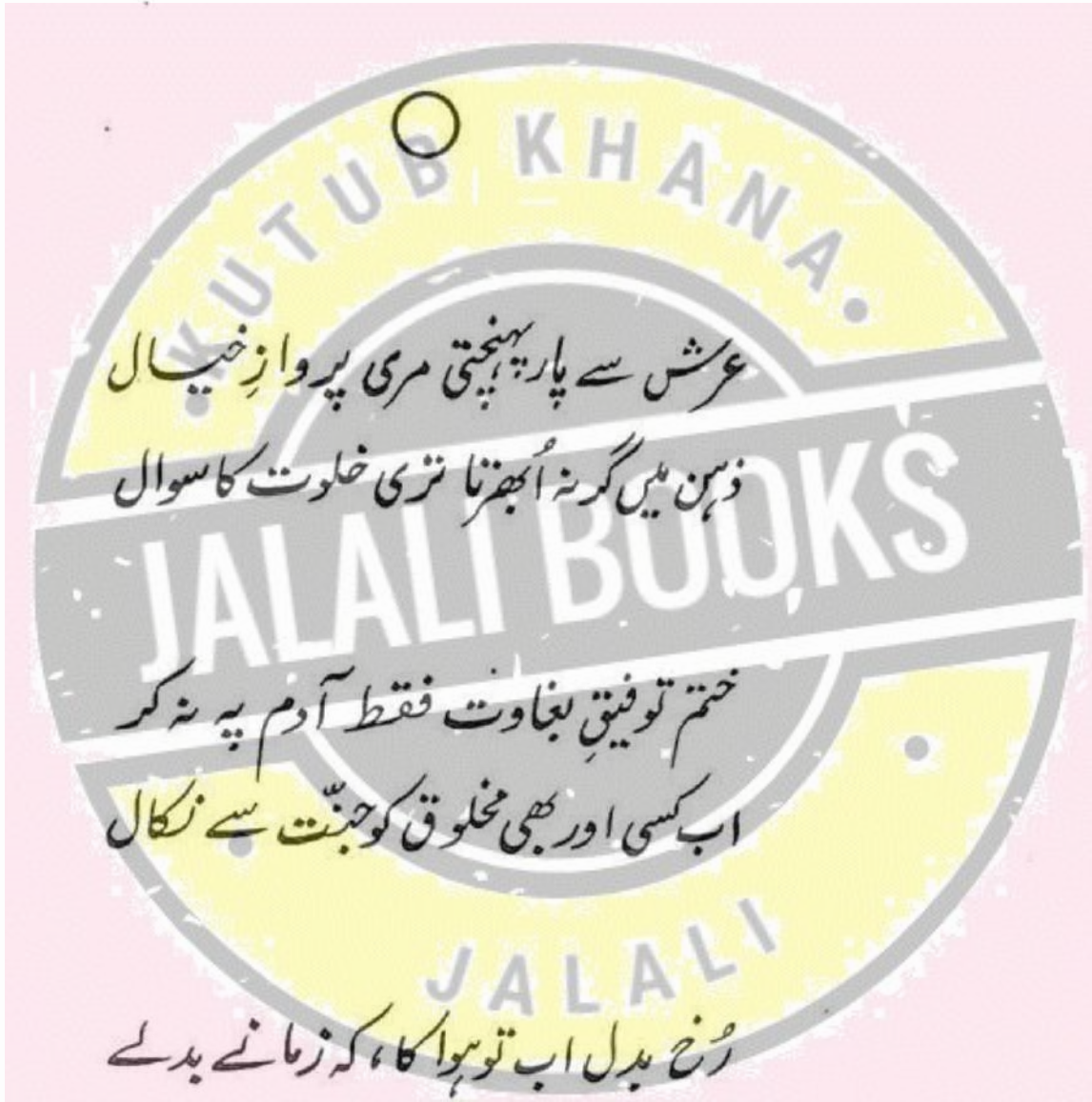
عرش سے پار پہنچتی مری پروازِ خیال
ذہن میں گر نہ اُبھرتا تری خلوت کا سوال

ختم توفیقِ بغاوت فقط آدم پہ نہ کر
اب کسی اور بھی مخلوق کو جنّت سے نکال

رُخ بدل اب تو ہوا کا، کہ زمانے بدلے
منتظر دشت ہیں کب سے، کہ چلے بادِ شمال

گھر سے ہر شخص نکلتا ہے شکاری بن کر
شہر میں جیسے چلے آئے ہوں صحرا کے غزال

دل اُجڑتے ہیں، جگر کٹتے ہیں، سر گرتے ہیں
یہ تجارت کے مراکز ہیں کہ میدانِ قتال

میرے ہر درد کا انجام مرے علم میں ہے
اِک نئی صبح کا پیغام ہے سُورج کا زوال

مجھ سے اِک پل کی بھی تقویم مکمّل نہ ہُوئی
کون رکھتا ہے محبّت میں حسابِ مہ و سال

اِنھی دھبّوں کو جو نزدیک سے دیکھو تو بہشت
میری غزلیں ہیں سمندر میں جزیروں کی مثال

آج بھی ہے مرا محبُوب وہی شخص ندیم
وقت کے ظلم سے مُرجھا گئے جس کے خد و خال

اکتوبر ۷۴ء ۱۹

○

میرے صحرا بھی ترے، میرا چمن بھی تیرا
مَیں بھی تیرا، مرا سرمایۂ فن بھی تیرا

اے مری راہ سے کترا کے نکلنے والے
مجھ کو تو یاد ہے بے ساختہ پن بھی تیرا

اجنبی سا کوئی بیٹھا مُجھے بہلاتا ہے
چہرہ تیرا ہے، تو چہرے پہ دہن بھی تیرا

تیری سانسوں میں تو لفظوں کی چھُپی ہیں گونجیں
یہ خموشی تو ہے اندازِ سخن بھی تیرا

رُوح کا حسُن بھی دکھلا، کہ ادھورا نہ رہے
حسُنِ صُورت بھی ترا، حسُنِ بدن بھی تیرا

ستمبر ۱۹۷۴ء

O

مستقبل پڑھنے والے تصویر ہوئے
دیواروں پر نقش نئے تحریر ہوئے

خود ہی اپنے تیروں کے نخچیر ہوئے
اپنی ذات میں جلتے لوگ اسیر ہوئے

روح کے کہساروں سے لاوا اُبل پڑا
جب انساں، محرومِ نانِ شعیر ہوئے
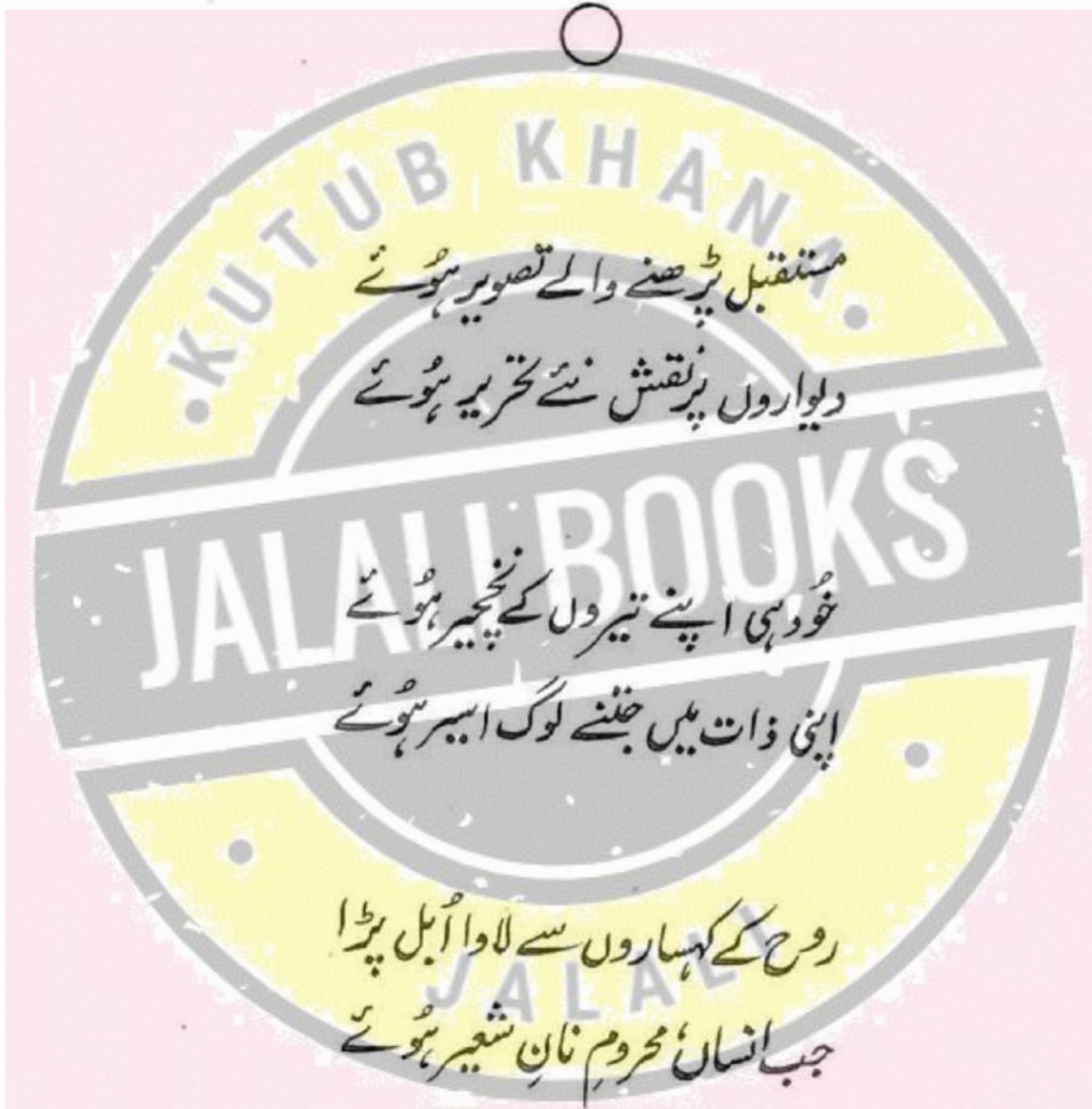
کاش اُس گھر کی دیواروں میں در ہوتا
دیوانے جس گھر میں بے زنجیر ہوئے

دل کی اِک اِک ضرب پہ ہے تیشے کا گماں
اپنے لیے تو سانس بھی جُوئے شیر ہُوئے

جب تک زندہ رہے ہم ۔ تنہا زندہ رہے
خاک ہُوئے تو سب کے دامن گیر ہُوئے

ہر منزل پر پھیل گئیں امکاں کی حدیں
خواب ہمارے خوابوں کی تعبیر ہُوئے

مسجد کے اندر مسجد تعمیر ہُوئی
جذبے ٹھنڈے، سجدے بے تاثیر ہُوئے

شعلۂ جاں کا پھول کھلا صحرا صحرا
اپنی آگ میں جل کر ہم اکسیر ہُوئے

اپنے دکھوں کا کوئی مداوا اب تو کرو
اب تو چاند ستارے بھی تسخیر ہُوئے

ہفت افلاک کی برفیں کب پگھلیں گی ندیمؔ
اب تو سات سمندر آتش گیر ہوئے

۱۹۷۴ء

○
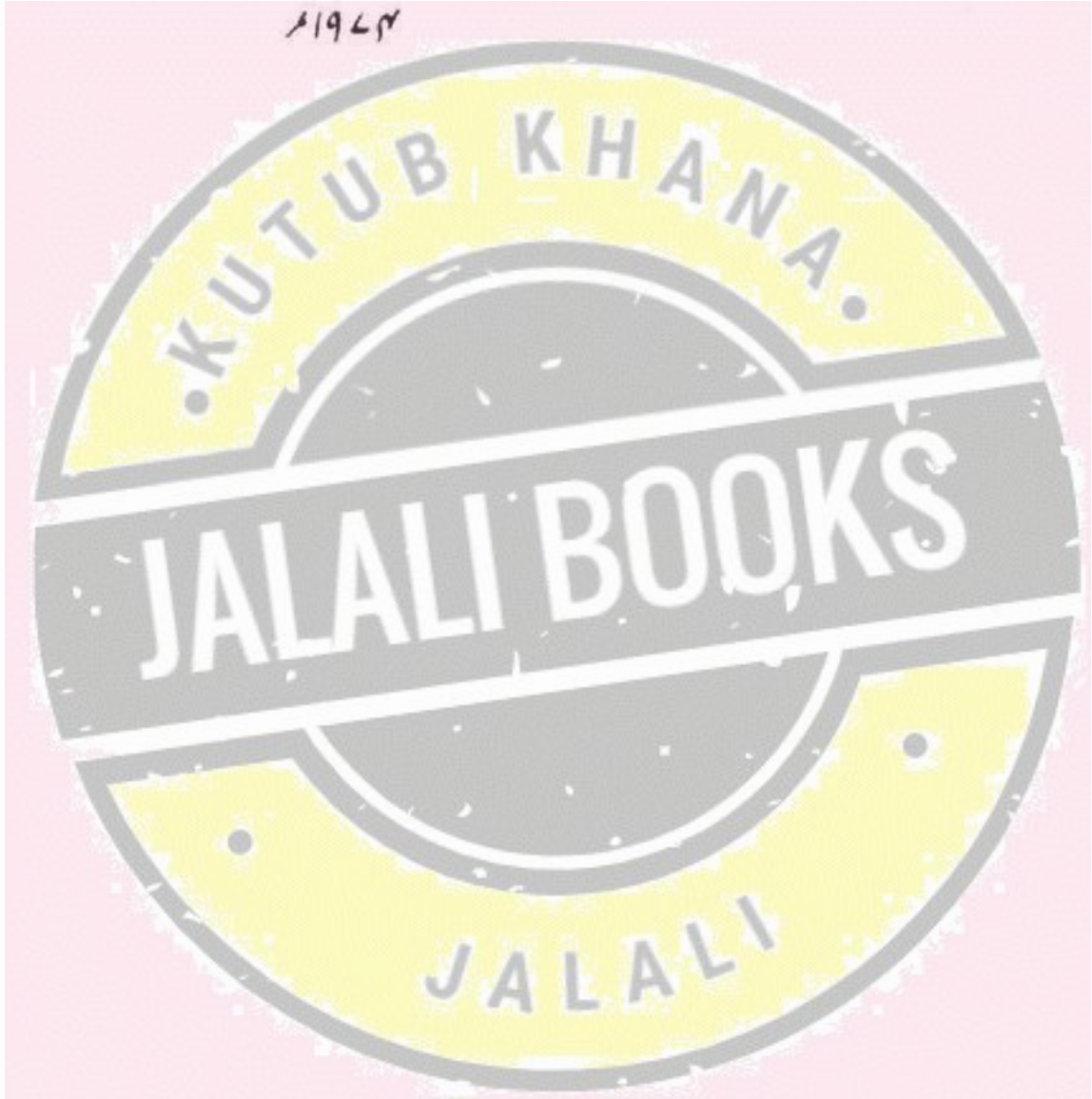
یہ کیا، کہ لمحۂ موجود کا ادب نہ کریں
اگر یہ شب ہے تو کیوں لوگ ذکرِ شب نہ کریں

نہ جانے کفر ہے یہ، یا جنونِ استغنا
ترے فقیر خدا سے بھی کچھ طلب نہ کریں

ترے کمالِ بلاغت سے ہم کو شکوہ ہے
جو گفتگو تری آنکھیں کریں، وہ لب نہ کریں

یہ عرض ہے کہ مرے حال پر مرے احباب
ترس جو کھانے چلے ہیں تو یہ غضب نہ کریں

کہیں وفا سرِ بازار بک نہ جائے ندیمؔ
کہ اب تو لوگ محبّت بھی بے سبب نہ کریں

دسمبر ۱۹۷۳ء

یہ جب تیری مشیت ہے تو کیا تقصیر میری ہے
تری تحریر آخر کس لیے تقدیر میری ہے

گھٹا جب دن کو شب کر دے، تو وہ تیرا کرشمہ ہے
جب اس کا حاشیہ چمکے، تو یہ تنویر میری ہے

غبارِ راہ سے کیوں ہمسفر گھبرائے جاتے ہیں
یہ ہے میری ہی مٹّی، اور دامن گیر میری ہے

مَیں اتنا بڑھ چکا ہُوں کارزارِ خُود شناسی میں
چلے گی جو مری گردن پہ، وہ شمشیر میری ہے

مَیں بعض آئینہ برداروں کے دل میں یُوں کھٹکتا ہُوں
وہ دیکھیں آئنہ، تو سامنے تصویر میری ہے

مری غزلیں ترے پیکر کی رعنائی کا پرتو ہیں
مرا فن حُسن تیرا ہے مگر تشہیر میری ہے

دسمبر ۱۹۷۳ء

مَیں دوستوں سے تھکا، دشمنوں میں جا بیٹھا
دُکھی تھے وہ بھی، سو مَیں اپنے دُکھ بھلا بیٹھا

سُنی جو شہرتِ آسودہ خاطری میری
وہ اپنے درد لیے، میرے دل میں آ بیٹھا

بس ایک بار غرورِ انا کو ٹھیس لگی
مَیں تیرے ہجر میں دستِ دُعا اُٹھا بیٹھا

خدا گواہ کہ لُٹ جاؤں گا، اگر میں کبھی
تجھے گنوا کے ترا درد بھی گنوا بیٹھا

ترا خیال جب آیا تو یوں ہُوا محسوس
قفس سے اُڑ کے پرندہ شجر پہ جا بیٹھا

سزا ملی ہے مجھے گردِ راہ بننے کی،
گنہ یہ ہے کہ میں کیوں راستہ دکھا بیٹھا

کٹے گی کیسے اس انجام ناشناس کی رات
ہَوا کے شوق میں جو شمع ہی بُجھا بیٹھا

مُجھے خُدا کی خدائی میں یُوں ہُوا محسوس
کہ جیسے عرش پہ ہو کوئی دُوسرا بیٹھا

دسمبر ۱۹۷۳ء

جب ترا حکم مِلا، ترک محبّت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا، کہ قیامت کر دی

تجھ سے کس طرح میں اظہارِ تمنّا کرتا
لفظ سُوجھا تو معانی نے بغاوت کر دی

مَیں تو سمجھا تھا کہ لوٹ آتے ہیں جانے والے
تُو نے جا کر تو جُدائی مری قِسمت کر دی

تجھ کو پُوجا ہے کہ اصنام پرستی کی ہے
مَیں نے وحدت کے مفاہیم کی کثرت کر دی

مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تیری اُلفت نے محبّت مری عادت کر دی

پُوچھ بیٹھا ہُوں مَیں تجھ سے ترے کُوچے کا پتہ
تیرے حالات نے کیسی تری صُورت کر دی

کیا ترا جسم، ترے حُسن کی حدّت میں جلا
راکھ کس نے تری سونے کی سی رنگت کر دی

ستمبر ۱۹۷۳ء

○

کتنے بہت سے رُوپ ہیں، حضرتِ آدمی کے بھی
ولولے داوری کے بھی، وسوسے کافری کے بھی

عشق جنوں سہی، مگر عشق فقط جنوں نہیں
ہوتے ہیں کچھ مطالبے عشق سے آگہی کے بھی

بُت شکنی کا مرتبہ یوں تو بلند ہے، مگر
اپنے ہی خاص لطف ہیں صنعتِ آزری کے بھی

یوں تو سمیٹ شوق سے نوشتۂ آخرت، مگر
وہ جو ہیں زندہ، ان پہ کچھ قرض ہیں زندگی کے بھی

کیسے مرا فقیہِ شہر میری سمجھ میں آسکے
ڈھنگ قلندری کے بھی، رنگ سکندری کے بھی

یُوں تو ہے شعر کا جمال، لفظ کا لَے سے اتّصال
مَیں نے چکھے ہیں ذائقے اس میں پیمبری کے بھی

ظلمتِ عمر کاٹ دی مَیں نے یہ سوچ کر ندیمؔ
چادرِ شب میں جا بجا، تار ہیں روشنی کے بھی

ستمبر ۱۹۷۳ء

کھڑا تھا کب سے، زمیں پیٹھ پر اُٹھائے ہُوئے
اب آدمی ہے قیامت سے لَو لگائے ہُوئے

یہ دشت سے اُمڈ آیا ہے کس کا سیلِ جنوں
کہ حسنِ شہر کھڑا ہے نقاب اُٹھائے ہُوئے

یہ بھید، تیرے سوا، اے خدا، کسے معلوم
عذاب ٹوٹ پڑے مجھ پہ، کس کے لائے ہُوئے

یہ سیلِ آب نہ تھا، زلزلہ تھا پانی کا
بکھر بکھر گئے قریے مرے بسائے ہُوئے

عجب تضاد میں کاٹا ہے زندگی کا سفر
لبوں پہ پیاس تھی، بادل تھے سر پہ چھائے ہوئے

سحر ہوئی تو کوئی اپنے گھر میں رُک نہ سکا
کسی کو یاد نہ آئے دیئے جلائے ہوئے

خدا کی شان، کہ منکر ہیں آدمیت کے
خود اپنی سکڑی ہوئی ذات کے ستائے ہوئے

جو آستینیں چڑھائیں بھی، مسکرائیں بھی
وہ لوگ ہیں مرے برسوں کے آزمائے ہوئے

وہ آدمی ہوں، کہ پیوندِ خاک ہو کر بھی
تنا رہوں گا، سر افلاک سے ملائے ہوئے

یہ انقلاب تو تعمیر کے مزاج میں ہے
گرائے جاتے ہیں ایواں بنے بنائے ہوئے

یہ اور بات، مرے بس میں تھی نہ گونج ان کی
مجھے تو مدّتیں گزریں یہ گیت گائے ہُوئے

مری ہی گود میں کیوں کٹ کے گر پڑے ہیں ندیمؔ
ابھی دُعا کے لیے تھے جو ہاتھ اُٹھائے ہُوئے

سیلابِ اگست
۱۹۷۳ء
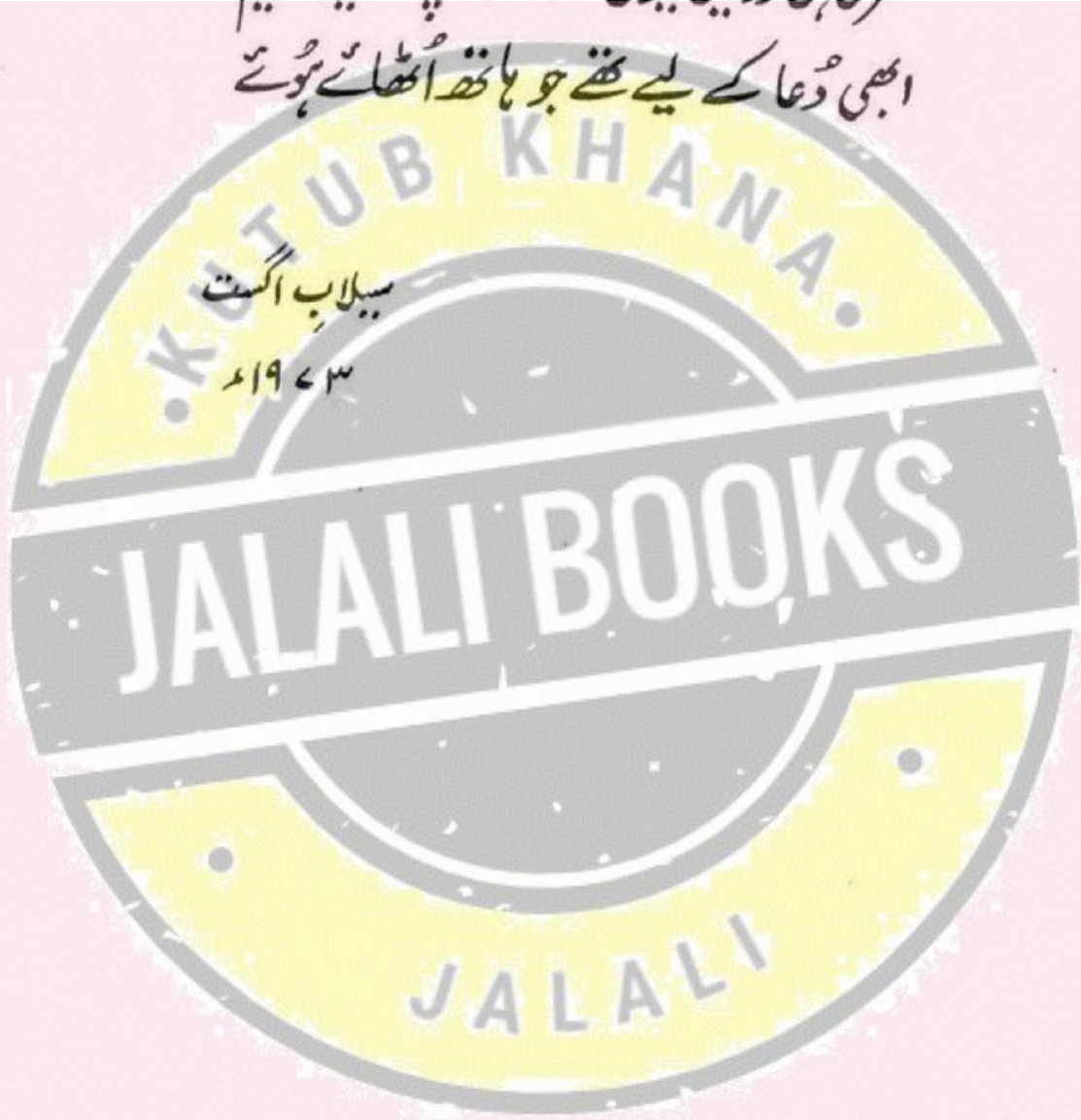
ببول کوہ پہ تھی، دشت میں صنوبر تھے
یہ تیرے عدل کے ماتھے پہ کیسے زیور تھے!

الٰہی! کس کے اشارے سے مجھ پہ ٹوٹ پڑے
وہ بے لگام عناصر، جو میرے چاکر تھے

ہوا چلی تو قیامت، گھٹا اُٹھی تو بلا
یہ خاص قسم کے احساں ترے، مُجھی پر تھے

گرفتِ آب میں ہیں جن کی میتوں کے ہجوم
یہ آدمی ترے تاجِ شہی کے گوہر تھے

یہ رزق بانٹتے تھے اس بھری خدائی میں
بہت غریب، مگر کتنے بندہ پرور تھے

رواں دواں تھے مرے کھیت سطحِ دریا پر
عجیب فصل اُگی تھی، عجیب منظر تھے

اُٹھی ہوئی ہے جو ملبے سے اس زمیں پہ کبھی
گھنے درخت تھے اور گونجتے ہوئے گھر تھے

میں شہرِ نغمہ و نے میں پلٹ کے جب آیا
گرا ہوئی تھیں چھتیں، اور سینہ زن در تھے

سزا ملی یہ ثمر ور درخت بننے کی
کہ عمر بھر مری قسمت میں صرف پتھر تھے

عجیب شان سے نکلا تھا دوستوں کا جلوس
کہ پھول ہاتھ میں، اور آستیں میں خنجر تھے

فلک کی طرح بدلتی ہے رُوپ دھرتی بھی
سُنا ہے، اب جو ہیں صحرا، کبھی سمندر تھے

مَیں جِن کو چُن کے اب اِک آشیاں بناؤں گا
کبھی یہی خس و خاشاک میرے شہپر تھے

ندیمؔ موسمِ باراں تو قتلِ عام سا تھا
کہ دستِ ابر میں بُوندیں نہیں تھیں، نشتر تھے

سیلابِ اگست
۱۹۷۳ء

فنا کی سمت ہے رُخ زندگی کے دھارے کا
مری نظر کو نہیں حوصلہ نظارے کا

ابھی کچھ اور بھی اصنام ڈھالے جائیں گے
کہ آدمی ابھی محتاج ہے سہارے کا

فضائے عصرِ رواں میں رچی ہے دم زدگی
غزال بھول گئے ہیں چلن طرارے کا

حیات، برف کے کہسار کھودنے میں کٹی
مجھے گماں سا ہُوا تھا یہاں شرارے کا

میں اشک پونچھ تو لوں شب گزیدہ آنکھوں سے
میں منتظر ہوں تری صبح کے اشارے کا

گواہ ہے کہ کبھی ڈوبتا نہیں خورشید
بس اتنا کام ہے ظلمات میں ستارے کا

محبت ایک سمندر ہے، وہ بھی اتنا بسیط
کہ اس میں کوئی تصوّر نہیں کنارے کا

ندیم، فن کے مجھے پینترے نہیں آتے
جو بات حق ہو تو کیا کام استعارے کا

اگست ۱۹۷۳ء

اِک بُت مجھے بھی گوشۂ دل میں پڑا ملا
واعظ کو وہم ہے کہ اُسی کو خُدا ملا

حیرت ہے، اس نے اپنی پرستش ہی کیوں نہ کی
جب آدمی کو پہلے پہل آئینہ ملا

خورشیدِ زندگی کی تمازت غضب کی تھی
تو راہ میں مِلا تو شجر کا مزا ملا

دیکھا جو غور سے تو مجسّم تجھی میں تھا
وہ حُسن جو خیال سے بھی ماورا ملا

سینے میں تیری یاد کے طوفان جب اُٹھے
ذہن اِک بگولا بن کے ستاروں سے جا مِلا

مُجھ سے بچھڑ کے، یوسفِ بے کارواں ہے تُو
مُجھ کو تو، خیر، درد مِلا، تُجھ کو کیا مِلا

دن بھر جلائیں مَیں نے اُمیدوں کی مشعلیں
جب رات آئی، گھر کا دِیا تک بُجھا مِلا

یارب، یہ کس نے ٹکڑے کیے روزِ حشر کے
مُجھ کو تو گام گام پہ محشر بپا مِلا

محکوم ہو کچھ ایسا کہ آزاد سا لگے،
انساں کو دَورِ نَو میں یہ منصب نیا مِلا

ماضی سے مُجھ کو یُوں تو عقیدت رہی، مگر
اُس راستے میں جو بھی نگر تھا، لُٹا مِلا

دشتِ فراق میں وہ بصیرت مِلی ، ندیمؔ
جو مجھ سے چھن گیا تھا ، وہی جا بجا مِلا

O

مَیں ہُوں تیرا کہ تُو شیدا میرا
بس یہ جھگڑا رہا تیرا میرا

کیا یہ کچھ کم ہے، کہ دل توڑ کے بھی
تُو نے پندار نہ توڑا میرا
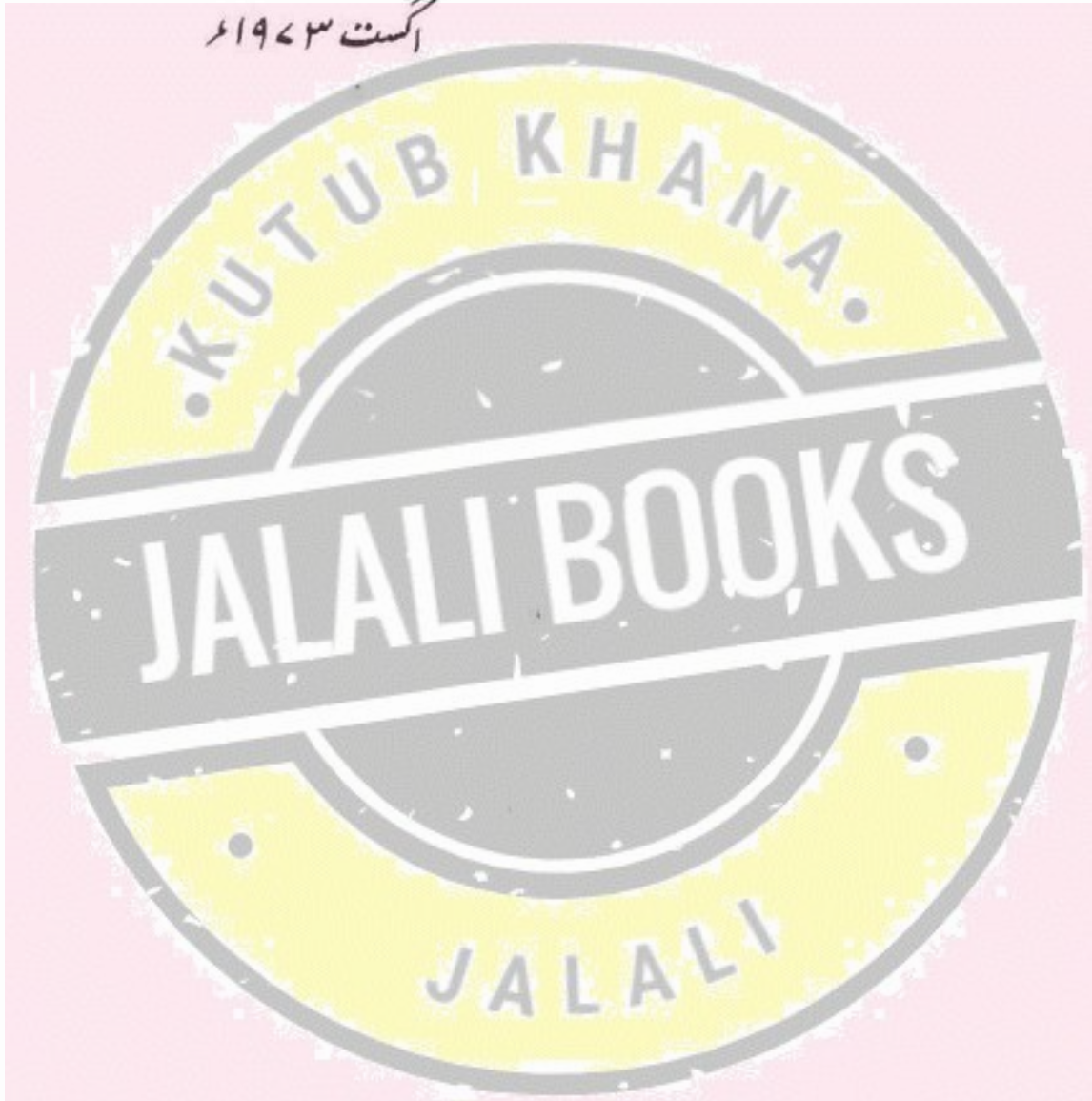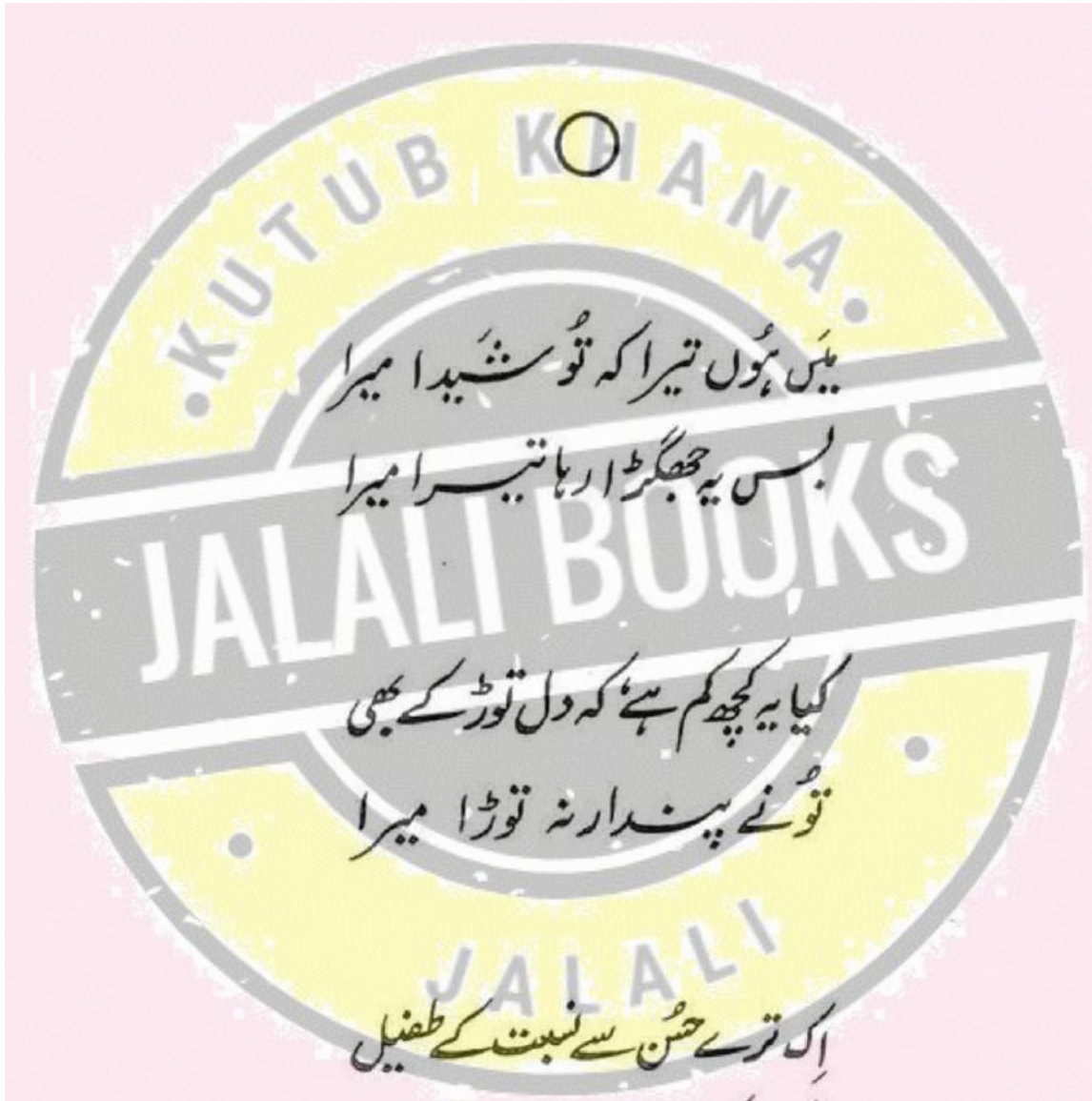
اِک ترے حُسن سے نسبت کے طفیل
لوگ تکتے رہے چہرہ میرا

چاند ڈُوبا تو مَیں اُبھرا، لیکن
تُو نے رستہ ہی نہ دیکھا میرا

رو رہا ہُوں، مگر آنسو گم ہیں
میرا سینہ ہے کہ صحرا میرا

اپنی فطرت میں تو ساون ہوں، مگر
عمر بھر ابر نہ برسا میرا

زندہ ہونے کی ہوس لاکھوں میں
اور مصلوب مسیحا میرا

اِک خدا ہے کہ اُترتا ہی نہیں
حشر صدیوں سے ہے برپا میرا

سُوئے خورشید سفر جُرم نہیں
کیوں تعاقب میں ہے سایہ میرا

خُون میں ڈوب کے، اے صُبحِ وطن
رنگ کیسا نکھر آیا میرا

ہار جانا مری فطرت میں نہیں،
رات اس کی ہے، ستارہ میرا

ڈوبنا سیکھ جو پانا ہے مجھے
میری گہرائی، کنارا میرا

شعر ہونے ہی، نکل آتا ہے
آستیں سے یدِ بیضا میرا

دوست بھی چونک کے تکتے ہیں مجھے
میرا دشمن ہوا چرچا میرا

مَیں تو مر جاؤں گا، لیکن یارو
کبھی آئے گا زمانہ میرا

جون ۱۹۷۳ء

میں کسی شخص سے بیزار نہیں ہو سکتا
ایک ذرّہ بھی تو بے کار نہیں ہو سکتا

اس قدر پیار ہے انساں کی خطاؤں سے مجھے
کہ فرشتہ مرا معیار نہیں ہو سکتا

اے خدا! پھر یہ جہنّم کا تماشا کیا ہے؟
تیرا شہکار تو فی النّار نہیں ہو سکتا
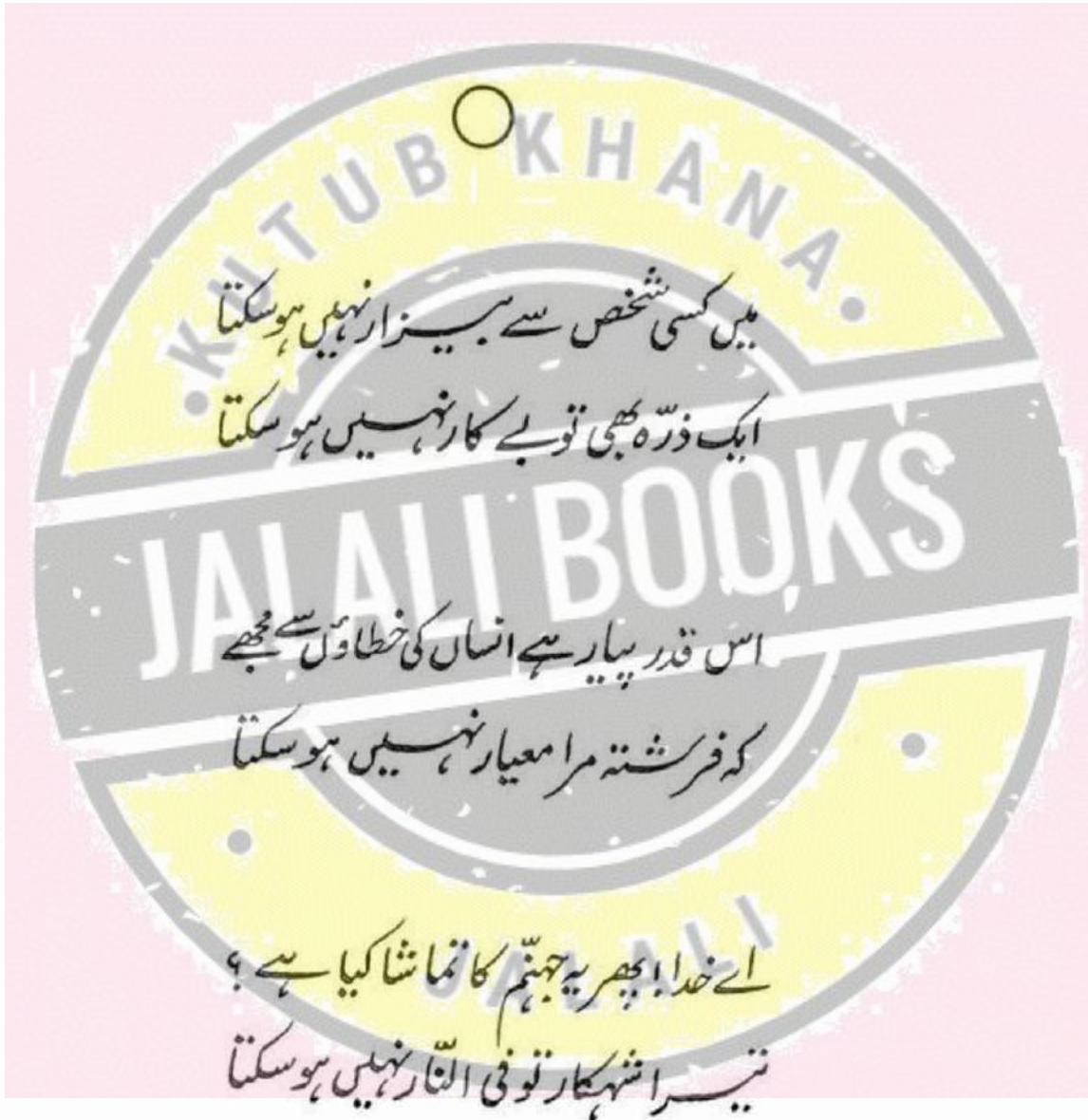
اے حقیقت کو فقط خواب سمجھنے والے!
تو کبھی صاحبِ اسرار نہیں ہو سکتا

تُو، جو اک موجۂ نکہت سے بھی چونک اُٹھتا ہے
حشر آتا ہے تو بیدار نہیں ہو سکتا

سرِ دیوار یہ کیوں نرخ کی تکرار ہُوئی
گھر کا آنگن کبھی بازار نہیں ہو سکتا

راکھ سی، مجلسِ اقوام کی چُٹکی میں ہے کیا!
کچھ بھی ہو، یہ مرا پندار نہیں ہو سکتا

اس حقیقت کو سمجھنے میں لُٹایا کیا کچھ
میرا دشمن مرا غمخوار نہیں ہو سکتا

مَیں نے بھیجا تجھے ایوانِ حکومت میں مگر
اب تو برسوں ترا دیدار نہیں ہو سکتا

تیرگی، چاہے ستاروں سے سفارش لائے
رات سے مجھ کو سروکار نہیں ہو سکتا

وہ جو شعروں میں ہے اک شے پسِ الفاظ ندیمؔ
اس کا الفاظ میں اظہار نہیں ہو سکتا

مئی ۱۹۷۳ء
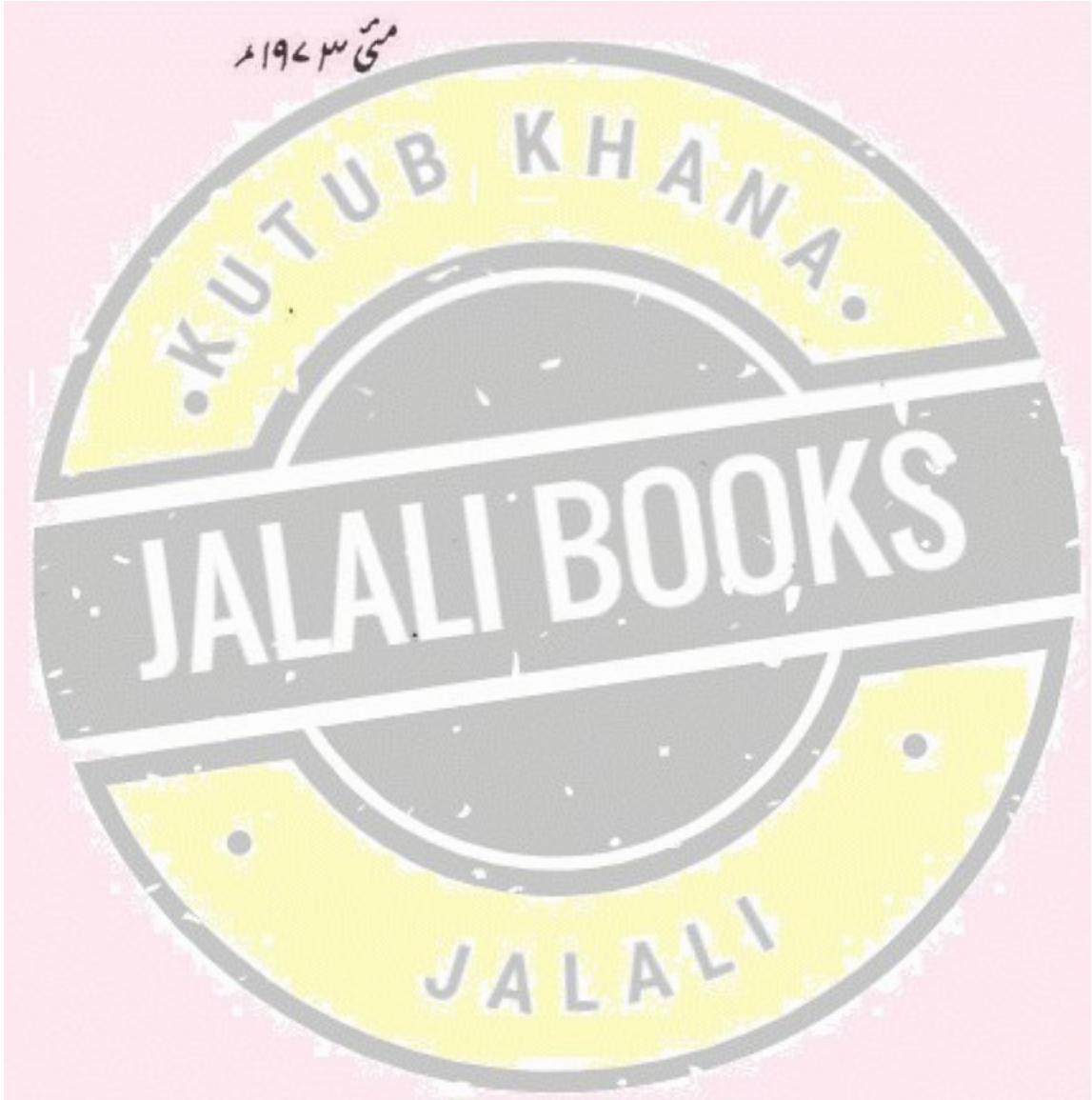
کہیں تو میری محبّت میں گھل رہا ہی نہ ہو
خدا کرے، تجھے یہ تجربہ ہوا ہی نہ ہو

سپردگی مرا معیار تو نہیں، لیکن
میں سوچتا ہوں، ترے رُوپ میں خدا ہی نہ ہو

میں تجھ کو پا کے بھی کس شخص کی تلاش میں ہوں
مرے خیال میں کوئی ترے سوا ہی نہ ہو

وہ عذر کر، کہ مرے دل کو بھی یقیں آئے
وہ گیت گا، کہ جو مَیں نے کبھی سُنا ہی نہ ہو

وہ بات کر، جسے پھیلا کے مَیں غزل کہہ لوُں
سُنا وہ شعر، جو مَیں نے ابھی کہا ہی نہ ہو

سحر کو دل کی طرف اک دُھواں سا کیسا ہے!
کہیں یہ میرا دیا رات بھر جلا ہی نہ ہو

ہو کیسے جبرِ مشیّت کو اُس دُعا کا لحاظ
جو ایک بار ملے، پھر کبھی جُدا ہی نہ ہو

یہ ابر و کِشت کی دُنیا میں کیسے ممکن ہے
کہ عمر بھر کی وفا کا کوئی صِلہ ہی نہ ہو

مری نگاہ میں وہ پیڑ بھی ہے بدکردار
لدا ہُوا ہو جو پھل سے، مگر جُھکا ہی نہ ہو

جو دشت سے پھُولوں کی بھیک مانگتا تھا
کہیں وہ توڑ کے کشکول، مر گیا ہی نہ ہو

طلوعِ صبح نے چمکا دیے ہیں ابر کے چاک
ندیم یہ مرا دامانِ مدّعا ہی نہ ہو

مئی ۱۹۷۳ء
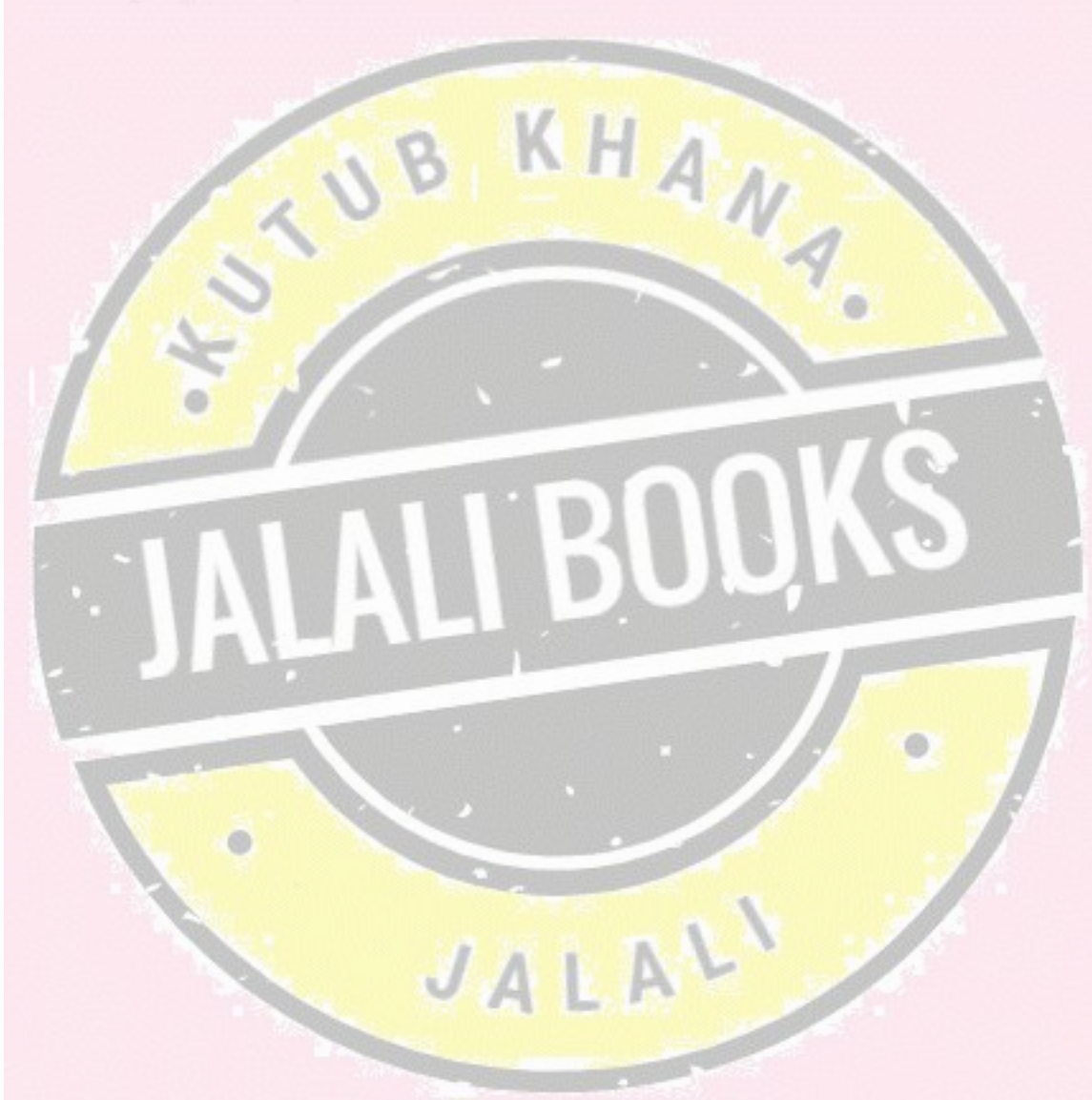
تجھ سے ملتے ہی، بچھڑنا ترا یاد آتا ہے
ابر اُٹھتا ہے تو کوندا بھی لپک جاتا ہے

تیرے پیکر کا ہے ہر زاویہ محفوظ اِن میں
مجھ کو اپنے ہی خیالات پہ رشک آتا ہے

یہ تصرّف ہے ترے حُسن کا — یا عجز مرا
ایک چہرہ، کئی چہروں میں نظر آتا ہے

اتنی شدّت ہے روایت سے بغاوت میں — کہ آج
آدمی پیار بھی کرتے ہوئے شرماتا ہے

عمر کا ہے یہ تقاضا، کہ زمانے کا مزاج
درد اُٹھتا ہے تو اب طیش بھی آجاتا ہے

میرا ہر قول گر آئینہ ہے اوروں کے لیے
میرا ہر فعل مجھے آئنہ دکھلاتا ہے

اس لیے وقت سا جابر بھی خدا بن نہ سکا
جب کوئی قبر میں اُترے تو یہ اِتراتا ہے

شانِ جمہور تو جب ہے کہ ہر انسان کہے
میرا حاکم، مرا ہر حکم بجا لاتا ہے

مارچ ۱۹۷۳ء

جانے، کون رہزن ہیں! جانے، کون رہبر ہیں
گرد گرد چہرے ہیں، آئنے مکدّر ہیں

مجھ کو جبر لفظوں کا، بولنے نہیں دیتا
ورنہ جتنے صحرا ہیں، ریت کے سمندر ہیں

بیسویں صدی کیسا انقلاب لائی ہے
کوہ پر ببولیں ہیں، دشت میں صنوبر ہیں
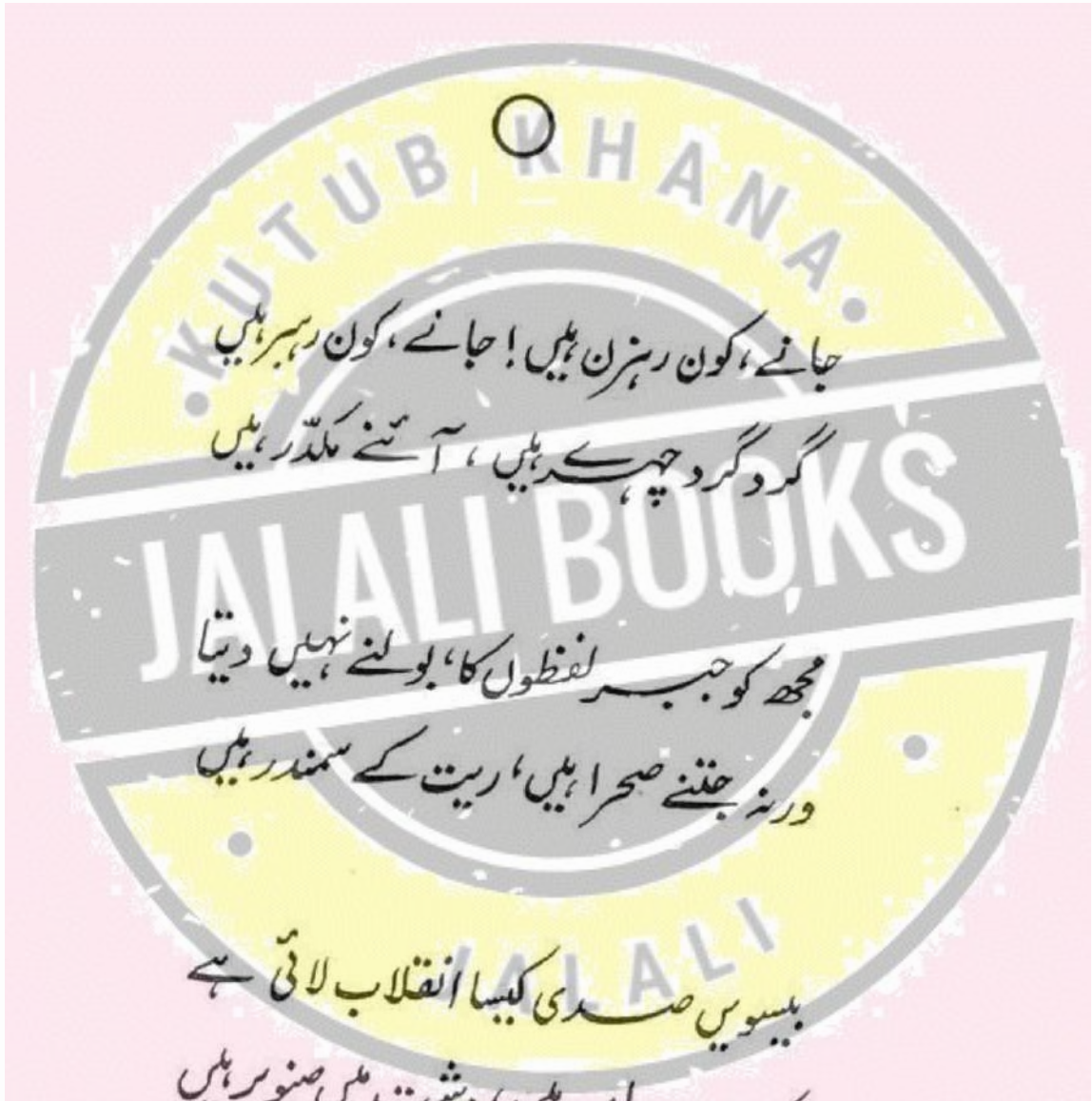
جب سے ایک چڑیا نے شیر کو پچھاڑا ہے
فاختہ کی آنکھوں میں قاتلوں کے تیور ہیں

دائیں بائیں میرے ساتھ اِک ہجوم رہتا ہے
دوستوں کی یادیں ہیں، دشمنوں کے لشکر ہیں

سُوئے جسم و جاں دیکھوں، یا ہیں یہ سماں دیکھوں
پھُول پھُول ہاتھوں میں کیسے کیسے پتھّر ہیں

بے زباں کا لہجہ کچھ نرم پڑ گیا، ورنہ
مالک اب بھی مالک ہیں، چاکر اب بھی چاکر ہیں

سوت پہنے بیٹھے ہیں یہ جو فرشِ مرمر پر
نام کے قلندر ہیں، بخت کے سکندر ہیں

صبر کیوں دلاتے ہو، ضبط کیوں سکھاتے ہو
مجھ کو کتنی صدیوں کے یہ سبق تو ازبر ہیں

زندگی تھی جنّت بھی، زندگی تھی دوزخ بھی
داورا! یہ انساں کے دیکھے بھالے منظر ہیں

کرب میرے شعروں کا، انبساطِ فردا ہے
اشک جو ہیں آنکھوں میں، سیپیوں میں گوہر ہیں

فروری
۱۹۷۳ء
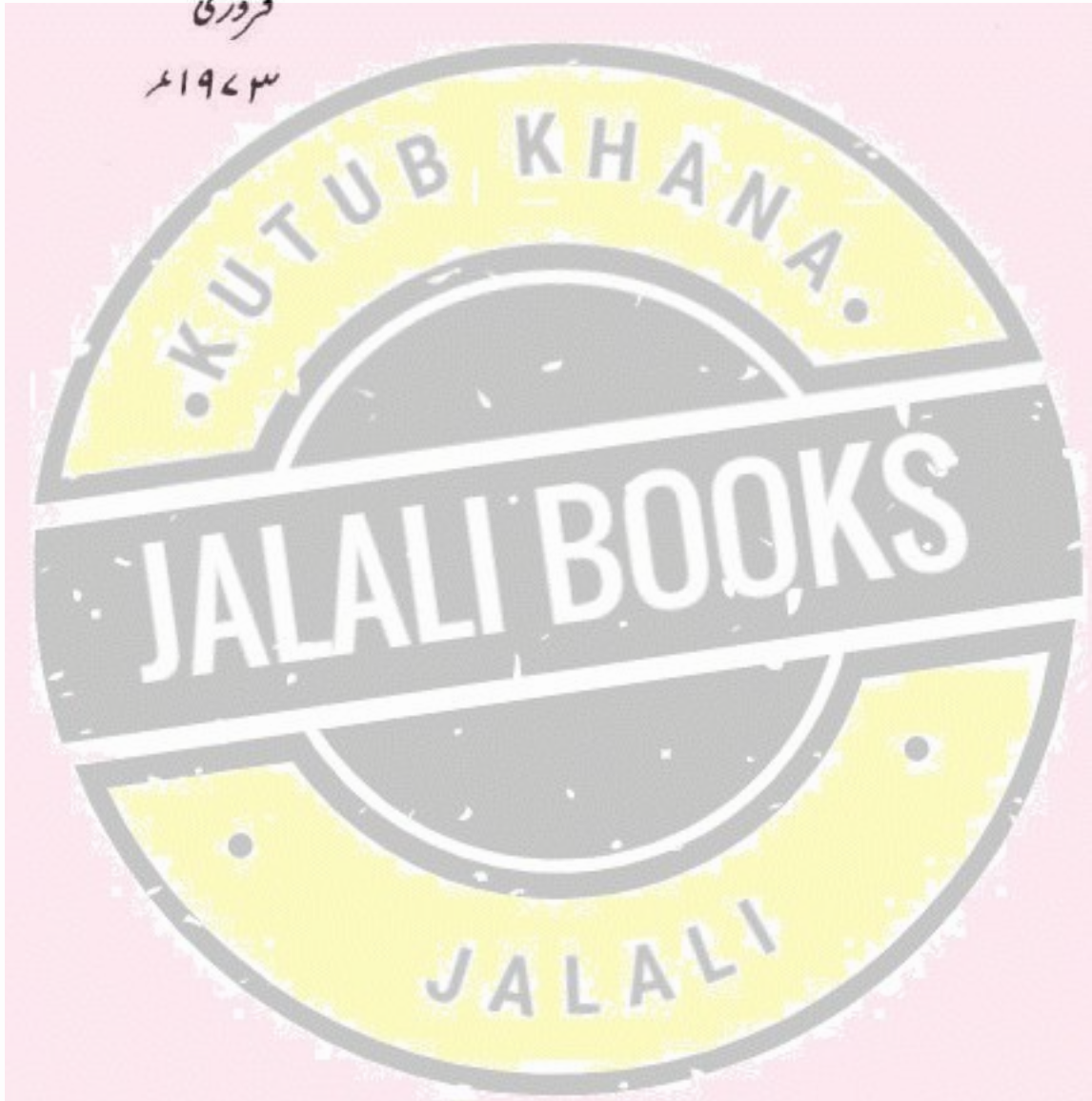
یہ ہو رہی ہیں جو سرگوشیاں ہواؤں میں
چھپی ہوئی ہیں کئی بجلیاں گھٹاؤں میں

کہیں یہ قربِ قیامت نہ ہو، کہ سنّاٹا
سسک رہا ہے پرانی محلسراؤں میں

عروسِ حسن تو کھیتوں سے شہر کو چل دی
نہ بج سکی کوئی شہنائی میرے گاؤں میں

وہی بجھی ہوئی آنکھوں میں اڑتی راکھ سہی
مگر رکی نہ جواں بیٹیوں کو ماؤں میں

ضمیرِ زندہ نہیں آفتابِ حشر سے کم
کہ بچ کے دھوپ سے، اب جل رہا ہوں چھاؤں میں

اب ایسے دَور کو واپس نہ لاؤ بہرِ خدا
گنے گئے تھے سلاطیں بھی جب خداؤں میں

نومبر ۱۹۷۲ء
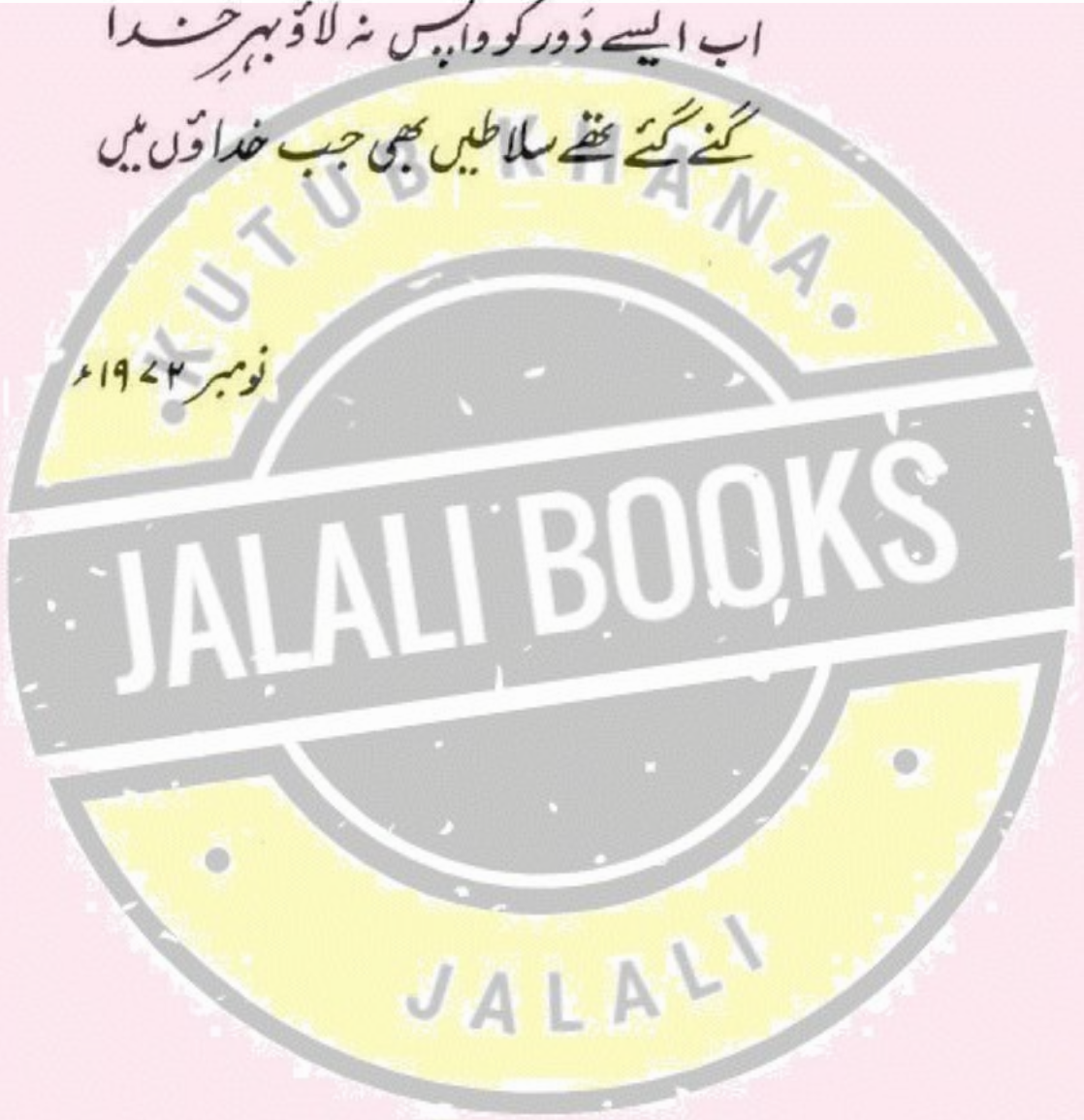
مَیں حقائق میں گرفتار ہُوں، وہموں میں نہیں
کوئی نغمہ مری زنجیر کی کڑیوں میں نہیں

ٹخنوں ٹخنوں مَیں پتاور میں کھڑا سوچتا ہُوں
جتنے پتّے ہیں یہاں، اُتنے درختوں میں نہیں

شہر والو! یہ گھروندے ہیں، یہ گلیاں ہیں، یہ کھیت
گاؤں والوں کی جو پُوچھو تو وہ گاؤں میں نہیں

غیر محسوس بہاروں کا وہ دَور آیا ہے،
رنگ غنچوں میں نہیں، نگہتیں پھُولوں میں نہیں

میں جو روؤں، کوئی ہوتا نہیں ہنسنے والا
جو سکوں دشت میں دیکھا ہے، وہ شہروں میں نہیں

گرد کیسی، کہ کوئی قافلہ آیا نہ گیا
نقشِ پا کیسے، کوئی گونج بھی رستوں میں نہیں

اس زمانے کے جو دُکھ ہیں، وہ نرالے دُکھ ہیں
کچھ علاج ان کا، بزرگوں کی بیاضوں میں نہیں

صرف دہقان کے خرمن کو بھلا کیوں تاکے
برق حالات میں ہوتی ہے، گھٹاؤں میں نہیں

پَل گزرتا ہے کہ جل جاتا ہے اِک سیّارہ
وقت کا راز جو لمحوں میں ہے، صَدیوں میں نہیں

رہنماؤں سے بس اِتنا سا گلہ ہے مُجھ کو
ان کے ہونٹوں پہ جو باتیں ہیں، وہ ذہنوں میں نہیں

پاؤں مٹی نے وہ پکڑے ہیں، کہ ہلنا ہے محال،
اب کوئی لطف خیالوں کی اُڑانوں میں نہیں

شعر میں بات چھپانے کی روش ترک کرو
اب تو افلاک کے اسرار بھی پردوں میں نہیں

اکتوبر ۱۹۷۲ء

آنکھیں تری، کیوں لُٹی ہُوئی ہیں
یہ ہرنیاں کیوں ڈری ہُوئی ہیں

شمعیں تو ہیں پُتلیوں میں روشن
اندر سے مگر بُجھی ہُوئی ہیں

کیا آئینۂ نگاہ ٹوٹا
سب صُورتیں کیوں کٹی ہُوئی ہیں
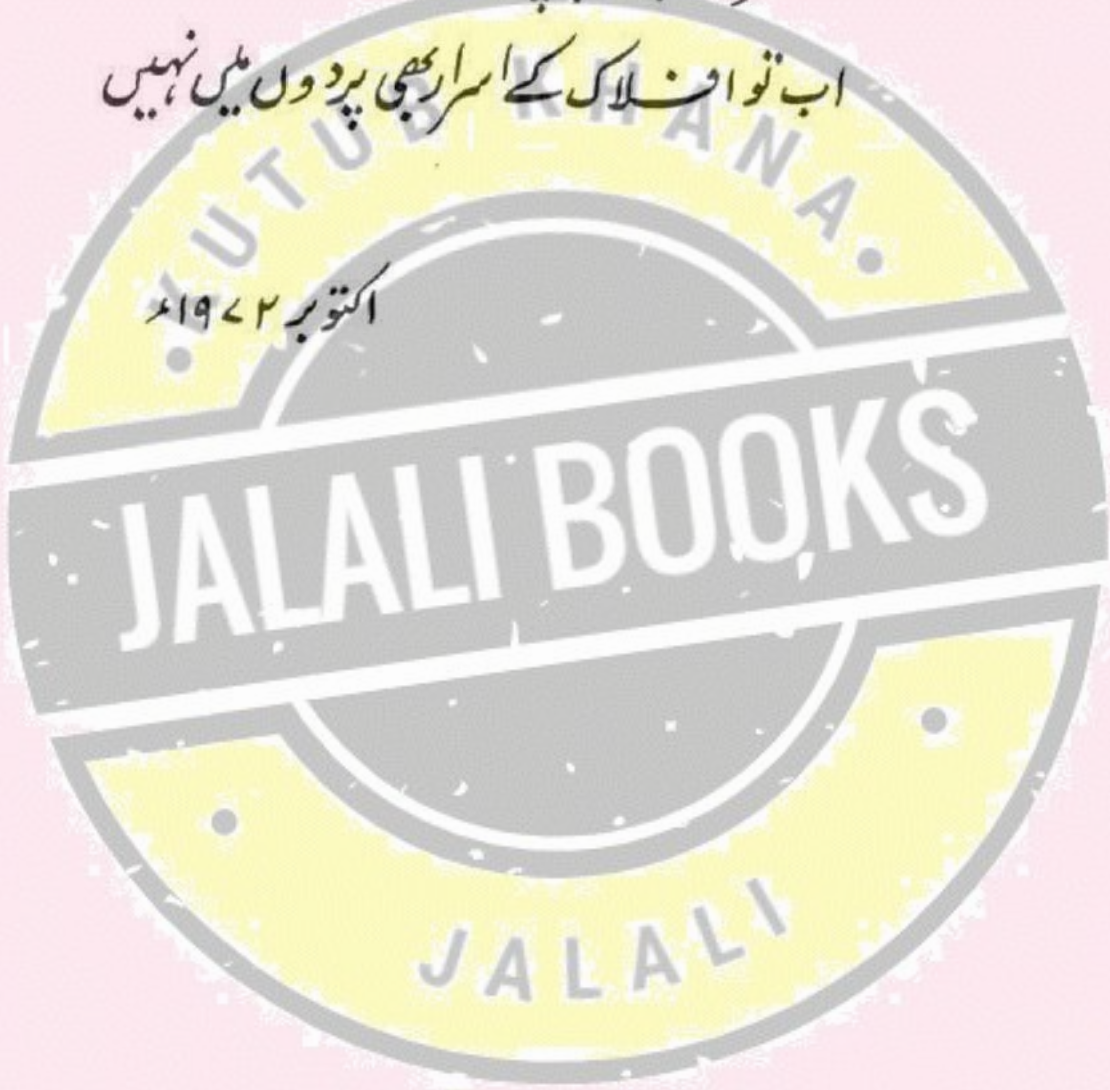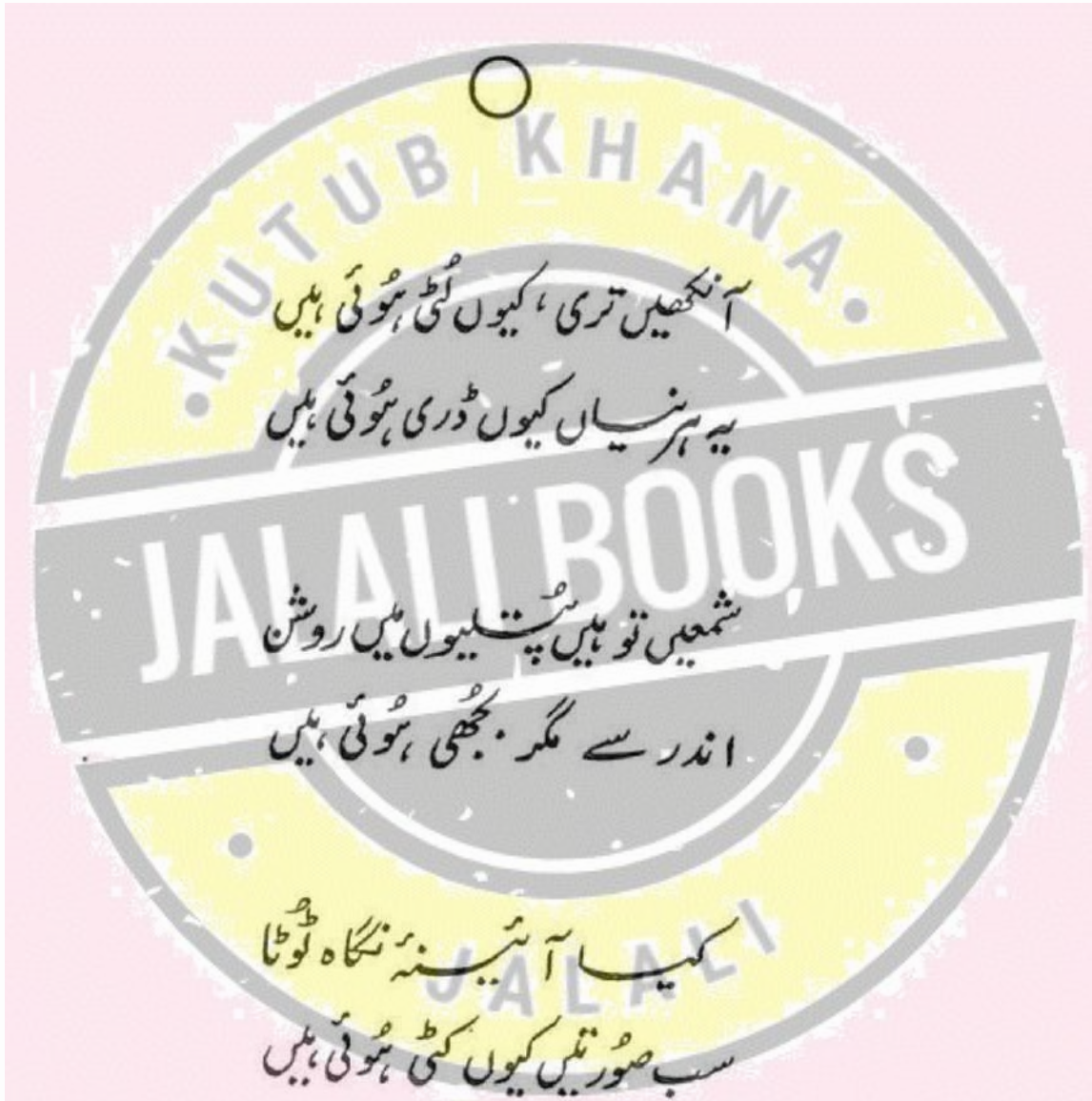
ہر ایک چٹان بولتی ہے
شکلیں سی عجب بنی ہُوئی ہیں

گو سب کے دہن میں ہیں زبانیں
تالُو سے مگر سِلی ہُوئی ہیں

دل دشت ہے، اور اس میں یادیں
لاشوں کی طرح پڑی ہُوئی ہیں

سُورج تو چمک رہا ہے سر پر
قدموں میں شبیں بچھی ہُوئی ہیں

دروازہ محل کا ہے مقفّل
گو کھڑکیاں سب کھُلی ہُوئی ہیں

شائستہ، شاعری کہاں ہیں
غزلیں تو بہت کہی ہُوئی ہیں

اکتوبر ۱۹۷۲ء

موت کی انجمن آرائی ہے
اور خدا ہے کہ تماشائی ہے

میرا بھائی بھی ہے دشمن میرا
میرا دشمن بھی مرا بھائی ہے

برگِ گُل ہُوں سرِ سیلاب ہُوا
جستجو دشت میں لے آئی ہے
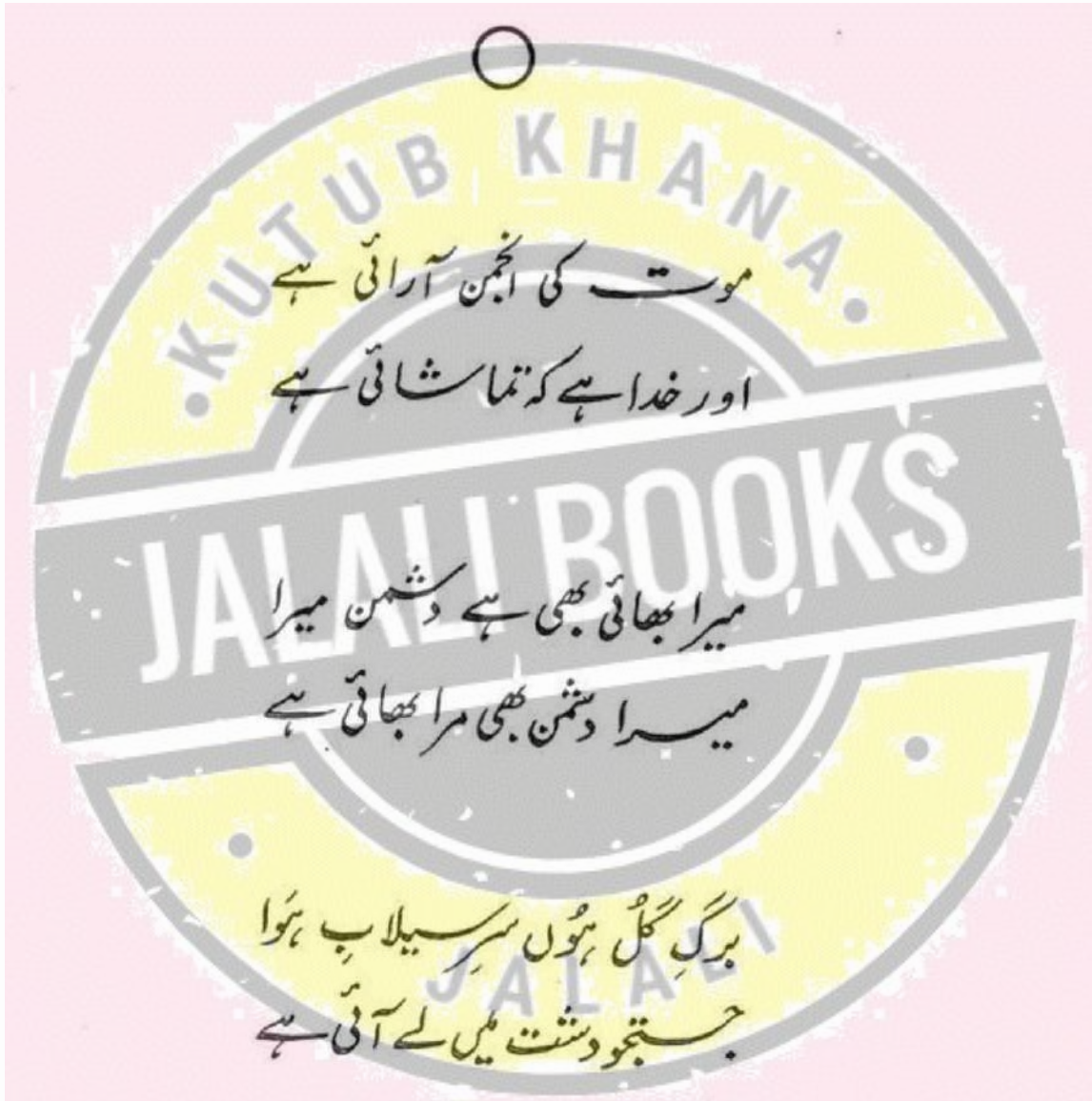
لوگ شہروں میں بھی تنہا کیوں ہیں
رُخ پہ کیوں وحشتِ صحرائی ہے

کس نے دُنیا کی حقیقت سمجھی
جس نے سمجھی وہی سودائی ہے

روشنی کے لیے گھر پھُونک دیا
میری دشمن مری دانائی ہے

کتنی صدیوں سے مَیں پیاسا ہُوں ندیمؔ
کتنی صدیوں سے گھٹا چھائی ہے

جون ۱۹۷۲ء

نئے انساں کی جو رعنائی ہے
ادھ کھلی نیند کی انگڑائی ہے

لفظ، معنی سے جُدا اُس کے بغیر
وہ مری قوتِ گویائی ہے

اُس کو تکتا ہُوا ں کہ دم توڑتا ہُوں
آنکھ روشن ہے کہ پتھرائی ہے
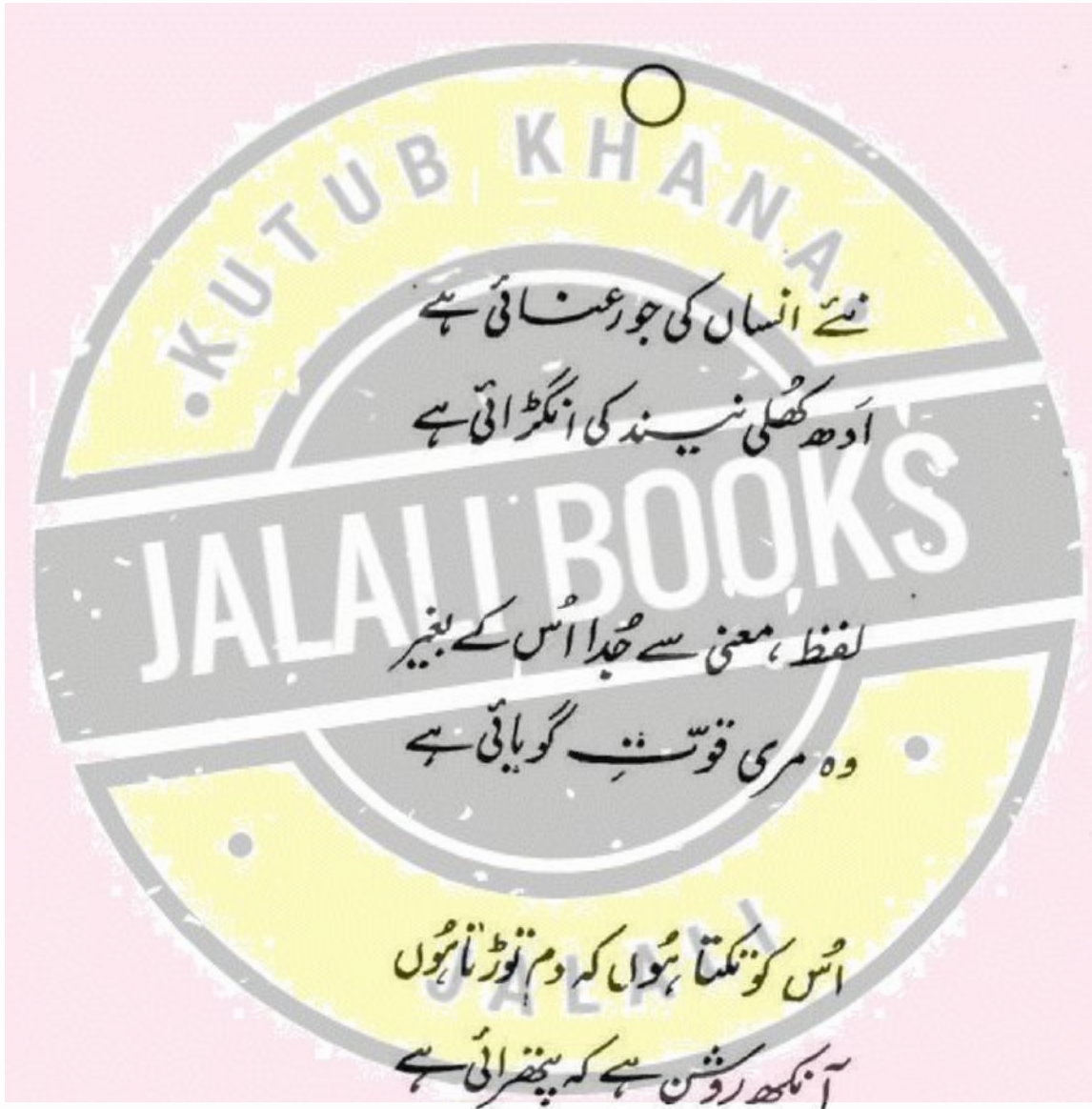
کتنا سادہ ہُوں، کہ مَیں سمجھا تھا
دن، حریفِ شبِ تنہائی ہے

روز مرتا ہوں تو جیتا بھی ہوں
یہ مرا شغلِ مسیحائی ہے

آئنہ لا کے مقابل رکھ لے
زندگی انجمن آرائی ہے

جون
۱۹۷۲ء

خلا میں پرتوِ آدم دکھائی دیتا ہے
یہ رہگزار مجھے نم دکھائی دیتا ہے

کبھی چمن میں، کبھی ذہن میں، ہوائیں کبھی
جو آنے والا ہو موسم، دکھائی دیتا ہے

اُڑا کے لے گئی پتّے، خزاں کی تُند ہوا
شجر علامتِ ماتم دکھائی دیتا ہے
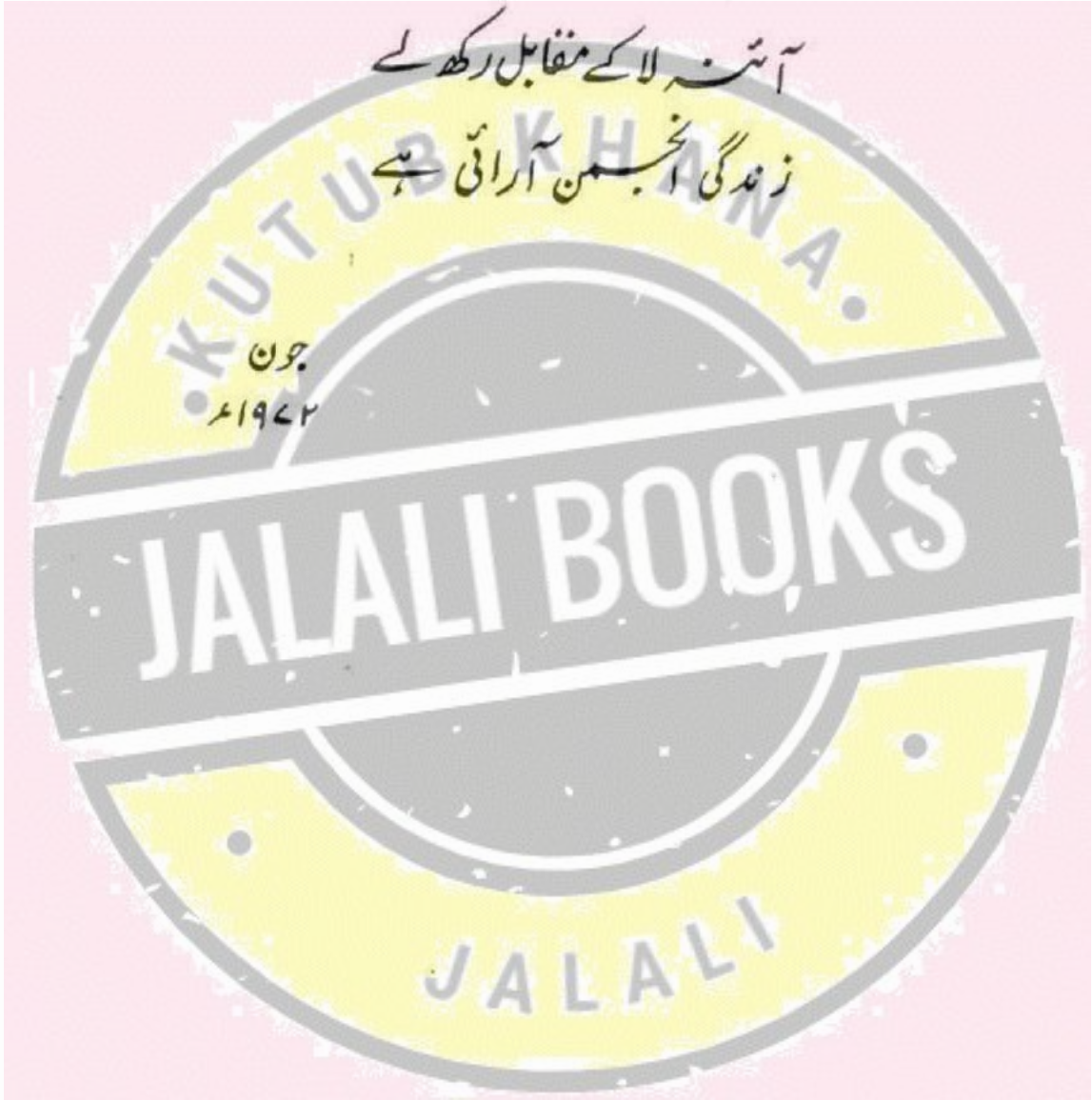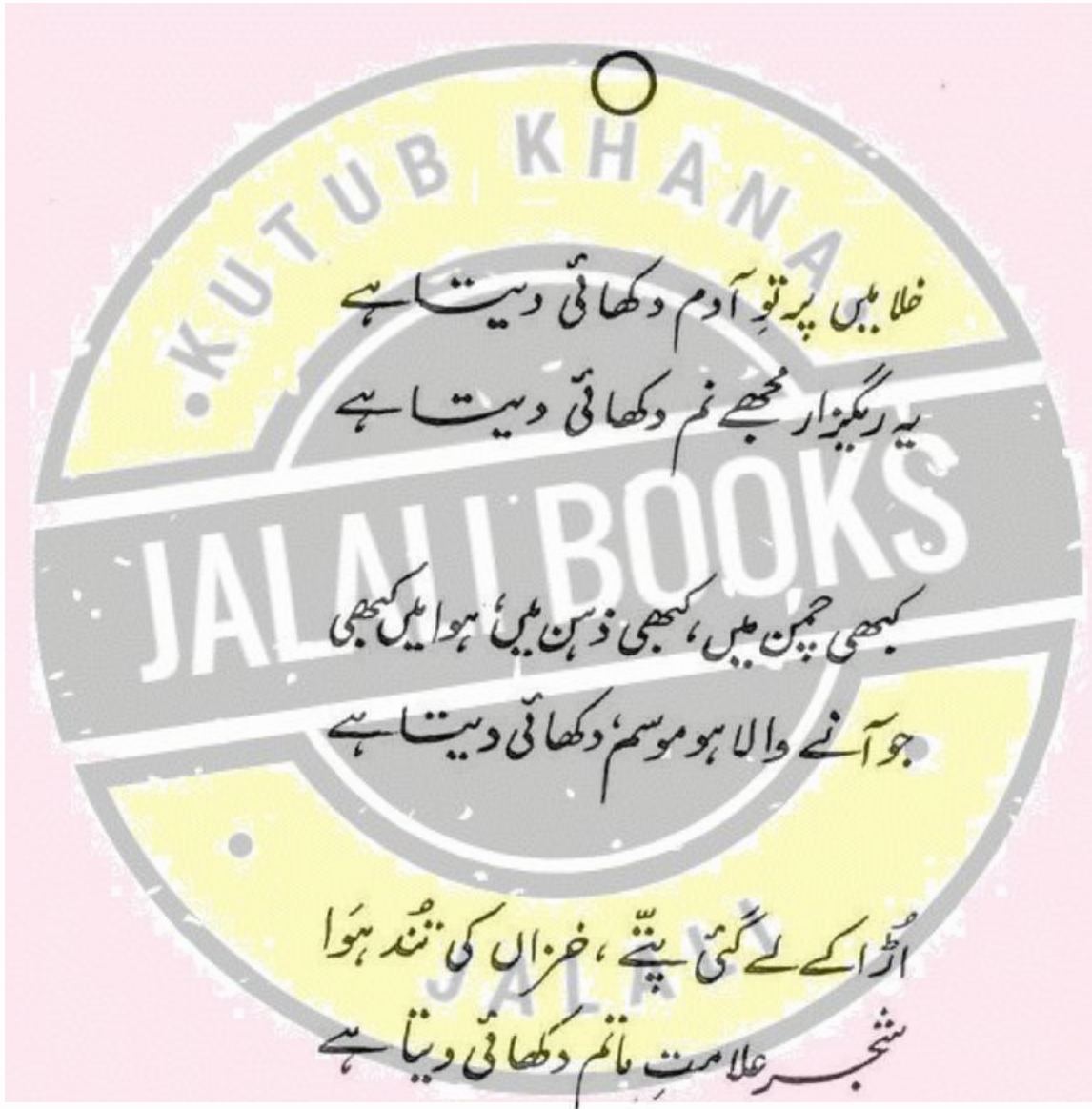
مجھی کو میرے مقابل نہ لا، خدا کے لیے
اِس آئینے میں مجھے کم دکھائی دیتا ہے

قریب تھا تو نظر خال و خد پہ رُک نہ سکی
تو جب سے دُور ہے، پیہم دکھائی دیتا ہے

تجھے خطوطِ بدن کی قسم، خدا مت بن
خدا تو وہ ہے جو مبہم دکھائی دیتا ہے

زمیں وہ کعبۂ تخلیقِ حسن و فن ہے ندیمؔ
سرِ فلک بھی جہاں خم دکھائی دیتا ہے

اپریل ۱۹۷۲ء
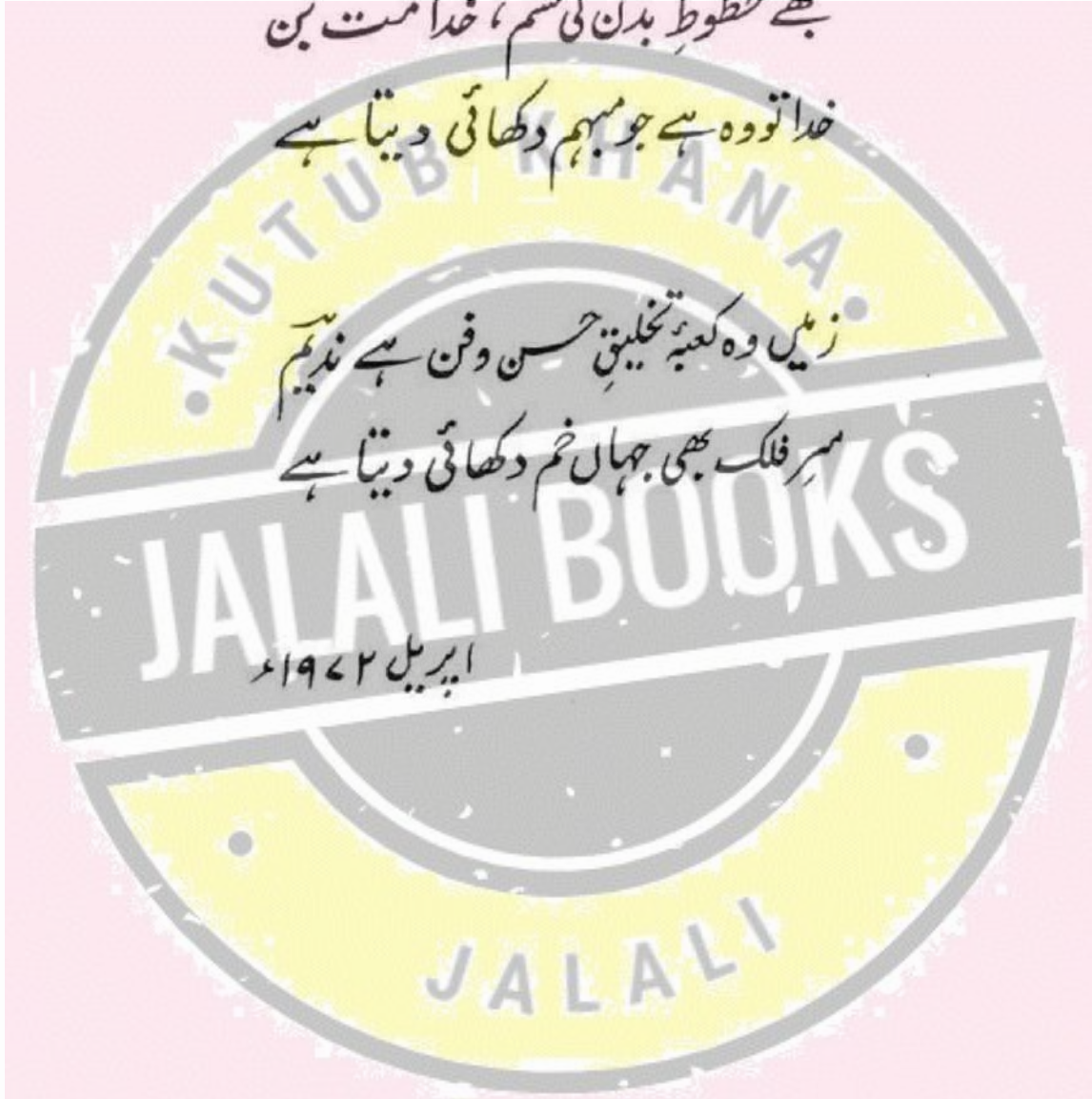
چارہ گرو، کیوں اُلجھاتے ہو غنچہ و گل کے فسانوں میں
مَیں چمنستان سے گزر کر پہنچا ہُوں ویرانوں میں

حُسن کا ساماں بیچو، لیکن حسن کو تو بِکنے سے بچاؤ
یارو، کوئی فرق تو رکھو گھروں میں اور دکانوں میں

عصرِ رواں کا تقاضا شاید رستہ تکنا ہے، ورنہ
مِل جاتے یا مر جاتے تھے لوگ قدیم افسانوں میں

ایک حقیقت یہ ہے کہ تم جب دل میں اُترے، دل میں رہے
ایک روایت یہ ہے کہ یُوسف رُکتے نہیں کنعانوں میں

تم نے میرے دل کا کعبہ کتنے بتوں سے پاٹ دیا
اور اُدھر کعبے بستے ہیں لُٹے ہوئے بت خانوں میں

اب تم آئے ہو تو مری جاں، زحمتِ لطف و کرم نہ کرو
گُل کیا، آنسو تک نہیں رُکتے پھٹے ہوئے دامانوں میں

حشر تو برپا ہوگا لیکن حشر نہیں برپا ہوگا
جب تک مہر و وفا کی رسمیں زندہ ہیں انسانوں میں

میری غزل کے آئینے میں جھانکو گے تو مانو گے
تم سا حسیں پیدا ہوتا ہے کئی ہزار زمانوں میں

یہ جو ندیم مرے شعروں میں سازِ محبت بجتا ہے
گونج کچھ ایسی ہی تو سُنی تھی روزِ ازل کی اذانوں میں

فروری ۱۹۷۲ء

جب سے ہم تقسیم ہوئے ہیں نسلوں اور زبانوں میں
حائل ہیں کتنے آئینے آپس کی پہچانوں میں

آدمیوں نے اب تک اپنے حسن کا محور پایا نہیں
اب بھی سرشتِ انسانی کے جھگڑے ہیں نادانوں میں

خود میرے دامن کی ہَوا نے اسی چراغ سے لَو چھینی
مَیں نے جس کو روشن رکھا صدیوں کے طوفانوں میں

رات کی پچھلی گھڑیوں میں، جب روشنیاں گُل ہوتی ہیں
اک آسیب سا ڈگ بھرتا ہے، بڑے بڑے ایوانوں میں

کہساروں پر جس کے دم سے آتشِ دل گلزار بنے
وُہی ہوا کیوں آگ لگائے، جب اُترے میدانوں میں

نام جو روشن ہو تو اِس کا، برق گرے تو اُن پہ گرے
ایک رئیس نے اپنے خرمن بانٹ دیے دہقانوں میں

چاند پہ لوگ اب پہنچے، لیکن "پس ماندہ" قوموں کے کسان
وقت کو کب سے تول رہے ہیں تاروں کی میزانوں میں

میری اِک اِک نیکی چمکے میرے عوام کے چہروں پر
میرے گناہوں کی فہرستیں شاہوں کے فرمانوں میں

ایسی نسل سے امن و سکوں کی آخر کون اُمید کرے
جس کی ساری عُمر کٹی ہو جنگوں اور بحرانوں میں

درِ عدالت پر اب دستک دُوں تو کیسے دُوں کہ ندیمؔ
سائل بوٹی بوٹی ہو کر بٹنے لگے دربانوں میں

فروری ۱۹۷۲ء

طوفان ہے ، ہمرکاب میرا
ہر خیمہ ہے بے طناب میرا

کتنی سفّاک ہے حقیقت
مٹی میں مِلا ہے خواب میرا

ہاں، شب تو گزر چکی ہے کب کی
اُبھرا نہیں آفتاب میرا
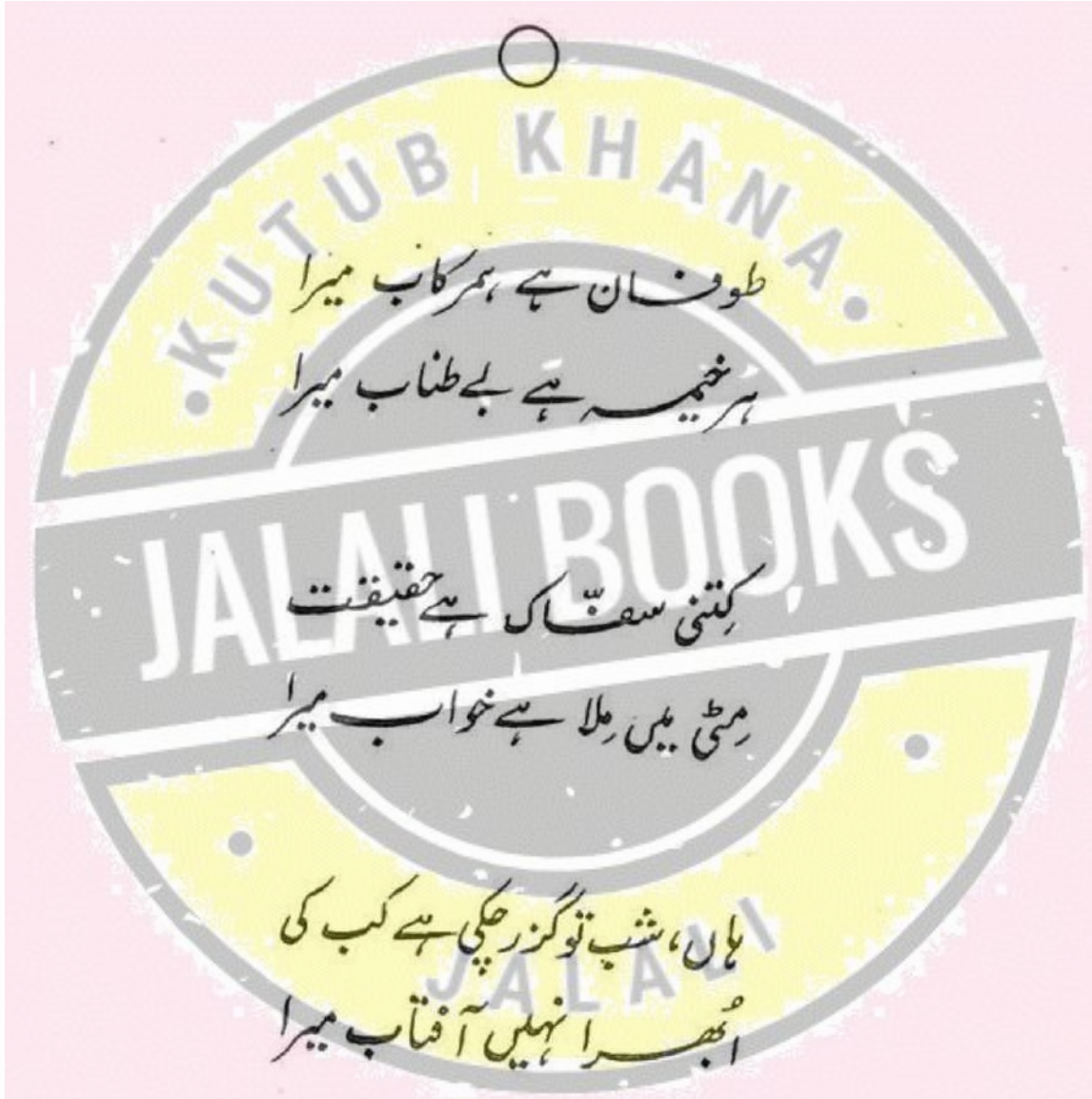
مَیں خود کو چھُپا رہا ہُوں خود سے
بادل مرے ، ماہتاب میرا

دُھندلے دُھندلے سبھی مناظر
ہے دیدۂ دل پُر آب میرا

اے کاش، کہیں برس بھی جاتا
گرجا تو بہت، سحاب میرا

شاید مرے رہنما سمجھ لیں
شعروں میں سہی خطاب میرا

جو پُوچھنے تھے سوال مجھ سے
سُنتے ہی نہ تھے جواب میرا

کتراتے رہے جو آئنوں سے
کرتے رہے احتساب میرا

اے سنگ زنو! بہار آئی
پتھّر پہ کھِلا گلاب میرا

میں دشتِ بلا میں لَو دِیے کی
با معنی ہے پیچ و تاب میرا

دُنیا بھی تو حشر ہے الٰہی!
دُنیا ہی میں کر حساب میرا

آسودہ ہیں سارے انقلابی
اب آئے گا انقلاب میرا

جنوری ۱۹۷۲ء

کیا خبر تھی، یہ زمانے بھی ہیں آنے والے
سوتے رہ جائیں گے سوتوں کو جگانے والے

میری آنکھیں مجھے لَوٹا ـ کہ تجھے دیکھ تو لوں
اے بصارت کے چراغوں کو بجھانے والے

عمر کاٹوں گا ترے ذہن کی جراحی میں
اے مجھے میری ذہانت سے بچانے والے

خود تری عمر تو گندم کے نشے میں گزری
اے مجھے فتنۂ گندم سے ڈرانے والے

جب مری پیاس سے ڈھلتا تھا تزا بادۂ ناب
اب وُہ ایّام نہیں لَوٹ کے آنے والے

سر بر آوردہ ہیں اُس وقت ترے ہجو نگار
سر بزانو ہیں قصیدے ترے گانے والے

خود سے ہو جاتے ہیں اِک دن متعارف آخر
وقت کی جھیل کو آئینہ بنانے والے

لوگ اُس وقت کو آشوبِ جہاں کہتے ہیں
سر اُٹھا لیتے ہیں جب ناز اُٹھانے والے

جانے اب تک تُو کہاں تھا، کہ دکھائی نہ دیا
اے مجُھے حدِّ نظر تک نظر آنے والے

۱۳- جنوری ۱۹۷۲ء
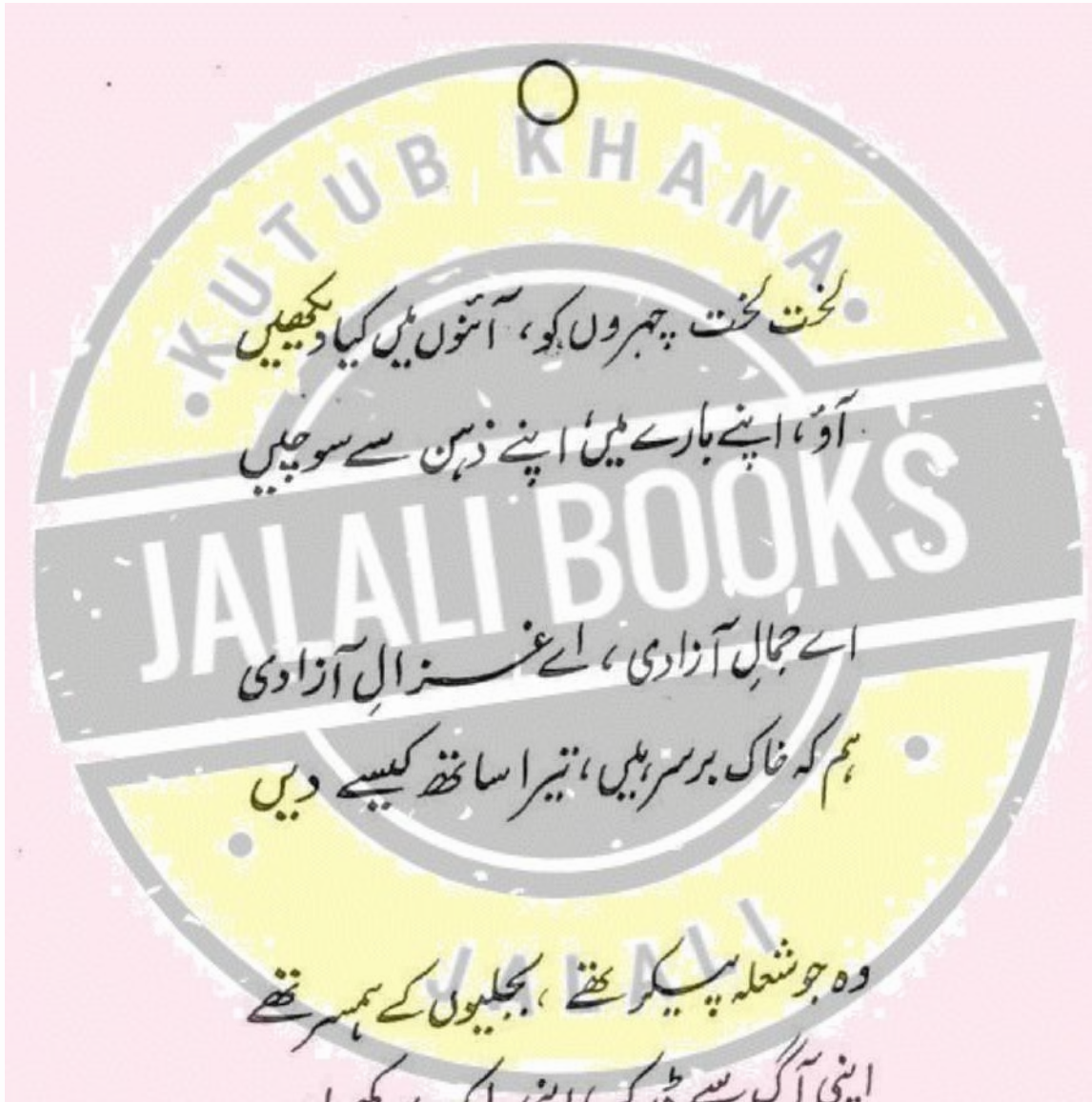
لخت لخت چہروں کو، آئنوں میں کیا دیکھیں
آؤ، اپنے بارے میں، اپنے ذہن سے سوچیں

اے جمالِ آزادی، اے غزالِ آزادی
ہم کہ خاک بر سر ہیں، تیرا ساتھ کیسے دیں

وہ جو شعلہ پیکر تھے، بجلیوں کے ہمسر تھے
اپنی آگ سے ڈر کر، اپنی راکھ سے کھیلیں

آنکھ تک جھپکنے کا، کس میں حوصلہ ہوگا
دیکھیں ٹکٹکی باندھے، جب کئی کروڑ آنکھیں

دشتِ بے اماں کی حد، روح سے بدن تک ہے
ٹکڑے ٹکڑے بادل ہیں، کیا کریں، کہاں برسیں

شاید اس نظّارے سے ربِّ دو جہاں چونکے
آؤ، اپنے ملبے پر بیٹھ کر دعا مانگیں

جب اُجڑ چکی محفل، جب بکھر چکے ہمدم
جب بدل چکا سب کچھ، ہم بھی اپنی لَے بدلیں

تاج گر بھی جاتے ہیں، تاج مل بھی جاتے ہیں
تاج ڈھونڈنے والے، پہلے اپنے سر ڈھونڈیں

جن کے ذہن سے اُبھرے آفتاب دانش کے
دُھوپ کیوں نہ چھلکائیں، برف بن کے کیوں پگھلیں

آسمان صحرا ہے، تیرگی قیامت ہے
نجمِ نیم شب بن کر، خود کو ڈھونڈنے نکلیں

اے ندیمؔ، میرا تو تجربہ ہے صدیوں کا
ہر غروب کے پیچھے ہیں طلوع کی کرنیں

۱۲- جنوری ۷۲ ۱۹ء

○
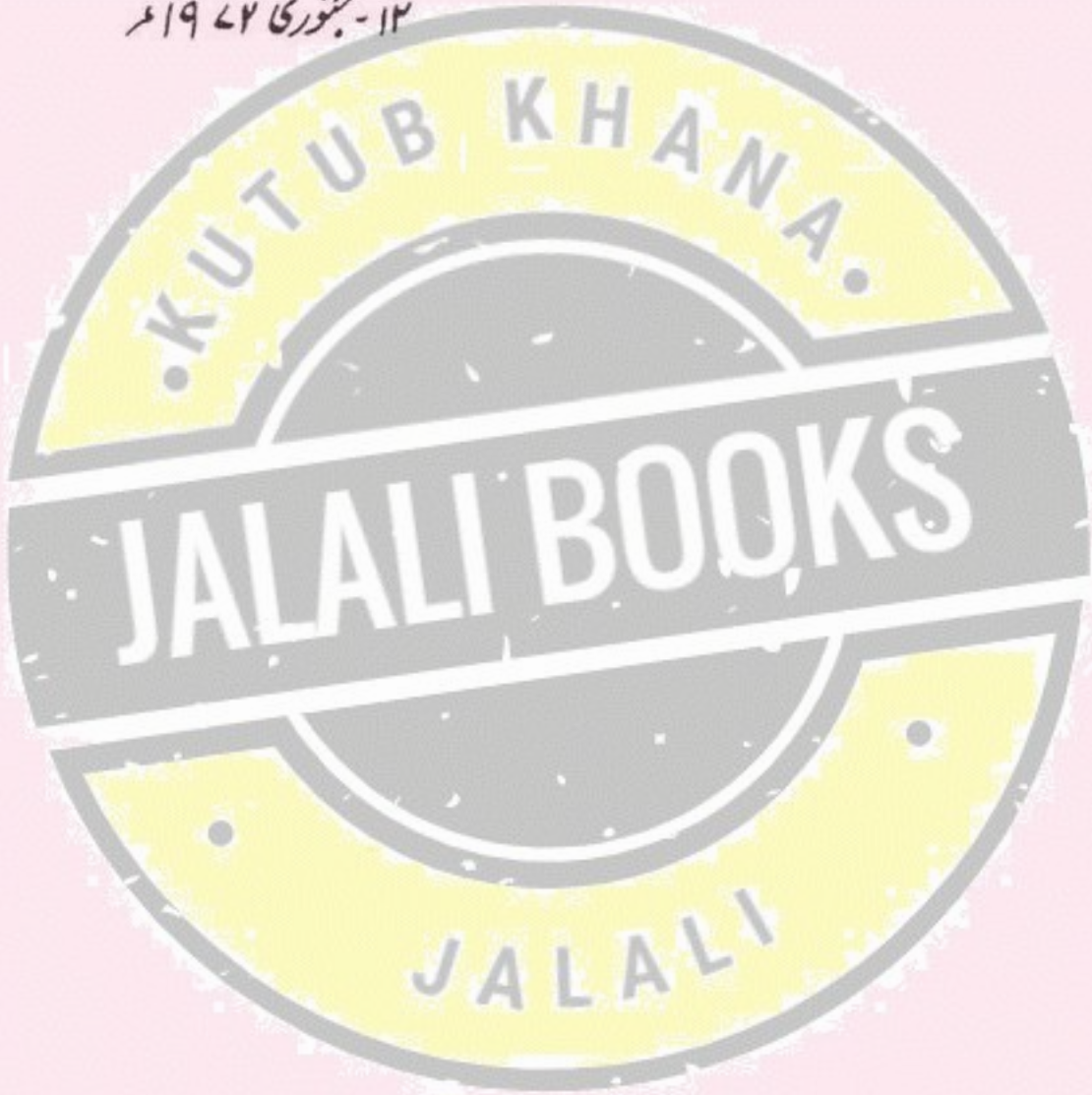
بہت مشکل ہے ترکِ عاشقی کا درد سہنا بھی
بہت دشوار ہے لیکن محبّت کرتے رہنا بھی

خدا کی طرح، میری چُپ کے بھی مفہوم لاکھوں ہیں
اِک اندازِ تکلّم ہے کِسی سے کچھ نہ کہنا بھی

اُسے کھو کر میں جیسے زندگی کا حسُن کھو بیٹھا
محبّت میں مگر اس داغ کو کہتے ہیں گہنا بھی

میں یخ بستہ ہوں، لیکن میرا سورج مُجھ پہ چمکے گا
کہ برفوں ہی سے وابستہ ہے دریاؤں کا بہنا بھی

بدن مانگے ہوئے ملبوس میں چھُپنے نہیں پاتے
پہنتے ہیں جو خلعت، مُجھ کو لگتے ہیں برہنہ بھی

ستمبر ۱۹۷۱ء

چھُپے جو راز ، مری قدرتِ بیاں بن کر
وہ اب لبوں سے برستے ہیں، ہچکیاں بن کر

مَیں تیرے قرب سے صرف اِس لیے گریزاں ہُوں
کہ تجھ کو یاد رہوں حرفِ داستاں بن کر

کہیں یہ عشق کا اظہارِ ماندگی تو نہیں
کہ تیری یاد بھی آتی ہے لوریاں بن کر
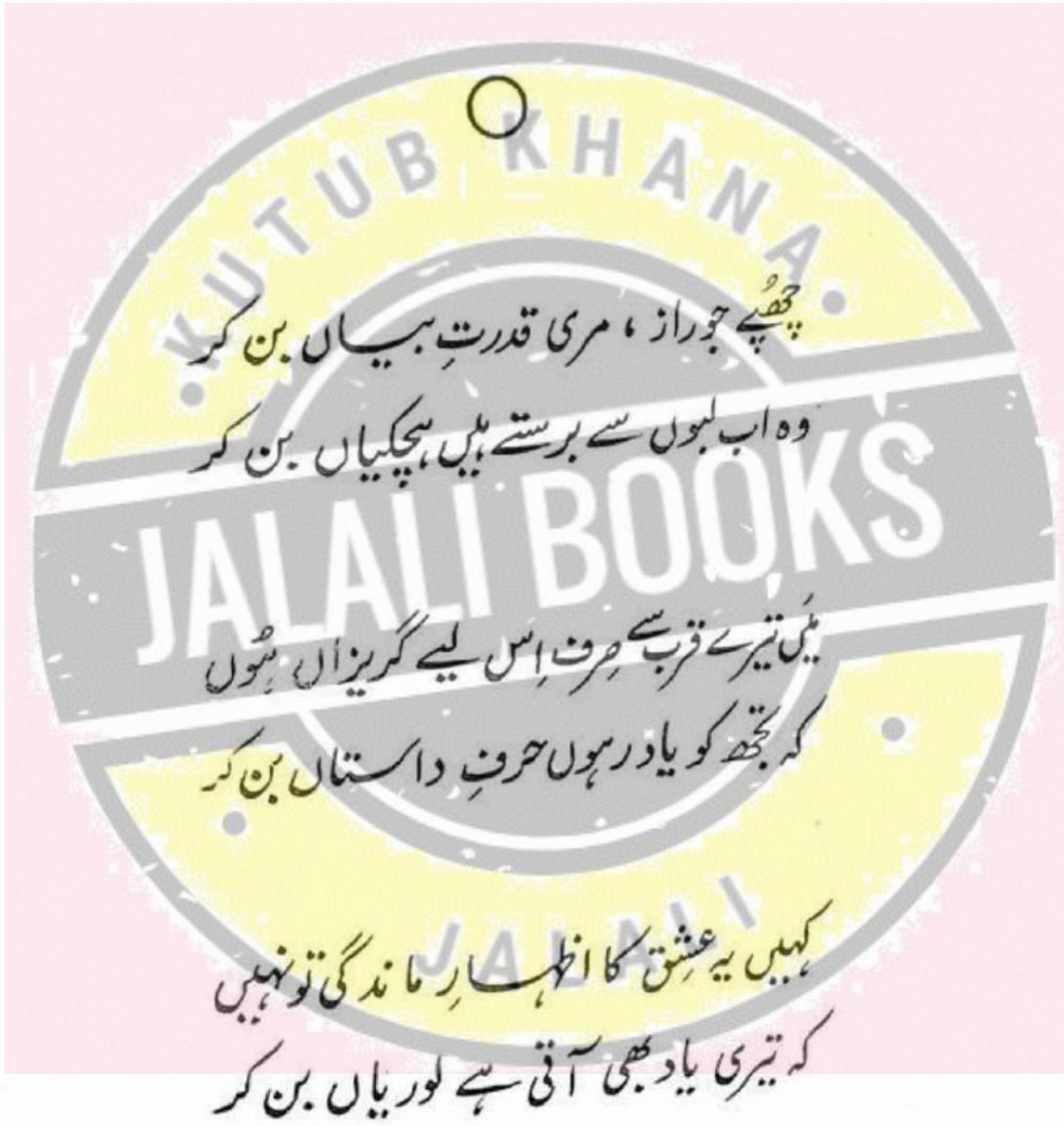
کِسی افق پہ تو خم کھا کے مُجھ کو چھُو لے گا
تو لاکھ دُور رہے مجُھ سے، آسماں بن کر

لویں چھنیں بھی ، تو شمعوں نے کی نہ موت قبول
کہ وہ تو بزم میں شامل رہیں، دھواں بن کر

اگر برس نہ سکے، ایک پل کو چھاؤں تو دی
جو میرے دشت سے گزرے تھے بدلیاں بن کر

انھیں بھی زیست کے صحراؤں میں نہ راہ ملی
جو پربتوں سے چلے موجِ رواں بن کر

انھیں زمین کا اِک پھول تو دکھاؤ کبھی
جو آسماں سے اُترتے ہیں بجلیاں بن کر

اگر وہ موت نہیں ہے تو زندگی بھی نہیں
وہ زندگی ، جو کٹے جنسِ رائیگاں بن کر

مرے بدن میں کھِلے جب کسی خیال کا پھول
لہو چلے مری نس نس میں آندھیاں بن کر

ندیمؔ ہوں، مجھے طعنِ شکستہ پائی نہ دے
مَیں تیرے ساتھ رہا، گردِ کارواں بن کر

ستمبر ۱۹۷۱ء

اتنی بلندیوں سے ، تہوں میں اُتر نہ جا
احسان کر چکا ہے تو احسان دھر نہ جا

بکھرا گئی ہیں در پہ جو آنکھیں لگی ہوئی
کترا کے اُن سے، شہرِ وفا سے گزر نہ جا

ہر شخص تجربات کی دُنیا ہے، سب سے مل
دانائیاں سمیٹ کے، پیارے! بکھر نہ جا
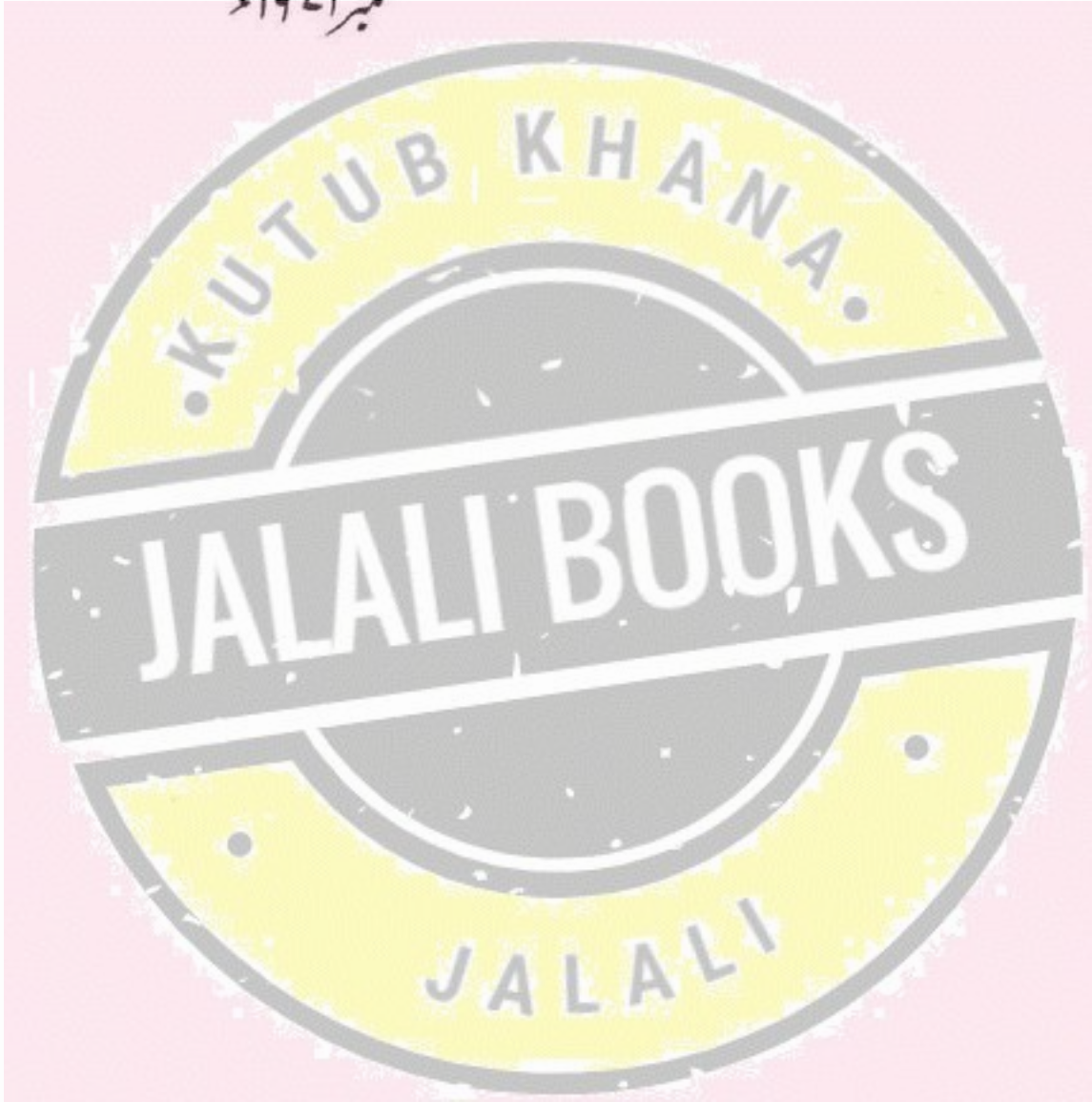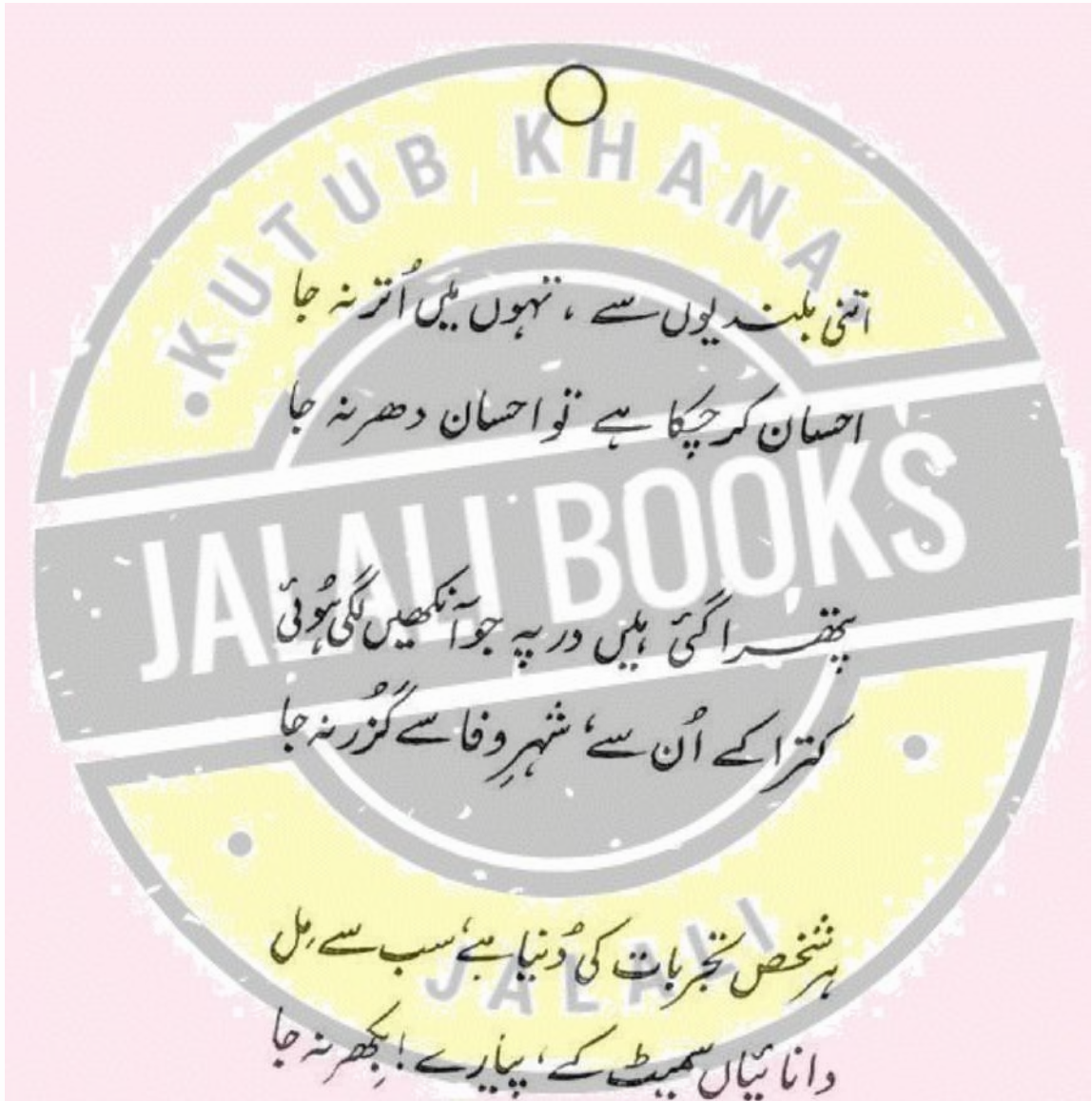
میں نے کہا نہ تھا کہ طلسمِ انا نہ توڑ
اب اپنا سامنا جو کیا ہے تو ڈر نہ جا

اِس شہرِ ناسپاس میں ہیں سنگ زن سبھی
اِس کانچ کے لباس میں بیرونِ در نہ جا

دُنیا کو ایک طرفہ تماشا سمجھ کے دیکھ
اِس آئینے کے سامنے با چشمِ تر نہ جا

عزمِ سفر کیا ہے تو رختِ سفر بھی باندھ
منزل ہے آسمان، تو بے بال و پَر نہ جا

دل میں اُٹھا ہے درد، تو اظہارِ درد کر
آنسو اُمڈ پڑے ہیں تو مُنہ پھیر کر نہ جا

صحرائے بے جہت سے حرم کا بھی رُخ نہ کر
دعوئی جنوں کا ہے تو خُدا کے بھی گھر نہ جا

لاکھوں چراغ لا، کہ ہوا تیز ہے بہت
صرف اِک دیا جلا کے سرِ رہگزر نہ جا

برحق ہے موت اگر، تو ہے برحق حیات بھی
یوں جیتے جی تو موت کی ہیبت سے مر نہ جا

کھو جائے گی وہاں ترے گیتوں کی گونج بھی
دربارِ شاہ میں پئے عرضِ ہنر نہ جا

دشنک سے دستِ فن کو نہ آلودہ کر ندیمؔ
سب جا رہے ہیں جانبِ در، تُو مگر نہ جا

جون ۱۹۷۱ء

○

موت و حیات کا مقصد کیا ہے، آخر کچھ معلوم تو ہو
لفظ تو ہیں صدیوں کے پرانے، ان کا کوئی مفہوم تو ہو

چاہے فرشتوں کی بولی ہو، معنی بھرنا میرا کام
لوحِ مقدّر پر لیکن اِک حرف کہیں مرقوم تو ہو

صوت و صدا پر پابندی، تکمیل نہیں خاموشی کی
سانسوں کی آواز بھی روکو، سنّاٹے کی دھوم تو ہو

اس کے قدموں پر برسیں گے نسلوں کی تحسین کے پھول،
شاعر اس سے قبل مگر غالبؔ کی طرح مرحوم تو ہو

جون ۱۹۷۱ء

○

دل میں ہم ایک ہی جذبے کو سموئیں کیسے
اب تجھے پا کے یہ اُلجھن ہے کہ کھوئیں کیسے

ذہن چھلنی جو کیا ہے، تو یہ مجبوری ہے
جتنے کانٹے ہیں وہ تلووں میں پروئیں کیسے

ہم نے مانا کہ بہت دیر ہے حشر آنے تک
چار جانب تری آہٹ ہو تو سوئیں کیسے

کتنی حسرت تھی، تجھے پاس بٹھا کر روتے
اب یہ مشکل ہے، ترے سامنے روئیں کیسے

جون ۱۹۷۱ء

کِس کو دلدار کہیں، کِس کو دلآزار کہیں
جب ہر انسان کو ہم پیار کا شہکار کہیں

دَور یہ وہ ہے، کہ اربابِ شعور و دانش،
حُسن کا نام نہ لیں، عِشق کو آزار کہیں

آج کے لوگ تو لفظوں کے بدل کر مفہوم
ہجر کو وصل کہیں، دشت کو گلزار کہیں
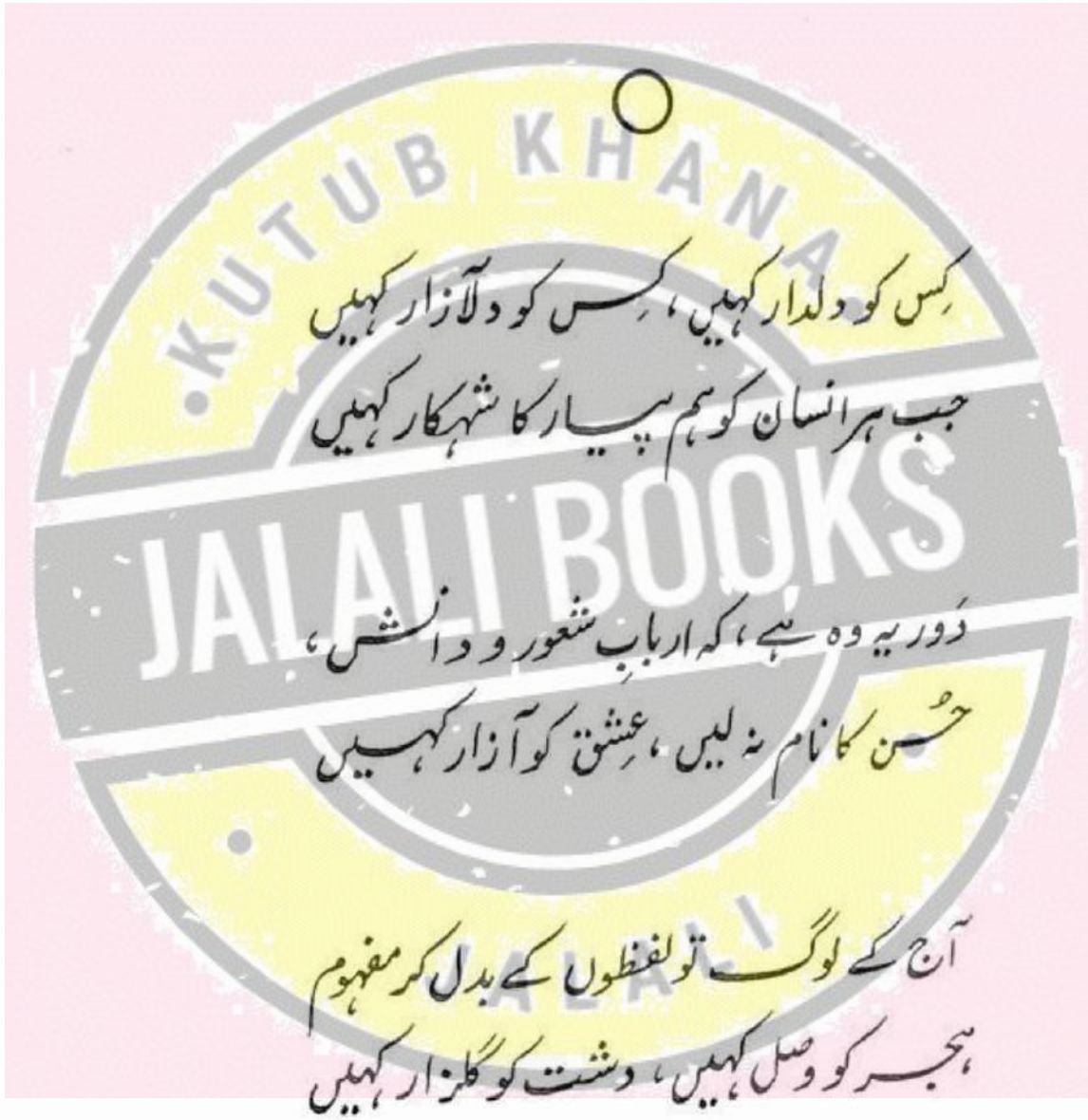
سخت دشوار ہے پتھّر کو گُلِ تر کہنا
ہاں، جو مجبُور ہیں کہنے پہ، وہ ناچار کہیں

وہ بصارت کی کمی ہے، کہ بصیرت زدہ لوگ
دُھوپ میں تپتے ہوئے دن کو شبِ تار کہیں

جُرم جس طرح پسِ پردۂ در ہوتے ہیں
لوگ اِس دور میں سچ بھی پسِ دیوار کہیں

وہ جو منصور کے سینے پہ سزا بن کے گرا
ہم تو اس پھول کی پتّی کو بھی تلوار کہیں

کب تک اے قوم! یہ حالات کے مارے شاعر
دن کو مصلوب رہیں، رات کو اشعار کہیں

اپریل ۱۹۷۱ء

ہم اندھیروں سے بچ کے چلتے ہیں
اور اندھیروں میں جا نکلتے ہیں

ایک کو دُوسرے کا ہوش نہیں
یُوں تو ہم ساتھ چلتے ہیں

وہ کڑا موڑ ہے ہمیں درپیش
راستے ہر طرف نکلتے ہیں
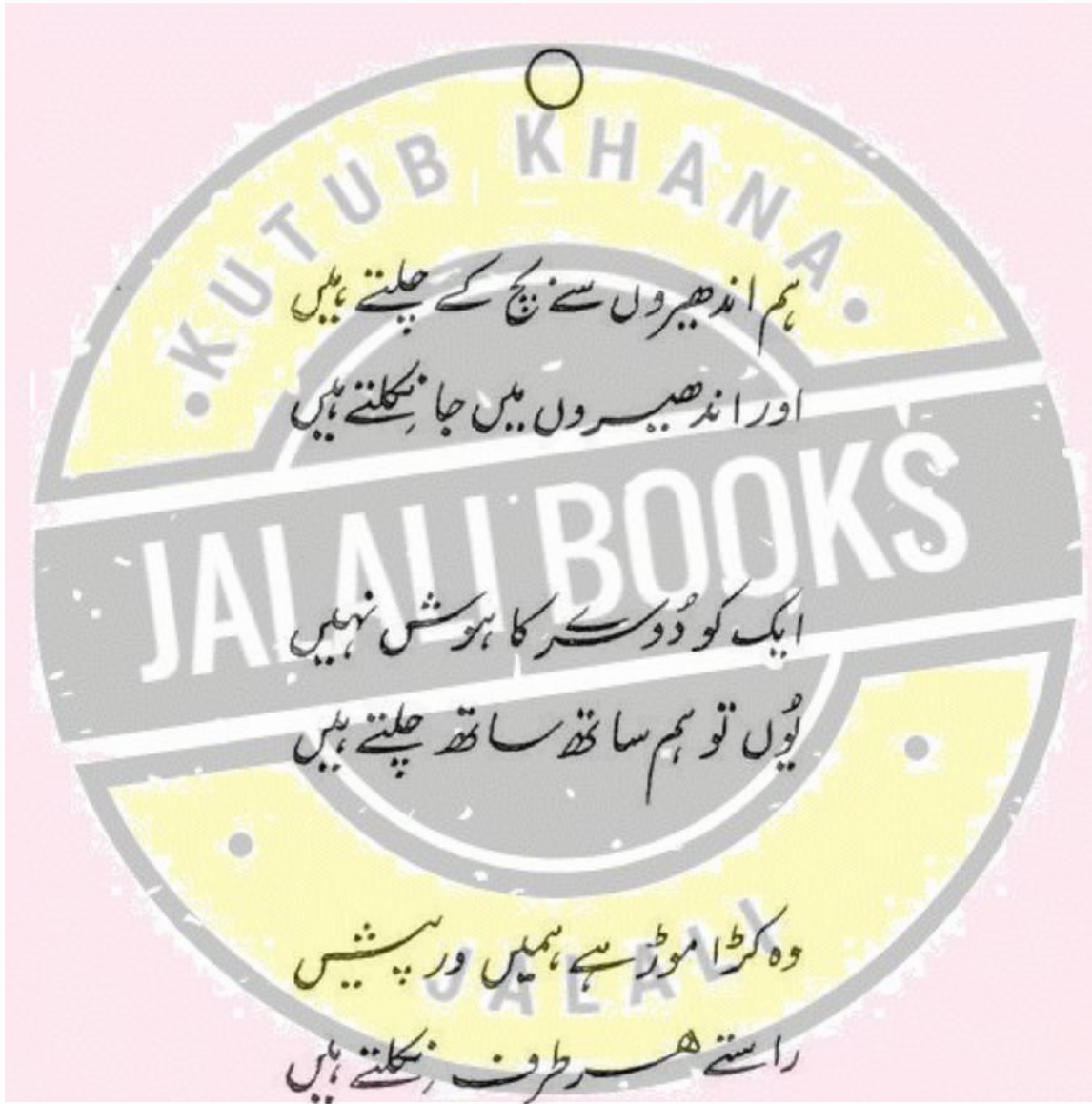
کتنے عیّاش لوگ ہیں ہم بھی
دن میں سو منزلیں بدلتے ہیں

وہ ہوئیں بارشیں، کہ کھیتوں میں
کرب اُگتے ہیں، درد پلتے ہیں

پتھّروں کا غرور ختم ہُوا
اب تو انساں شرر اُگلتے ہیں

ٹھوکریں کھا رہے ہیں صدیوں سے
گو دِلوں میں چراغ جلتے ہیں

اپریل ۱۹۷۱ء

اپنے چہروں کو گُل فشاں دیکھو
اپنی رُوحوں کو خوں چکاں دیکھو

کیا نظر آئے تم کو حُسنِ ضمیر
تم تو دامن کی دھجّیاں دیکھو

جتنا روشن ہے چاند آج کی رات
اُتنا کالا ہے آسماں، دیکھو
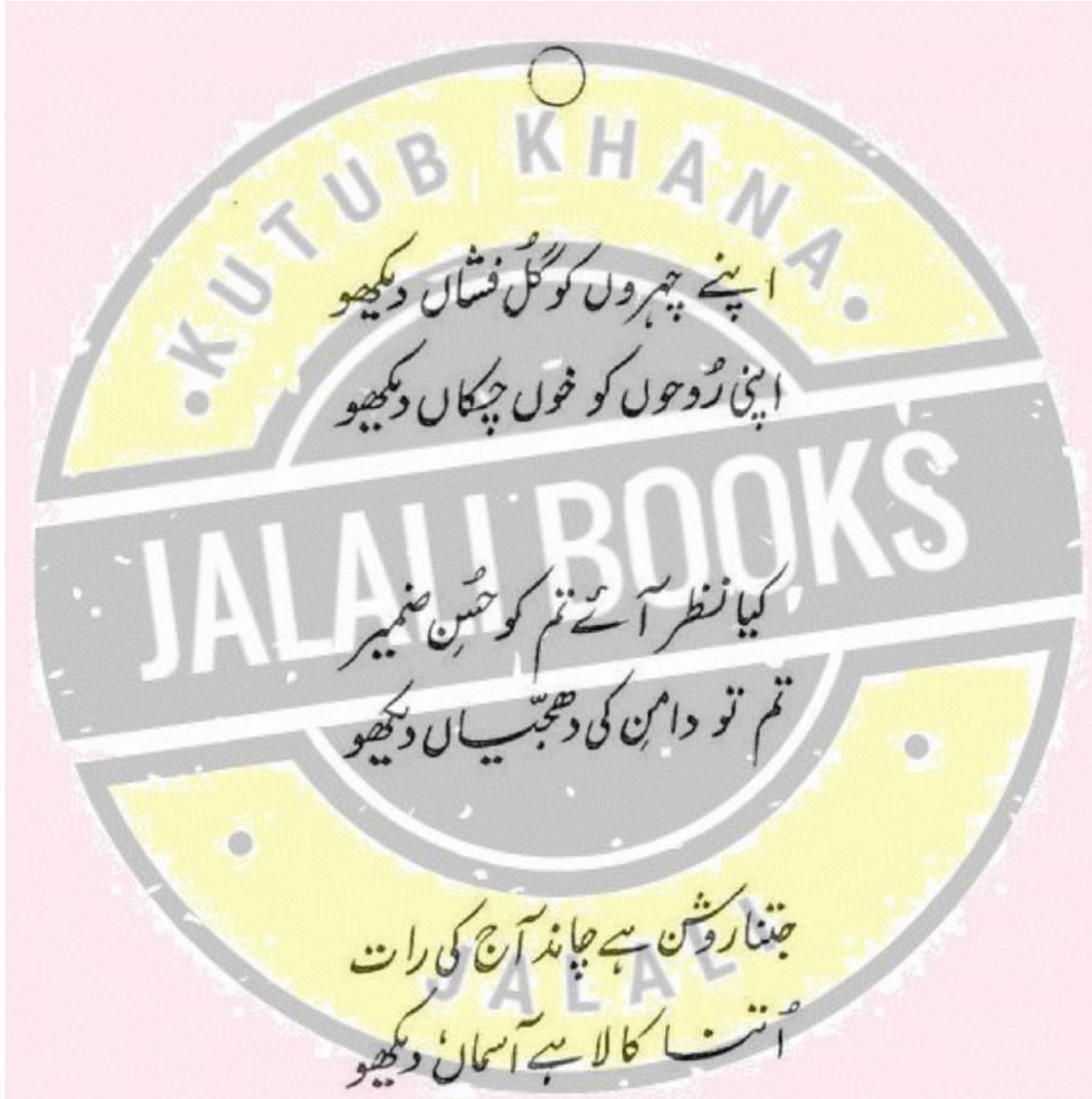
شب کا بھی اِک جمال ہے، لیکن
تم تو دن بھی دُھواں دُھواں دیکھو

جھرّیوں کی نقاب کے پیچھے
عہدِ ماضی کے نوجواں دیکھو

تیرگی میں اسیر پروانو!
اُڑ چلو، روشنی جہاں دیکھو

مارچ ۱۹۷۱ء
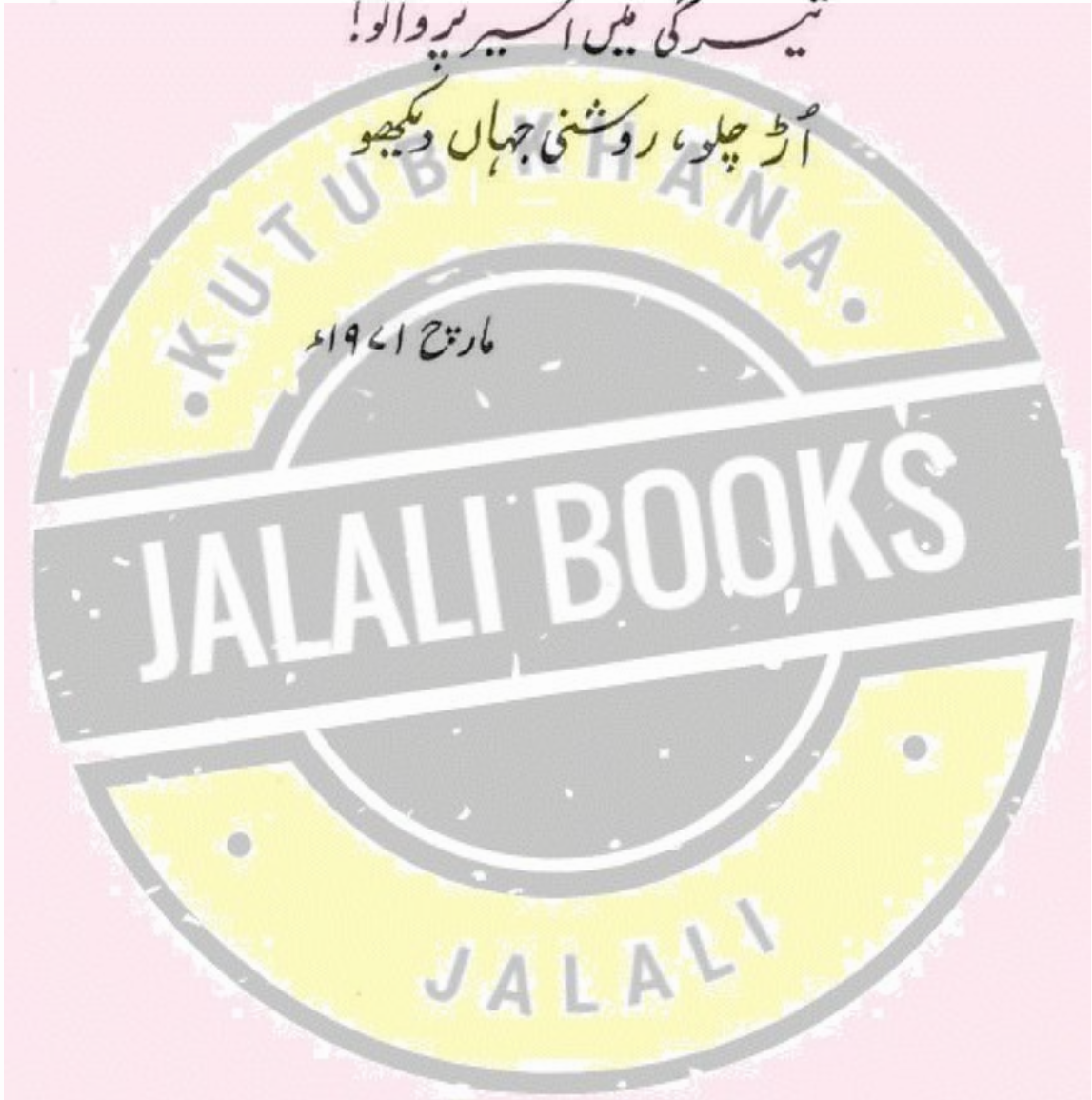
کب تک آخر میں بھرے شہر کو صحرا سمجھوں
اپنے سائے کو جو دیکھوں تو بگولا سمجھوں

یہ چمک سی، جو مری پیاس کو ترساتی ہے
ریت سمجھوں کہ اسے دامنِ دریا سمجھوں

وہ بھی کیا دن تھے، کہ ہر وہم، یقیں ہوتا تھا
اب حقیقت نظر آئے تو تماشا سمجھوں

جس کو بھی دیکھتا ہوں، جستجوئے ذات میں ہے
میں کسے بزم میں شامل، کسے تنہا سمجھوں

تُو کبھی گُل، کبھی شبنم، کبھی نکہت، کبھی رنگ
تُو فقط ایک ہے، لیکن تجھے کیا کیا سمجھوں

مجھ کو کیا علم، غمِ ہجر کسے کہتے ہیں
مَیں تو ہر گُل کو ترا چہرۂ زیبا سمجھوں

اب سحر پھُوٹتی ہے تیرے تبسّم کی طرح
اب صبا کو بھی تری سانس کا جھونکا سمجھوں

ظلم یہ ہے، کہ ہے یکتا تری بیگانہ روی
لطف یہ ہے، کہ مَیں اب تک تجھے اپنا سمجھوں

کس قدر قحطِ وفا ہے مری دُنیا میں ندیمؔ
جو ذرا ہنس کے ملے، اس کو مسیحا سمجھوں

مارچ ۱۹۷۱ء

اُس سے پہلے کہ حشر آنے لگے
کاش انسان مُسکرانے لگے

ظلم صدیوں کے رنگ لانے لگے
وہ جو جلتے رہے ، جلانے لگے

چاند پر جب سے لوگ جانے لگے
صرف پتھّر زمیں پہ لانے لگے
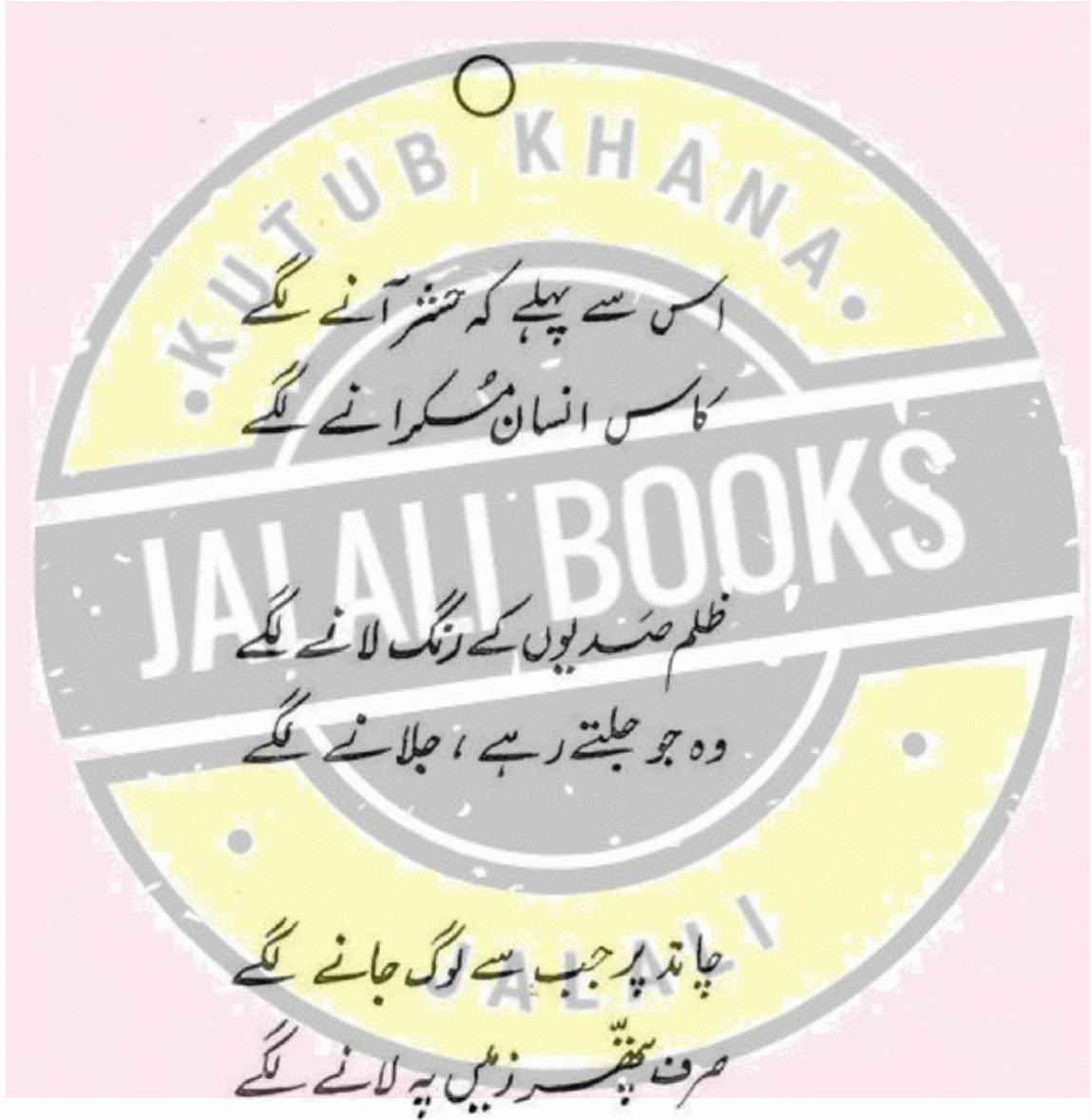
جن کا منصب تھا نگہت افشانی
وہی جھونکے غبار اُڑانے لگے

گرد سے اِس قدر اَٹے چہرے
آئنوں پر غُبار چھانے لگے

ہم کو معلُوم تھا مآل اُن کا
جو نئے تھے، ہمیں پُرانے لگے

انتہا، ابتداء کو لوٹ چلا
مقتبس کے راستے دکھانے لگے

مارچ ۱۹۷۱ء

○

تم یہ کیا معجزے دکھانے لگے
ہم تمھیں کھو کے، خود کو پانے لگے

تم ہمیں کیوں سپردِ شب کر کے
پسِ مژگاں دیے جلانے لگے

اِک تمھارا خیال آتے ہی
کیسے کیسے خیال آنے لگے

اچھے وقتوں کو بھول جانے میں
تم کو دو پل، ہمیں زمانے لگے

کِتنا کافر ہے کربِ محرومی
ہم بھی دستِ دُعا اُٹھانے لگے

مارچ ۱۹۷۱ء

چُھپا گئے سر میں جو تہذیب کے کھنڈر نکلے
وہ اپنے آپ سے کس درجہ بے خبر نکلے

رُکے جو لوگ، تو اِک آب جُو بھی دریا تھی
اُتر گئے تو سمندر بھی تا کمر نکلے

ہر ایک رُوح یہاں، جسم کے لباس میں ہے
کہ پتھّروں کو جو توڑا، شرر شرر نکلے
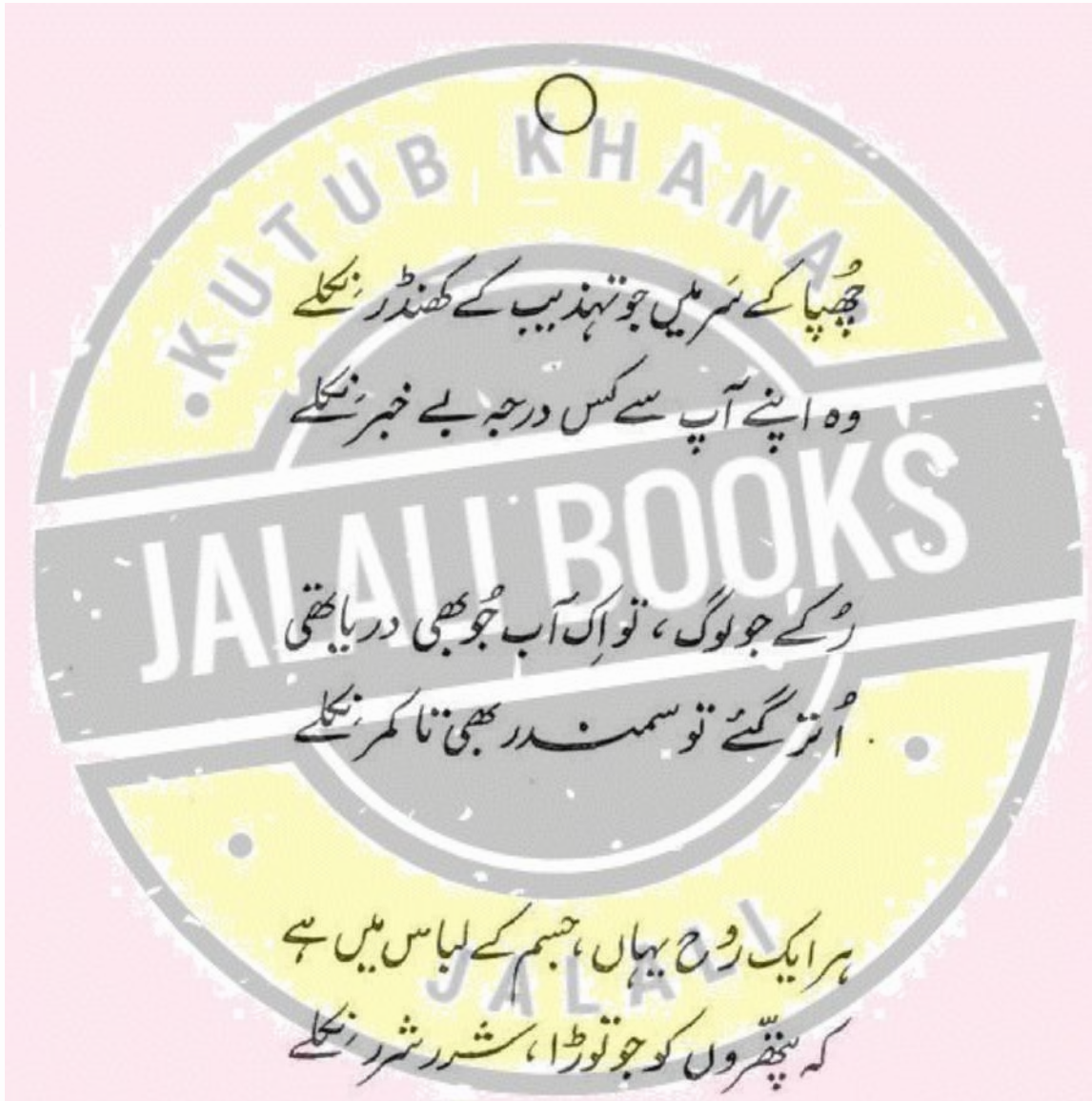
اگر جنوں ہے، تو آداب اس کے شب سے سیکھ
اِدھر ہو چاک گریباں، اُدھر سحر نکلے

یہ سوچ کر میں فقط ایک رہگزر پہ چلا
یہ رہگزر نہ کہیں تیری رہگزر نکلے

لہو پلا کے خزاں میں بھی سینچتا ہوں جسے
بڑا مزا ہو جو یہ پیڑ بے ثمر نکلے

میں اس خیال سے مر مر کے زندہ ہوں کہ کبھی
حیات کا نہ سہی، موت کا تو ڈر نکلے

ندیمؔ، عدل کی زنجیرِ در بجائی تو ہے
میں ڈر رہا ہوں کہ یہ بھی نہ اُس کا گھر نکلے

اکتوبر ۱۹۷۰ء

یارب، تُو اگر اب بھی گریزاں رہا ہم سے
مر جائیں گے سر پھوڑ کے دیوارِ حرم سے

لکھتے ہیں کہ ہم چیختے ہیں، کچھ نہیں کھلتا
الفاظ نکلتے ہیں کہ فریاد قلم سے

تقدیر پہ روتے ہوئے دہقاں کو خبر کیا
مٹی کبھی نم ہو نہ سکی آنکھ کے نم سے

جس دشت میں انسان کا نقشِ کفِ پا ہے
اس دشت کا رتبہ نہیں کم باغِ ارم سے

ہم عشق کے معیار کو گرنے نہیں دیتے
ہم زہر بھی پیتے ہیں تو پیمانۂ جم سے

دیوانہ ہوں میں بھی، کہ نکلتے ہیں بہ ہر لفظ
افکار کے خورشید، مرے چاکِ قلم سے

اکتوبر ۱۹۷۰ء

جب یہ طے ہے، مَیں کبھی تُجھ کو نہیں پا سکتا
اب یہ حسرت ہے، تجھے کوئی تو اپنا سکتا

یُوں تو برسوں سے مُجھے تیری محبّت ہے نصیب
مَیں ترے دل کی مگر تھاہ نہیں پا سکتا

سرِ افلاک مُجھے بھی تو ستارے ہی ملے
کاش مَیں تیرے لیے دردِ دُروں لا سکتا

تُو مرے دل میں جو اُترا تو یہ مہلت بھی نہ دی
مَیں ترے لمس کے اعزاز پہ اِترا سکتا

تُو حقیقت ہے، تو آ اس کی گواہی دینے
اب مجھے تیرا تصوّر نہیں بہلا سکتا

تُو مِلا ہے تو تھکن ٹوٹ پڑی صدیوں کی
اب میں مر کر بھی ترے ساتھ نہیں جا سکتا

جس نے گلزار کو مہکے ہُوئے جھونکے بخشے
کاش، صحرا میں بھی اِک موجِ صبا لا سکتا

دُھوپ کے ظلم کا قصّہ تو ہزاروں سے سُنا
کاش اس دشت پہ بادل کوئی برسا سکتا

درد سینے میں چمکتے ہیں کہ تیری شمعیں
زندگی! میں ترے احساں نہیں گِنوا سکتا

دامنِ کوہ میں کملاتا ہے جب پھُول ندیمؔ
دنگ ہوتا ہے، کہ پتھّر نہیں مُرجھا سکتا!

ستمبر ۱۹۷۰ء

وہی نقش رو برو ہے، وہی عکس چار سُو ہے
مجھے تیری آرزو تھی، مجھے تیری آرزو ہے

ہیں دیارِ شش جہت میں جو تری جہت نہ بھولا
تو کمال کیا ہے میرا، کہ وفا تو میری خُو ہے

مرا ربط ہے جو تجھ سے، وہ ہے ربط گردشوں کا
پسِ ہر غروب مَیں ہُوں، پسِ ہر طلوع تُو ہے

کوئی گونجتا ہے مجھ میں، وہ سکوت ہو کہ دل ہو
یہ وفا کی انجمن ہے کہ ابد کا دشتِ ہُو ہے

تُو مِلا تو یہ ہوس ہے، لبِ خدّ و خال دیکھوں
وہ جو کھو کے جُستجو تھی، وہی پا کے جُستجو ہے

مَیں ندیمؔ وہ نہیں ہُوں، جو دکھائی دے رہا ہُوں
مرا فن مرا بدن ہے، مرا غم مرا لہُو ہے

ستمبر ۱۹۷۰ء

میری آنکھیں ہیں کہ پڑتے ہیں بھنور پانی میں
آئنہ ڈوب گیا ہے مری حیرانی میں

اتنا معصوم نہ بن، عشق کا مفہوم نہ پوچھ
عقل کی بات نہ کہہ دوں کہیں نادانی میں

بند ہونٹوں پہ تبسم کی جو لو پھوٹی ہے
ایک آیت ہے ترے مصحفِ نورانی میں
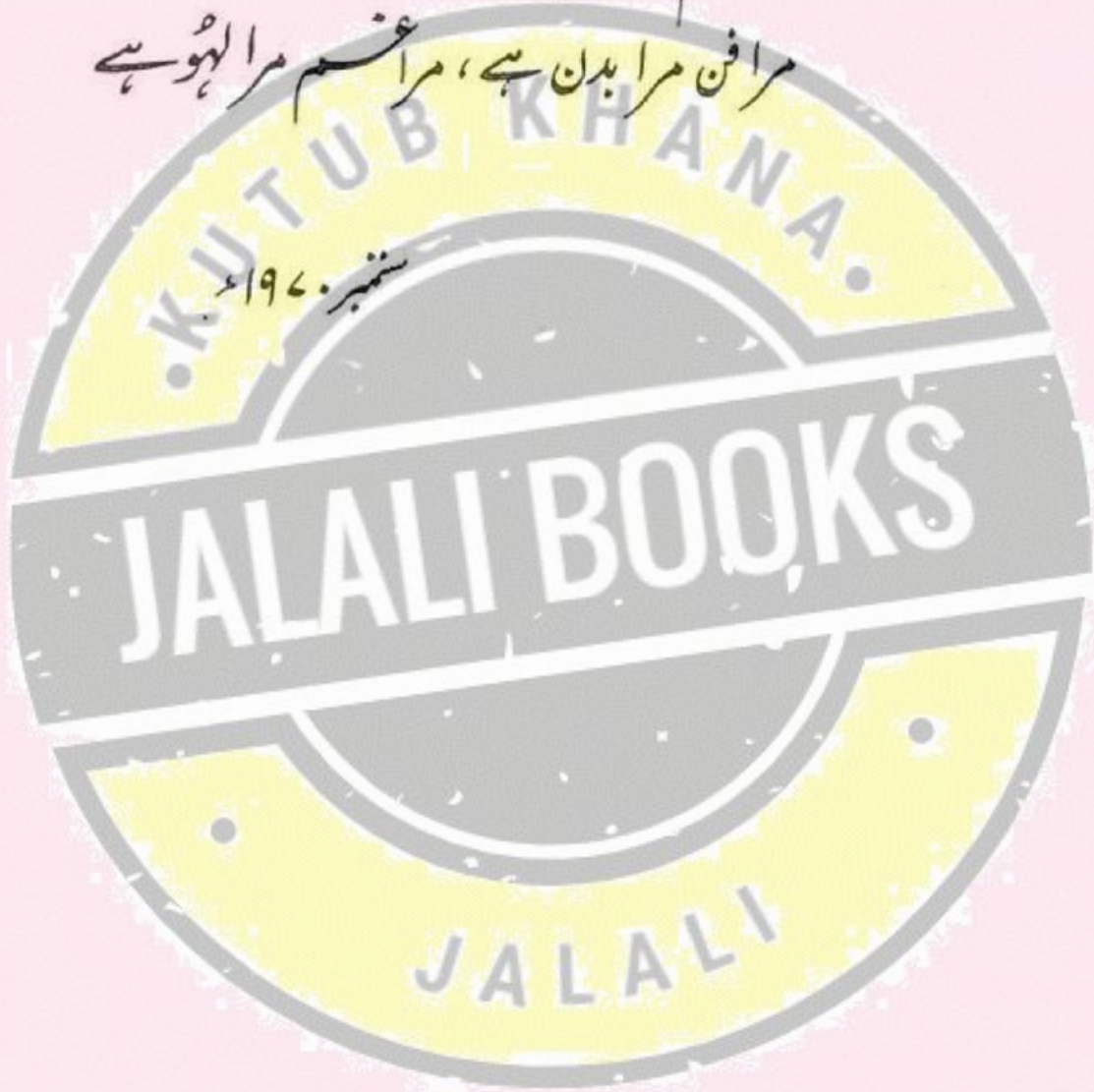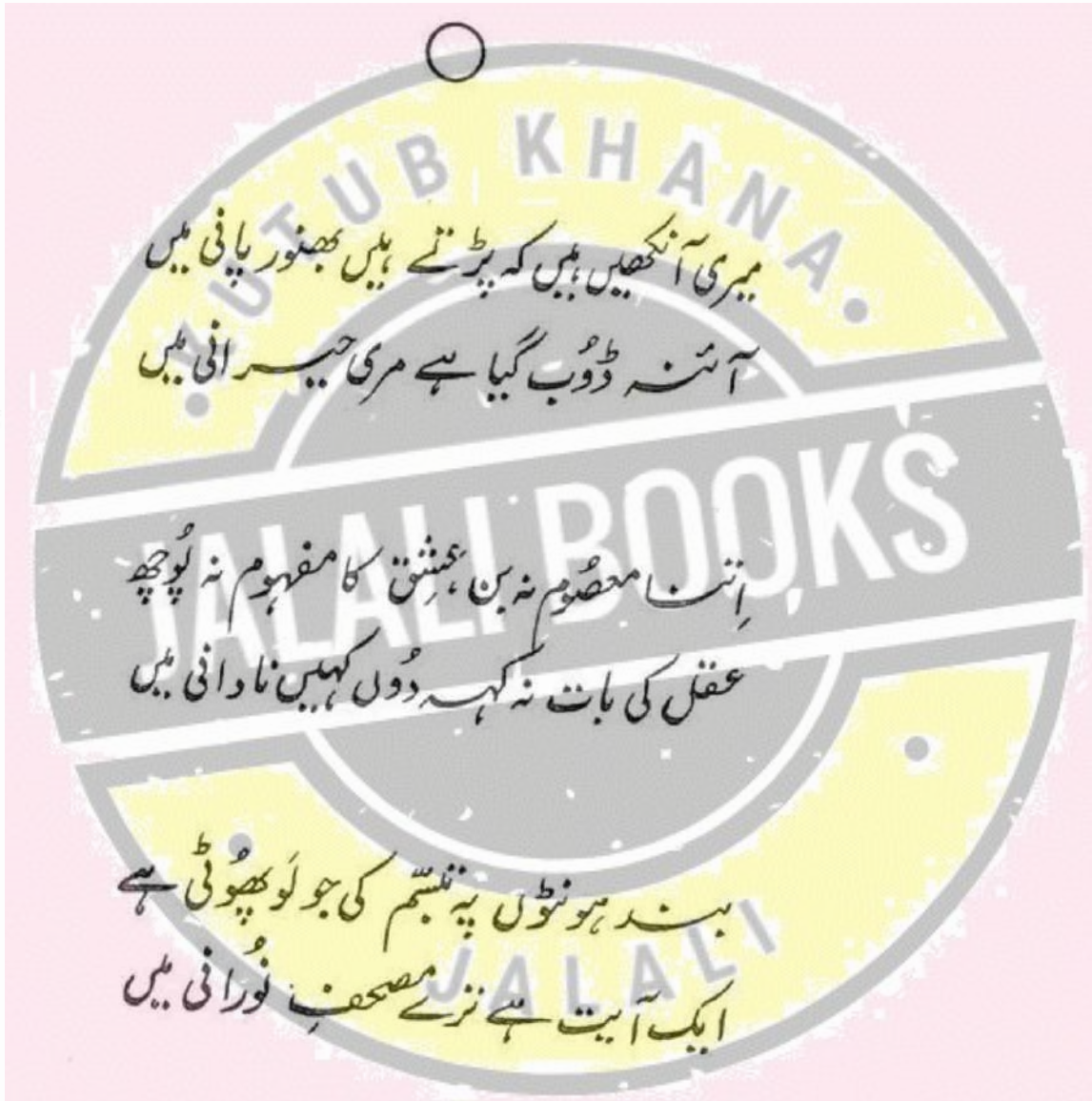
کیا بُرا ہے جو مَیں زخموں سے ہٹا کر پردے
گُل کِھلاتا ہُوں شب و روز کی ویرانی میں

یہ سب احساسِ سیہ کاری و عُریانی ہے
ورنہ کیوں رات چُھپے صُبح کی تابانی میں

بھیک مانگے کوئی انساں تو میں چیخ اُٹھتا ہُوں
بس یہ خامی ہے مرے طرزِ مُسلمانی میں

فصلِ گُل میں بھی نہ میں دامنِ صحرا بھُولا
کٹ گئی عُمر یُونہی بے سروسامانی میں

اِس صدی کا اَلمیہ بھی عجب ہے، کہ ندیمؔ
ذات لُٹ جاتی ہے خُود اپنی نگہبانی میں

جون ۱۹۷۰ء

گیا جو میں کبھی محفل میں التجا بن کر
خدا پرست بھی پیش آئے ہیں خدا بن کر

گلہ یہ ہے کہ بگولے اُڑانے نکلا ہوں
میں اپنے دشت میں چلتا ہوں جب ہوا بن کر

مری دعا ہے یہی، میرا مدّعا ہے یہی
سکوت کو متلاطم کروں، صدا بن کر
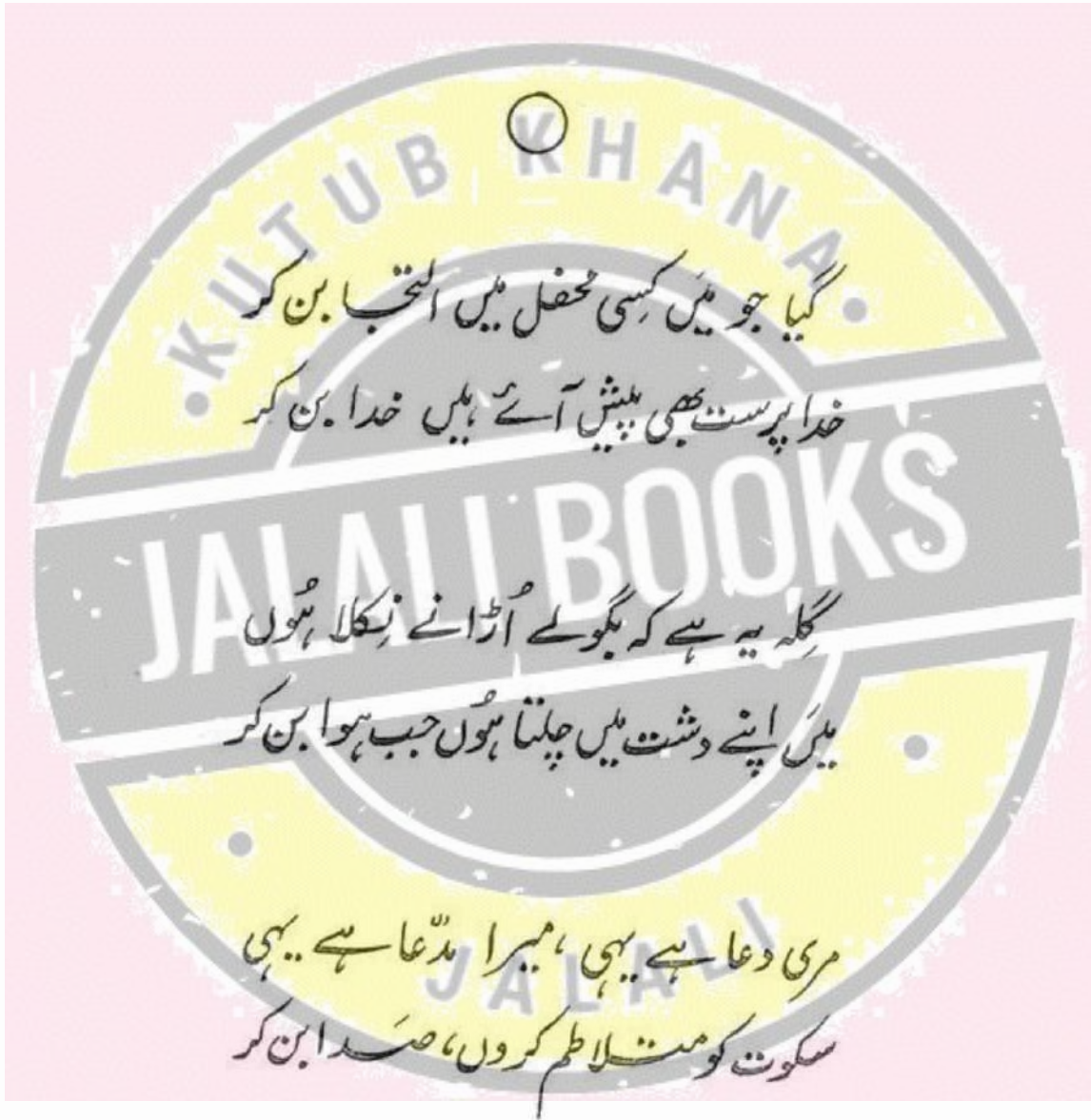
مجھے تو بجھ کے بھی ہے زندگی سے پیار اتنا
کہ جل رہا ہوں کسی ہاتھ کی حنا بن کر

اب ایک بار مجھے اجنبی ہی بن کے ملے
وہ اجنبی جو ملا مجھ سے آشنا بن کر

مَیں کیوں کروں اسے اظہارِ عشق پر مجبور
کہ لفظ بولتے ہیں سُرخیِ حیا بن کر

ندیمؔ صُبح کو سوئے فلک نظر جو اُٹھی
زمین پھیل گئی دامنِ دعا بن کر

اپریل ۱۹۷۰ء

○

شب گزرنے سے تو انکار نہیں
آج تک صُبح کے آثار نہیں

جتنا مشکل ہے ترس کر جینا
اُس قدر مَوت بھی دُشوار نہیں

پَل گزرتے ہیں قضا کی مانند
کہیں یہ دَور تو بیمار نہیں
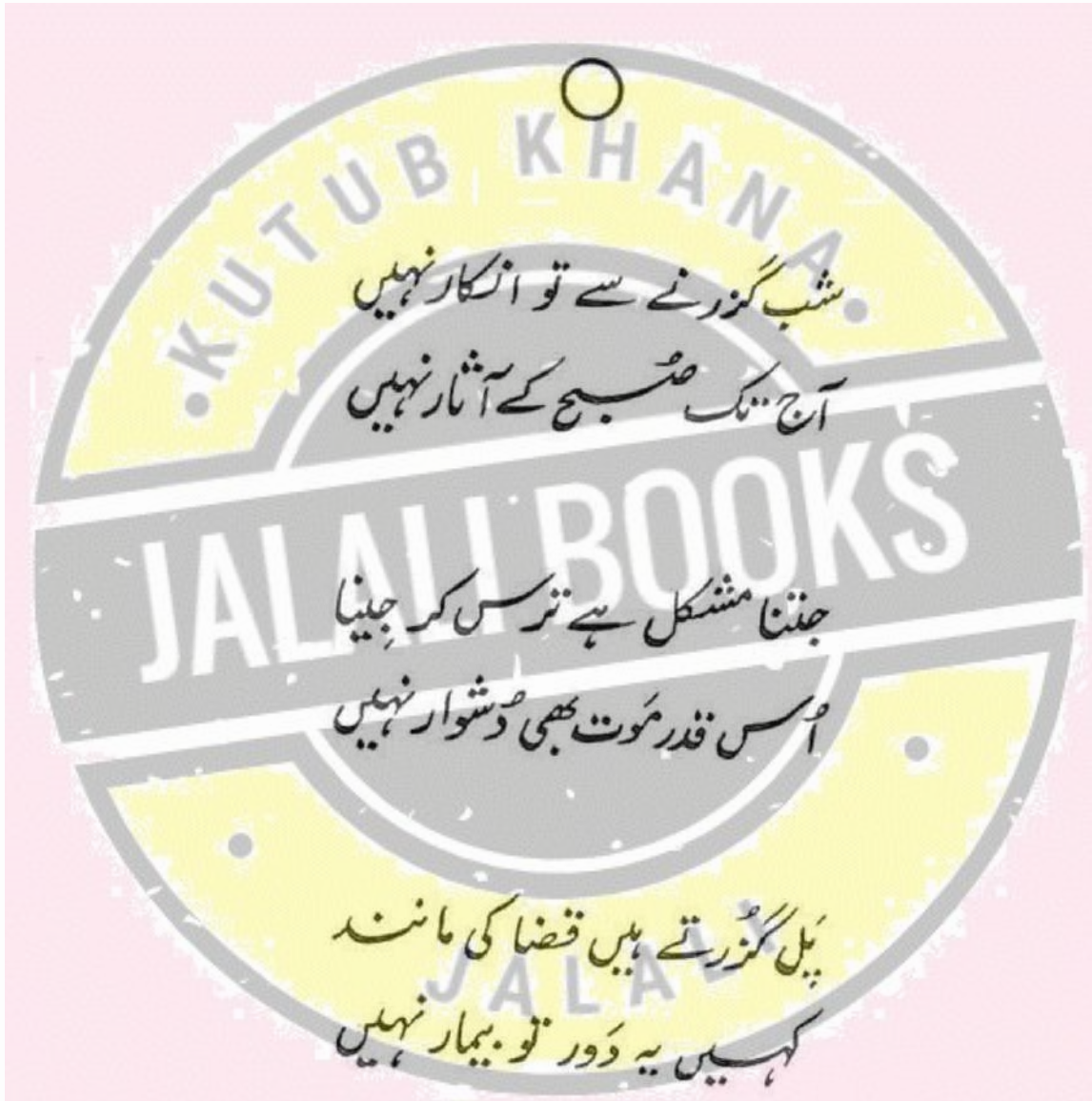
سب زلیخاؤں کے متوالے ہیں
کوئی یوسُف کا خریدار نہیں

اب انھیں دُودھ نہ بخشیں مائیں
جو محبّت کے طرف دار نہیں

جب تک انسان ہے فانی یارب
میری دُنیا، ترا شہکار نہیں

اپریل ۱۹۷۰ء

مر جاتا ہوں، جب یہ سوچتا ہوں
میں تیرے بغیر جی رہا ہوں

تارے سے خرام جیسے چھن جائے
میں تجھ سے کچھ اس طرح جدا ہوں

میں تیرے جمالِ چشم و لب میں
اب دل کا گداز ڈھونڈتا ہوں
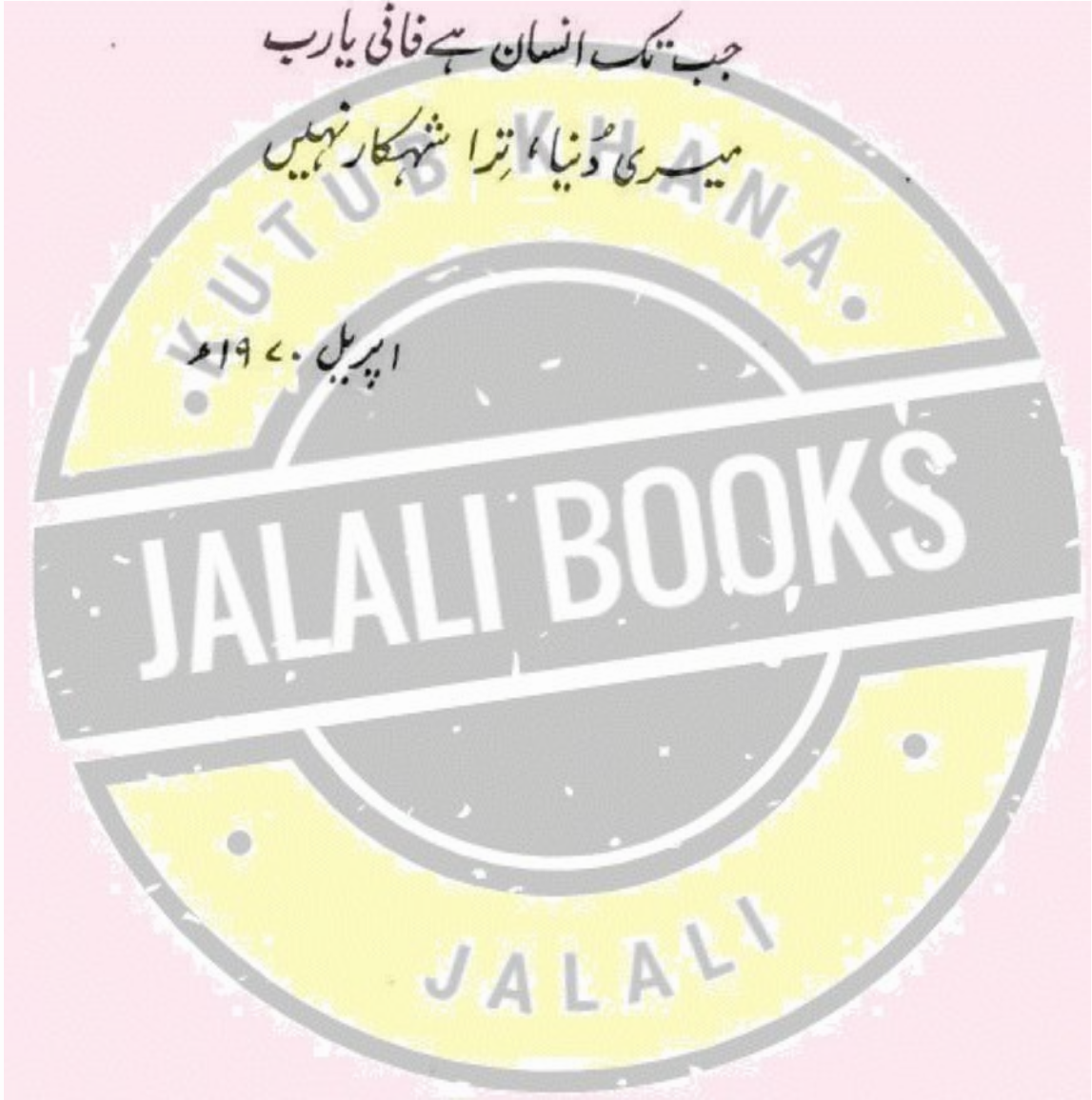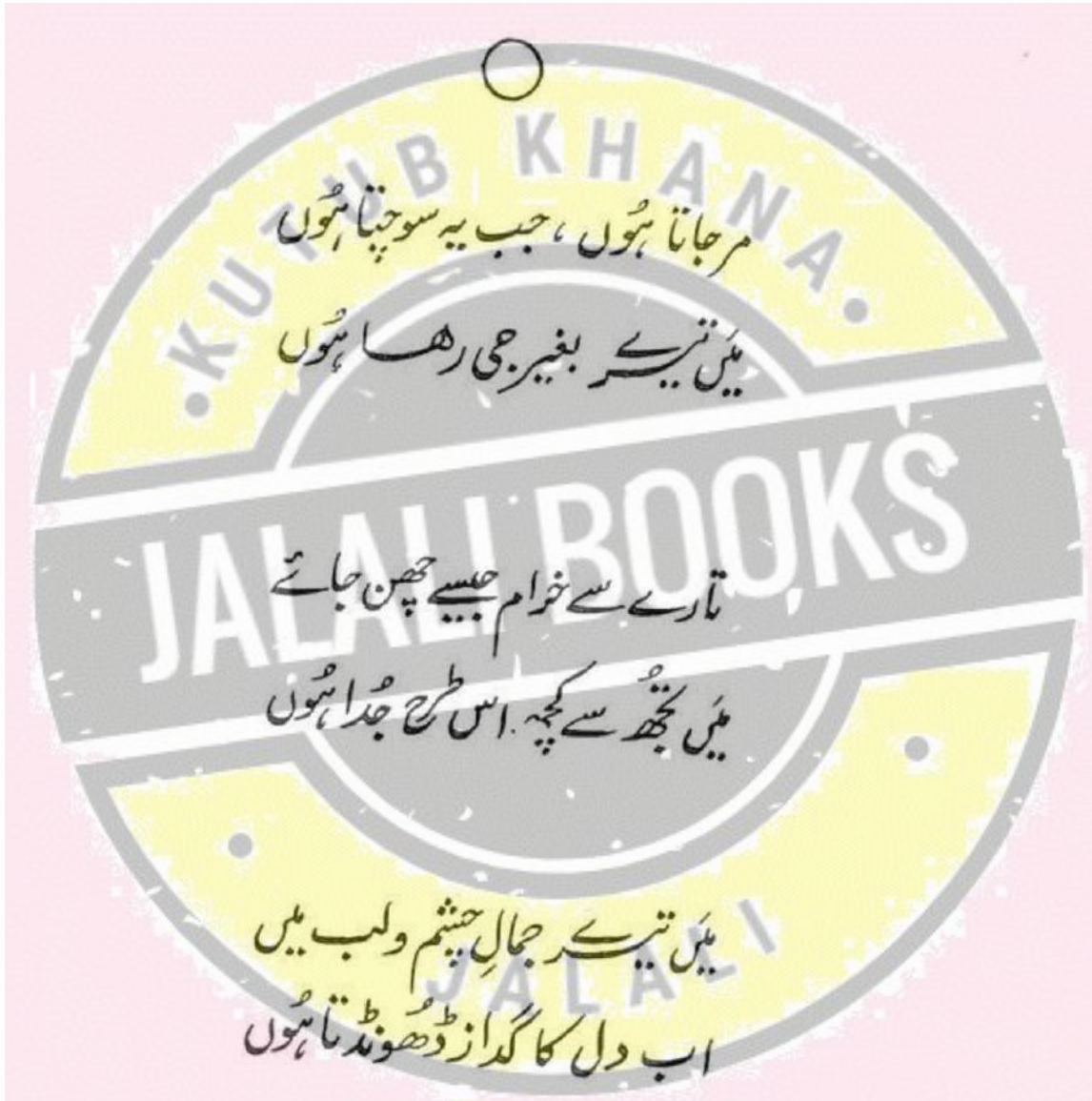
تجھ پر سے نظر ہٹاؤں کیسے
اب تک تری کھوج میں لگا ہوں

یہ تیری تلاش کا صِلہ ہے
مَیں اپنا وجُود کھو چُکا ہُوں

تُو پھُول ہے یا صبا ہے، کیا ہے
مَیں رنگ ہُوں یا مہک ہُوں، کیا ہُوں

کچُھ ایسے لگا جو تُو نے دیکھا
جیسے آئینہ دیکھتا ہُوں

دُھندلانے لگی ہیں تیری یادیں
مَیں کِتنا غریب ہو رہا ہُوں

معبُود کے راز جانتا ہُوں
میں بھی مسجُود رہ چکا ہُوں

آنکھوں میں کٹی ہے عُمر، لیکن
جیسے ابھی نیند سے اُٹھا ہُوں

سو جاتی ہیں جب صدائیں شب کو
مَیں اپنے کھنڈر میں گونجتا ہُوں

الفاظ سے کون بھیک مانگے
مَیں ایک صدائے بے صدا ہُوں

اُتروں گا چمن پہ اوس بن کر
مَیں ٹُوٹتی رات کی دُعا ہُوں

دُنیا! ترے حُسن کی قسم ہے
مَیں عرش سے عرش پر گرا ہُوں

گُل کی تو ہیں سب صفات مجھ میں
بس یہ ہے کہ قبر پر کھلا ہُوں

اے صبح! مری گواہ رہنا
مَیں رات سے عُمر بھر لڑا ہُوں

مارچ ۱۹۷۰ء

برباد کر گیا مرا دستِ دُعا مجھے
اب تو خُدا کا بھی نہ رہا آسرا مجھے

دی مصلحت نے تربیتِ التجا مجھے
میرا ضمیر مُہر بہ لب کر گیا مجھے

جب دشت وشت اُس نے بکھیرا مرا وجُود
پھر کیوں چمن چمن میں پُکارے صبا مجھے
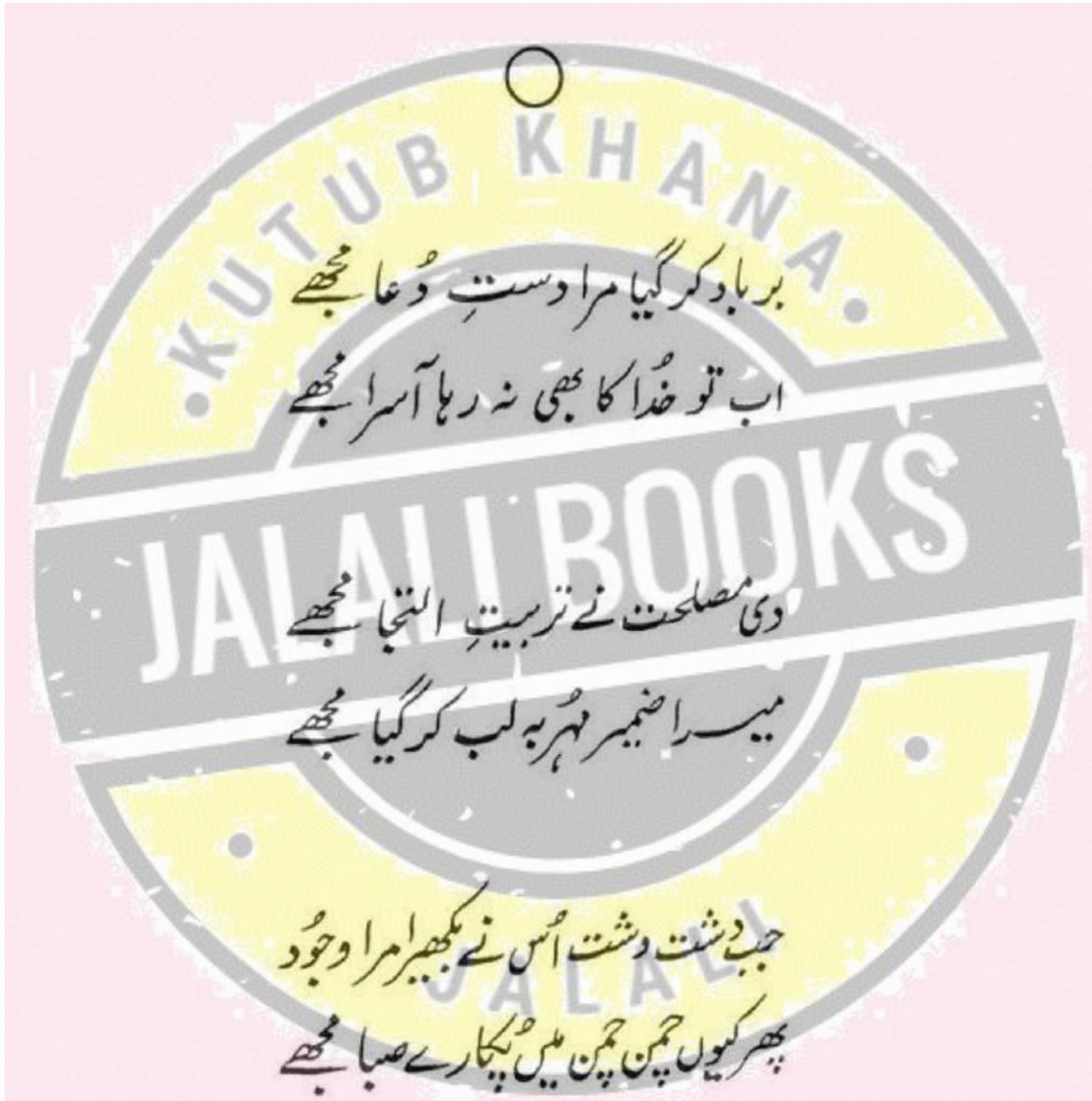
اُمّید کی شکست بڑا سانحہ سہی،
سنّاٹے میں سُنائی تو دی اِک صَدا مجھے

دن کو بھی جل رہا ہوں مَیں مانندِ شمعِ شب
اے دھوپ! بادلوں کو ہٹا کر بجھا مجھے

حق بات پوچھنے کو نکیرین آئے ہیں
سچ بولنے کا مل تو چُکا ہے صلہ مجھے

انصاف کی سزا تو اِک اعزاز ہے، مگر
پہلے بتا تو دیجیے میری خطا مجھے

اُس کا ستم بھی عدل سے خالی نہیں ندیمؔ
دل لے کے شاعری کا سلیقہ دیا مجھے

مارچ ۱۹۷۰ء

شکستہ پائی کے مرحلے، دشتِ ہجر میں اس لیے نہ آئے
کہ یہ سفر میں نے طے کیا ہے دراز پلکوں کے سکتے سائے

حیات اور کائنات میں ربط تھا، مگر اتنا ربط کب تھا
ہوا درختوں سے جب بھی گزرے، کسی کی سرگوشیاں سنائے

نہ جانے کس حُسنِ بے کراں کی مجھے نمائندگی ملی ہے
زمیں مجھے رنگ رُوپ بخشے، فلک مجھے آئنہ دکھائے

جسے فرشتوں نے خلد سے، ربِ خُلد کے حکم سے نکالا
وہ خلدزادہ، زمیں پہ تخلیقِ خلد سے کیسے باز آئے

یہ آدمی بھی عجیب شے ہے، اُدھر ستاروں کو چھُو رہا ہے
اِدھر ابھی تک فصیلِ شاہی کے سائے میں جھونپڑے بنائے

فقیہہِ شیریں زباں کے حسنِ بیاں کا مَیں معترف ہُوں لیکن
یہ ابر برسے تو میرے کھیتوں کی سمت اِک بُوند بھی نہ آئے

ندیمؔ تجھ کو خدا حدِ کائنات سے ماوراء ملے گا
جو خالقِ کائنات ہے، کائنات میں کس طرح سمائے

فروری ۱۹۷۰ء
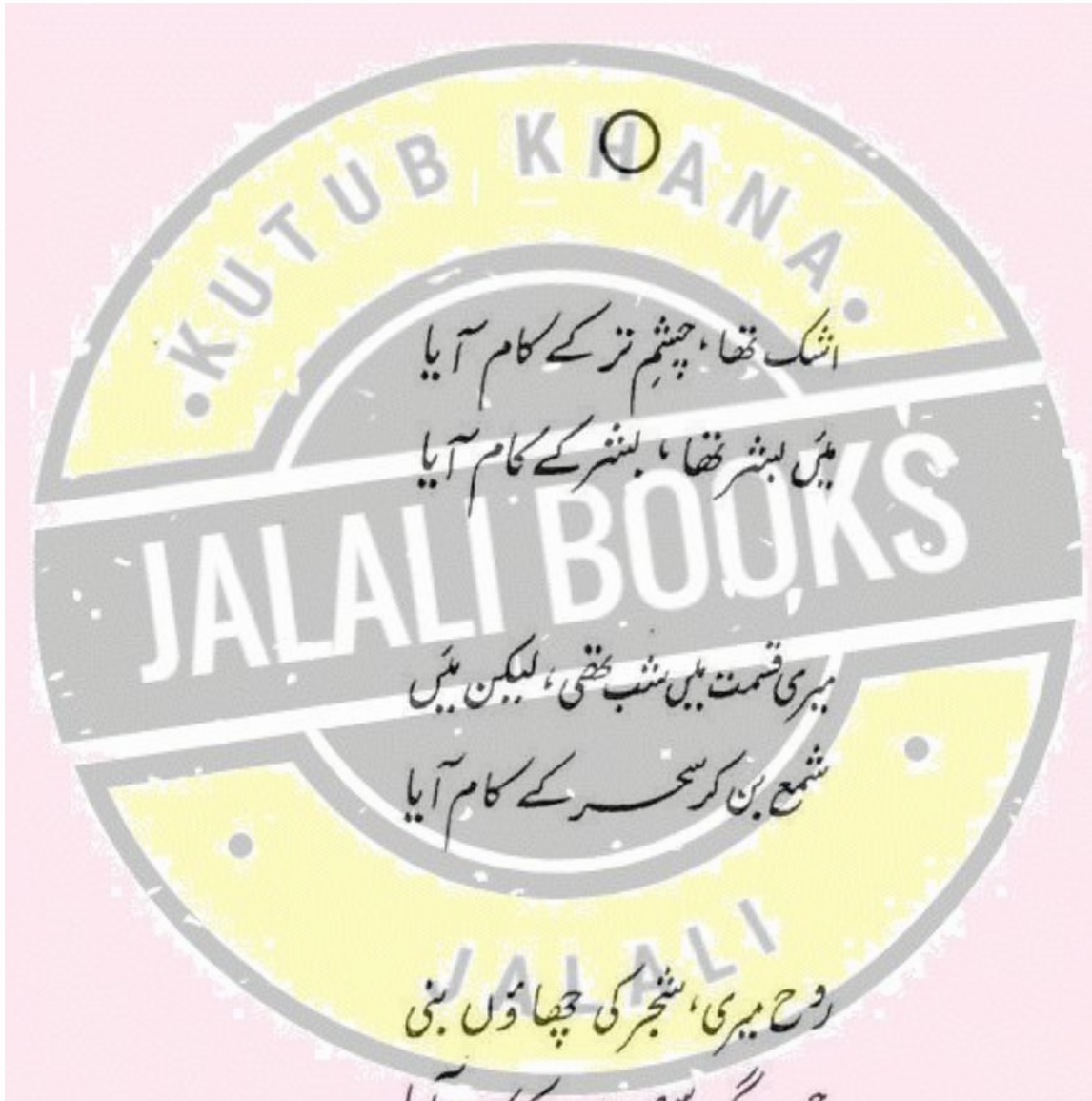
اشک تھا، چشمِ تر کے کام آیا
میں بشر تھا، بشر کے کام آیا

میری قسمت میں شب تھی، لیکن میں
شمع بن کر سحر کے کام آیا

روح میری، شجر کی چھاؤں بنی
جسم، گردِ سفر کے کام آیا

جبر کو بھی زوال ہے — جیسے
آہن، آئینہ گر کے کام آیا

عجز کو بھی عروج ہے — جیسے
ایک قطرہ، گہر کے کام آیا

زندگی، اہلِ شر کے گھر کی کنیز
خیر کا کام، مر کے کام آیا

تاجِ زرّیں پہ کچھ نہیں موقوف
سنگِ طفلاں بھی سر کے کام آیا

سیم و زر آدمی کے چاکر تھے
آدمی سیم و زر کے کام آیا

فقر و فاقے میں مر گیا شاعر
شعر، اہلِ نظر کے کام آیا

کاش سن لوں کہ مرا شہپرِ فن
کسی بے بال و پر کے کام آیا

جنوری ۱۹۷۰ء

چاند سُورج نگراں رہتے ہیں باطل کی طرف
عصرِ حاضر میں اندھیرا ہے فقط دل کی طرف

خُونِ ناحق کی تو خنجر ہی گواہی دے گا
اور جتنے بھی تھے، سب ہو گئے قاتل کی طرف

جب بھی خرمن کی طرف آتے ہیں دہقاں زادے
رُخ بدل جاتا ہے بجلی کا بھی، حاصل کی طرف

زیست مشکل ہے، مگر موت بھی آساں تو نہیں
کس سمندر کی ہے یہ گُونج سی، ساحل کی طرف

یوں تو اس کرب سے گھلتی رہیں شمعیں، لیکن
صرف تکتی رہیں پروانۂ محفل کی طرف

کتنے بھولے ہوئے چہروں کے خد و خال ابھرے
آج کی رات جو دیکھا مہِ کامل کی طرف

جنوری ۱۹۷۰ء
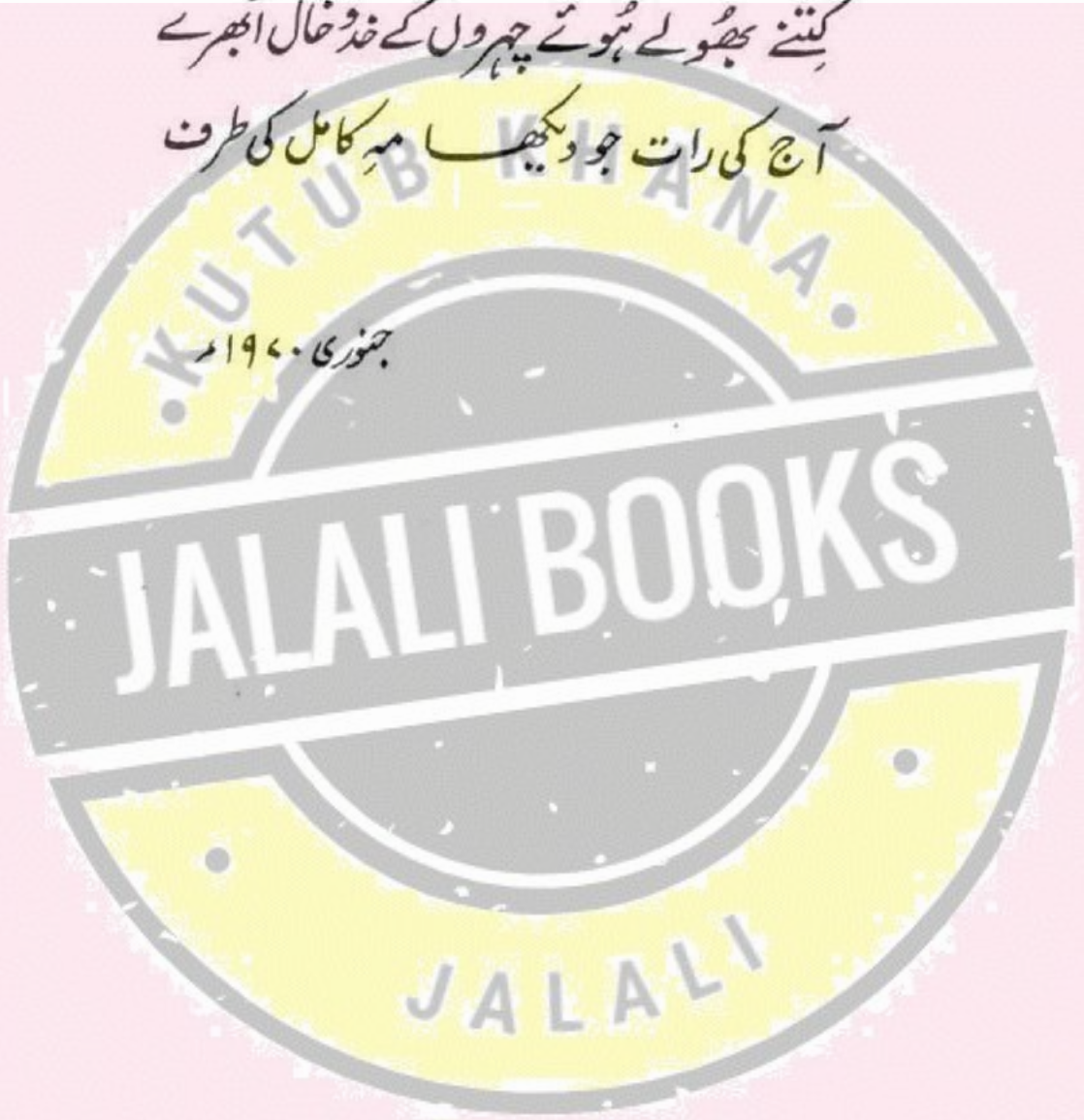
آئنہ دیکھ کے، ایک اور تماشا دیکھو
اپنے پیکر میں مرا حسنِ تمنّا دیکھو

تم کو خوش آئی نہ شاید مری پلکوں کی نمی،
دل میں اُترے ہو تو آؤ، مرا صحرا دیکھو

میری پیاسوں، مری آسوں، مری آنکھوں میں کبھی
میرے بَن، میرے گلستاں، مرے دریا دیکھو

نام لے کر مرا، تم اُس کو پکارو تو سہی
اِس بھرے شہر میں جس شخص کو تنہا دیکھو

میں محبت کے سفر میں نہیں بھٹکوں گا کبھی،
اپنے قدموں سے چمکتا ہُوا رستہ دیکھو

میں اگر یاد نہ آؤں، تو چمن میں جا کر
شاخ کے ہاتھ سے گرتا ہُوا پتّہ دیکھو

دسمبر
۱۹۶۶ء

یُوں تو کہنے کو ہے بدن بھی یہی
پیرہن بھی یہی ، کفن بھی یہی

انتظار، ایک دردِ بے انجام
ہے محبّت کا بانکپن بھی یہی

شہر کا حُسن ہے چمن کی مثال
گھر میں جا بیٹھیے تو بن بھی یہی
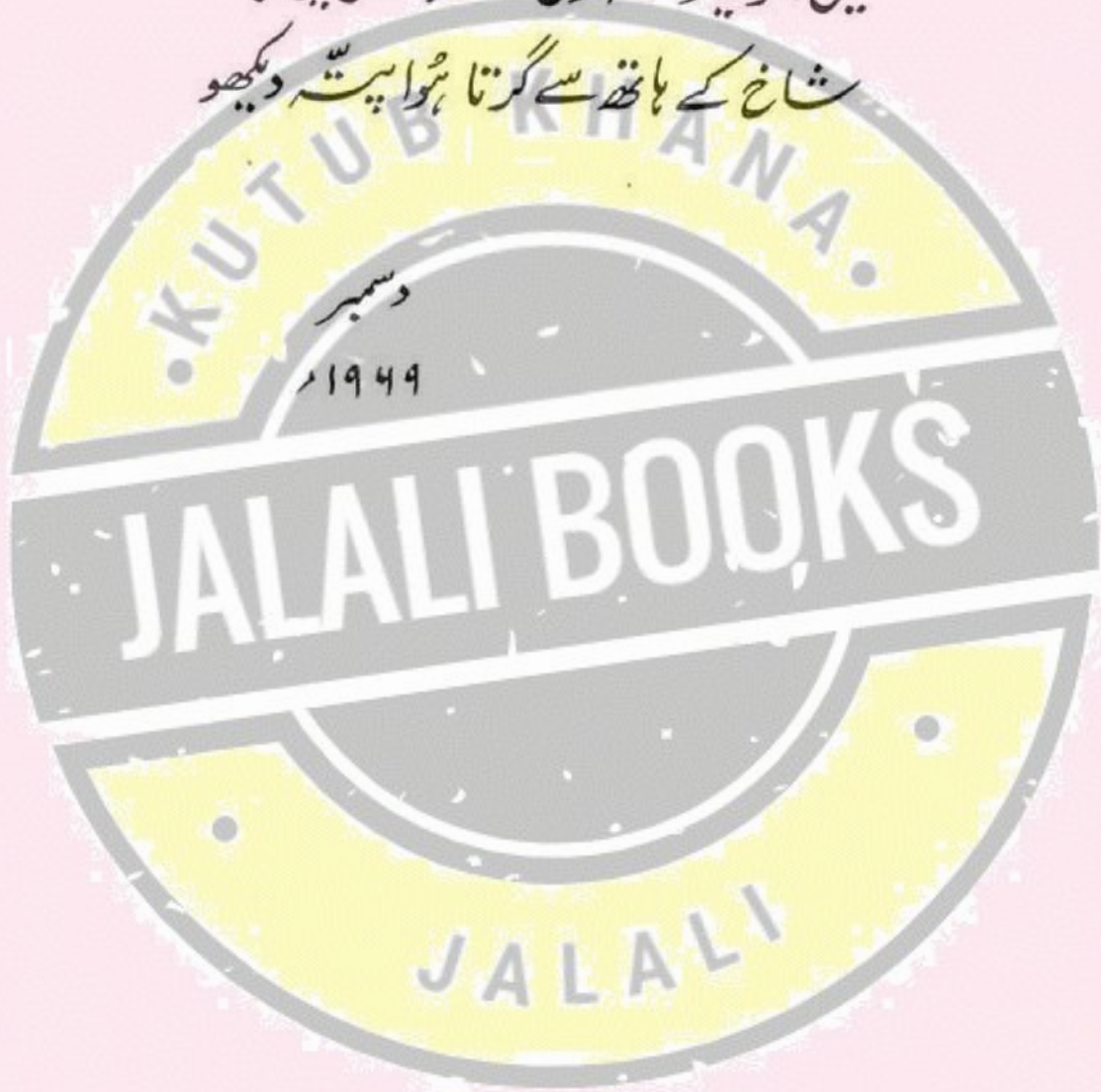
گمرہی ، اِک ادائے معصُومی
سادگی بھی یہی ، بھبن بھی یہی

یہی رحمت ، جو ہے خزاں کی دُعا
دامنِ گُل میں شعلہ زن بھی یہی

بات دل سے نکل کے دل میں بسے
زندگی بھی یہی ہے ، فن بھی یہی

نومبر ۱۹۶۹ء
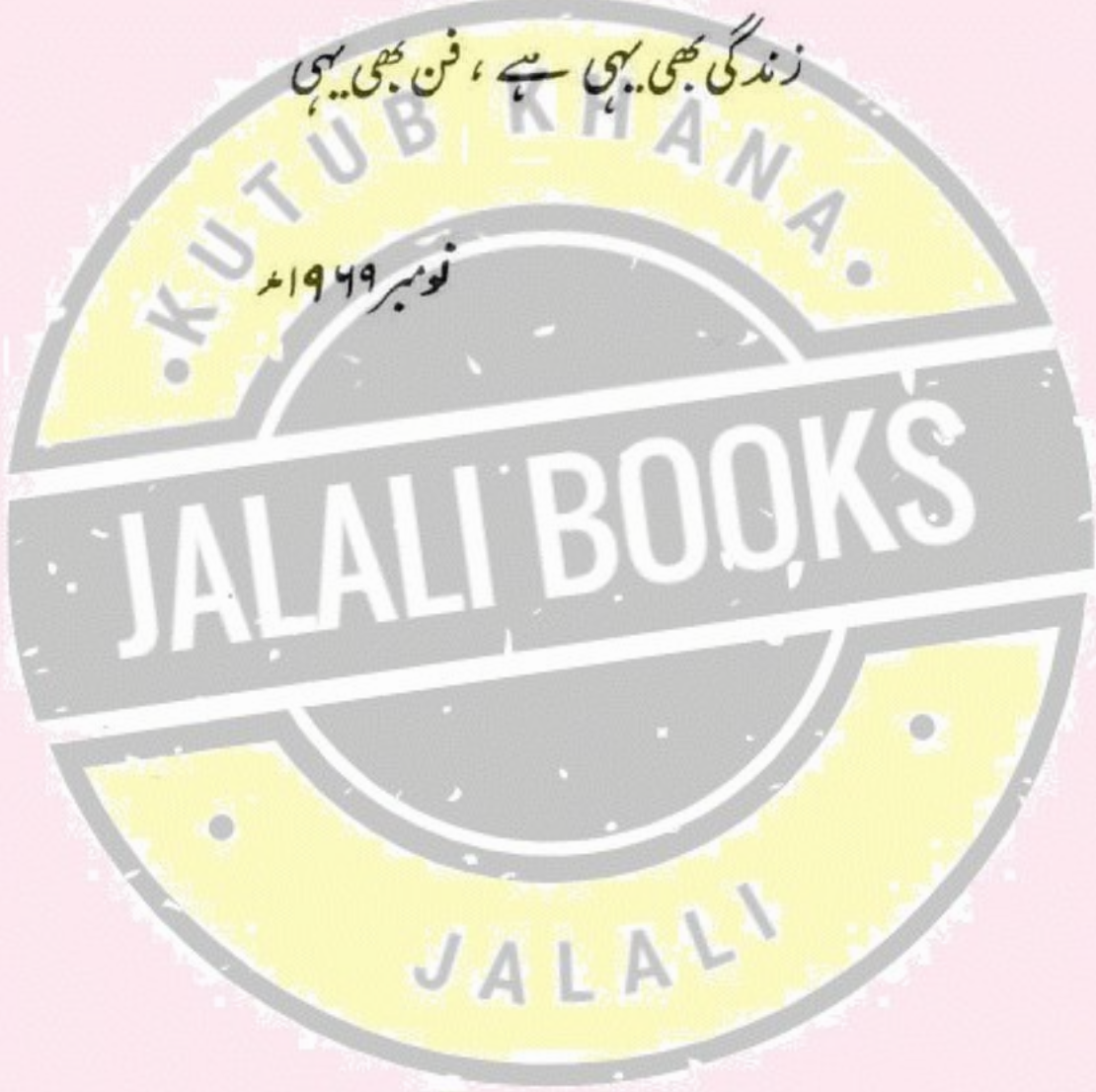
اب ترے شہر میں آؤں گا مُسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

تیرا پیمانِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا، مر جاؤں گا

چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار، کہ مَیں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا

اب تو خورشید کو ڈوبے ہُوئے صدیاں گزریں
اب اسے ڈھونڈنے مَیں تابہ سحر جاؤں گا

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہُوں ندیمؔ
بُجھ تو جاؤں گا مگر صُبح تو کر جاؤں گا

اکتوبر ۱۹۶۹ء

O

کِسے معلُوم تھا، اِس شے کی بھی تُجھ میں کمی ہو گی
گماں تھا تیرے طرزِ جبر میں شائستگی ہو گی

مُجھے تسلیم ہے، تُو نے محبّت مُجھ سے کی ہو گی
مگر حالات نے اظہار کی مُہلت نہ دی ہو گی

مَیں اپنے آپ کو سُلگا رہا ہُوں اِس توقّع پر
کبھی تو آگ بھڑکے گی، کبھی تو روشنی ہو گی

شفق کا رنگ کِتنے والہانہ پن سے بِکھرا ہے
زمیں ــ بامِ اُفق پر ــ اپنے سُورج سے مِلی ہو گی

سُنا ہے ، عالمِ لاہوت میں پھر زندہ ہونا ہے
مگر دھرتی سے کٹ کر زندگی کیا زندگی ہوگی!

وہ وقت آئے گا ، چاہے آج آئے ، چاہے کل آئے
جب انساں دشمنی ، اپنے خدا سے دشمنی ہوگی

کبھی گر جرم ٹھہرا تذکرہ حُسن و محبّت کا
تو کس کافر سے مُلک و قوم کی بھی شاعری ہوگی

ستمبر ۱۹۶۹ء

اب کے یوں موسمِ بہار آیا
اپنا سب کچھ خزاں پہ وار آیا

عمر گزری جِسے گرانے میں
سامنے پھر وہی حصار آیا

صفحۂ وقت پر — بہ خطِّ جلی
میں ترا نقش تو اُبھار آیا
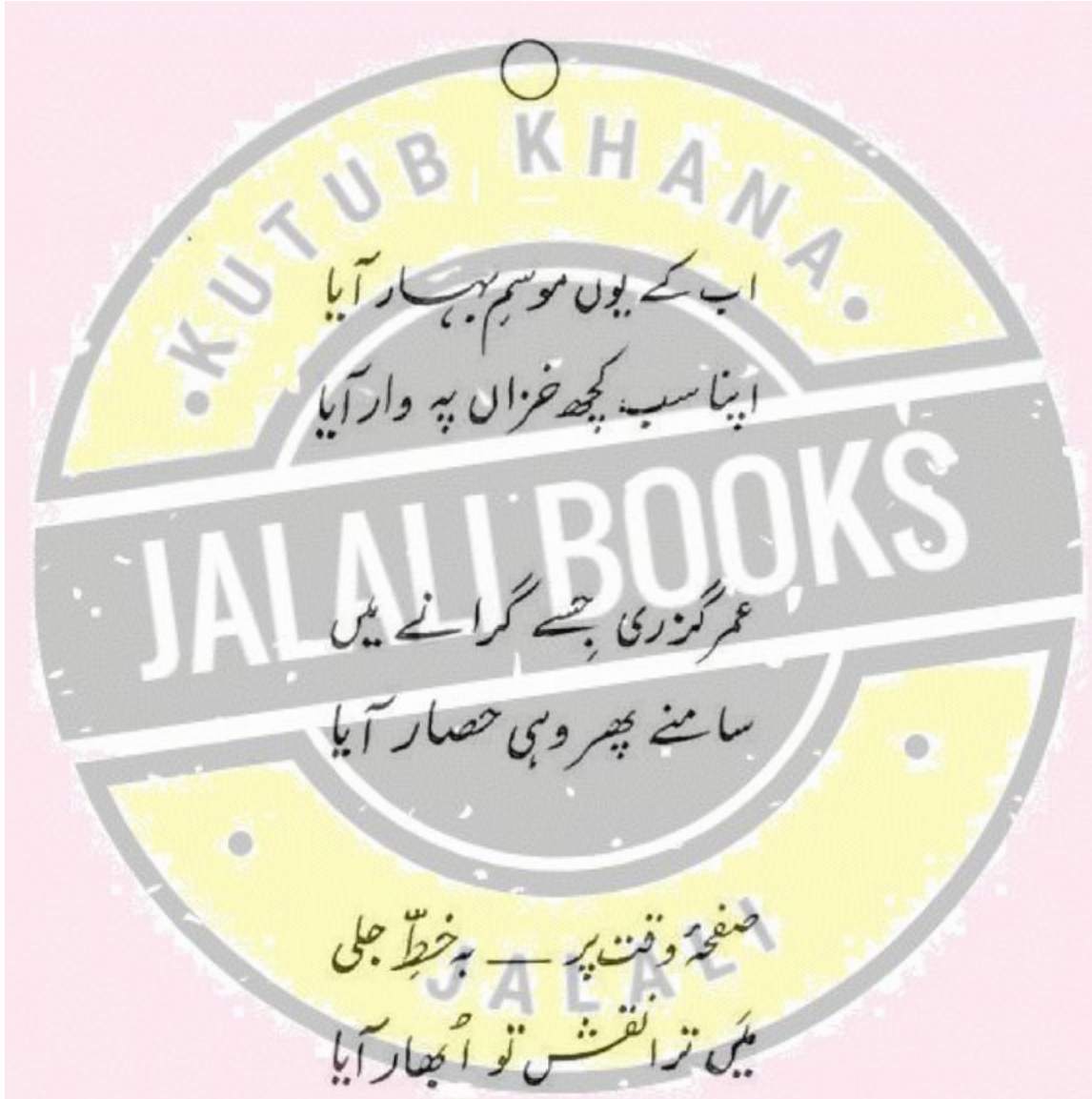
حُسن ہر شے کی کیفیت میں ہے
مجھ کو تو رات پر بھی پیار آیا

کتنی عُمریں عدم میں گزُری ہیں
میں زمیں پر بس ایک بار آیا

نہ ہُوئی عشق کی نماز قبُول!
دل مگر بوجھ تو اُتار آیا

سب کو مجبور کر دیا اس نے
جس کے قبضے میں اختیار آیا

جون ۱۹۶۹ء

جو شوق ہے، کہ اضافہ ہو نکتہ چینیوں میں
نئے گلاب اگاؤ نئی زمینوں میں

تمام عمر رہے ہم اگرچہ سر بہ سجود،
وہی لکیریں کھدی رہ گئیں جبینوں میں

عجیب آب و ہوا تھی شعورِ انساں کی
کئی گماں پنپتے رہے یقینوں میں
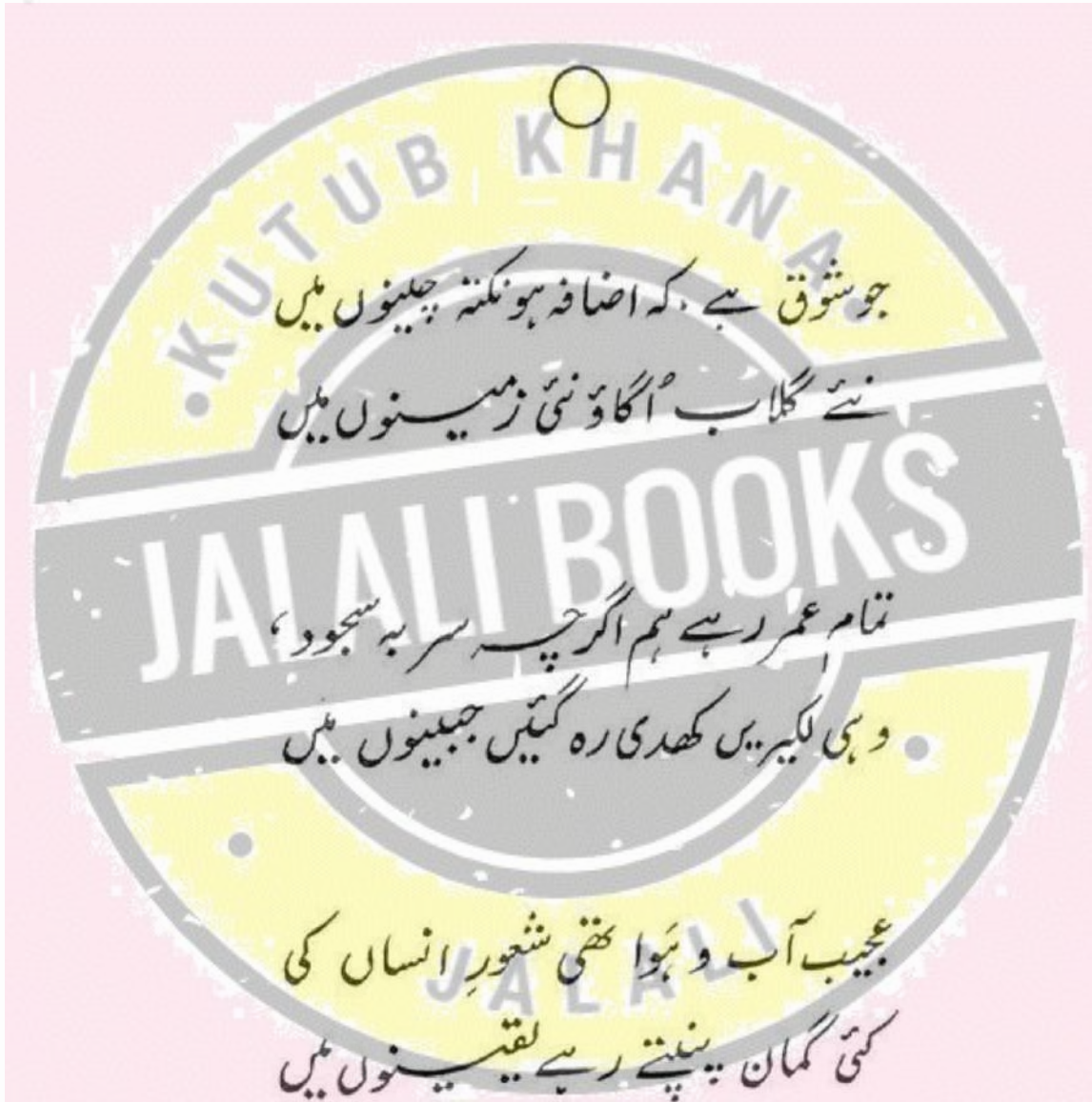
بتوں کو آج سروں پر سجا کے نکلے لوگ،
وہ دن گئے کہ چھپاتے تھے آستینوں میں

یہ کس کے اشک ہیں اے بادشاہِ عدل پناہ
جو ڈھل گئے ہیں ترے تاج کے نگینوں میں

خدا نہ کردہ، کِسی قوم پر یہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینوں میں

مئی ۱۹۶۹ء

○
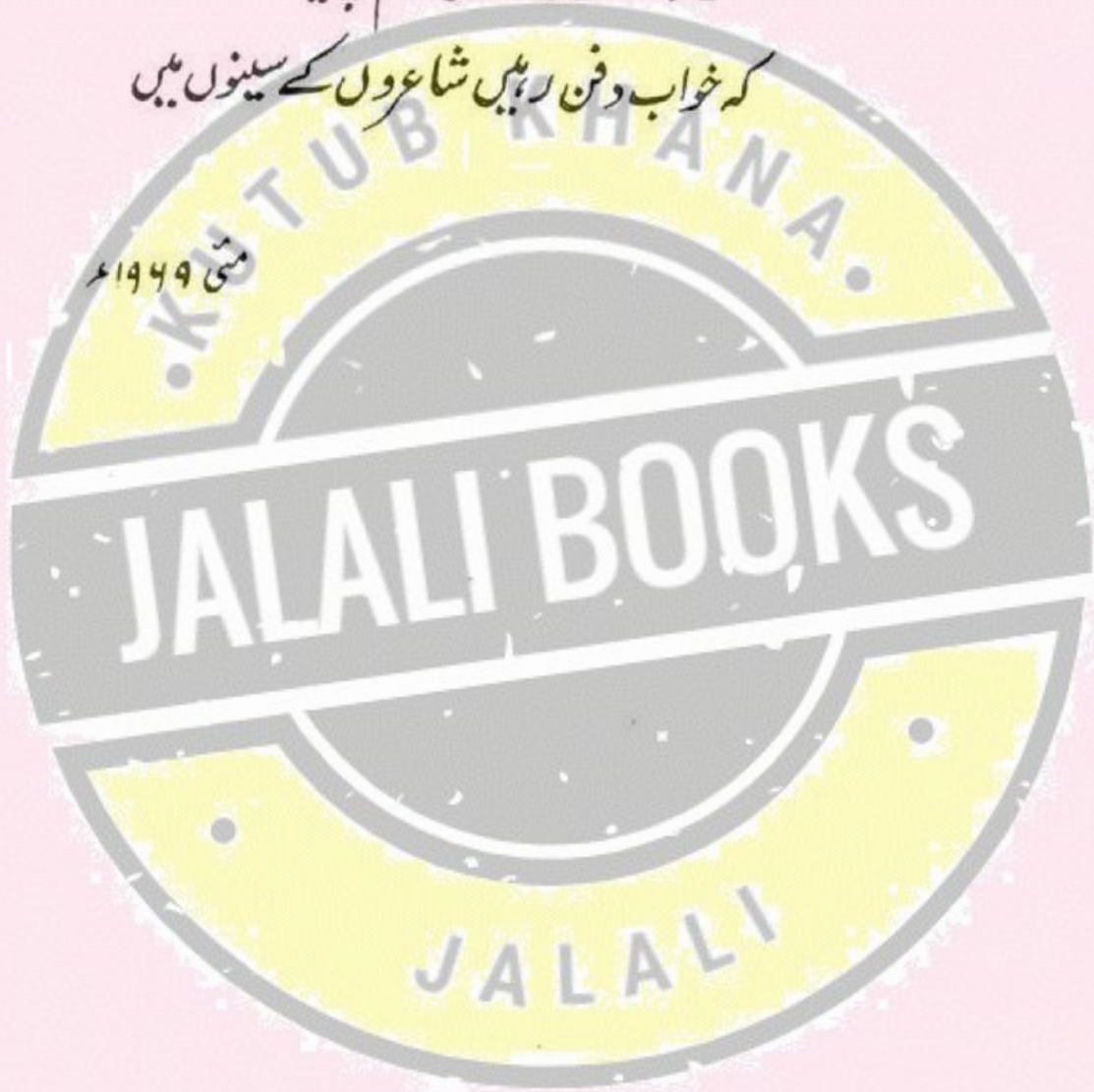
(نذرِ اقبال)

بجا، کہ یوں تو سکون تیری بارگاہ میں ہے
مگر یہی تو قیامت مری نگاہ میں ہے

میں جب بھی تجھ سے ملا، جیسے پہلی بار ملا
بڑا سرور ملاقاتِ گاہ گاہ میں ہے

جہاں بھی جاؤں، تعاقب میں ہیں مسائلِ زیست
پناہ صرف ترے حُسنِ بے پناہ میں ہے

تمام عمر کی مشقِ گناہ میں نہ ملی
وہ سرخوشی جو مرے اوّلیں گناہ میں ہے

نہ کر سکا مَیں بغاوت مزاجِ آدم سے
بلا کا نُور مرے نامۂ سیاہ میں ہے

اُفق پہ خلد کے آثار جھلملائے تو ہیں
مگر سُنا ہے، جہنّم بھی اس کی راہ میں ہے

چھُپا رہا ہے وہ داغ اپنی بے دماغی کا
جو سَر سجا ہُوا زربفت کی کلاہ میں ہے

سحر سے عشق بھی ہو، شام کا شعور بھی ہو
یہی پیام مری آہِ صُبحگاہ میں ہے

خدا کا شکر کہ ارزاں نہیں مرے سجدے
مرے وجُود کا پندار، لاالٰہ میں ہے

ندیم حال کو کھا جائے گا وہ سنّاٹا
کہ جس کی گوُنج سی، ماضی کی خانقاہ میں ہے

اپریل ۱۹۶۹ء

کیا جرم ہے شوقِ خود نمائی؟
پھولوں کو ہنسی نہ راس آئی

دل کو رہی جستجو ہماری
ہم چھانتے رہ گئے خدائی

ہم خوش ہیں شکستِ آرزو سے
سنّاٹے میں اک صدا تو آئی
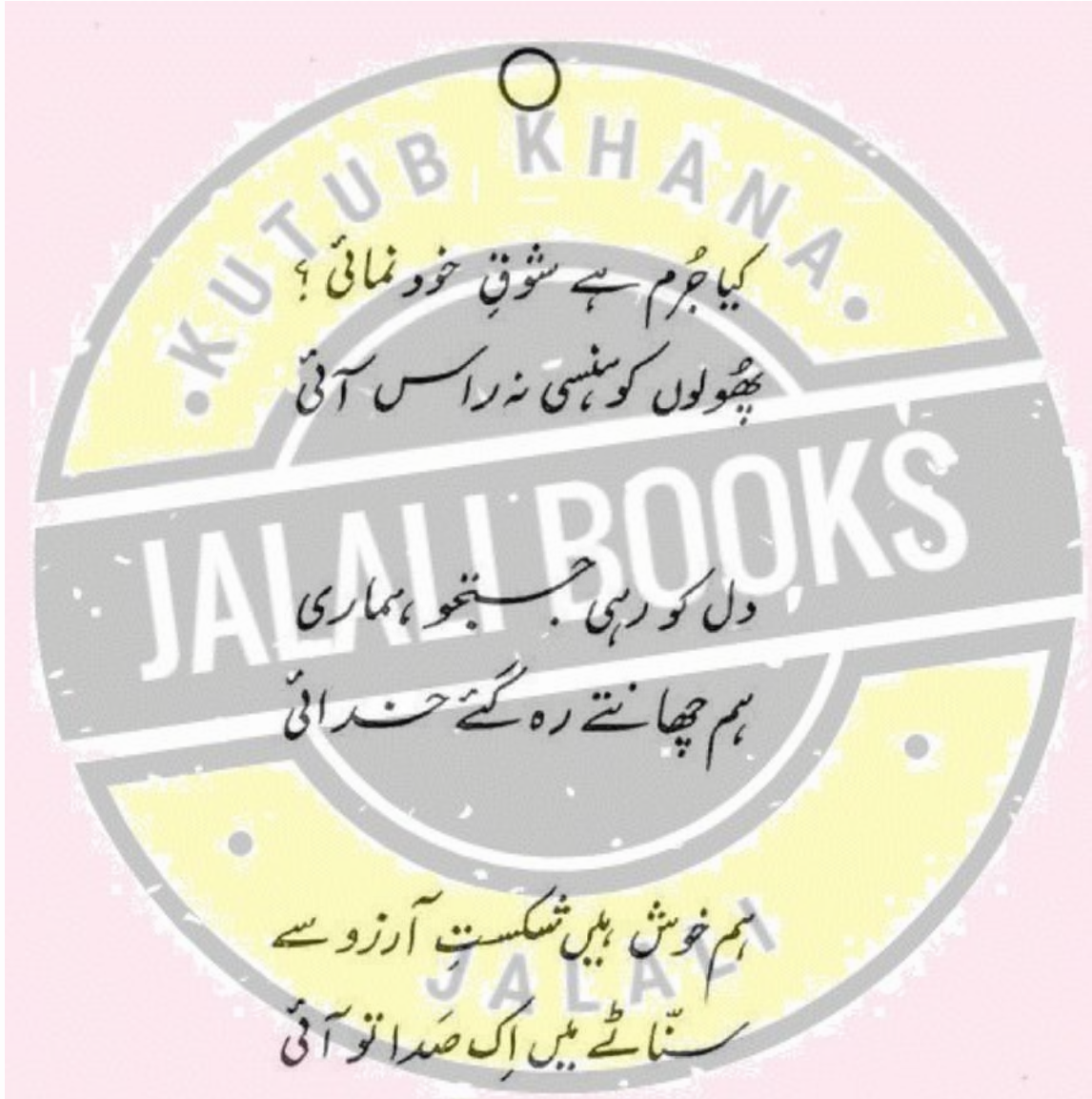
گھٹتے نہیں فاصلے دِلوں کے
مِٹتا نہیں دردِ نارسائی

بس ایک ہی نقش روبرو ہے
آئینے پہ جم رہی ہے کائی

لمحوں میں سمٹ گیا ترا وصل
برسوں پہ بکھر گئی جدائی

انساں کو کوئی جواب تو دے
یارب! ترے عدل کی دہائی

صحراؤں کی وسعتوں سے ہٹ کر
خرمن ہی پہ برق کیوں گرائی؟

اپریل ۱۹۶۹ء

○

(نذرِ غالبؔ)

اب تک تو نور و نکہت و رنگ و صدا کہوں
مَیں تجھ کو چھُو سکوں تو خدا جانے کیا کہوں

لفظوں سے اُن کو پیار ہے، مفہوم سے مجھے
وہ گُل کہیں جسے، مَیں ترا نقشِ پا کہوں

اب جستجو ہے تیری جفا کے جواز کی
جی چاہتا ہے، تجھ کو وفا آشنا کہوں

صرف اس لیے، کہ عشق اسی کا ظہور ہے
مَیں تیرے حسن کو بھی ثبوتِ وفا کہوں

تو چل دیا تو کتنے حقائق بدل گئے
نجمِ سحر کو، مرقدِ شب کا دیا کہوں

کیا جبر ہے، کہ بُت کو بھی کہنا پڑے خدا
وہ ہے خدا تو، میرے خدا! تجھ کو کیا کہوں

جب میرے مُنہ میں میری زباں ہے، تو کیوں نہ میں
جو کچھ کہوں، یقیں سے کہوں، برملا کہوں

کیا جانے، کس سفر پہ رواں ہوں ازل سے میں
ہر انتہا کو ایک نئی ابتدا کہوں

ہو کیوں نہ مجھ کو اپنے مذاقِ سخن پہ ناز
غالبؔ کو کائناتِ سخن کا خدا کہوں

فروری ۱۹۶۹ء

○

(نذرِ غالبؔ)

میرا ذوقِ دید، تیرا رُوئے زیبا جل گیا
کیا بتاؤں، دشتِ تنہائی میں کیا کیا جل گیا

اپنے جلوؤں کو غرورِ کبریائی سے نہ دیکھ
اپنی حد سے بڑھ کے جب چمکا ستارا، جل گیا

بسکہ مشکل ہے، جہنم زارِ دل میں جھانکنا
لوگ کہہ دیتے ہیں، بے چارے کا چہرہ جل گیا

رُوح کی حدّت میں جل بُجھ کر بھی، میرے جسم میں
وہ قیامت کی تپش تھی، دستِ عیسیٰ جل گیا

پیاس کیا بجھتی کہ صحرا کا تھا منظر سامنے
دُھوپ اِتنی تیز نکلی، رنگِ دریا جل گیا

اب تو ذرّے بس سے باہر ہیں، ستارے پاس ہیں
آگ وہ برسی کہ سب معیارِ اشیا جل گیا

درسِ آدابِ محبّت میں کٹی عُمرِ عزیز
وہ دِیا ہُوں مَیں، جو اس تربت پہ تنہا جل گیا

فروری ۱۹۶۹ء

(اندازِ غالب)

گو زر و سیم کے انبار ہیں اغیار کے پاس
دولتِ درد ہے صرف اِک ترے فن کار کے پاس

منتشر رُخ پہ ترے، صبحِ شبِ وصل کے رنگ
پھول ہی پھول ہیں اس لمحۂ گُل بار کے پاس

تیری کافر نگہی کی نہیں کرتا تائید
جرمِ چشم، ترے ابروئے خم دار کے پاس

دُور تک اُن کی بصارت بھی ترے ساتھ گئی
صرف آنکھیں ہی تو تھیں تشنۂ دیدار کے پاس

آج تنہائی کی یُوں آخری تکمیل ہُوئی
مر گئے سائے بھی آ کر تری دیوار کے پاس

ان میں کچھ ہے تو فقط گُونج ہے سنّاٹوں کی
گھر جو آباد نظر آتے ہیں بازار کے پاس

جو چمکتے ہیں، وہی رات کا سرمایہ نہیں
راکھ ہے کِتنے ستاروں کی، شبِ تار کے پاس

کِتنے چہرے ہیں جنھیں وقت مٹاتا ہی نہیں
اِک نمائش سی لگی ہے رسن و دار کے پاس

صِرف اتنا ہے، کہ رستے سے شناسائی نہیں
یُوں تو سب کچھ ہے مرے قافلہ سالار کے پاس

کچھ حقائق ہیں تو کچھ خواب سراسر مایہ
بس یہی کچھ ہے حقیقت کے گنہگار کے پاس

جنوری ۱۹۶۹ء

خوئے اظہار نہیں بدلیں گے
ہم تو کردار نہیں بدلیں گے

غم نہیں بدلیں گے یارو، جب تک
غم کے معیار نہیں بدلیں گے

لوگ آئینے بدلتے ہیں، مگر
اپنے اطوار نہیں بدلیں گے
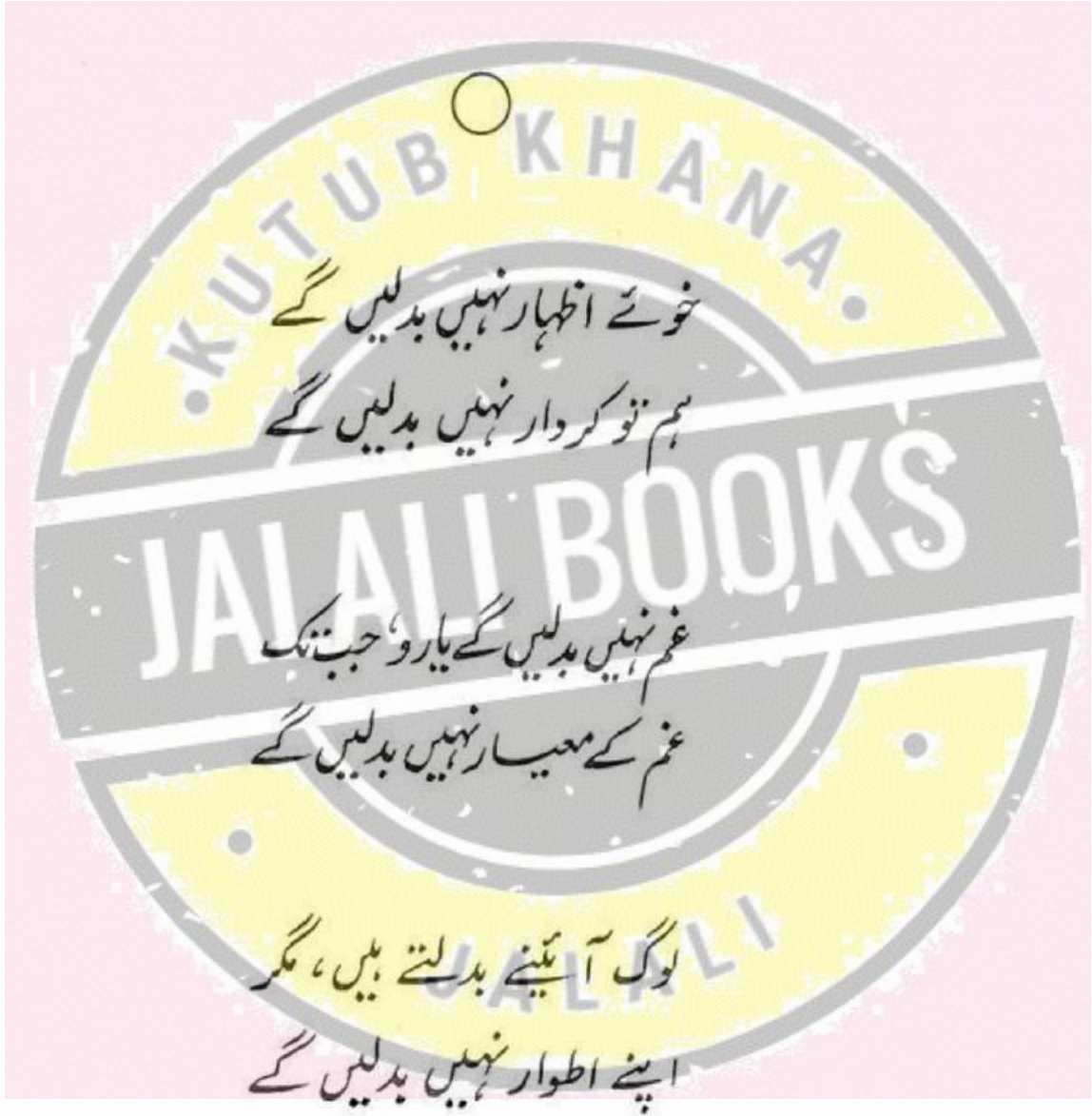
تم نہ بدلو گے، تو زندانوں کے
در و دیوار نہیں بدلیں گے

قافلے راہ بدلنے پہ مصر
اور سالار نہیں بدلیں گے

چاہیں تو راہنما سستا لیں
ہم تو رفتار نہیں بدلیں گے

دسمبر ۱۹۶۸ء
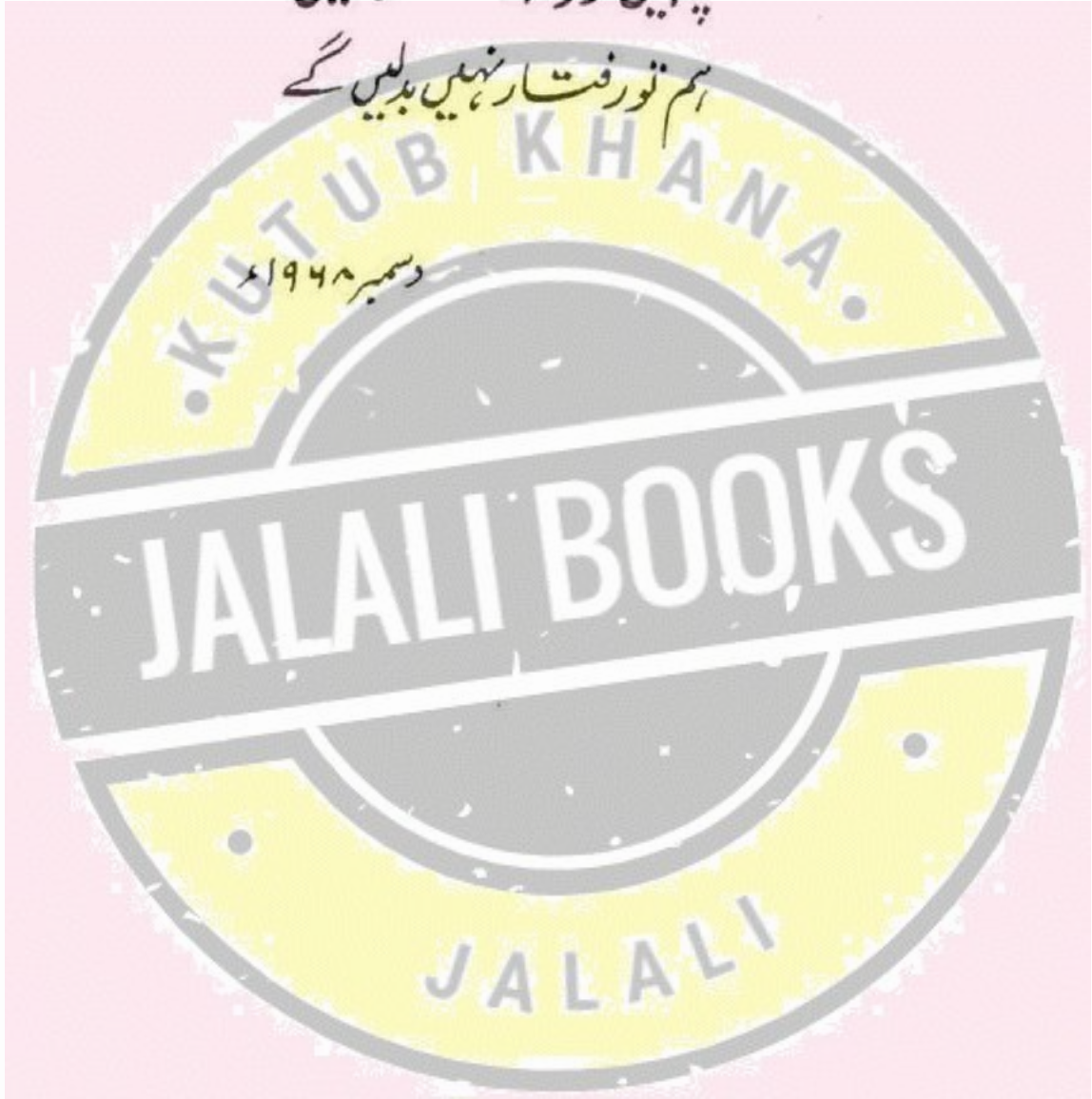
مَیں تیرے ساتھ رواں تھا، مگر اکیلا تھا
یہ مَیں تھا تیرے جلو میں، کہ تیرا سایہ تھا

عجب تھیں ہجر کی راتیں، کہ ان کے ماتھے پر
سدا سحر کا ستارہ چمکتا رہتا تھا

تری شمیمِ بدن نے قدم اکھیڑ دیے
مَیں آندھیوں میں بھی کیسا سنبھل کے چلتا تھا

یہ سوچ کر، کہ مَیں تیرے بغیر زندہ رہا
مَیں تیرے سامنے کل رات کتنا رویا تھا

تُو دیکھتا ہے تو کیوں روشنی سی پھیلتی ہے
افق پہ یا تری آنکھوں میں چاند ڈُوبا تھا

زمین ضد پہ اڑی تھی کہ صُبح ہو بھی چکے
ستارے ڈوب رہے تھے، چراغ جلتا تھا

یہی کہ عِشق سلیقہ ہے زندہ رہنے کا
میں ایک عُمر میں بس اِتنی بات سمجھا تھا

وہ ایک پَل تھا، کہ عصرِ رواں، کہ پُوری صدی
ندیم، دل سے جو اِک تیرِ حُسن گُزرا تھا

اکتوبر ۱۹۶۸ء

ہیں میرے قلب و نظر، لعل اور گہر میرے
سمیٹ لیں مرے ریزوں کو شیشہ گر میرے

وہ بول ہوں کہ کہیں نغمہ ہوں، کہیں فریاد
وہ لفظ ہوں کہ معانی ہیں منتشر میرے

مرے نصیب میں بنجر زمیں کی رکھوالی
کنوئیں اداس مرے، کھیت بے ثمر میرے
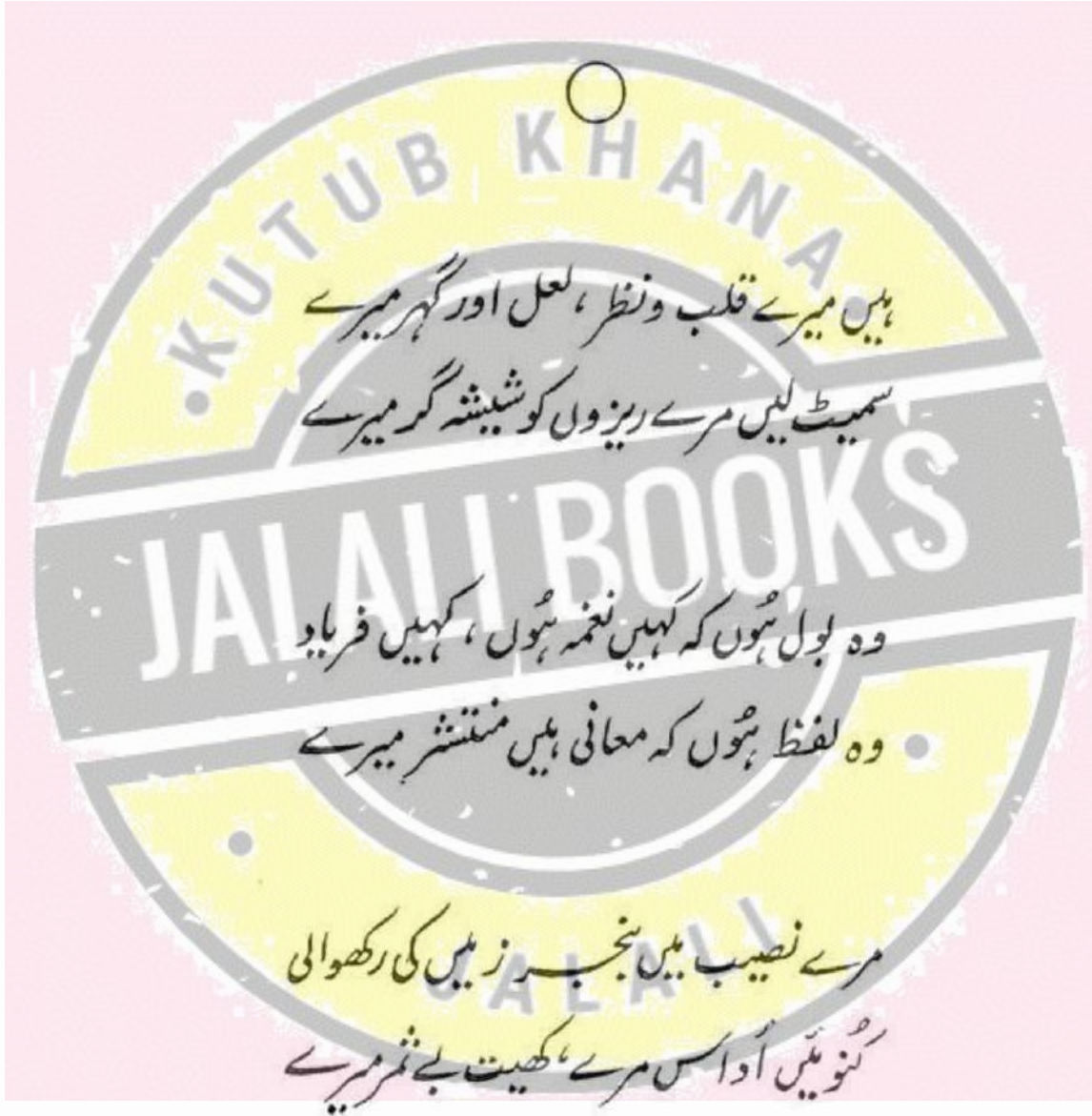
خزاں میں ولولۂ پرکشائی کس نے دیا
بہار آئی تو باندھے ہیں کس نے پر میرے

وہ پھول توڑتے ہیں، اور میں خار چنتا ہوں
بچھڑتے جاتے ہیں یوں مجھ سے ہمسفر میرے

عجیب دور ہے! بےغم بھی اور بےحس بھی
کہ میرے درد پہ ہنستے ہیں چارہ گر میرے

جو گل کو دیکھ کے تخلیقِ گل کا ذکر کیا
تو یہ کھلا کہ ارادے ہیں پُرخطر میرے

مجھے تلاش ہے اُس عدل گاہ کی جس میں
مرے گناہوں کے الزام آئیں سر میرے

ندیم میرے ہنر کے وہ لوگ منکر ہیں
مرے عیوب کو کہتے ہیں جو ہنر میرے

اکتوبر ۱۹۶۸ء

چھن گئے تم، تو حسینوں کے یہ میلے کیوں ہیں
بجھ گیا دل، تو اُجالے کے یہ ریلے کیوں ہیں

عشق کا کھیل بھی ہے دُوسرے کھیلوں جیسا
مات کا جن میں نہیں حوصلہ، کھیلے کیوں ہیں

اے خداوند! ہر انسان کا جینا، مرنا
تیری منشا ہے، تو پھر اتنے جھمیلے کیوں ہیں
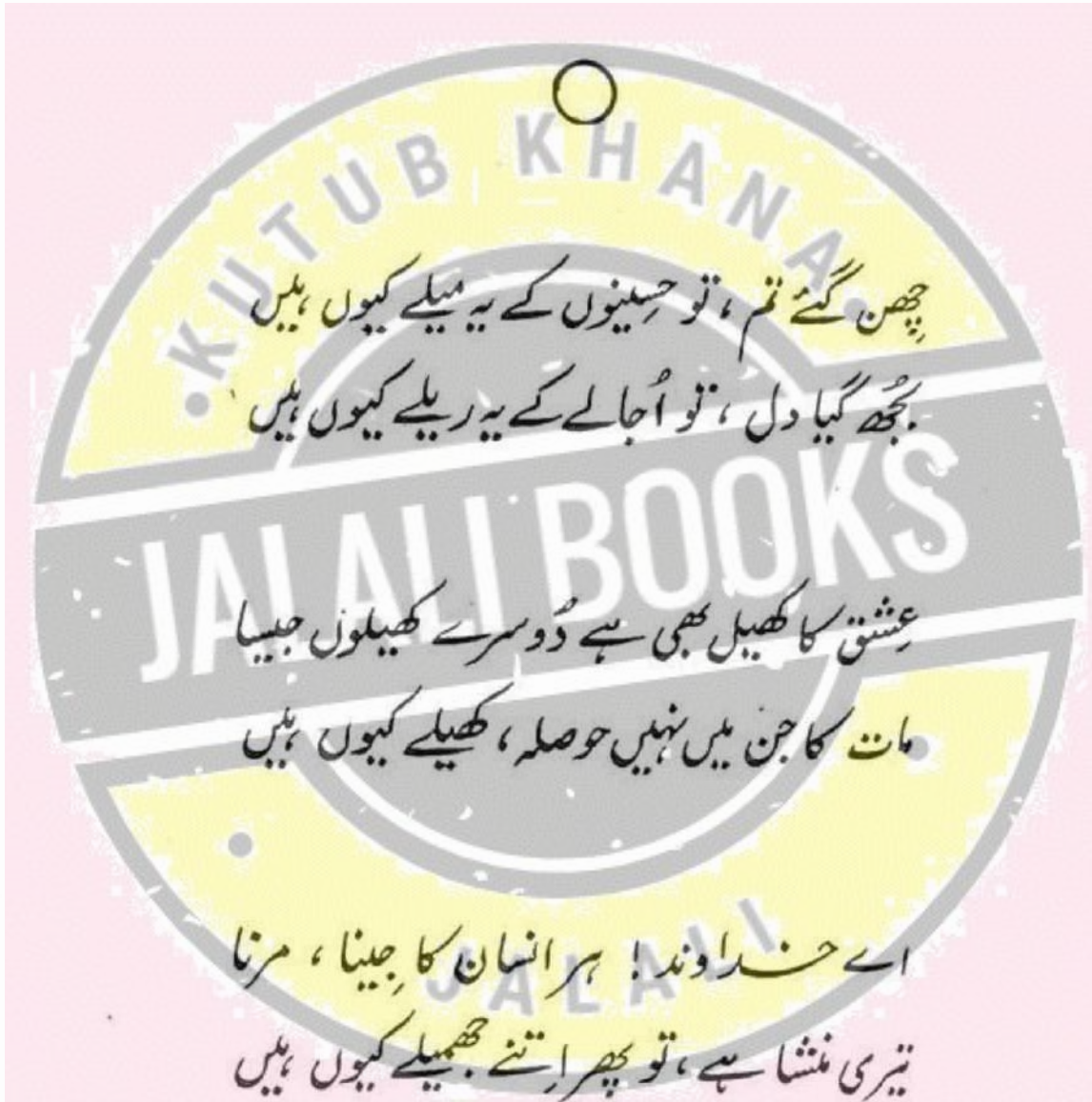
جب کسی شخص کو تقدیر نے کچھ بھی نہ دیا
آج تک سب اسی جلّاد کے چیلے کیوں ہیں

اپنے کاندھوں پہ جنازے لیے اپنے اپنے
ہم کروڑوں ہیں، مگر پھر بھی اکیلے کیوں ہیں

پا بہ زنجیر سہی، چیخ تو سر کر دیتے
ہم نے دُکھ اتنے کڑے صبر سے جھیلے کیوں ہیں!

جولائی ۱۹۶۸ء
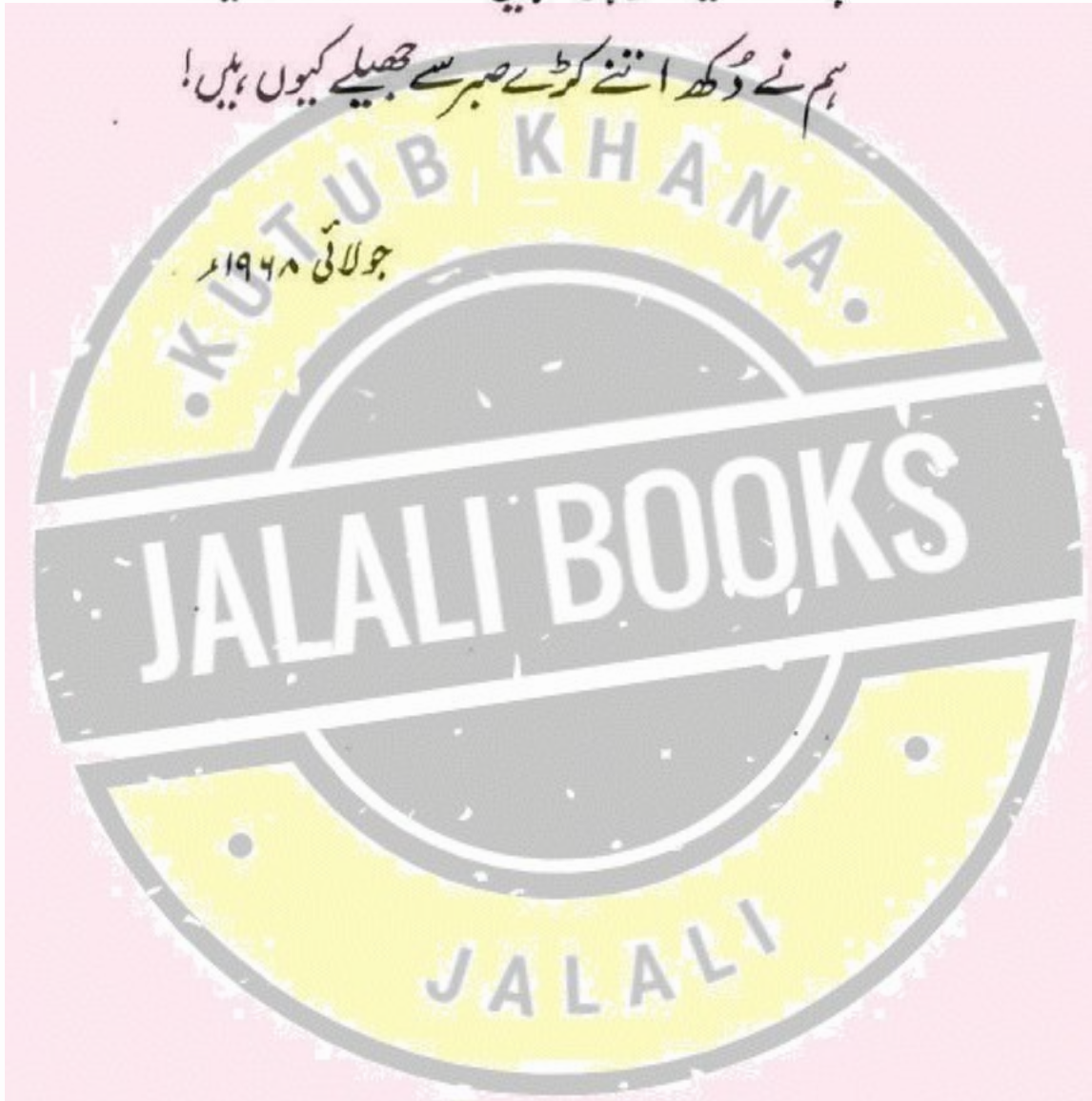
کوہ کاٹیں گے کبھی ، دشت کبھی چھانیں گے
ہم تو اے عشق ، سدا تیرا کہا مانیں گے

ہم تو خوش ہیں ترے اظہارِ محبت سے ، مگر
آئینے اب تری صُورت نہیں پہچانیں گے

تُو بُھلانا ہمیں چاہے تو بُھلا دے ، لیکن
تُو ہمیں یاد نہ آئے گا تو جب جانیں گے

ہم تو اللہ کے بھی قرب سے بیگانہ ہیں
اجنبی ! ہم تجھے کچھ دُور سے پہچانیں گے

عُمر بھر جس کے تعاقب میں رہیں گے ہم لوگ
مار ڈالیں گے تو پھر اُس کو خدا مانیں گے

یہی تاریخ کے ہر دَور کا عنواں ہے ندیمؔ
جو قدم چھُوتے ہیں، نیزے بھی وہی تانیں گے

جولائی ۱۹۶۸ء
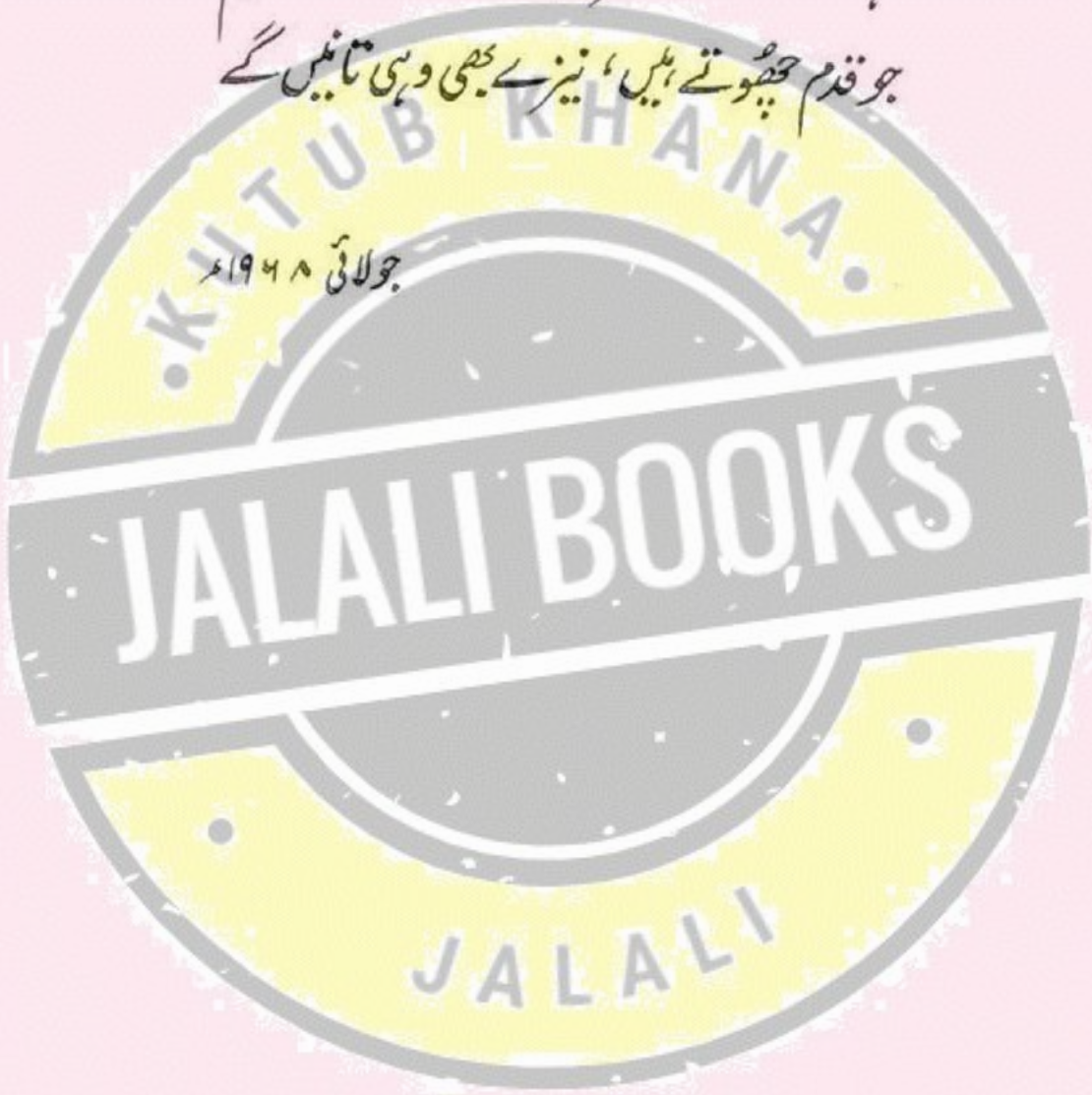
مَیں زندۂ جاوید باندازِ دگر ہُوں
بھیگے ہُوئے جنگل میں سُلگتا ہُوا گھر ہُوں

ذرّہ ہُوں، بظاہر مَیں دکھائی نہیں دیتا
مُجھ میں کبھی جھانکو تو مَیں تا حدِّ نظر ہُوں

دشمن بھی جو چاہے تو مِری چھاؤں میں بیٹھے
مَیں ایک گھنا پیڑ، سرِ راہگزر ہُوں

ظُلمت مرا ماحول، تجلّی مِری منزل
مَیں شب کا مُسافر ہُوں، مگر شمعِ سحر ہُوں

بے دَم ہُوں، مگر ساتھ نہ چھوڑوں گا تمھارا
تم لوگ مُسافر ہو تو مَیں گردِ سفر ہُوں

یہ سوچ کے پتّھر مجُھے مارو مِرے یارو
کچھ بھی ہُوں، تمھارا ہی تو مَیں آئینہ گر ہُوں

یارب، مجُھے اِس کربِ مسلسل سے رہا کر
مسجُودِ ملائک ہُوں تو کیوں خاک بسر ہُوں

قدرت سے ودیعت ہیں مجُھے رنگ بھی، رس بھی
ارزاں ہوں، کہ مَیں شاخِ بریدہ کا ثمر ہُوں

جون، جولائی ۱۹۶۸ء

کل رات عجیب خواب دیکھا
بجھتا ہُوا آفتاب دیکھا

دھجی دھجی تھی دُھوپ ساری
ٹکڑے ٹکڑے سحاب دیکھا

کہنے کو تو کائنات دیکھی
اِک خیمۂ بے طناب دیکھا
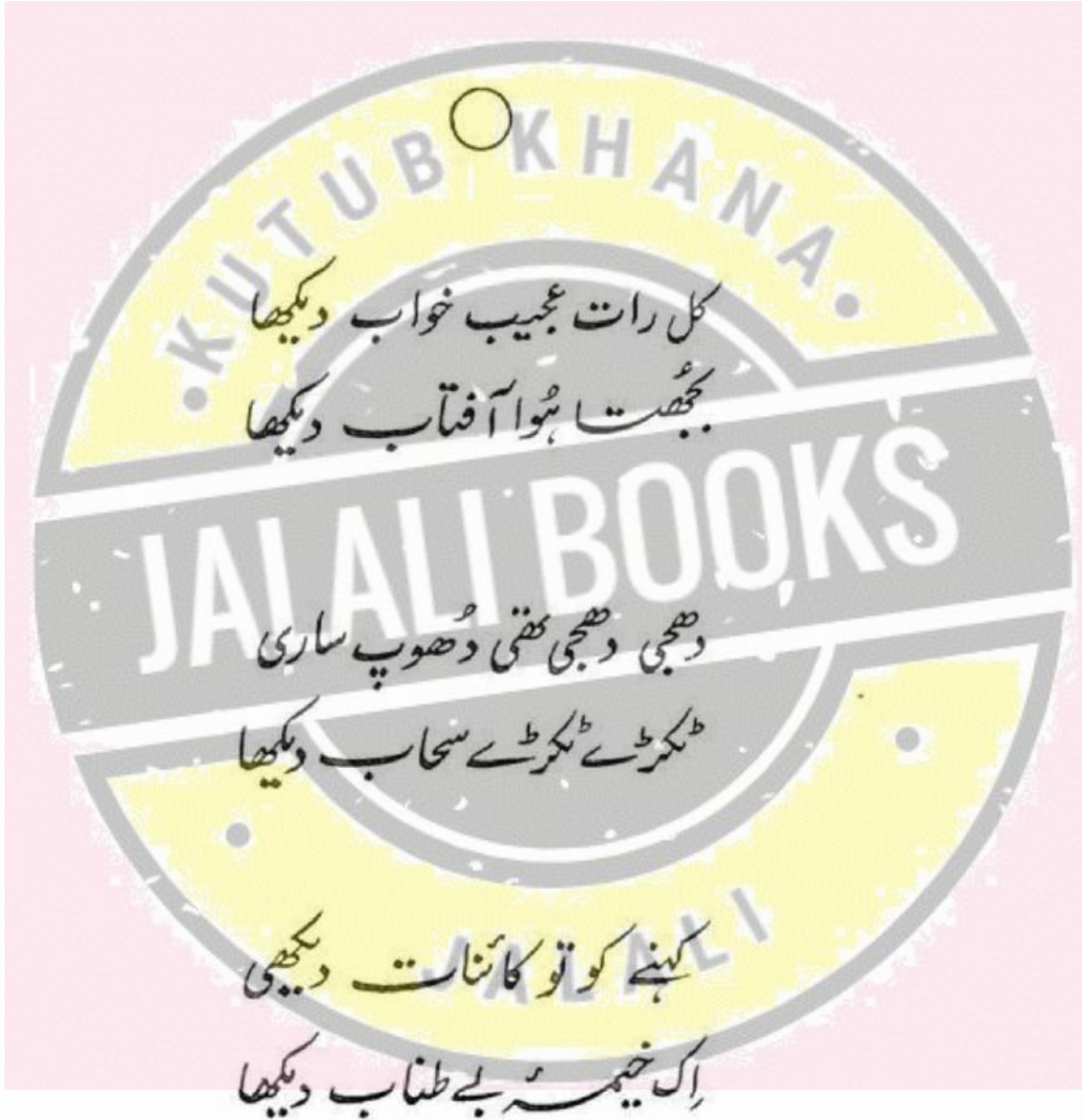
صحرائے حیات سے نکل کر
دیکھا تو وہی سراب دیکھا

سرکا جو ذرا سا پردۂ خیر
ہر جرم کا ارتکاب دیکھا

انسان نے فکر ترک کر دی
ایسا بھی اِک انقلاب دیکھا

مئی ۱۹۶۸ء

○

(نذرِ غالبؔ)

اِس طرف سے، ترا اِک پَل کو گزر ہونے تک
اِک بھرے شہر کو دیکھا ہے، کھنڈر ہونے تک

جیسے صحرا میں جدھر جائیے، ریت اُڑتی ہے
عُمر نے ساتھ دیا، صِرف بسر ہونے تک

رات سے بر سرِ پیکار نہیں صِرف چراغ
کہ ستارے بھی تو جلتے ہیں، سحر ہونے تک
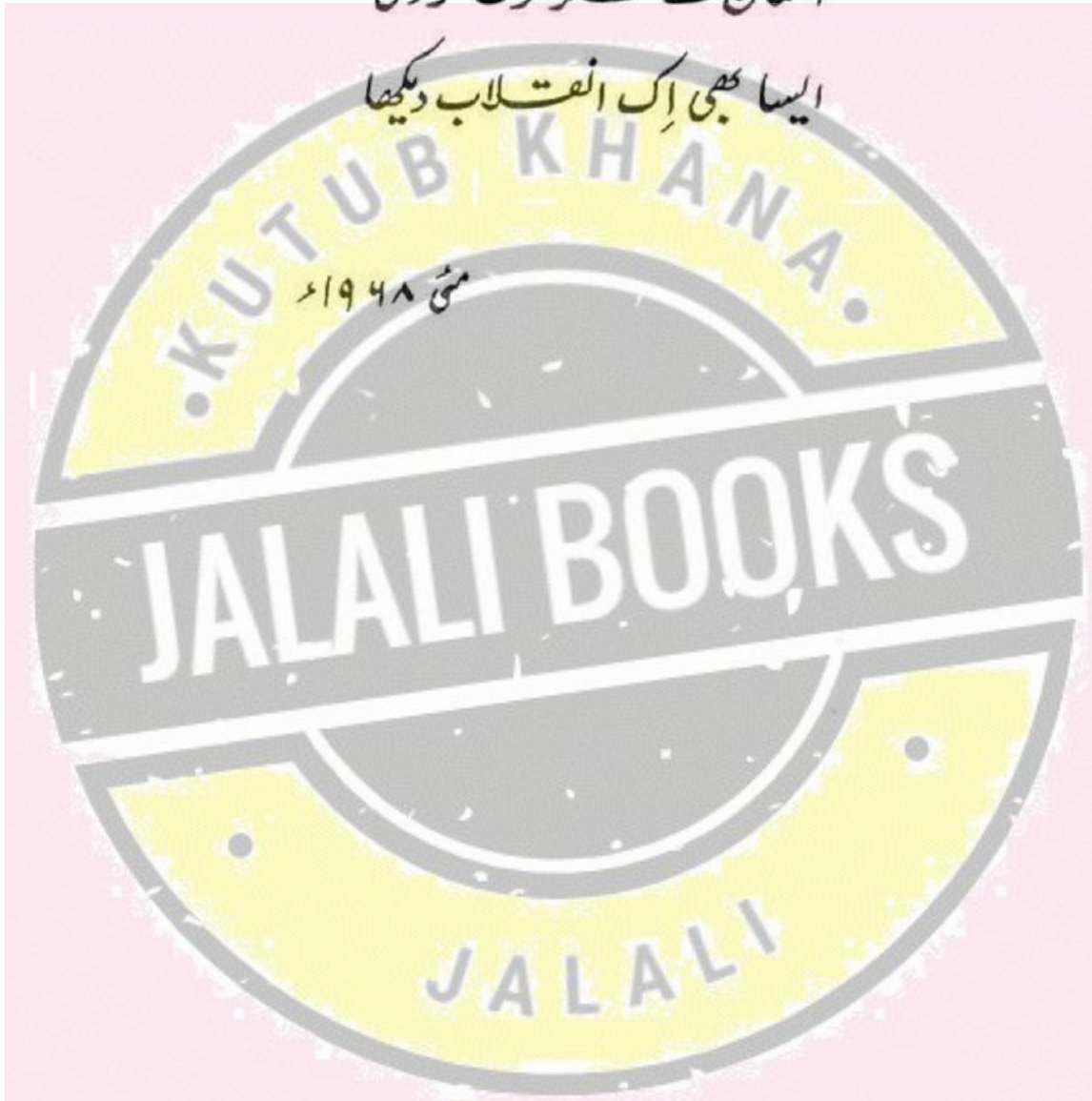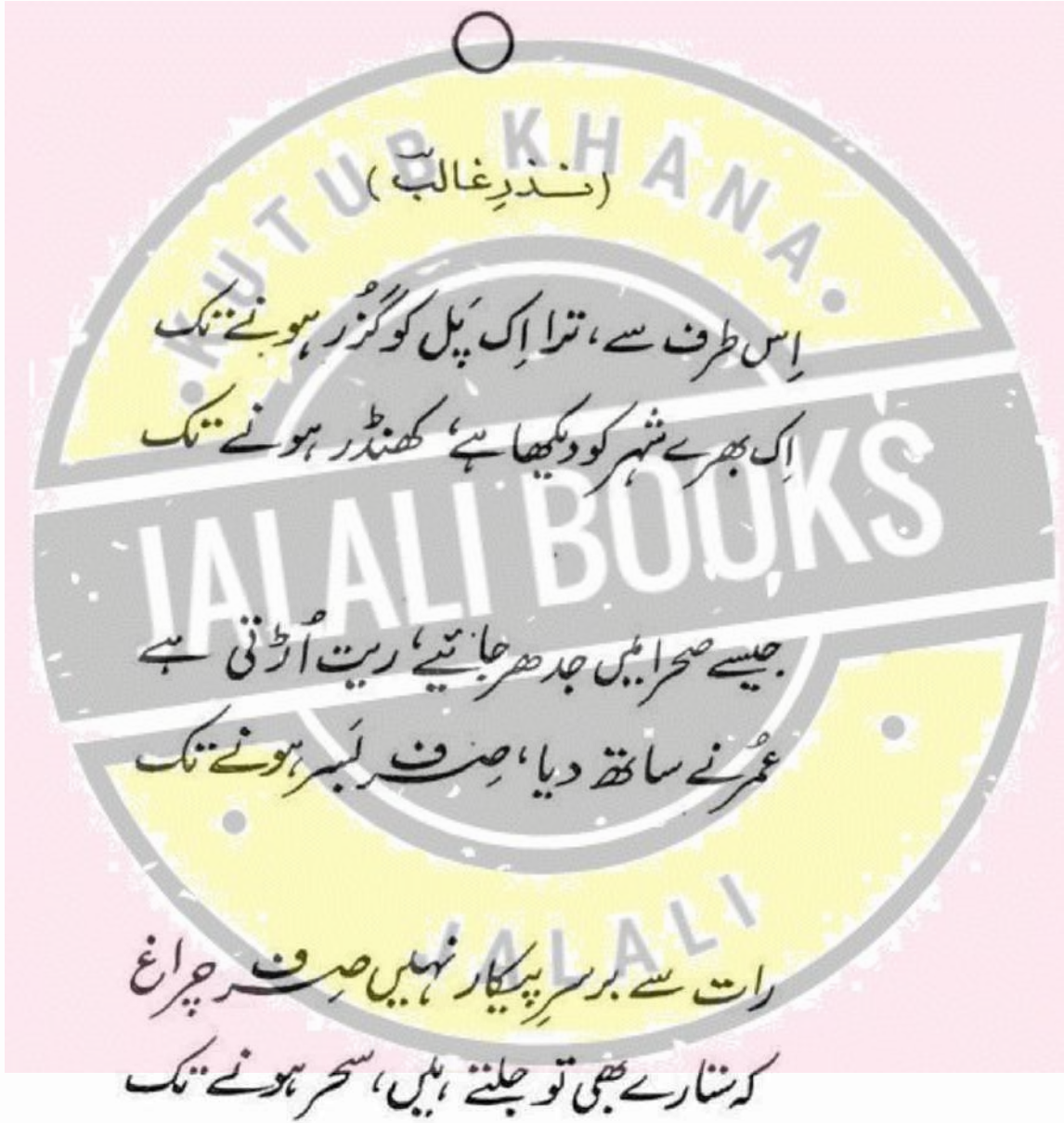
اے فصیلِ عدم! اے حلقۂ اسرار! ابھی
کِتنے سر چاہئیں دیوار کو در ہونے تک

سوچتا ہُوں کہ قیامت ہی نہ برپا ہو جائے
تیری رحمت پہ دُعاؤں کا اثر ہونے تک

آ ہی جائے گا تجھے حُسن کے منصب کا لحاظ
دل شکستہ ہوں ترے آئنہ گر ہونے تک

دُھوپ نکلی تو مِرا نغمۂ رنگیں سُننا
نالہ بر لب ہُوں میں اعلانِ سحر ہونے تک

مارچ ۱۹۶۸ء

احباب کے حِصّے میں ہزاروں ہُنر آئے
کچُھ درد بچے رہ گئے، جو میرے سر آئے

خُود اپنے ہی ریزے مری جھولی میں بھرے ہیں
اور لب پہ دُعا ہے کہ کوئی شیشہ گر آئے

مَیں جانتا ہُوں، زندہ ہُوں جس کرب سے، لیکن
زندہ ہُوں کہ شاید کوئی اُمّید بر آئے

مانا کہ ازل سے تری جانب نگراں ہُوں
بِھیگی ہُوئی آنکھوں سے مگر کیا نظر آئے

وہ شعبدۂ حُسنِ ادا ہے، کہ خدا ہے
ہر بار مِرے پاس برنگِ دگر آئے

جنگل ملے خاموش، تو صحرا ملے تنہا
انداز مِرے شہر کے ہر سُو نظر آئے

کہتے ہیں کہ مر کر مَیں کبھی مر نہ سکوں گا
کیا مر کے ہی جینے کی دُعا میں اثر آئے!

اُس حُسن کو آغوش میں لینے کا جنوں ہے
جو حُسن مجھے حدِّ نظر تک نظر آئے

کیا عرش سے آگے بھی کوئی ہے کہ نہیں ہے!
اب تو مجھے خُود اپنے خیالوں سے ڈر آئے

گردش سے اگر قطعِ نظر ہو، تو ہے ممکن
ڈوبا تھا جہاں چاند، وہیں سے اُبھر آئے

بہلاؤ نہ اب خلد سے ان خودنگروں کو
غیرت کو بچاکر جو فلک سے اُتر آئے

فروری ۱۹۶۸ء

○
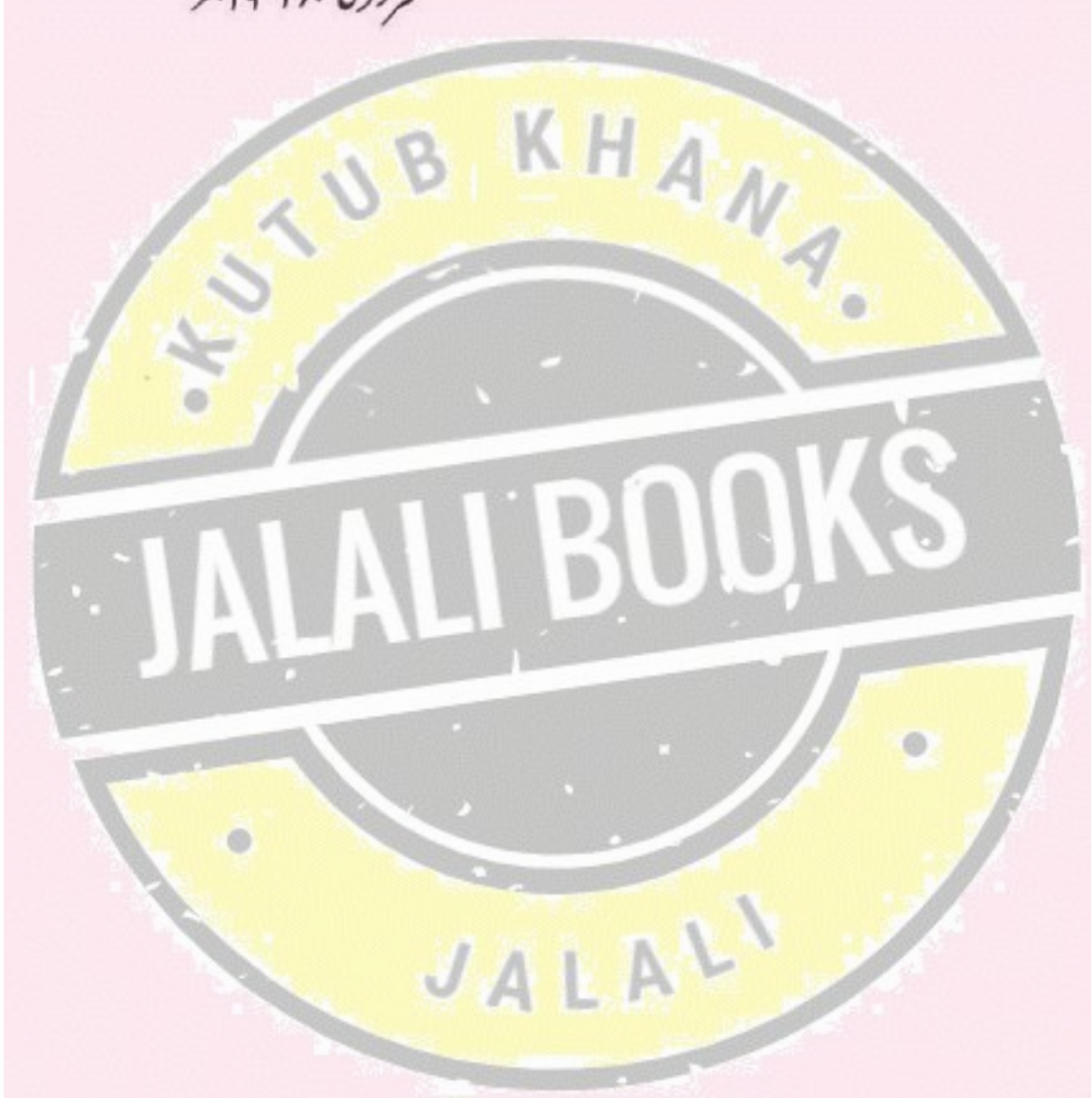
نہ ظلمتِ شب میں کچھ کمی ہے، نہ کوئی آثار ہیں سحر کے
مگر مسافر رواں دواں ہیں، ہتھیلیوں پر چراغ دھر کے

حصارِ دیوار و در سے مَیں نے نکل کے دیکھا کہ اس جہاں میں
ستارے جب تک چمک رہے ہیں، چراغ روشن ہیں میرے گھر کے

مَیں دل کا جامِ شکستہ لاؤں کہ روح کی کرچیاں دکھاؤں
مَیں کس زباں میں تمھیں سناؤں، جو مجھ پہ احساں ہیں شیشہ گر کے

نئی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی تاریخ خود لکھے گا
بس اب عجائب گھروں میں رکھ دو قدیم معیار خیر و شر کے

بہشت کی رفعتیں ابھی تک ندیمؔ کے انتظار میں ہیں
کہ اب بھی ذرّے چمک رہے ہیں فلک پہ آدم کی رہگزر کے

فروری ۱۹۶۸ء

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے، تو جھونکا ہوا کا تھا

اِس حُسنِ اتفاق پہ لُٹ کر بھی شاد ہُوں
تیری رضا جو تھی، وہ تقاضا وفا کا تھا

دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی،
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا
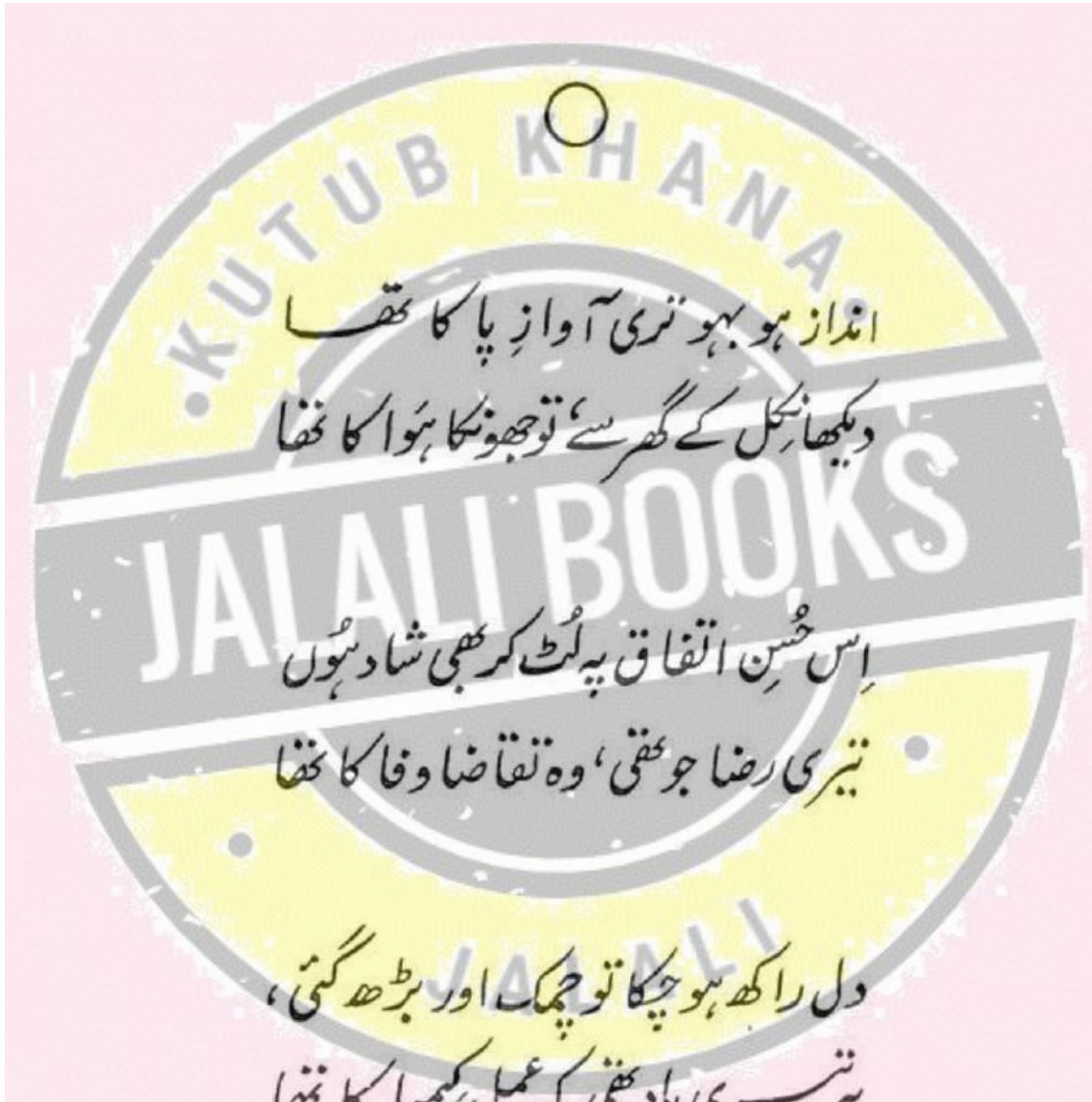
اس رشتۂ لطیف کے اسرار کیا کھُلیں!
تُو سامنے تھا، اور تصوّر خدا کا تھا

چھُپ چھُپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا تھا

اُٹھا عجب تضاد سے انسان کا خمیر
عادی فنا کا تھا تو پجاری بقا کا تھا

ٹوٹا تو کتنے آئنہ خانوں پہ زد پڑی
اٹکا ہُوا گلے میں جو پتھر صدا کا تھا

حیران ہُوں کہ دار سے کیسے بچا ندیمؔ
وہ شخص تو غریب و غیور انتہا کا تھا

دسمبر ۱۹۶۷ء

اب تو شہروں سے خبر آتی ہے دیوانوں کی
کوئی پہچان ہی باقی نہیں ویرانوں کی

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھریاں سر پہ اُٹھائے ہُوئے ایمانوں کی

اپنی پوشاک سے ہشیار! کہ خدّامِ قدیم
دھجیاں مانگتے ہیں اپنے گریبانوں کی
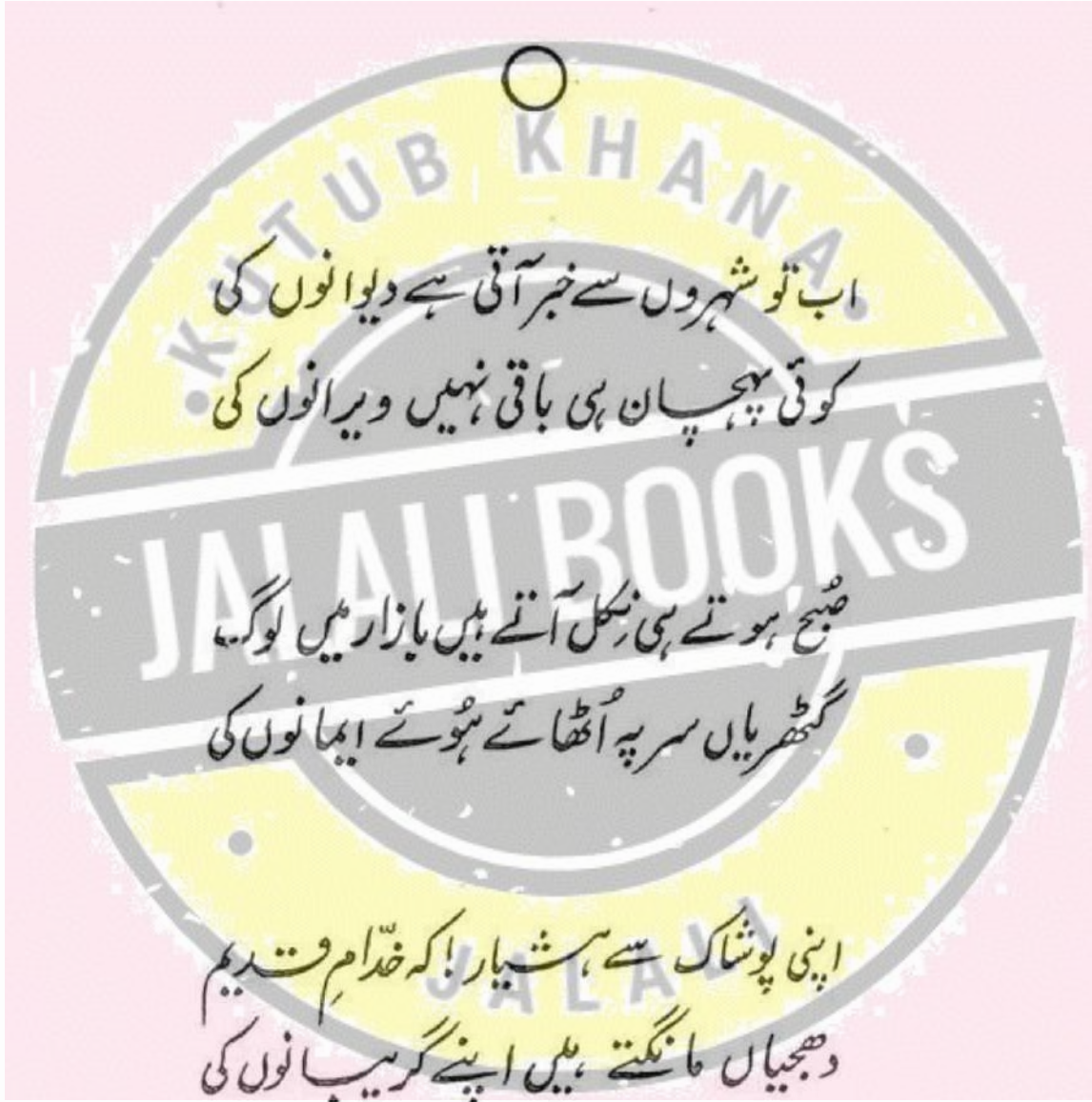
صنعتیں پھیلتی جاتی ہیں، مگر اس کے ساتھ
سرحدیں ٹوٹتی جاتی ہیں گلستانوں کی

دل میں وہ زخم کِھلے ہیں، کہ چمن کیا شے ہیں
گھر میں بارات سی اُتری ہُوئی گلدانوں کی

ایک اِک یاد کے ہاتھوں میں چراغوں بھرے طشت
کعبۂ دل کی فضا ہے کہ صنم خانوں کی

اُن کو کیا فِکر، کہ مَیں پار لگا، یا ڈُوبا
بحث کرتے رہے ساحل پہ جو طُوفانوں کی

مقبرے بنتے ہیں زندوں کے مکانوں سے بلند
کِس قدر اوج پہ تکریم ہے اِنسانوں کی

تیری رحمت تو مسلّم ہے، مگر یہ تو بتا
کون بجلی کو خبر دیتا ہے کاشانوں کی

ابھی تکمیل کو پہنچا نہیں ذہنوں کا گداز
ابھی دُنیا کو ضرورت ہے غزل خوانوں کی

ستمبر ۱۹۶۷ء

کسی کی چاپ نہ تھی، چند خشک پتّے تھے
شجر سے ٹوٹ کے جو فصلِ گُل پہ روئے تھے

ابھی ابھی تمھیں سوچا تو کچھ نہ یاد آیا
ابھی ابھی تو ہم اِک دُوسرے سے بچھڑے تھے

تمھارے بعد، چمن پر جب اِک نظر ڈالی
کلی کلی میں خزاں کے چراغ جلتے تھے

ہم اِک نظر کے گنہگار، کیا خدا سے کہیں
تمھی کہو، کہ یہ تم تھے. جو دل میں اُترے تھے

تمام عمر وفا کے گناہ گار رہے
یہ اور بات، کہ ہم آدمی تو اچھّے تھے

ہمارے ذہن پہ پتھراؤ بے سبب تو نہ تھا
کہ ہم نے تیرہ دلوں سے ستارے مانگے تھے

یہ فخر بھی تو بہت تھا، کہ جو ہنسے ہم پر
وہ کوئی غیر نہیں تھے، تمام اپنے تھے

کسی کا جسم حسیں تھا، کسی کی رُوح حسیں
غرض یہاں کے سب انسان حُسن پارے تھے

شبِ خموش کو تنہائی نے زباں دے دی
پہاڑ گُونجتے تھے، دشت سنسناتے تھے

وہ اِک ہی بار مرے، جن کو تھا حیات سے پیار
جو زندگی سے گریزاں تھے، روز مرتے تھے

نئے خیال اب آتے ہیں ڈھل کے آہن میں
ہمارے دل میں کبھی کھیت لہلہاتے تھے

اب ایک شخص جو خوش ہے فقط وہی خوش ہے
وہ دردمند کہاں، جن میں درد بٹتے تھے

یہ ارتقاء کا چلن ہے، کہ ہر زمانے میں
پرانے لوگ، نئے آدمی سے ڈرتے تھے

ندیمؔ، جو بھی ملاقات تھی، ادھوری تھی
کہ ایک چہرے کے پیچھے ہزار چہرے تھے

اگست ۱۹۶۷ء

دلوں سے آرزوئے عمرِ جاوداں نہ گئی
کوئی نگاہ، پسِ گردِ کارواں نہ گئی

وہ اور چیز ہے، ہوتے ہیں جس سے دل شاداب
نری بہار سے ویرانیِ خزاں نہ گئی

نکل کے خلد سے بھی آدمی نہ پچھتایا
زمیں پہ بھی چمن آرائیِ گماں نہ گئی
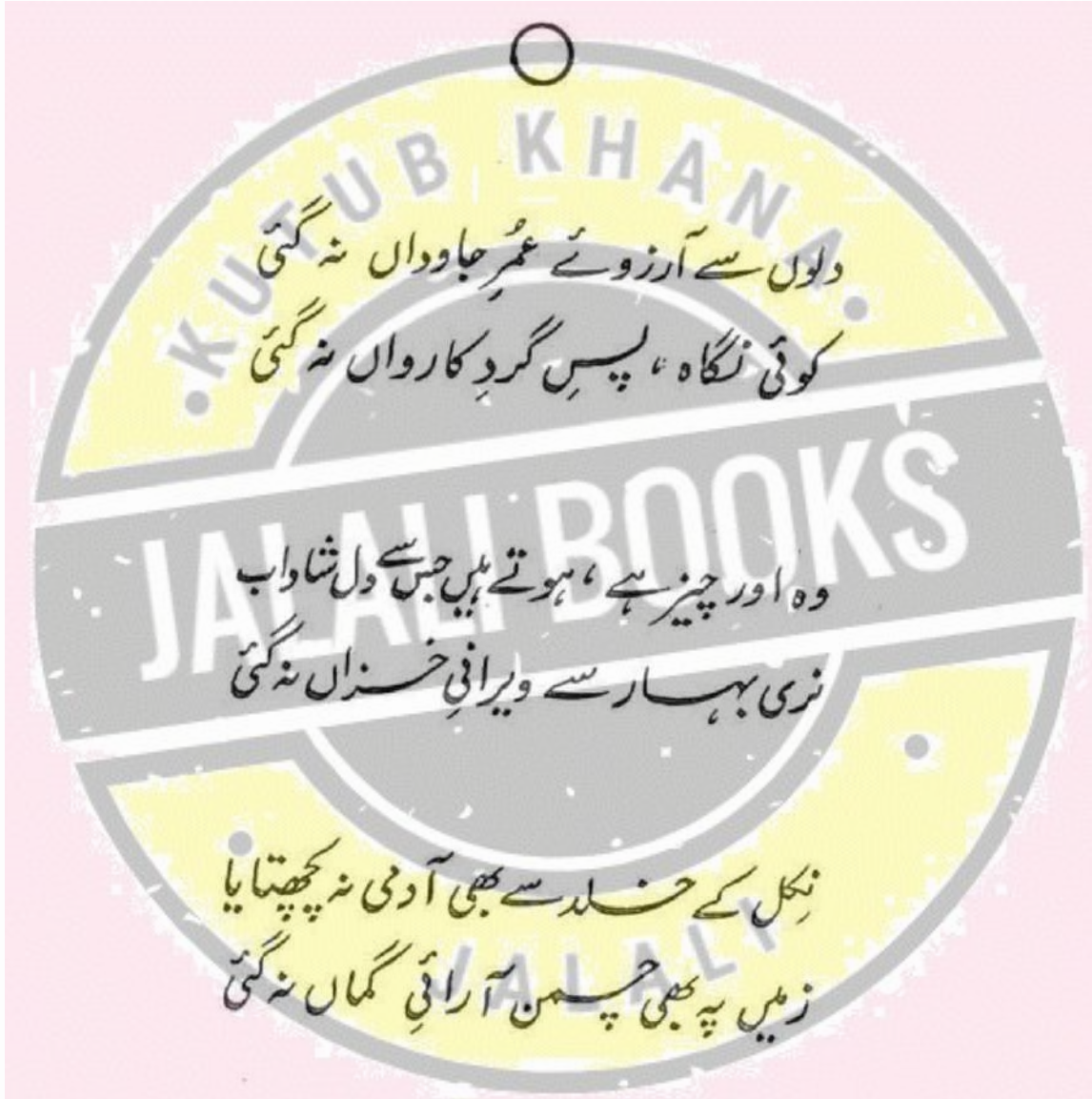
بس ایک کنجِ قفس تک نہ آسکی، ورنہ
صبا چلی تو چمن میں کہاں کہاں نہ گئی

کہاں کہاں نہ ہُوئیں ثبت، حسُن کی مُہریں
کلی ہَوا میں بکھر کر بھی رائیگاں نہ گئی

مری دُعا کی یہ غیرت ہے کتنی قابلِ داد
لبوں سے نِکلی، مگر سُوئے آسماں نہ گئی

دیارِ عشق کھنڈر، اور دشتِ دل سنسان
مگر ندیمؔ کی رنگینیٔ بیاں نہ گئی!

مارچ ۱۹۶۷ء

سب نے انسان کو معبود بنا رکھا ہے
اور سب کہتے ہیں — انسان میں کیا رکھا ہے!

یوں بظاہر تو دیا مَیں نے بجھا رکھا ہے
درد نے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے

منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سرِ بازارِ حیات
مجھ کو احساس نے سُولی پہ چڑھا رکھا ہے
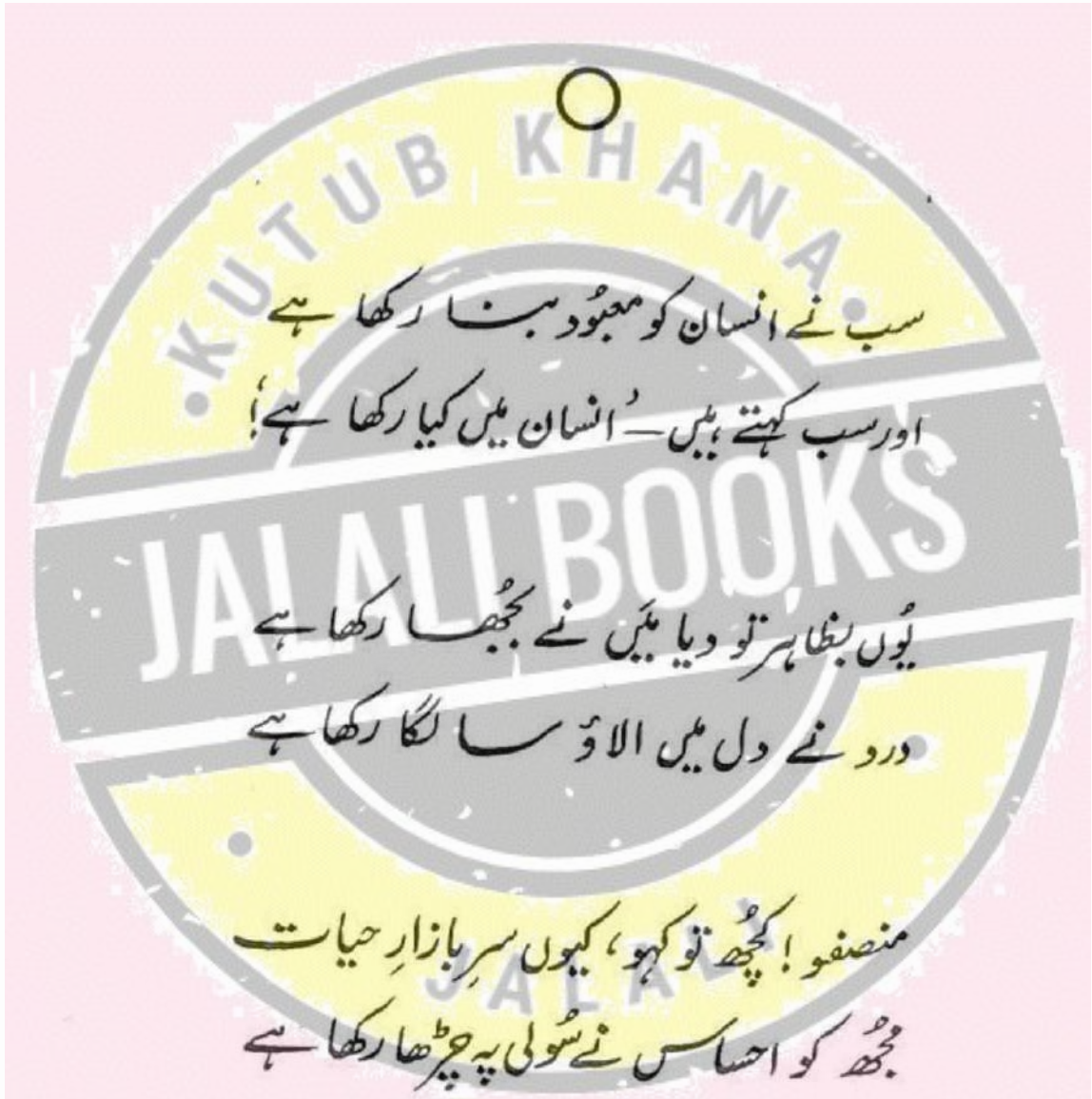
جس کے ہر لفظ سے ہو حشرِ صداقت پیدا
مَیں نے وہ گیت قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

کتنا مجبور ہوں میں، حسنِ نظر کے ہاتھوں
مجھ کو ہر شخص نے دیوانہ بنا رکھا ہے

ہاں، میں خاموش محبت کا بھرم رکھ نہ سکا
ہاں، خدا کو تو ترا نام بتا رکھا ہے

اور تو کوئی چمکتی ہوئی شے، پاس نہ تھی،
تیرے وعدے کا دیا راہ میں لا رکھا ہے

لاکھ فرزانگیاں میرے جنوں کے قرباں
میں نے لٹ کر بھی غمِ عشق بچا رکھا ہے

میری امید کی پتھرا گئیں آنکھیں، لیکن
میں نے اس لاش کو سینے سے لگا رکھا ہے

گھومتی پھرتی ہیں لیلائیں، بگولوں کی طرح
قیس نے دشت میں اک شہر بسا رکھا ہے

حُسنِ تخلیق کی دھرتی میں جڑیں کیا پھیلیں!
تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

مارچ ۱۹۶۷ء

پھولوں سے تو لد رہی ہے ڈالی
دامن کو نہ دیکھ اے سوالی

یہ میں ہوں کہ سب ہیں آئنے میں
آنکھیں لبریز، ہاتھ خالی

بے مثل سہی خرام تیرا
قدروں کی تو دیکھ پائمالی
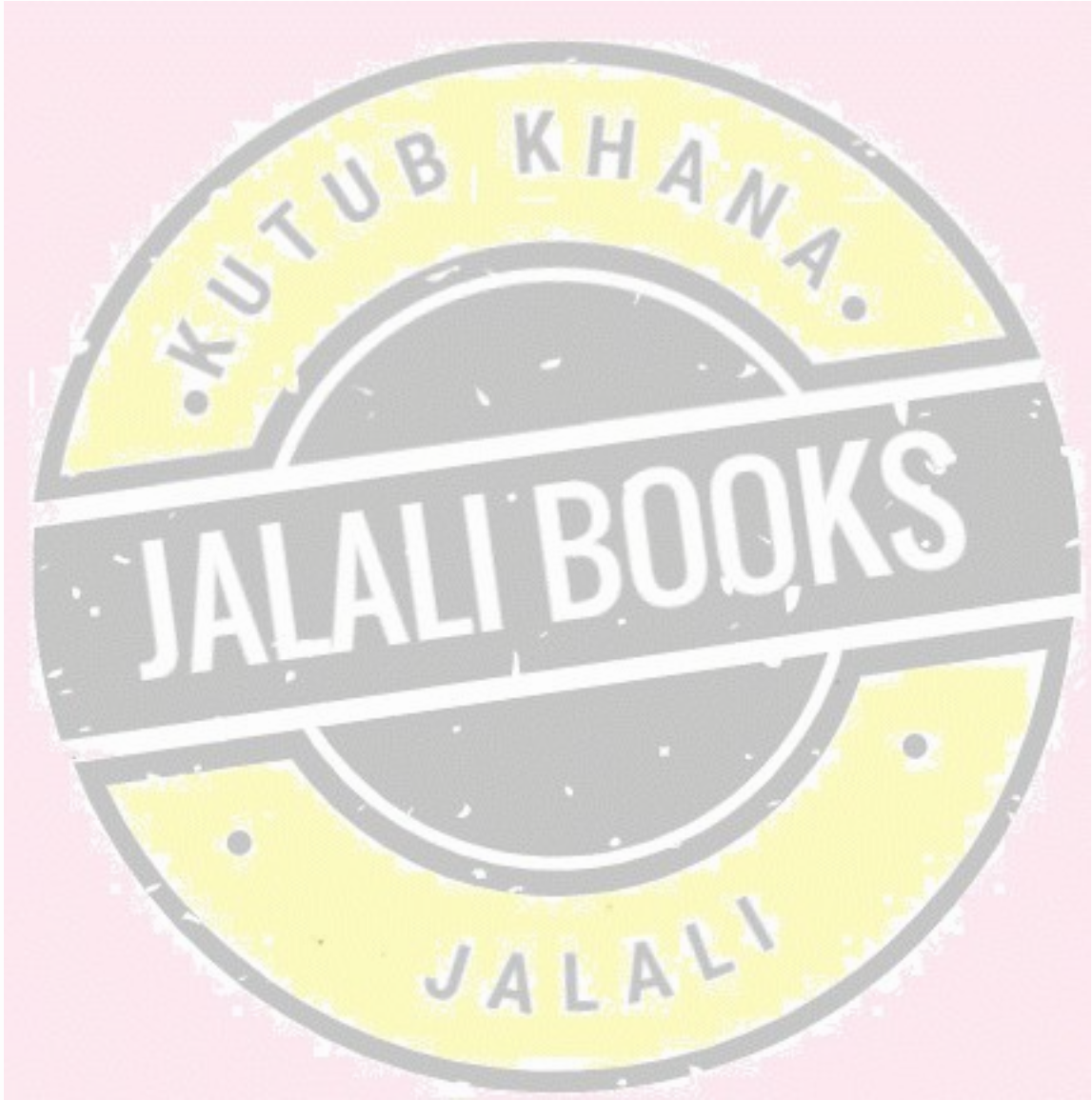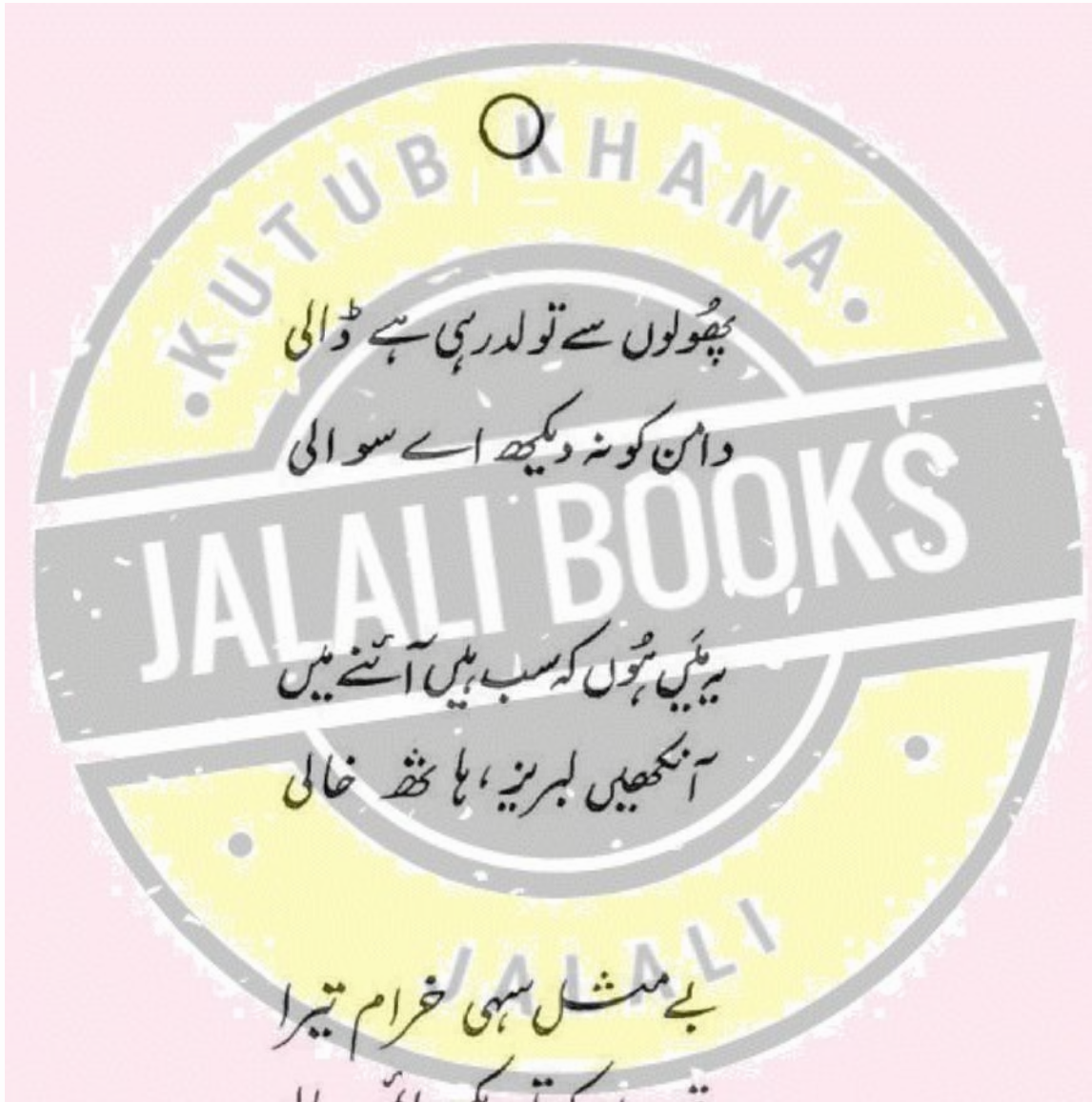
گُل پر اسے دسترس نہیں کیوں
مٹی کو تو سینچتا ہے مالی

توہینِ گناہ کر رہا ہے
زاھد ہے بلا کا لااُبالی

دوزخ سے ڈرا رہا ہے اس کو
جنّت بھی ہے جس کی دیکھی بھالی

فردوس میں، اِک گنہ کے بدلے
انسان نے کائنات پالی

شاہانِ زمیں نے بہرِ مرقد
آخر تو مری جگہ نکالی

قبروں پہ لہک رہا ہے سبزہ
اِس دشت کی ہر ادا نرالی

پیراہنِ شب نہ جل رہا ہو
مشرق پہ بِکھر رہی ہے لالی

دسمبر ۶۶ ۱۹ء

ہجر کی رات کا انجام تو پیارا نکلا
وہی سورج، کہ جو ڈوبا تھا، دوبارہ نکلا

ظلمتِ شب نے کیا دن کا تصوّر ممکن،
یہ اندھیرا تو اُجالے کا سہارا نکلا

تُو، کہ تھا بزم میں تصویرِ کم آمیزی کی
میری تنہائی میں کیوں انجمن آرا نکلا

وقت نے جب بھی مرے ہاتھ سے مشعل چھینی،
ذہن میں تیرے تصوّر کا ستارا نکلا

مَیں ترے قرب سے ڈرتا ہُوں کہ تُو زندہ رہے
مَیں سمندر میں جب اُترا تو کنارا نکلا

اپنی ہستی کو مٹانے کا نتیجہ یہ ہے
پھُول توڑا تو مرے خُون کا دَھارا نکلا

نفسی نفسی بھی وہی، سچ کی دُہائی بھی وہی
تیرا محشر، مرا مانوس نظارا نکلا

اب تو پتھّر کے زمانے سے نکل آؤ ندیمؔ
اب تو سوچوں کے تصادم سے شرارا نکلا

اکتوبر ۶۶ ۱۹ء

○

اس وقت وہ حدّت ہے امانت مرے فن کی
تخلیق ہے جو، دل کے سُلگتے ہوُئے بن کی

شعلوں میں جلا ہے کبھی سُولی پہ چڑھا ہے
لت ہے مگر انسان کو بے ساختہ پن کی

مَیں نے تو پُکارا تھا فقط نُورِ سحر کو
روزن سے اُتر آئی ہے تلوار کرن کی

دُنیا کو تو تج دُوں، مگر اے بچھڑے ہُوئے دوست
اِس خاک میں خوُشبو سی ہے کیوں تیرے بدن کی

جب بھی کوئی لفظ اِک نئے مفہُوم سے کھنکا
زندانِ سخن میں کوئی زنجیر سی چھنکی

جولائی ۱۹۶۶ء

تو کعبۂ دل میں تھا تو پتھر کا صنم تھا
لیکن مری آغوش میں قندیلِ حرم تھا

جب میں نے پرستش کی حدوں تک تجھے چاہا
پھر جو بھی حسیں تھا، مرے معیار سے کم تھا

انساں کا محبّت بھرا دل تھا مرا مسکن
مشرق تھا نہ مغرب تھا، عرب تھا نہ عجم تھا

جس راز سے انساں کو کئی فلسفے سوجھے
دیکھا تو وہی پھول کی پتّی پہ رقم تھا

ظلمت گہِ حالات کے سنسان افق پر
جو چاند چمکتا ہی رہا، وُہ مرا غم تھا

جی کھول کے ہنسنے سے بھی آنسو نکل آئے
کس درجہ مکمّل ترا آئینِ ستم تھا

شایانِ شہادت نہ ہُوا کیوں کوئی منصُور
یارو، رسن و دار کا ساماں تو بہم تھا

حالاتِ سفر مجھ سے سمٹتے بھی تو کیسے
جو سنگِ لحد تھا، وہ مِرا نقشِ قدم تھا

ہر تازہ حقیقت مجھے جِس موڑ پہ لائی
تا حدِ نظر دشتِ پُر اسرارِ عدم تھا

اے محتسبو! تم نہ کرو جُرم کا اقرار
پیوست مِری روح میں میرا ہی قلم تھا

میری طرح، کسی کو تو اپنا بنا کے دیکھ
مَیں رو رہا ہُوں، تُو بھی ذرا مُسکرا کے دیکھ

تُو میرے بازوؤں میں نہیں، میرے دل میں ہے
تُو مُجھ سے اِتنا دُور نہیں، پاس آ کے دیکھ

مَیں تیرا کچھ نہیں، مگر اے حسُنِ بے نیاز
اپنا درِ ضمیر ذرا کھٹکھٹا کے دیکھ
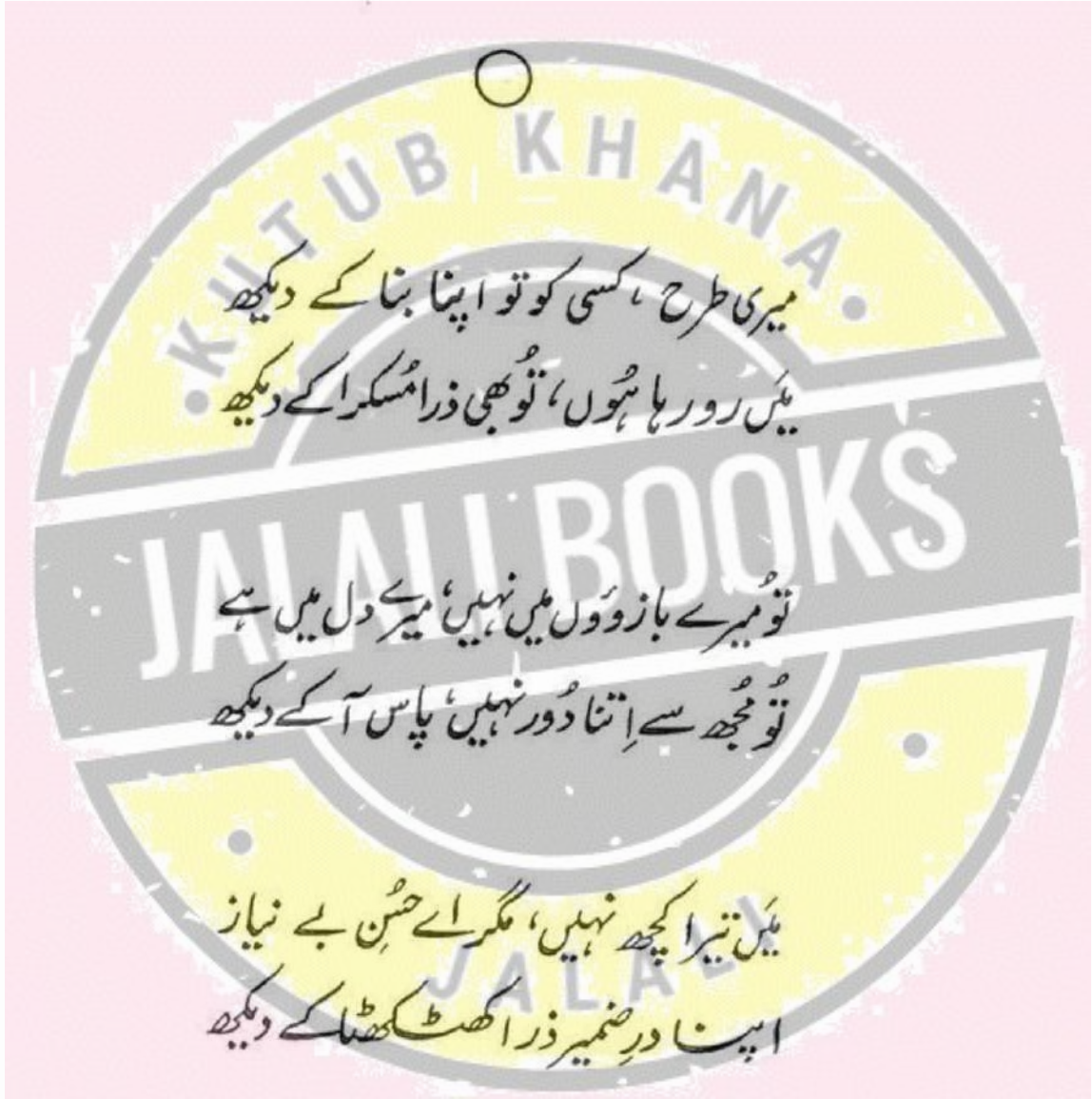
آخر مَیں کیسے محو کروں دل سے تیری یاد
خورشید کو جبینِ فلک سے مٹا کے دیکھ

تخلیق ہے مری، یہ ترا حسنِ خد و خال
آنکھوں کے آئنے مرے نزدیک لا کے دیکھ

گر میری جستجو ہے، تو میرا پتہ نہ پُوچھ
دامانِ دشت سے کوئی ذرّہ اُٹھا کے دیکھ

انجام سب کا ایک سہی راہِ عشق میں
کچُھ دیکھنا ہے مجُھ میں، تو تیور وفا کے دیکھ

تُو بھی اِک آفتاب کا خالق ہے، اے جنوں!
چاکِ سحر سے چاکِ گریباں ملا کے دیکھ

ہاتھوں سے خُون دُھل نہ سکے گا تمام عُمر
دستِ بہار پر سے گُلِ تر اُٹھا کے دیکھ

ہر لفظ میں چھُپے ہوُئے چہرے پہ غور کر
اے فن شناس، رنگ بھی میری صدا کے دیکھ

اب رنگ لائے گا ترا دشتِ وفا ندیم
سُن زمزمے ہوا کے، اشارے گھٹا کے دیکھ

جون ۱۹۶۶ء

اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سُورج نہ بجھایا جائے

گُل ہیں کمیاب اگر، خُون تو ارزاں ہوگا
کِسی عنواں تو کوئی رنگ جمایا جائے

آج کے دَور میں انصاف کے معنی یہ ہیں
رُوح مرجائے، مگر جِسم بچایا جائے

آج اَنا الحق سے بڑی کوئی حقیقت ہی نہیں
مومنو، دار پہ کِس کِس کو چڑھایا جائے

نئے انساں سے تعارف جو ہُوا تو بولا
مَیں ہُوں سقراط، مجھے زھر پلایا جائے

مجھ کو دعویٰ تو ہے کانٹوں کو بھی روند آنے کا
اور پھُولوں سے بھی دامن نہ چھُڑایا جائے

موت سے کِس کو مفر ہے، مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے

یُوں بھی ہو سکتی ہے آویزشِ خیر و شر ختم
پھر سے شیطاں کو عزازیل بنایا جائے

کوئی بھی تیرے سوا، مُونسِ تنہائی نہ تھا
اِک خدا تھا، مگر اُس کو بھی چھُپایا جائے

مَیں محبّت کا پُجاری ہُوں، عقیدوں کا نہیں
ان بُتوں کو مِرے رستے سے ہٹایا جائے

کس نے مانگی تھی مرے ترکِ تجسّس کی دُعا
میرے دشمن کو مرے سامنے لایا جائے

مَیں قیامت کا تو مُنکر نہیں، لیکن واعظ
مُجھ سے انساں کو تماشا نہ بنایا جائے

حکم ہے، سچ بھی قرینے سے کہا جائے ندیمؔ
زخم کو زخم نہیں، پھول بتایا جائے

جون ۱۹۶۶ء

عُمر بھر اُس نے اِسی طرح لُبھایا ہے مجُھے
وہ جو اِس دشت کے اُس پار سے لایا ہے مجُھے

کِتنے آئینوں میں اِک عکس دکھایا ہے مجُھے
زندگی نے جو اکیلا کبھی پایا ہے مجُھے

تُو مرا کُفر بھی نہ ہے، تُو مرا ایمان بھی ہے
تُو نے لُوٹا ہے مجُھے، تُو نے بسایا ہے مجُھے
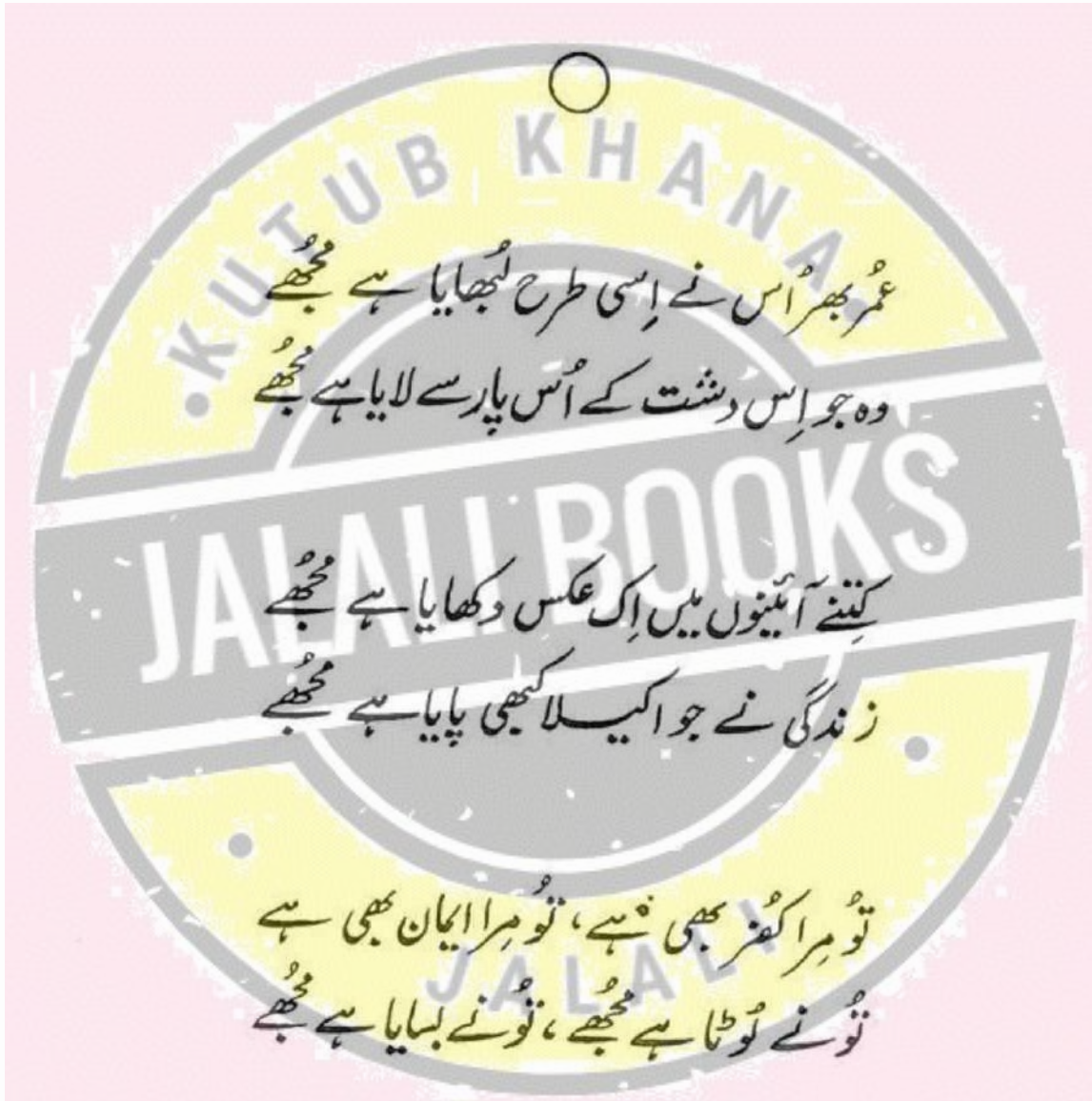
مَیں تجُھے یاد بھی کرتا ہُوں تو جل اُٹھتا ہُوں
تُو نے کِس درد کے صحرا میں گنوایا ہے مجُھے

تُو وہ موتی کہ سمندر میں بھی شعلہ زن تھا
مَیں وہ آنسُو کہ سرِ خاک گرایا ہے مجھے

اِتنی خاموش ہے شب، لوگ ڈرے جاتے ہیں
اور مَیں سوچتا ہُوں — کِس نے بلایا ہے مجھے

میری پہچان تو مشکل تھی، مگر یاروں نے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے مجھے

یہ الگ بات کہ مٹّی میں پڑا رُلتا ہُوں
یُوں تو فن کار نے شہ کار بنایا ہے مجھے

وہی شبنم، جو سرِ گُل تھی، سرِ خار بھی تھی
عُمر بھر اِک یہی منظر نظر آیا ہے مجھے

اپنا ادراک ہے دراصل خُدا کا ادراک
شاید اس خوف نے خُود مجھ سے چھُپایا ہے مجھے

واعظِ شہر کے نعروں سے تو کیا کھلتی آنکھ
خود مرے خواب کی ہیبت نے جگایا ہے مجھے

اے خدا، اب ترے فردوس پہ میرا حق ہے
تُو نے اِس دَور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

اپریل ۱۹۶۶ء
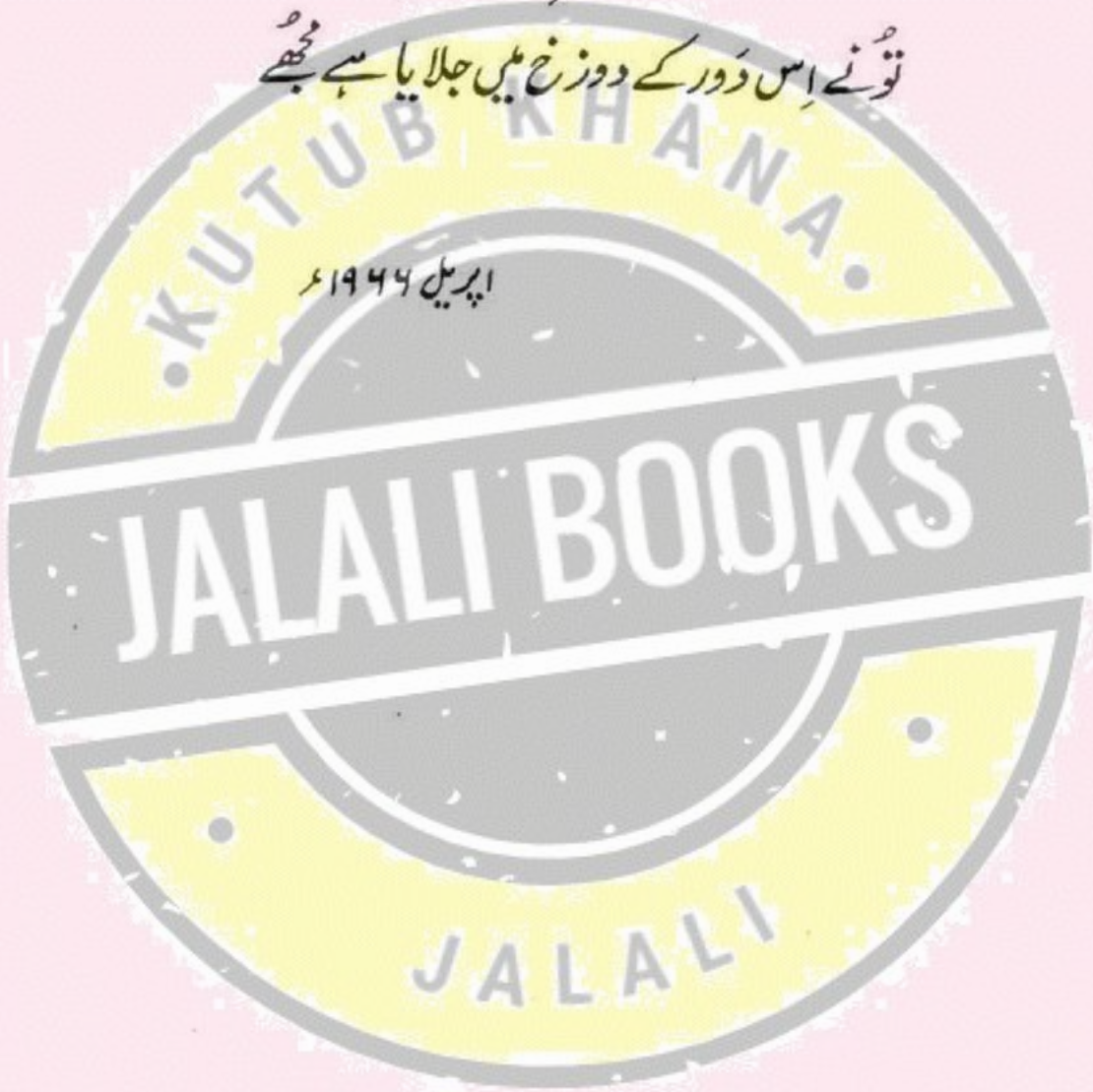
مَیں وہ شاعر ہُوں، جو شاہوں کا ثنا خواں نہ ہُوا
یہ ہے وہ جُرم، جو مجھ سے کِسی عنواں نہ ہُوا

اس گنہ پر، مری اِک عمر اندھیرے میں کٹی
مجھ سے، اس موت کے میلے میں چراغاں نہ ہُوا

کل جہاں پھُول کِھلے، جشن ہے زخموں کا وہاں
دل وہ گلشن ہے، اُجڑ کر بھی جو ویراں نہ ہُوا

آنکھیں کچھ اور دکھاتی ہیں، مگر ذہن کچھ اور
باغ مہکے مگر احساسِ بہاراں نہ ہُوا

یُوں تو ہر دَور میں گرتے رہے انسان کے نرخ
ان غلاموں میں کوئی یُوسفِ کنعاں نہ ہُوا

مَیں خود آسودہ ہُوں، کم کوش ہُوں، یا پتھر ہُوں
زخم کھا کر بھی مجُھے درد کا عرفاں نہ ہُوا

ساری دُنیا متلاطم نظر آتی ہے ندیمؔ
مجُھ پہ اِک طنز ہُوا، روزنِ زِنداں نہ ہُوا

مارچ ۱۹۶۶ء

O

مروں تو میں کسی چہرے میں رنگ بھر جاؤں
ندیمؔ کاش یہی ایک کام کر جاؤں

یہ دشتِ ترکِ محبّت، یہ تیرے قرب کی پیاس
جو اِذن ہو تو تری یاد سے گزر جاؤں

مرا وجود، مری رُوح کو پکارتا ہے
تری طرف بھی چلوں تو ٹھہر ٹھہر جاؤں

ترے جمال کا پرتو ہے سب حسینوں پر
کہاں کہاں تجھے ڈھونڈوں، کدھر کدھر جاؤں

مَیں زندہ تھا کہ ترا انتظار ختم نہ ہو
جو تُو مِلا ہے، تو اب سوچتا ہُوں، مر جاؤں

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو
مَیں تیرے در سے جو اُٹھوں تو کِس کے گھر جاؤں

خدا کرے ترا معیارِ عدل اور بلند
مَیں تیری بزم سے کیسے بچشمِ تر جاؤں

یہ سوچتا ہُوں کہ مَیں بُت پرست کیوں نہ ہُوا
تجھے قریب جو پاؤں، تو خُود سے ڈر جاؤں

کِسی چمن میں، بس اِس خوف سے گزر نہ ہُوا
کِسی کلی پہ نہ بھُولے سے پاؤں دھر جاؤں

جراحتوں پہ جمی جا رہی ہے وقت کی گرد
ذرا لہُو میں نہا لُوں تو پھر سنور جاؤں

یہ جی میں آتی ہے تخلیقِ فن کے لمحوں میں،
کہ خوں بن کے رگِ سنگ میں اُتر جاؤں

دسمبر ۱۹۶۵ء
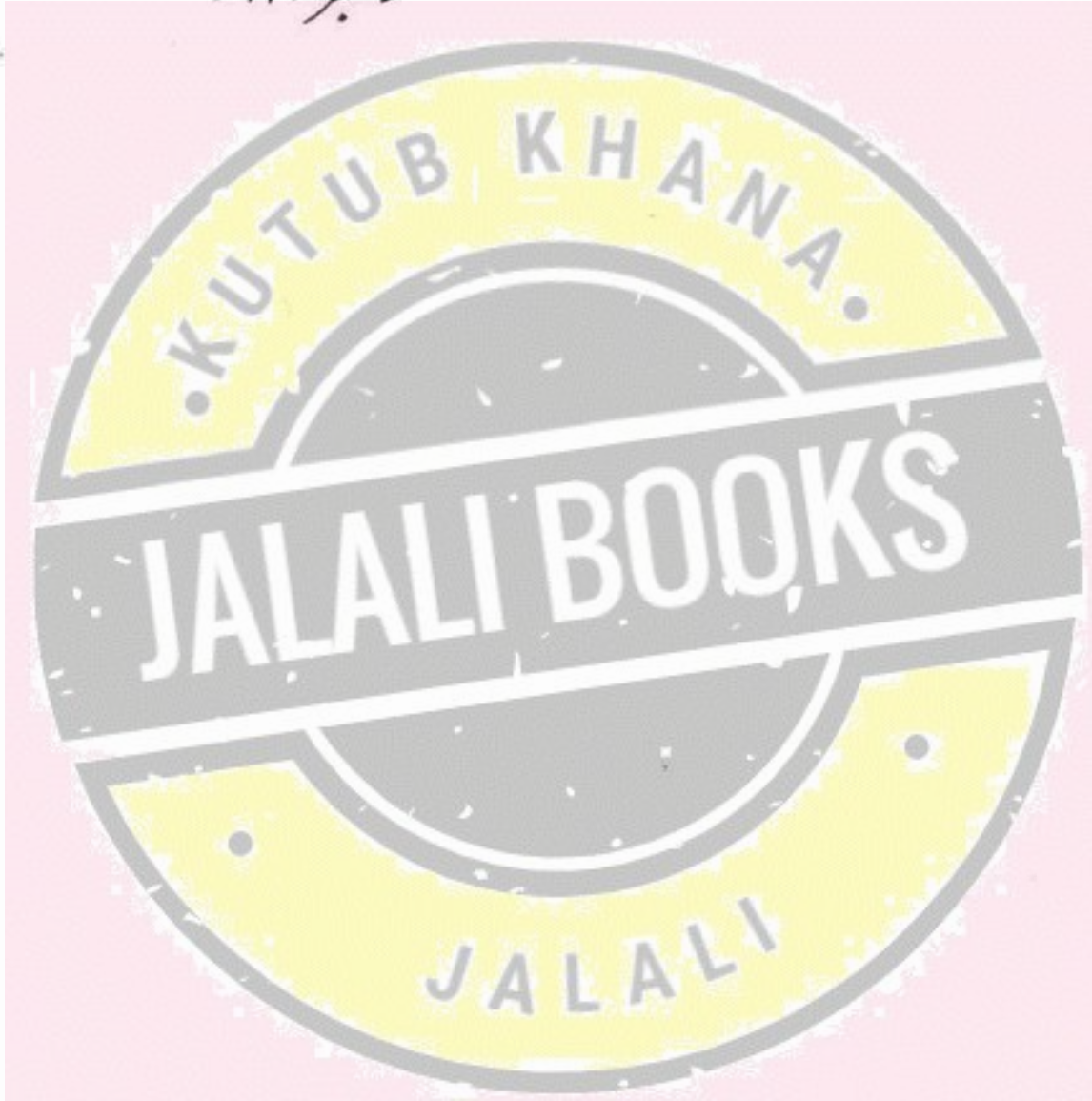
ضبط کا عالم جب اِس حد تک تہ و بالا نہ تھا
آگ جلتی تھی، مگر اتنا دھواں اُٹھتا نہ تھا

اب تو تیری یاد بھی آئے، تو گونج اُٹھتا ہے دل
زندگی میں اس قیامت کا سکوں دیکھا نہ تھا

موت آئے گی کہ تُو آئے گا، کچھ ہو گا ضرور
ہجر کی شب، چاند کا چہرہ کبھی ایسا نہ تھا

میرے معیاروں کی دُنیا ہی بدل دی عشق نے
اس سے پہلے آدمی اِتنا حسیں ہوتا نہ تھا

تیرے مِلنے کی خوشی سے اشک تھمتے ہی نہیں
مَیں کسی پیارے کے مرنے پر بھی یُوں رویا نہ تھا

آج تیرا اجنبی لگنا قیامت ہو گیا
مَیں تو خُود اپنے سے بھی بچھڑا تو گھبرایا نہ تھا

تُو نے مجُھ کو پیار سے دیکھا تو گردش تھم گئی
ایک لمحہ، اِتنی صدیوں میں کبھی گزُرا نہ تھا

یُوں تو جو رنگِ چمن کل تھا، وہی ہے آج بھی
پھُول ماضی میں مگر اس کرب سے کِھلتا نہ تھا

اب تو کچھ کہنے سے پہلے خُون ہو جاتا ہے دل
اِتنی شِدّت سے تو مَیں نے آج تک سوچا نہ تھا

یُوں تو جو پَیدا ہُوا ہے، مر ہی جائے گا، مگر
ہائے وہ دن، موت کا جب اس قدر چرچا نہ تھا

دُھن تو مجُھ کو قیس کی سی تھی، مگر اِس دَور میں
پھُول اِتنے تھے، کہ صحرا کا کوئی رستہ نہ تھا

زندگی میں عُمر بھر یُوں تو بھنوَر پڑتے رہے
ڈُوب کر دیکھا تو پانی اِس قدر گہرا نہ تھا

آنکھ سے آنسو بھی گِرتا ہے تو بجتی ہے زمیں
شُکر ہے، دل میں تو اِس شدّت کا سنّاٹا نہ تھا

غم اَدُھورا تھا کہ پیغامِ اَجل آیا ندیمؔ
بُوند ابھی بھڑکی نہ تھی، پتھر ابھی بولا نہ تھا

جون ۱۹۶۵ء

شعور میں، کبھی احساس میں بساؤں اُسے
مگر مَیں چار طرف بے حجاب پاؤں اُسے

اگرچہ فرطِ حیا سے نظر نہ آؤں اُسے
وہ رُوٹھ جائے تو سو طرح سے مناؤں اُسے

طویل ہجر کا یہ جبر ہے، کہ سوچتا ہُوں
جو دل میں بستا ہے، اب ہاتھ بھی لگاؤں اُسے

اُسے بلا کے مِلا عُمر بھر کا سنّاٹا
مگر یہ شوق، کہ اِک بار پھر بلاؤں اُسے

اندھیری رات میں جب راستہ نہیں مِلتا
مَیں سوچتا ہُوں، کہاں جا کے ڈھُونڈ لاؤں اُسے

ابھی تک اُس کا تصوّر تو میرے بس میں ہے
وہ دوست ہے، تو خدا کِس لیے بناؤں اُسے

ندیمؔ ترکِ محبّت کو ایک عُمر ہوئی
مَیں اب بھی سوچ رہا ہُوں، کہ بھُول جاؤں اُسے

مارچ ۱۹۶۵ء

آج کی شب تم نہ آ پائے، مگر اچھا ہُوا
چاندنی روئی ہُوئی ہے، چاند ہے ٹُوٹا ہُوا

شام کا جادُو تھا، یا شِدّت تمہاری یاد کا
وقت کیا، مجُھ کو تو دریا بھی لگا ٹھہرا ہُوا

جان و تن جلتے ہیں، لیکن ایک کیفیّت کے ساتھ
حُسن انگارہ تو ہوتا ہے، مگر پگھلا ہُوا

ہجر کا احساسِ تنہائی ہے بے قیدِ مقام
مجُھ کو تو صحنِ چمن بھی دامنِ صحرا ہُوا

جذبۂ تخلیق نے ماتم کی مُہلت ہی نہ دی
ہر لُٹے منظر سے اِک منظر نیا پیدا ہُوا

وقت کی اپنی طبیعت، عشق کا اپنا مزاج
زندگی پر چھا گیا ہے ایک پَل گُزرا ہُوا

آدمی اِک تھا، مگر اس کے ہزاروں رُوپ تھے
وہ کبھی بندہ، کبھی آقا، کبھی مولا ہُوا

کیا سوائے موت، کچھ بھی دستِ قدرت میں نہیں
یہ تماشا تو ہے صدیوں سے مِرا دیکھا ہُوا

فروری ۱۹۶۵ء

یوں تمھارا طرزِ محبوبی تو معصومانہ تھا
میرا اندازِ نظر ہی آرزو مندانہ تھا

جب بھی سوچا، تم مری حدِ رسائی میں نہیں
حشر تک پھیلا ہُوا تنہائی کا ویرانہ تھا

جس کے پاس آتے ہی دل قندیل بن کر جل اُٹھا
دُور رہ کر بھی وہی میرا چراغِ خانہ تھا

عشق پر اتنا بگڑنا بھی توانائی نہ تھی
قیس کی مانند سارا نجد کیوں دیوانہ تھا

جستجو اتنی بڑھی، سمتوں کو چکّر آگئے
ہر بگولا اصل میں، پیراہنِ دیوانہ تھا

ساری دُنیا جل بُجھی، لیکن مَیں کچھ یُوں تھا اُداس
بجلیوں کی زد میں جیسے اِک مرا کاشانہ تھا

یوں بظاہر سب کے ہونٹوں پر تھی توصیفِ حرم
نیّتیں پرکھیں تو ہر انسان اِک بُت خانہ تھا

جنوری ۱۹۶۵ء

○

اذانِ صبح سے شب کا علاج کیا ہوگا
مجھے تو تیرا ہی چہرہ سحر نما ہوگا

اس انتظار میں تکمیلِ کفر ہو نہ سکی
کبھی تو میرا خدا بھی مرا خدا ہوگا
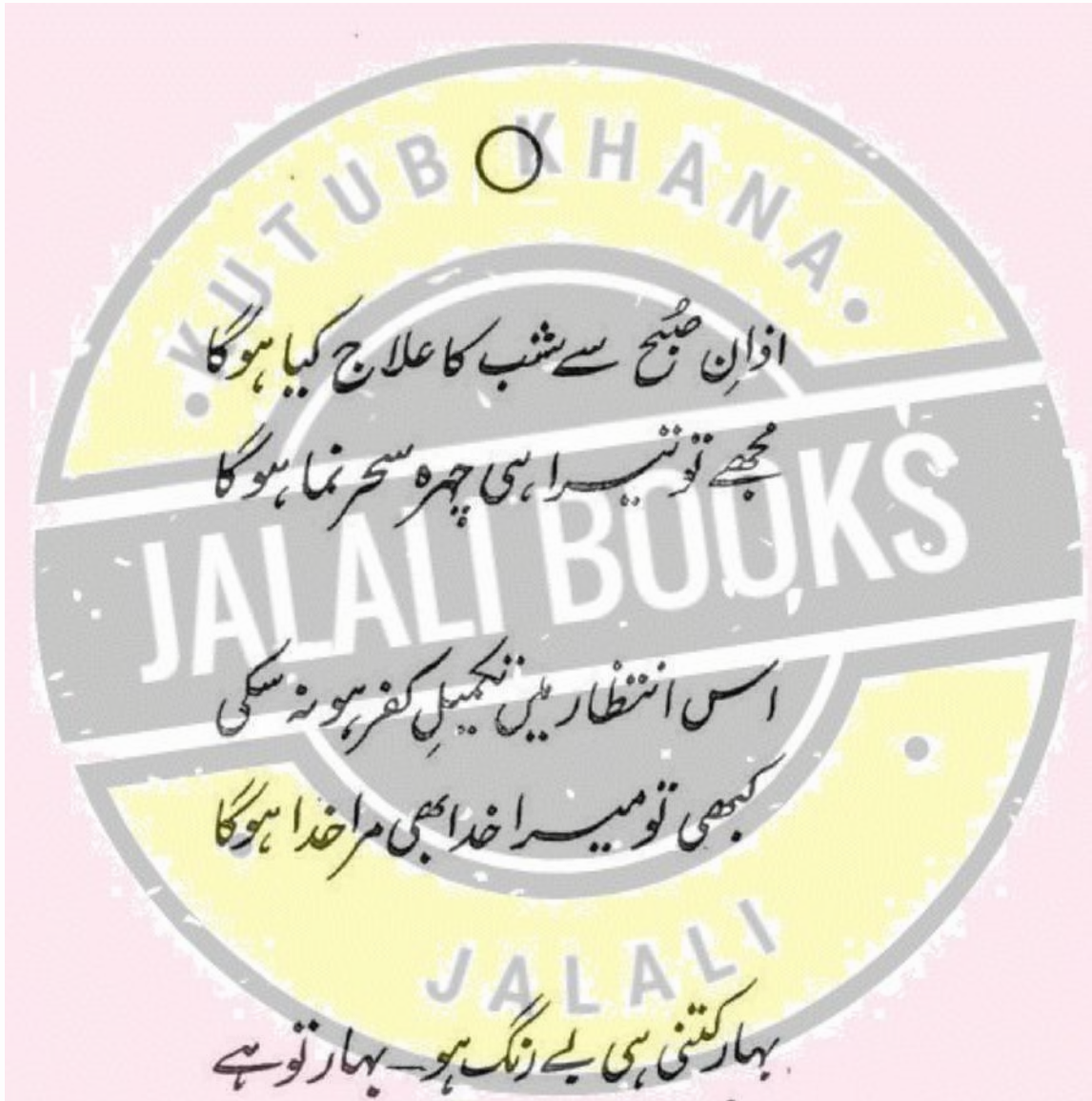
بہار کتنی ہی بے رنگ ہو — بہار تو ہے
جو گُل نہیں تو کوئی زخم ہی کھلا ہوگا

وہ تیرگی ہے، کہ راہِ وفا سے پُوچھتا ہُوں
تجھے تو اپنے مُسافر کا کچھ پتا ہوگا

میں آج تیرے تصوّر میں مسکرا تو دیا
مگر یہ فکر ہے، کس کس کا دل جلا ہو گا

ہے میرے لمس میں اب تک ترے بدن کی مہک
تری جدائی کا حق مجھ سے کیا ادا ہو گا

ترے فراق میں بھی تجھ سے ربط قائم ہے
کہ میری یاد میں تُو بھی تو جاگتا ہو گا

مرے دیار کی مانند، تیرے شہر میں بھی
اُداس رات کا سنّاٹا رو رہا ہو گا

فضا میں تیر رہے ہوں گے کتنے فق چہرے
افق کی دھار پہ مہتاب کٹ گیا ہو گا

میں کُھل کے رو نہ سکا جب، تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تُو نے کیا کیا ہو گا

جنوری ۱۹۶۵ء
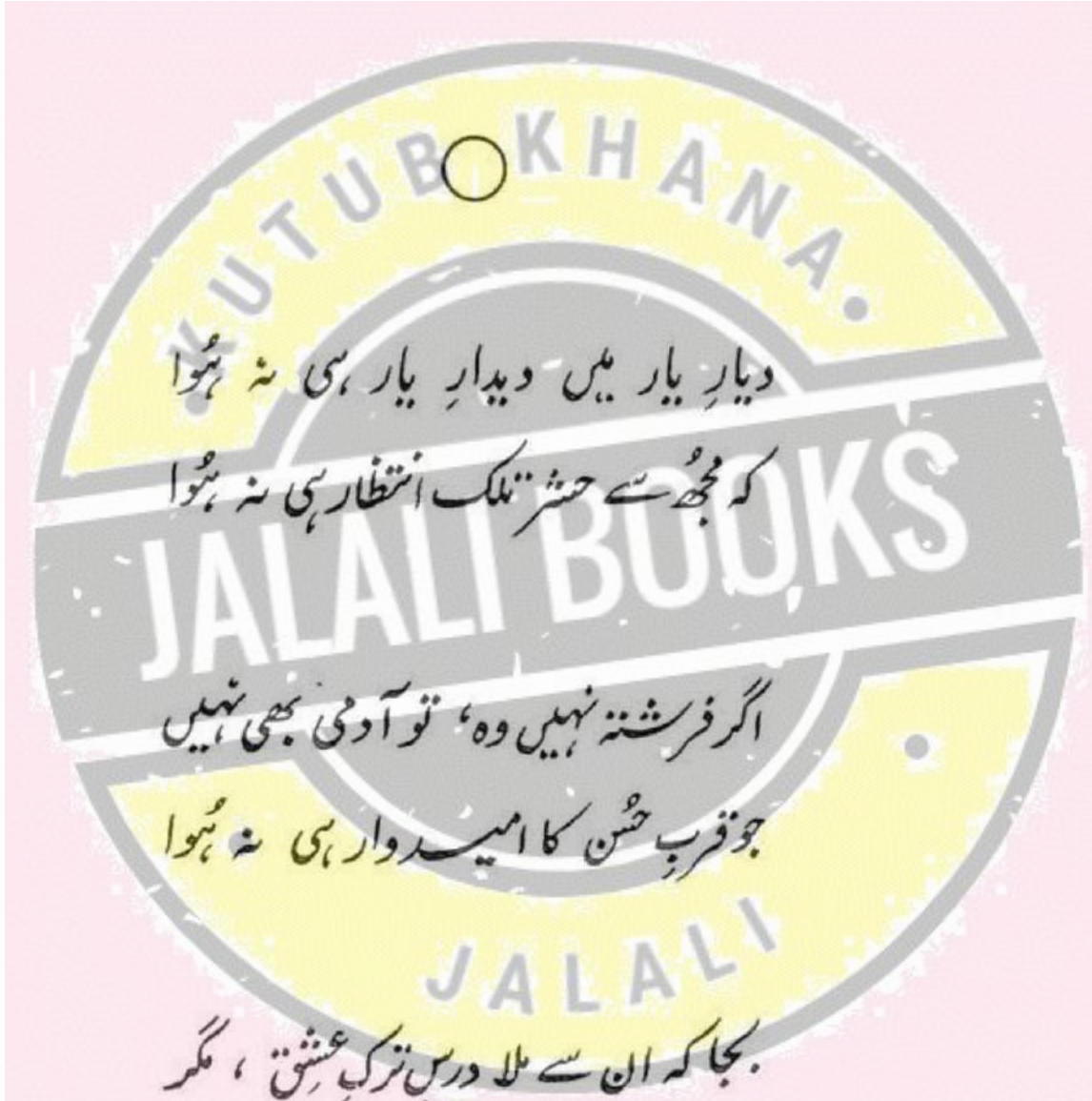
دیارِ یار میں دیدارِ یار ہی نہ ہُوا
کہ مجھ سے حشر تلک انتظار ہی نہ ہُوا

اگر فرشتہ نہیں وہ، تو آدمی بھی نہیں
جو قربِ حُسن کا امیدوار ہی نہ ہُوا

بجا کہ ان سے ملا درسِ ترکِ عشق، مگر
کچھ اس طرح کہ مجھے ناگوار ہی نہ ہُوا

اگر فقیہہ نے ٹوکا مجھے، بجا ٹوکا
گناہِ عشق پہ مَیں شرمسار ہی نہ ہُوا

ابھی بہشت کی تنہائی سے نہیں نکلا
وہ آدمی جسے انساں سے پیار ہی نہ ہُوا

یہ پھُول تھے، کہ نقوشِ قدم تھے، پت جھڑ کے
مجھے تو ان پہ گمانِ بہار ہی نہ ہُوا

وہ شعر اور تو سب کچھ ہے، صرف شعر نہیں
جو رُوحِ عصر کا آئینہ دار ہی نہ ہُوا

۱۹۶۴ء

احساس میں پھول کھل رہے ہیں
پت جھڑ کے عجیب سلسلے ہیں

کچھ ایسی شدید تیرگی ہے
آنکھوں میں ستارے تیرتے ہیں
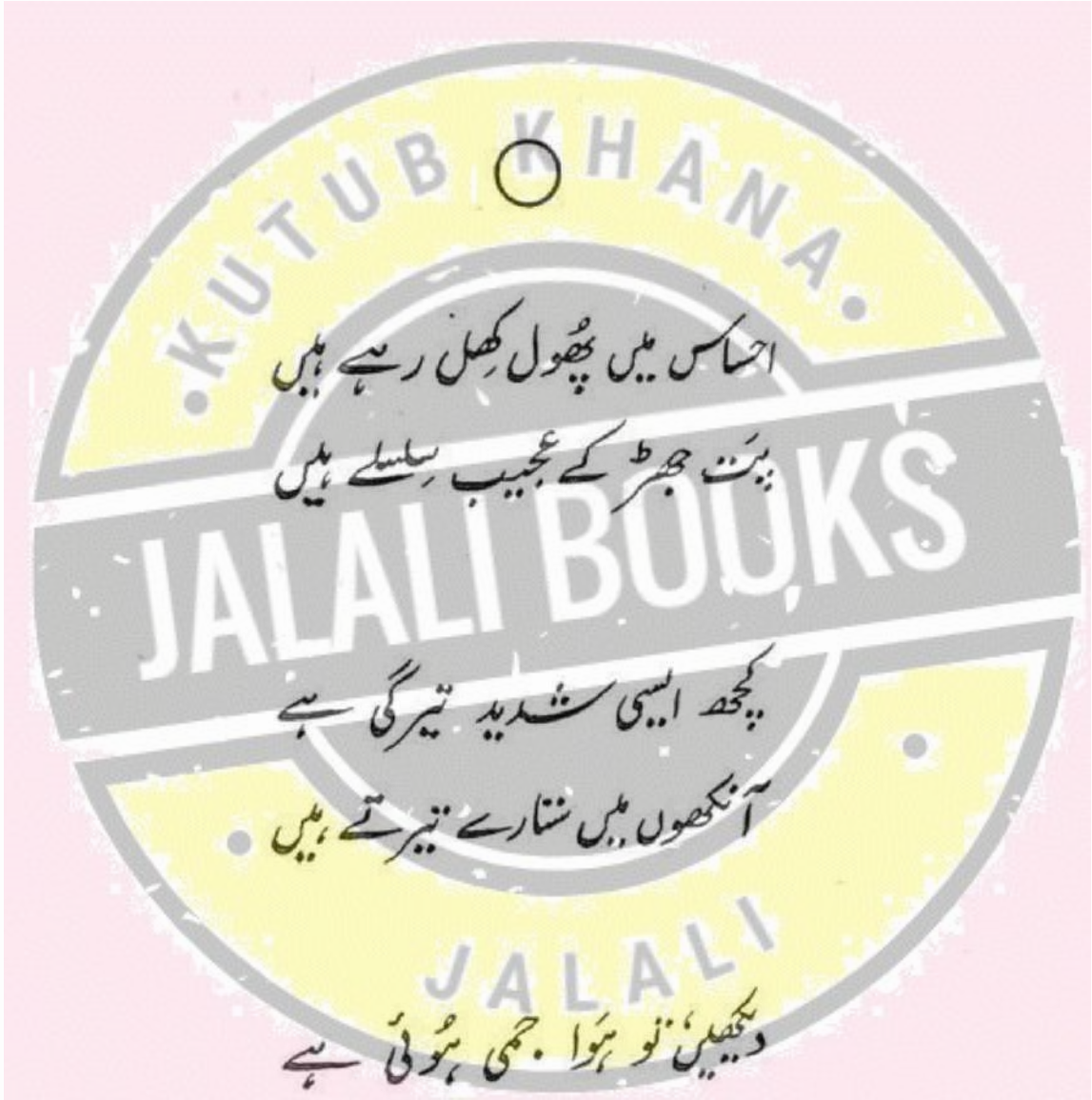
دیکھیں، تو ہوا جمی ہوئی ہے
سوچیں، تو درخت جھومتے ہیں

سقراط نے زہر پی لیا تھا
ہم نے جینے کے دکھ سہے ہیں

وہ غم تو ہمیں ہیں جاں سے پیارے
جو غم ترے پیار نے دیے ہیں

ہم تجھ سے بگڑ کے جب بھی اُٹھے
پھر تیرے حضور آ گئے ہیں

ہم عکس ہیں ایک دُوسرے کا
چہرے یہ نہیں ہیں، آئنے ہیں

لمحوں کا غبار چھا رہا ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

سُورج نے گھنے صنوبروں میں
جالے سے شعاعوں کے بُنے ہیں

یکساں ہیں فراق و وصل دونوں
یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں

پا کر بھی تو نیند اُڑ گئی تھی
کھو کر بھی تو رت جگے ملے ہیں

جو دن ترے پیار میں کٹے تھے
ماضی کے کھنڈر بنے کھڑے ہیں

جب تیرا جمال ڈھونڈتے تھے
اب تیرا خیال ڈھونڈتے ہیں

ہم دل کے گداز سے ہیں مجبور
جب خوش بھی ہوئے تو رو دیے ہیں

لو دل کی خبر بھی چارہ سازو
دامن کے تو چاک سی لیے ہیں

ہم زندہ ہیں، اے فراق کی رات
پیاری، ترے بال کیوں کھلے ہیں

جولائی ۱۹۶۴ء

یوں تو سب پھول کھِلے سائے میں تلواروں کے
نگہتِ گل سے بھرم کھُل گئے گلزاروں کے

ہم جسے رات سمجھتا رہا ، وہ رات نہ تھی
ساری دُنیا پہ تھے سائے تری دیواروں کے

جب سے یاروں نے محبّت کو تجارت سمجھا
گھر جو گلیوں میں ہیں ، در بن گئے بازاروں کے

یوں تو اک سر پہ بڑی شان سے دستار بندھی
لیکن اس طرح کھُلے بَل کئی دستاروں کے

کاش اُس انسان کے آنسو بھی کبھی رُک سکتے
راستے جس نے معیّن کیے سیّاروں کے

مَیں خلاؤں میں اُڑوں، یا سرِ افلاک ندیمؔ
اپنی دھرتی پہ قدم ہیں مرے معیاروں کے

اپریل ۱۹۶۴ء

یہ دوپہر، یہ خموشی کے لب پہ سائیں سائیں
چلو، حیات کی اِس قبر پر چراغ جلائیں

وہ حشر ہے کہ کسی کو بھی اپنا گھر نہیں مِلتا
کِسی نے راستہ پُوچھا تو رو پڑیں گی ہوائیں

الٰہی، اب کوئی آندھی عطا ہو صحراؤں کو
سمندروں پہ تو گِھر کر برس گئی ہیں گھٹائیں

یہ سادگی ہے کہ درد آشناؤں کی پُرکاری
مری خوشی کے لیے میرے غم کی قسمیں کھائیں

اک ایسا وقت بھی آتا ہے طولِ ہجر کے ہاتھوں
دل اُن کو یاد کیے جائے ، اور وہ یاد نہ آئیں

اب انتظار کی شدّت میں نیند آنے لگی ہے
کہیں فراق کی سب اُلجھنیں سُلجھ ہی نہ جائیں

اب اس سے بڑھ کے بھی معراجِ نارسائی کیا ہو
مجھے گلے سے لگائیں مگر سمجھ میں نہ آئیں

انھیں دلوں کے عجائب گھروں میں لا کے سجا دو
قدیم عہد کے آثار بن چکی ہیں وفائیں

ندیمؔ ، میں کبھی اظہارِ مدّعا نہ کروں گا
مگر وہ ، بہرِ خدا ، یہ غزل تو سُنتے جائیں

اپریل ۱۹۶۴ء

ہر لمحہ اگر گریز پا ہے
تُو کیوں مرے دل میں بس گیا ہے

چلمن میں گلاب کھِل رہا ہے
یہ تُو ہے کہ شوخیِ صبا ہے

مَیں نے تجھے دیکھا جب سے پیارے
ہر چیز پہ، پیار آ رہا ہے
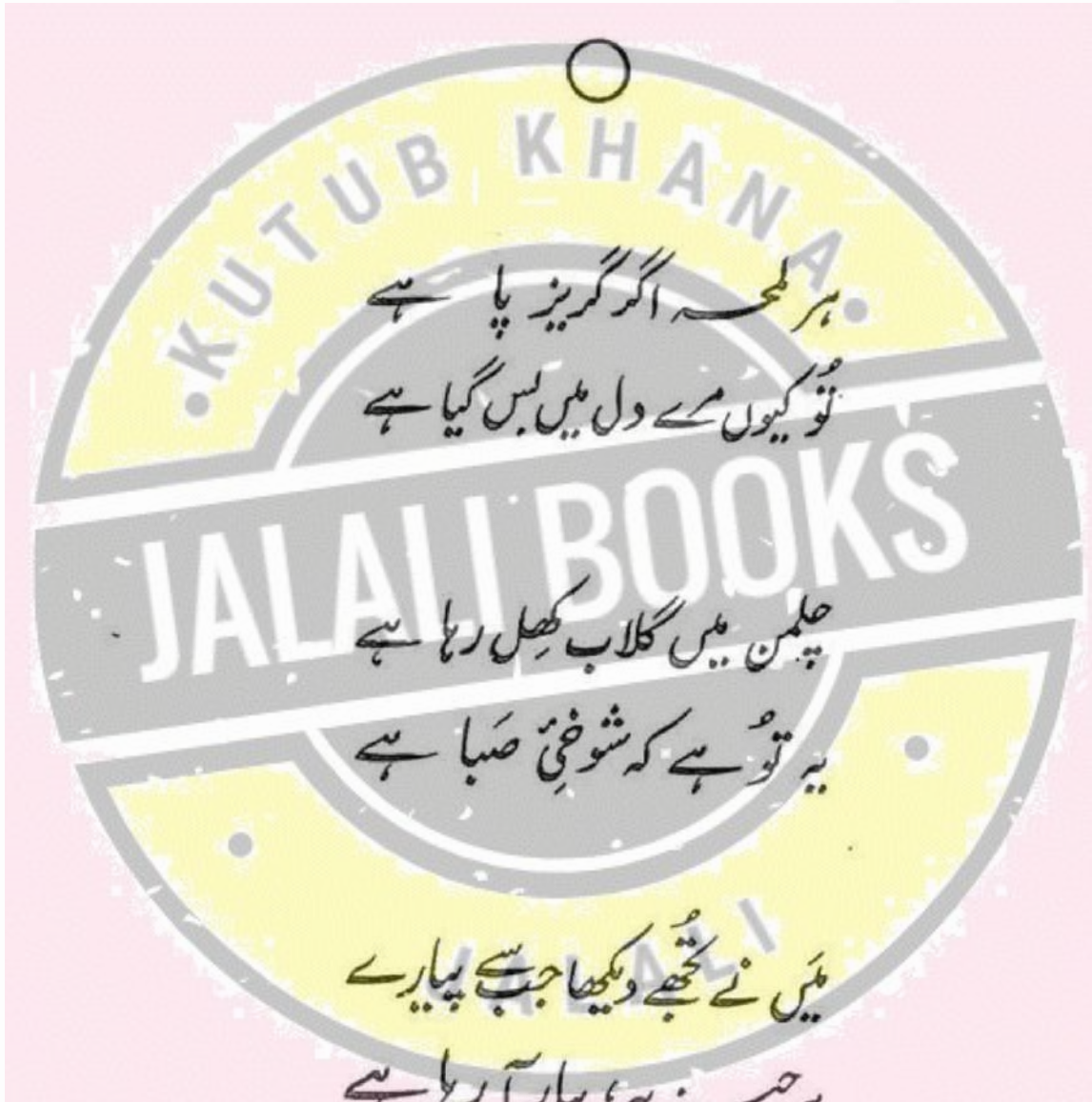
جھکتی نظریں بتا رہی ہیں
میرے لیے تُو بھی سوچتا ہے

مَیں تیرے کہے سے چُپ ہُوں، لیکن
چُپ بھی تو بیانِ مدّعا ہے

ہر دیس کی اپنی اپنی بولی
صحرا کا سکُوت بھی صَدا ہے

اِک عمُر کے بعد مُسکرا کر
تُو نے تو مجُھے رُلا دیا ہے

اُس وقت کا مَیں حساب کیا دُوں
جو تیرے بغیر کٹ گیا ہے

ماضی کی سُناؤں کیا کہانی
لمحہ لمحہ گزُر گیا ہے

مت مانگ دُعائیں، جب محبّت
تیرا میرا معاملہ ہے

کِس دِل سے کروں وداع تجھ کو
ٹُوٹا جو ستارہ، جل بُجھا ہے

اب تجھ سے جو ربط ہے تو اِتنا
تیرا ہی خدا مرا خدا ہے

رونے کو اب اشک بھی نہیں ہیں
یا عِشق کو صبر آگیا ہے

اب کِس کی تلاش میں ہیں جھونکے
میں نے تو دِیا بُجھا دیا ہے

کچھ کھیل نہیں ہے عِشق کرنا
یہ زندگی بھر کا رَت جگا ہے

دسمبر ۱۹۶۲ء
مارچ ۱۹۶۴ء
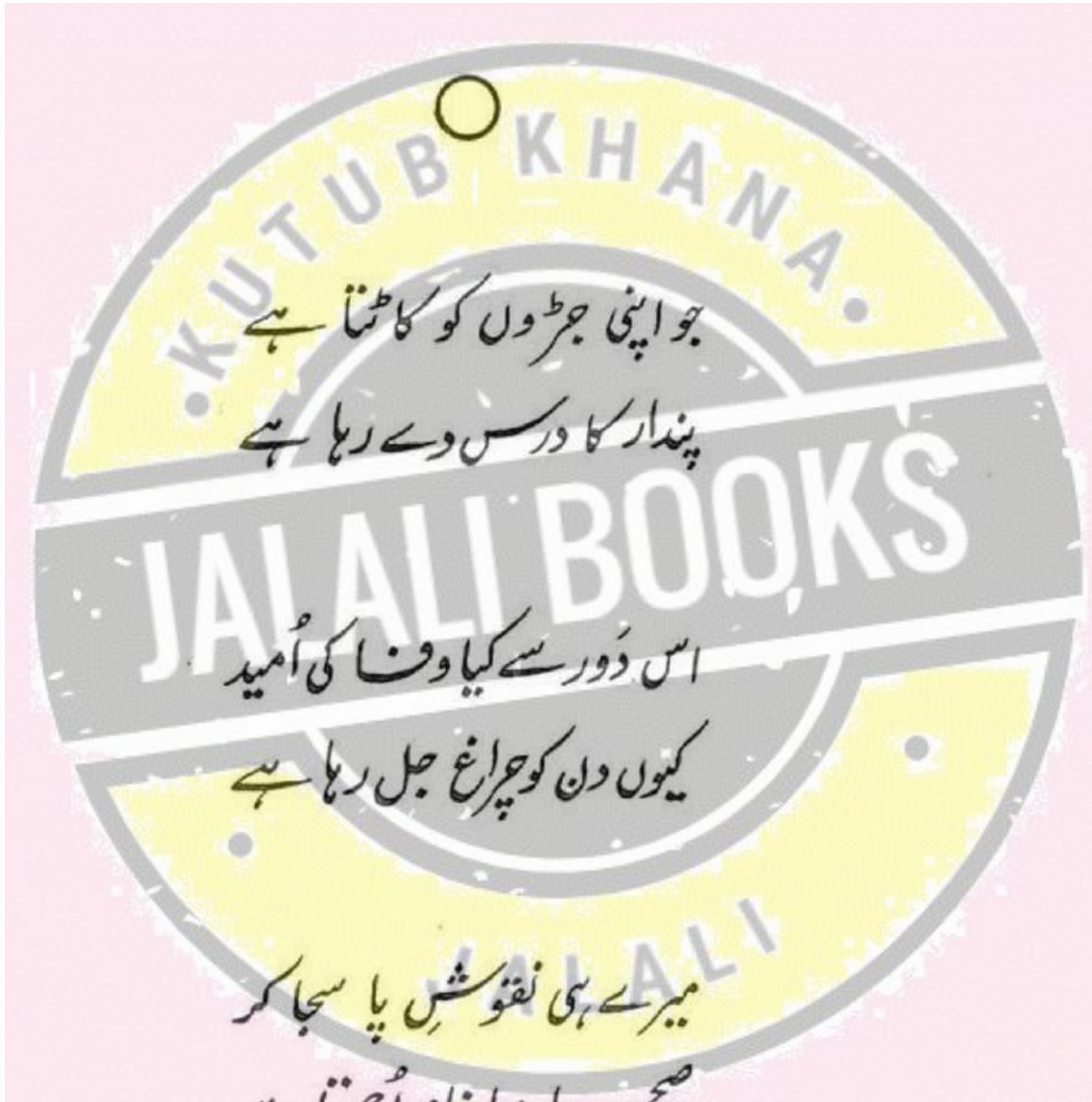
جو اپنی جڑوں کو کاٹتا ہے
پندار کا درس دے رہا ہے

اس دَور سے کیا وفا کی اُمید
کیوں دن کو چراغ جل رہا ہے

میرے ہی نقوشِ پا سجا کر
صحرا مرا نام پُوچھتا ہے

نِکلا ہے یہ صُبح کا ستارہ
یا رات کی قبر کا دِیا ہے

آدم سے ابھی ہے جنگ جاری
صدیوں سے فلک تنا کھڑا ہے

اے نغمہ گرانِ عصرِ حاضر
آغوشِ خیال کب سے وا ہے

جب دل ہو رہینِ طاقِ نسیاں
سر اپنے مدار سے جُدا ہے

مِٹّی سے اگر بنا تھا آدم
انسان تو پیار سے بنا ہے

دسمبر ۱۹۶۲ء

مارچ ۱۹۶۴ء

ذہنوں میں خیال جل رہے ہیں
سوچوں کے الاؤ سے لگے ہیں

دُنیا کی گرفت میں ہیں سائے
ہم اپنا وجود ڈھونڈتے ہیں
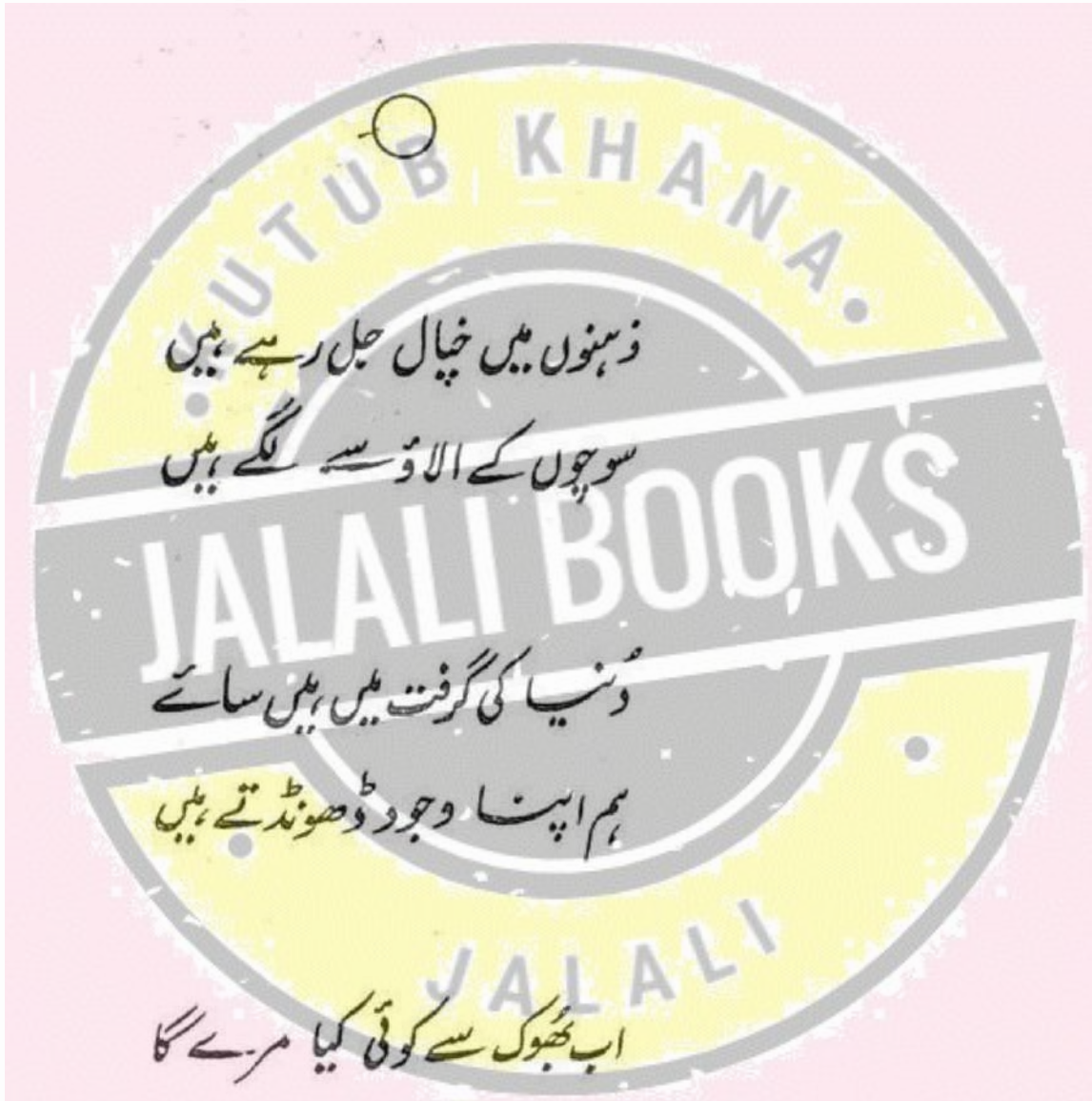
اب بھوک سے کوئی کیا مرے گا
منڈی میں ضمیر بِک رہے ہیں

ماضی میں تو صرف دل دُکھے تھے
اِس دَور میں ذہن بھی دُکھے ہیں

سر کاٹتے تھے کبھی شہنشہ
اب لوگ زبان کاٹتے ہیں

ہم کیسے چھڑائیں شب سے دامن
دن نکلا تو سائے چل پڑے ہیں

لاشوں کے ہجوم میں بھی ہنس دیں
اب ایسے بھی حوصلے کسے ہیں

شکوہ ہے انھیں، کہ ہم قلمکار
آزاد ہیں اور رو رہے ہیں

رونا عادت نہیں ہماری
ہم روتے ہیں جب بھی سوچتے ہیں

ہم سوچتے ہیں کہ یہ مسافر
تاروں کو جو نوچنے چلے ہیں

کہسار کی چوٹیوں سے بچ کر
پاتال میں کیوں اُتر گئے ہیں

ہم روتے ہیں جب تو در حقیقت
تاریخ نگار چونکتے ہیں

ہم لوگ تو ان کے راستوں پر
اشکوں کے دِیے جلا رہے ہیں

ہم لوگ تو اپنے آنسوؤں سے
تہذیب کی فصل سینچتے ہیں

برسوں کے سپاٹ اُفق پہ اب تو
بادل عجب آن سے اُٹھے ہیں

کچھ ایسی گرج اُمڈ رہی ہے
جس طرح پہاڑ پِس گئے ہیں

کچھ ایسے لپک رہے ہیں کوندے
خنجر سے فضا میں اُڑ رہے ہیں

اس رنگ سے چل رہے ہیں جھونکے
جیسے کچھ ڈھونڈنے چلے ہیں

ہر چیز کی آنکھ کھُل گئی ہے
ہر شے کے حواس جاگتے ہیں

کاندھوں پہ رکھے ہوئے کدالیں
میداں میں کسان آ گئے ہیں

کچھ روز میں دیکھ لے گی دُنیا
پانی میں پہاڑ اُگ رہے ہیں

جولائی ۱۹۶۴ء

○

ہوائے دشت میں کیفیتِ بہار بھی ہے
کہ دردِ ہجر میں شامل جمالِ یار بھی ہے

شمیمِ گُل کی ہے تجسیم تیرا پیکرِ ناز
تُو راز ہے، مگر آنکھوں پہ آشکار بھی ہے

غمِ حیات غمِ عشق ہی سہی، لیکن
کہیں تہوں میں چھُپا دردِ روزگار بھی ہے

پلٹ چلے ہیں مسافر جوارِ منزل سے
کہ انتہائے رسائی مقامِ دار بھی ہے

میں اس کو پا نہ سکا اور پھر بھی زندہ رہا
ندیمؔ، جبر میں شامل یہ اختیار بھی ہے

۱۹۶۳ء

تو بعنوانِ حیا یاد آیا
شعلہ در برگِ حنا یاد آیا

چاندنی تھی کہ تری یاد کا نُور
چاند ڈُوبا تو خُدا یاد آیا
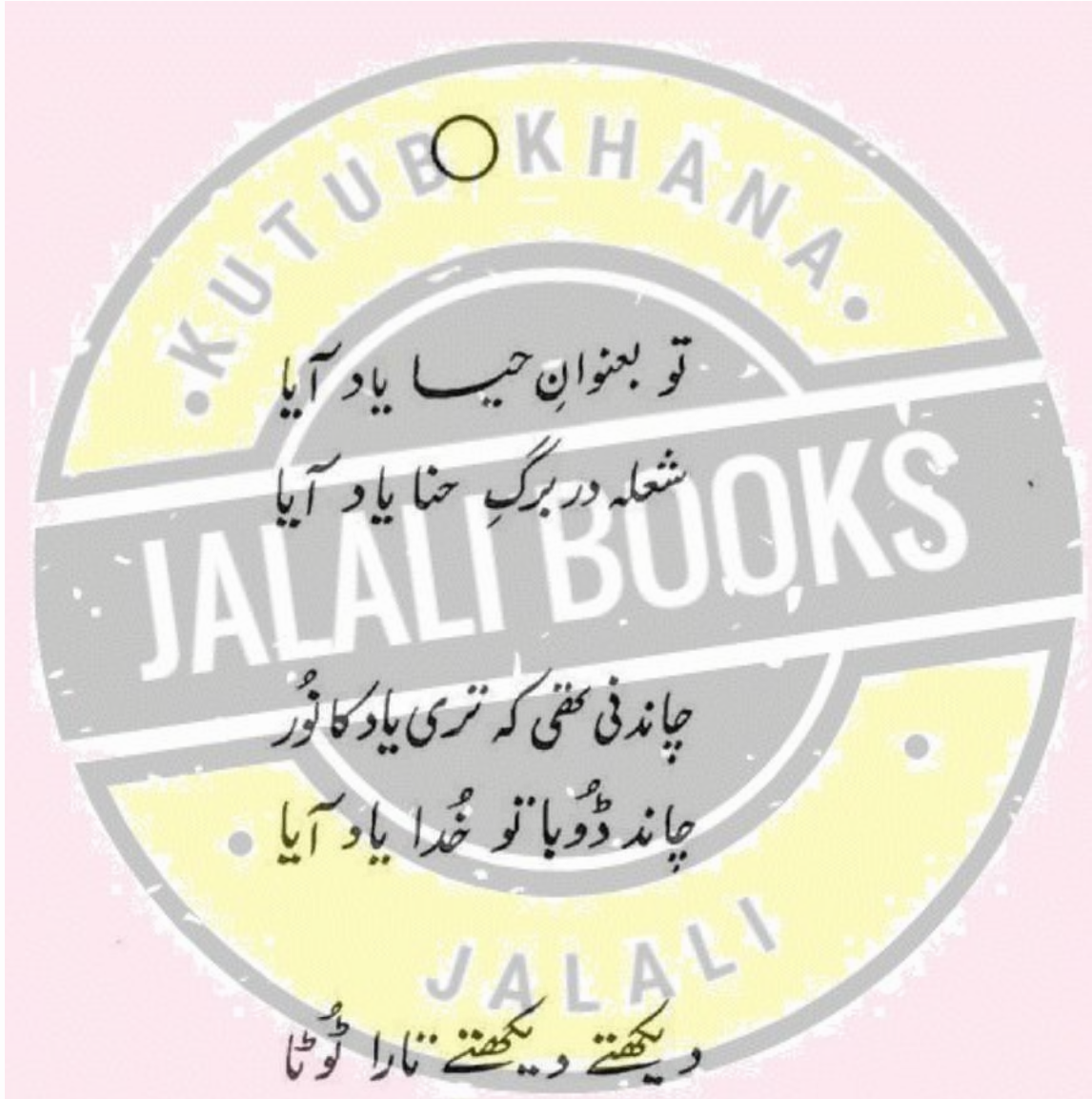
دیکھتے دیکھتے تارا ٹوٹا
تیرا پیمانِ وفا یاد آیا

دشت میں، موجِ شمیمِ گُل سے
تُو جو یاد آیا، بجا یاد آیا

قوسِ محرابِ حرم کے صدقے
خطِ خمدارِ قبا یاد آیا

اس عیادت کی بلاغت کے نثار
مجھے مرقد کا دیا یاد آیا

وقت نشتر بھی ہے، مرہم ہی نہیں
کل سے تُو آج سوا یاد آیا

دیکھ کر قبر سے اُگتا ہُوا پھُول
اپنا معیارِ بقا یاد آیا

یُوں تو یادوں کا مرکب ہُوں ندیم
وہ مجھے سب سے جُدا یاد آیا

۱۹۶۳ء

تجھے کھو کر بھی تجھے پاؤں، جہاں تک دیکھوں
حُسنِ یزداں سے تجھے حُسنِ بُتاں تک دیکھوں

تُو نے یُوں دیکھا ہے، جیسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا
مَیں تو دل میں ترے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

فقط اِس شوق میں پُوچھی ہیں ہزاروں باتیں
مَیں ترا حُسن، ترے حُسنِ بیاں تک دیکھوں

میرے ویرانۂ جاں میں، ترے غم کے دم سے
پُھول کِھلتے نظر آتے ہیں، جہاں تک دیکھوں

وقت نے ذہن میں دھندلا دیئے تیرے خد و خال
یوں تو میں ٹوٹتے تاروں کا دھواں تک دیکھوں

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

اک حقیقت سہی فردوس میں حوروں کا وجود
حسنِ انساں سے نمٹ لوں تو وہاں تک دیکھوں

۱۹۶۳ء

آج تک حسن کا معیار ہے عشق آزاری
کوئی کرتا ہی نہیں تجربہ دل داری

آدمی اپنی ہی آواز سے ڈر جاتا ہے
اس قیامت کی خموشی ہے فضا پر طاری

لوگ اب عشق بھی کرتے ہیں بڑی عقل کے ساتھ
اب تو پتھر سے بھی تولو، تو کلی ہے بھاری

نہ اُٹھے رُوح سے جب ہوک، تو کس کام کا درد
یوں بظاہر تو سبھی زخم لگے ہیں کاری

اپنی آنکھوں کے سمندر کا تموّج بھی دیکھا
تُو نے پلکیں تو اُٹھائی ہیں بہ صد دشواری

کتنے افسانے سُنائے تری خاموشی نے
اس بلاغت پہ ہو قُرباں مری خوش گفتاری

عام سے تیرے خد و خال کہیں مل نہ سکے
یُوں تو دیکھی ہیں کئی صُورتیں پیاری پیاری

اِک پجاری کی طرح فن کی پرستش کی ہے
اِسی باعث مرے معیار نہیں بازاری

جولائی ۱۹۶۳ء

۱۰
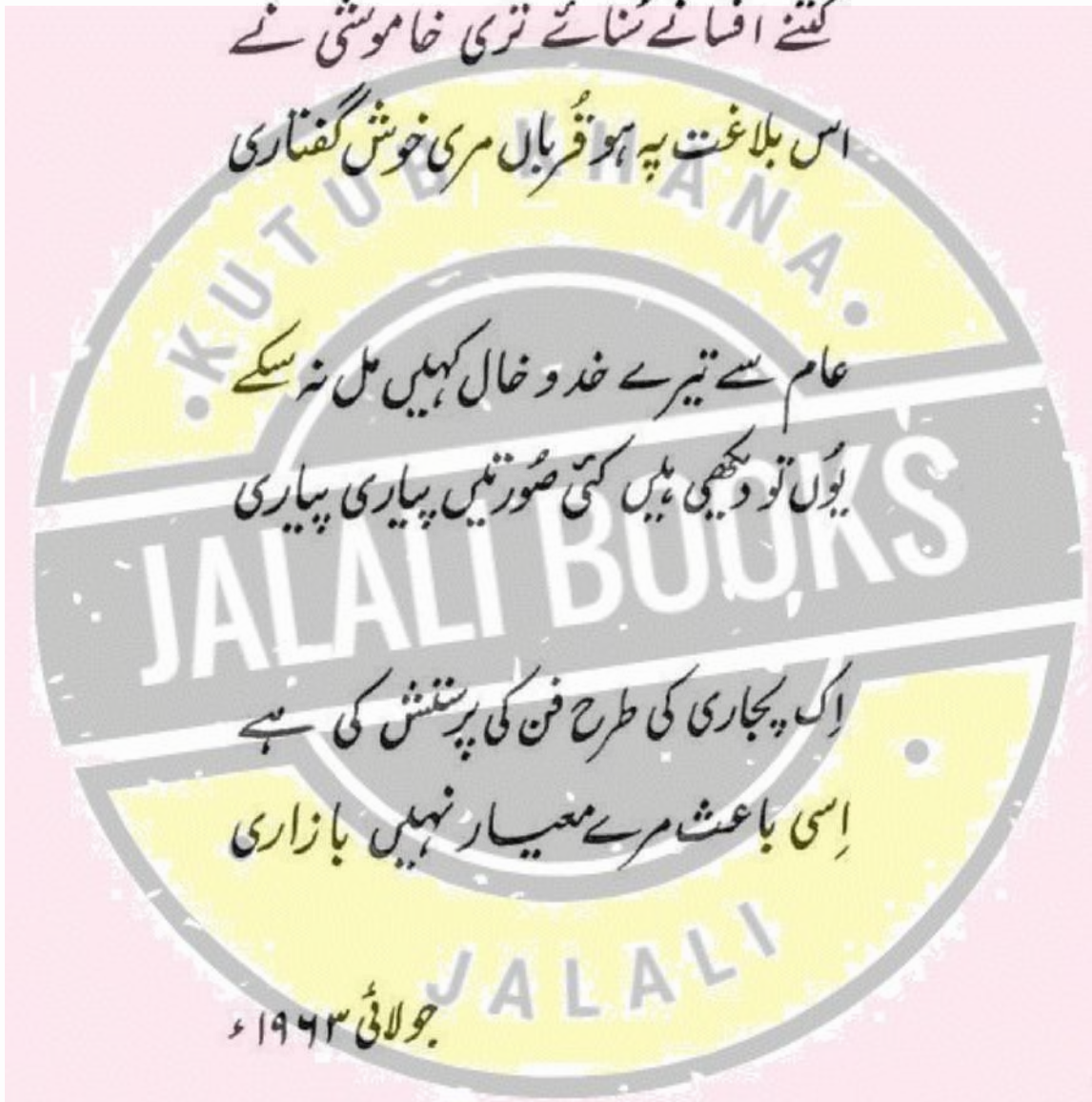
مجھ سے کافر کو ترے عشق نے یوں شرمایا
دل تجھے دیکھ کے دھڑکا تو خدا یاد آیا

میرے دل پر تو ہے اب تک ترے غم کا سایہ
لوگ کہتے ہیں نیا دَور نئے دُکھ لایا

میرا معیارِ وفا ہی مری مجبوری ہے
رُخ بدل کر بھی تجھے اپنے مقابل پایا

چارہ گر، آج ستاروں کی قسم کھا کے بتا
کِس نے انساں کو تبسّم کے لیے ترسایا

نذر کرتا رہا مَیں پھُول سے جذبات اسے
جس نے پتھّر کے کھلونوں سے مجھے بہلایا

گھنے اشجار میں اُلجھے رہے کاکل شب کے
چاند نے دستِ تجلّی تو بہت پھیلایا

لوگ ہنستے ہیں تو اس سوچ میں کھو جاتا ہُوں
موجِ سیلاب نے پھر کِس کا گھروندا ڈھایا

اُس کے اندر کوئی فن کار چھُپا بیٹھا ہے
جانتے بُوجھتے جس شخص نے دھوکا کھایا

مئی ۱۹۶۳ء

○

گو مَیں سکوں کی خاطر اُترا ہُوں آسماں سے
تکمیل پا رہا ہُوں، آلامِ جاوداں سے

ھٹّن جائے کس بلا کی، یزدان و اہرمن میں
انساں اگر کسی دن ہٹ جائے درمیاں سے

لفظوں کے سینے شق ہیں، معنی عرق عرق ہیں
مَیں نے کتابِ ہستی کھولی جہاں جہاں سے

ہر قوم کا تمدّن، لیتا ہے رنگ و نکہت
کچھ یادِ رفتگاں سے، کچھ جلوۂ بتاں سے

اُونچے شجر ہوں تیرے، یا پیڑ گھر میں میرے
آندھی چلی تو پتّے ٹوٹے کہاں کہاں سے!

اپریل ۱۹۶۳ء

○

دشت میں ساتھ چلے تو ہزاروں، جو بھی چلا ۔ بیگانہ چلا
قصدِ چمن جب مَیں نے کیا تو میرے جلو میں زمانہ چلا

اس کی قبا بھی نقابِ صنم تھی، میرے گریباں کی مانند
اسی لیے تو شیخِ حرم سے اپنا بہت یارانہ چلا

عِشق نہ تھا تو نکتہ بہ نکتہ بات سے بات نِکلتی تھی
عِشق ہُوا تو آخری دم تک ایک ہی افسانہ چلا

عِشق کی رسمِ بے سامانی اپنی سمجھ میں خاک آتی
جب بھی چلا مَیں سُوئے گلستاں، ساتھ مرے ویرانہ چلا

دل کی آزادی کے بدلے، مَیں کیوں لیتا حور و قصور
میری مملکتِ غیرت میں یہ کھوٹا سِکّہ نہ چلا

دسمبر ۱۹۶۲ء
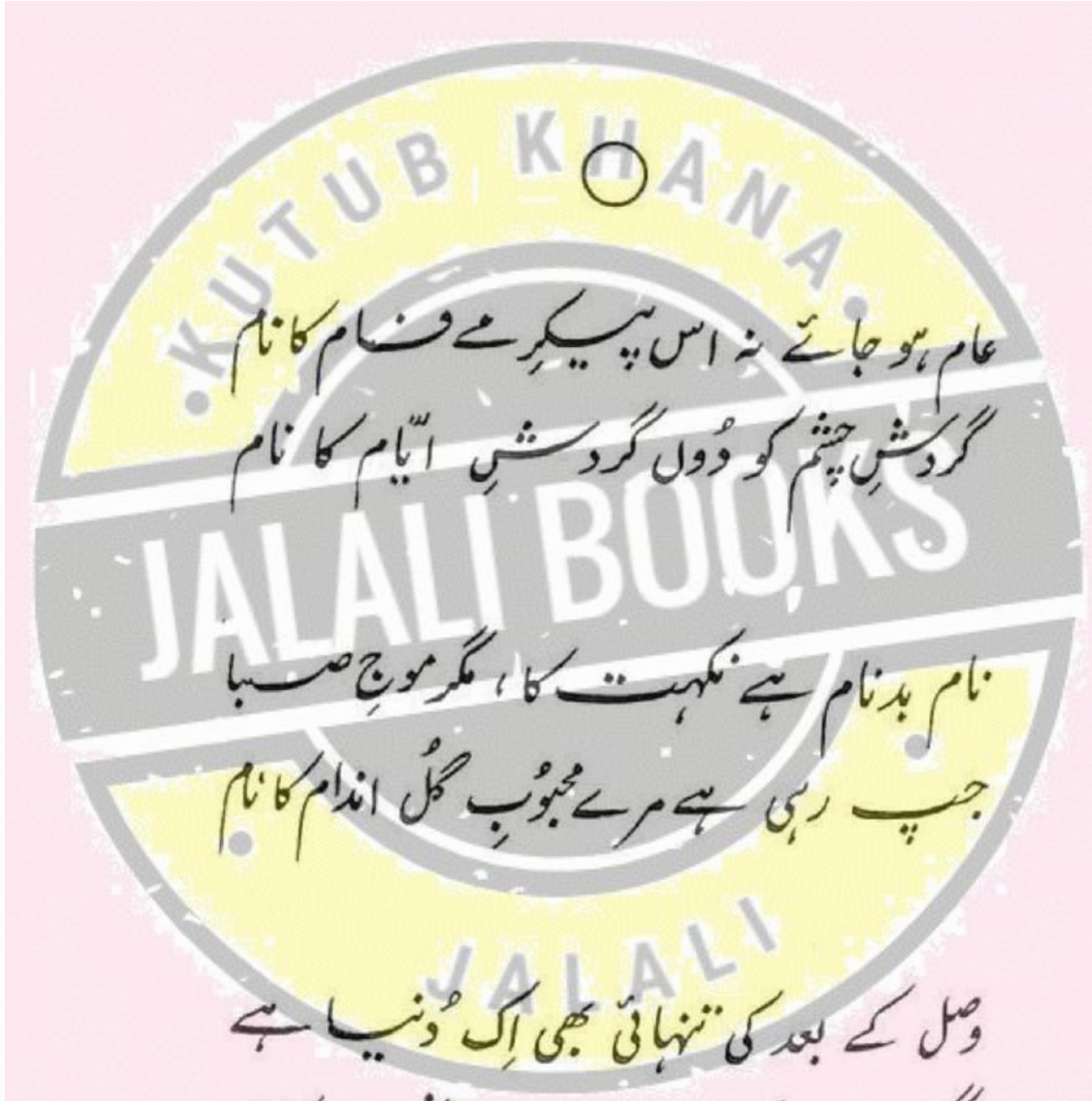
عام ہو جائے نہ اس پیکرِ مے فام کا نام
گردشِ چشم کو دُوں گردشِ ایّام کا نام

نام بدنام ہے نکہت کا، مگر موجِ صبا
جب رہی ہے مرے محبوبِ گُل اندام کا نام

وصل کے بعد کی تنہائی بھی اِک دُنیا ہے
لوگ آغاز کو دے دیتے ہیں انجام کا نام

شب نہ کٹتی تو نئی آگ نہ جلتی دِل میں
صُبح کی ساری شرارت ہے مگر شام کا نام

دل کی چیخوں میں سُنائی نہیں دیتا کچھ بھی
شبِ خاموش ہے شاید اسی کہرام کا نام

آسماں کچھ بھی نہیں عجزِ بصارت کے سوا
نارسائی ہے محبّت کی ــــ لبِ بام کا نام

کتنے معصوم ہیں انساں، کہ بہل جاتے ہیں
اپنی کوتاہی کو دے کر غم و آلام کا نام

ایک لمحے کو رُکا ہُوں تو اُفق پھیل گیا
اب تو مر کر بھی نہ لُوں گا کبھی آرام کا نام

یُوں مُسلماں تو بہت ہیں، مگر اب تک نہ سُنا
اِک مُسلماں سے بھی اِک پیرِ وِاسلام کا نام

یہ فقط میرا تخلّص ہی نہیں ہے، کہ ندیمؔ
میرا کردار کا کردار ہے ــــ اور نام کا نام

۱۹۶۲ء

○

بے وفا وقت نہ تیرا ہے، نہ میرا ہو گا
رات بھی آئے گی، سُورج کا بھی پھیرا ہو گا

مَیں تو اس سوچ میں گم ہوں کہ ہنسوں یا رو دوں
شب نے لی آخری ہچکی تو سویرا ہو گا

تم حقیقت سے جو ڈرتے ہو تو دن کے باوصف
بند کر لو اگر آنکھیں تو اندھیرا ہو گا

شاید اس دکھ سے اُجڑتی چلی جاتی ہے زمیں
اب تو انساں کا ستاروں پہ بسیرا ہو گا

کتنی شدّت پہ ہے، زنداں میں، مری غیرتِ فن
یہ وہ جنگل ہے جو جل کر بھی گھنیرا ہو گا

۱۹۶۲ء

خاک پر خلدِ بریں کی باتیں
چاند پر جیسے زمیں کی باتیں

دل سے اِک شمع جبیں کی باتیں
اُسی محفل میں وہیں کی باتیں
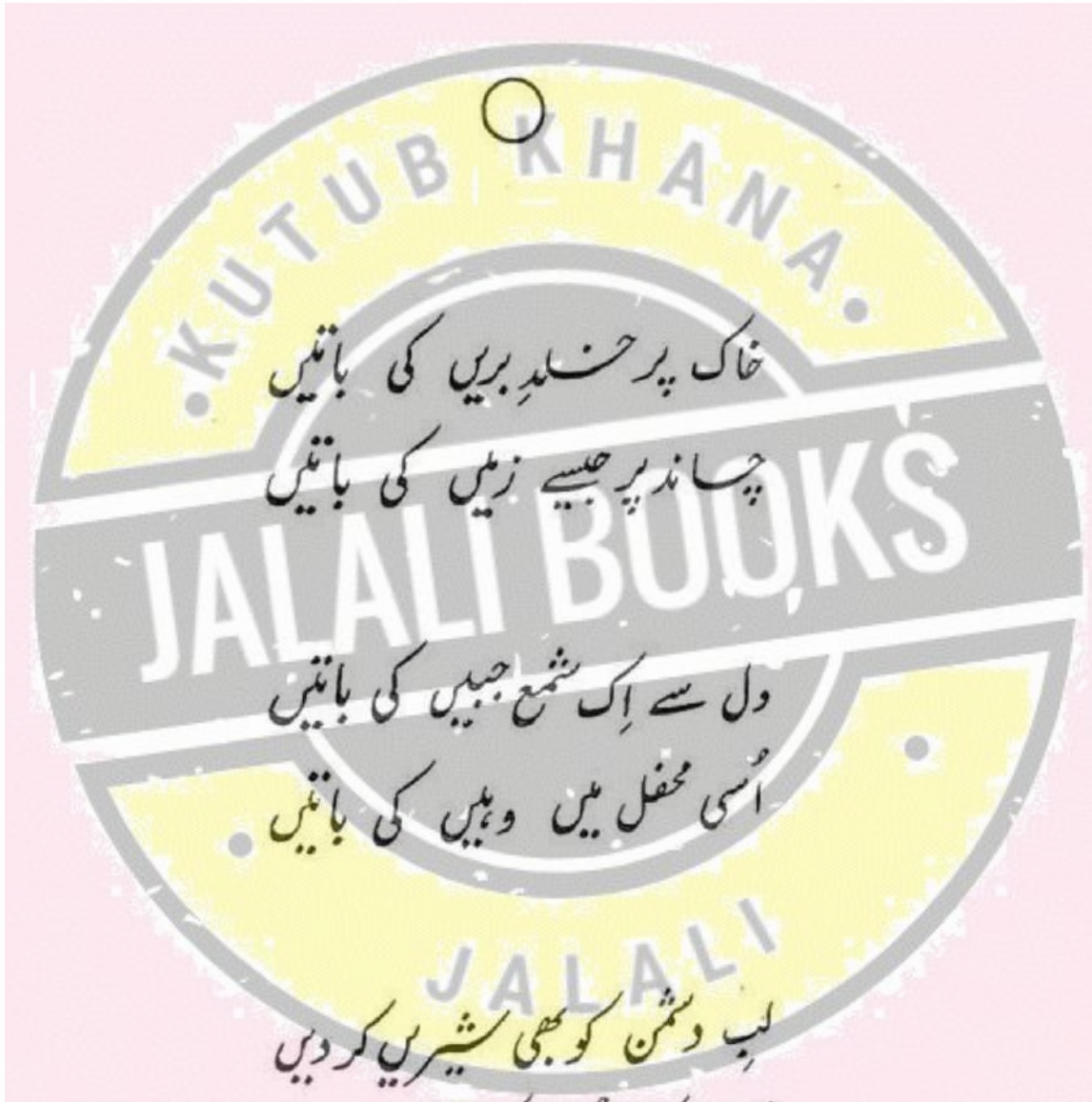
لبِ دشمن کو بھی شیریں کر دیں
اس کے حسنِ نمکیں کی باتیں

وہم سے بوقلموں کون و مکاں
ورنہ یک رنگ، یقیں کی باتیں

دل کا پتھر نہ کسی سے پگھلا
لوگ کرتے رہے دیں کی باتیں

میرے ناقد! مرا موضوعِ سخن
یہی دنیا ہے، یہیں کی باتیں

۱۹۶۲ء
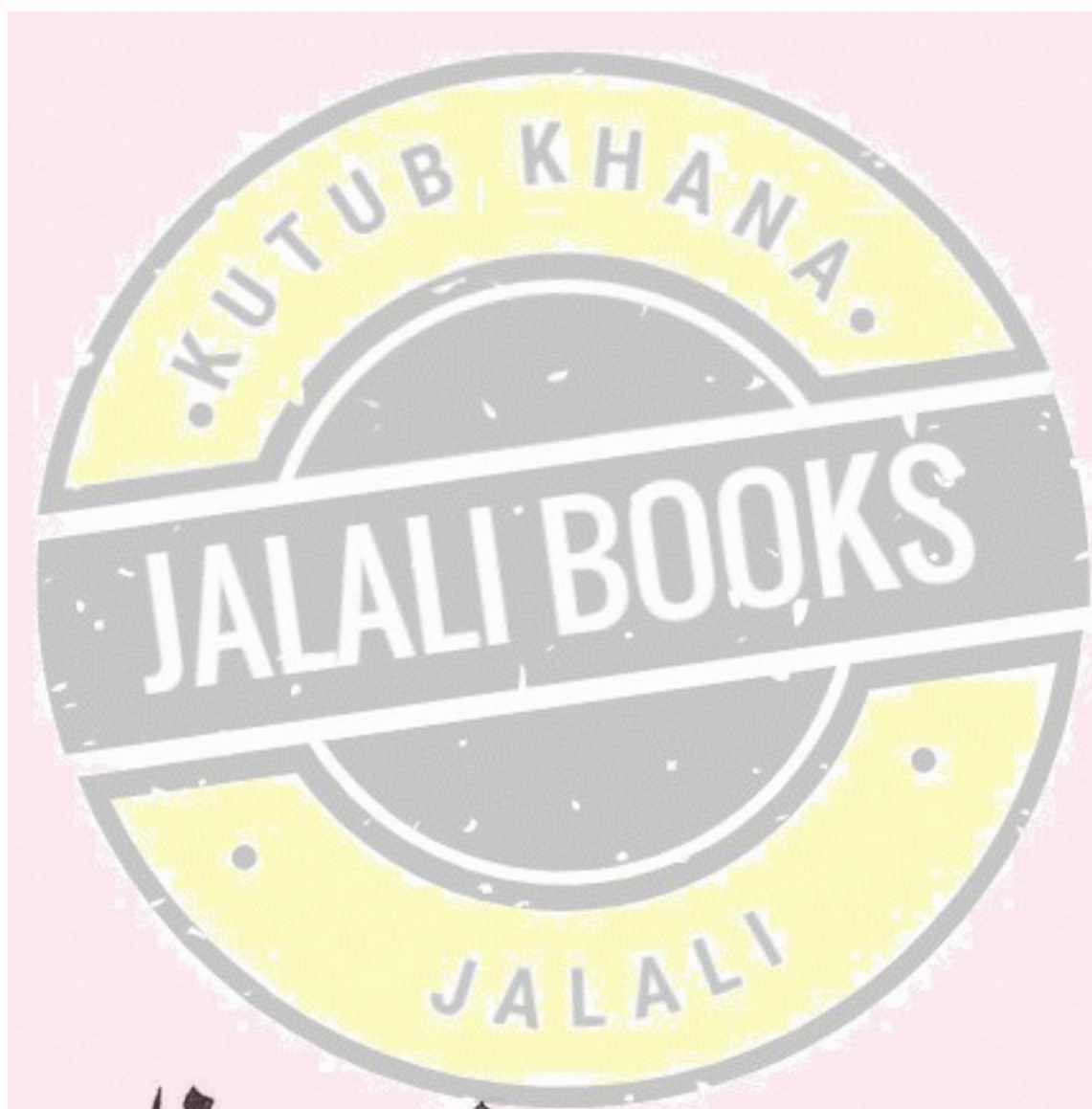
دشتِ وفا

غزل

پھول ہیں گلشن میں کچھ خوابیدہ، کچھ بیدار سے
بسنی جاتی ہیں مری یادیں شمیمِ یار سے

لوگ کہتے ہیں انھیں تاریخِ انسانی کے موڑ
راستے جب جھوم اُٹھتے ہیں تری رفتار سے

کون گل چینوں کو سمجھائے کہ معصومانِ گل
کٹ تو سکتے ہیں، چٹک سکتے نہیں تلوار سے

اتنے بے مایہ نہیں ہوتے خزاں کے پھول بھی
رُت کا اندازہ نہ ہوگا نکہتِ گلزار سے

دل کا اک اک زخم، اک اک شمع بن کر جل اُٹھا
درد یوں چمکا کسی کے شعلۂ گفتار سے

ایک پل گزرا کہ اِک آئی قیامت ٹل گئی !
وقت نے سیکھا ہے اٹھلانا خرامِ یار سے

اِس قدر پھیلا ہے زنداں کا حصارِ بے اماں
شہر بھی لبریز ہیں زنجیر کی جھنکار سے

زندگی مشکل ہے لیکن موت بھی آساں نہیں
دشت میں سر پھوڑنے نکلے ہو کس دیوار سے

لالۂ صحرا کبھی ، سنگِ رہِ دریا کبھی
زندگی ! تُو نے مجھے برتا ہے کتنے پیار سے

حسنِ شیریں اب بھی ہے شاید اسیرِ قصرِ سنگ
ورنہ کیوں آتی ہے تیشے کی صدا کہسار سے

شعر کہنے کا مزا جب ہے کہ صدیوں تک ندیمؔ
آئینے بنتے چلے جائیں مرے اشعار سے

مئی ۱۹۶۲ء

غزل

(نذرِ میر)

کٹی پتنگ ہے ساری دُنیا کی نظروں میں سمائی ہُوئی
جتنے ہم تجھ سے کترائے، اتنی تری رسوائی ہُوئی

ترکِ تعلّق سے تو ہم نے غیرتِ عشق کو بھٹکا تھا
تیرے تصوّر سے تو ورنہ برسوں بعد جُدائی ہُوئی

یادوں کے ظلمات میں اب بھی ٹوٹ رہے ہیں تارے سے
بھوبھل بن کر سُلگ رہی ہے آج بھی آگ بجھائی ہُوئی

پلٹ گئی رُت، جب تک رنگِ چمن سے ہم مانوس ہُوئے
یوں صیّاد کے کہنے کو تو موسمِ گُل میں رہائی ہُوئی

دھول اُڑائیں دشتِ وفا میں آندھی بن کر نگہت و رنگ
بسترِ شب سے چُنیں کنیزیں جب کلیاں مُرجھائی ہُوئی

حُسن و توازن کے رسیا ہیں، کیوں اضداد سے صُلح کریں
اِسی لیے تو صحنِ حرم میں برہمنوں سے لڑائی ہُوئی

فانی ہے انسان تو کیسے لاکھوں برس سے زندہ ہے
سب دھندا ہے عجزِ نظر کا، ساری بات بنائی ہُوئی

اب بھی ندیمؔ ضمیر پہ تیرے، مصلحتوں کے پہرے ہیں
ورنہ کیسے رُک جاتی ہے بات زباں پر آئی ہُوئی

مئی ۱۹۶۲ء

غزل

وہی بہشت کی تنہائیوں سے بیزاری
ہوئی نہ مجھ سے فرشتوں کی نازبرداری

مرے خیال میں جیسے جمالِ یار کی لَو
نہاں ہے شب کے دھوئیں میں سحر کی چنگاری
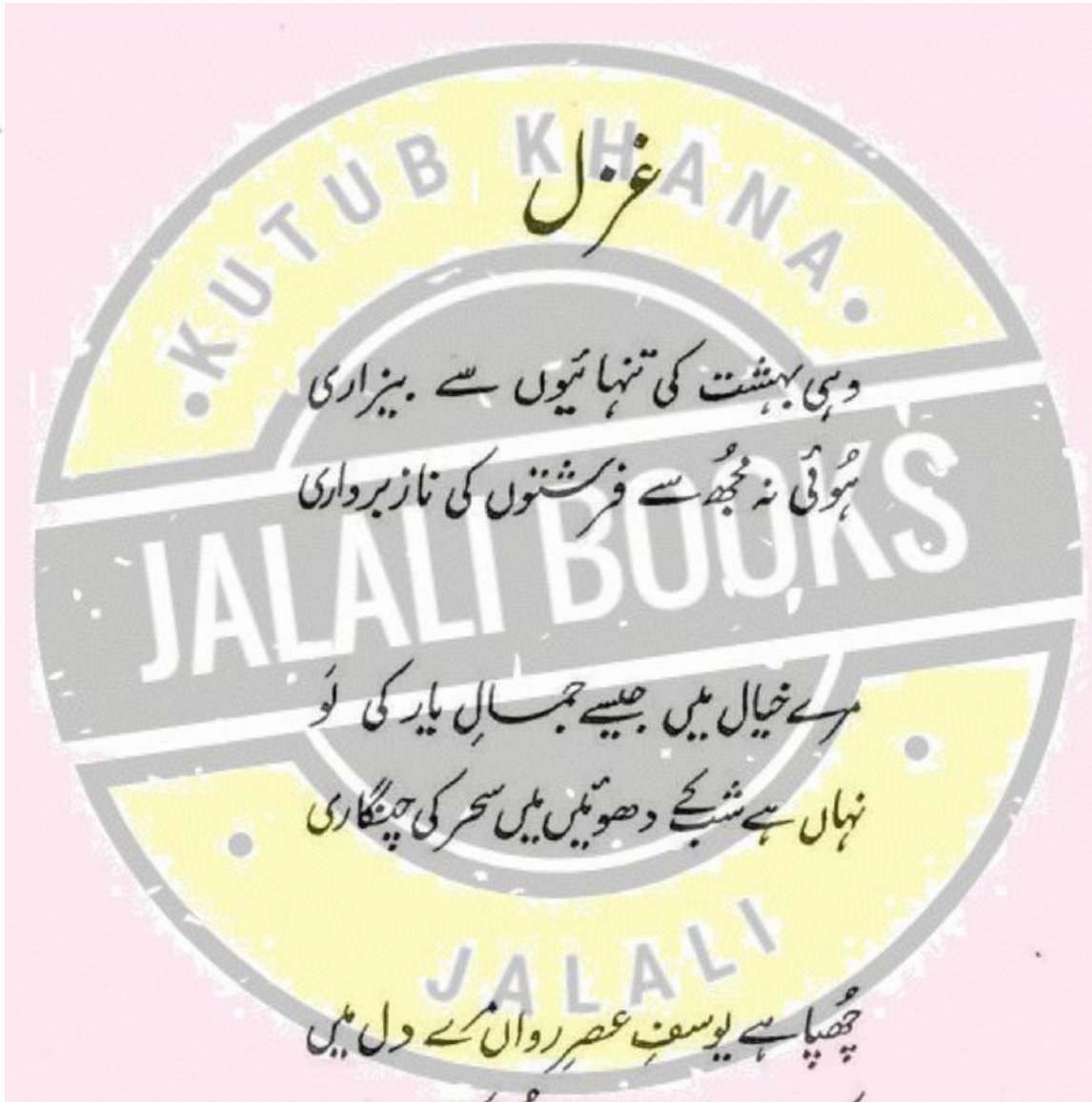
چھپا ہے یوسفِ عصرِ رواں مرے دل میں
کہ بڑھ رہی ہے بہت حُسن کی خریداری

کلی کلی متحیّر، چمن چمن پامال
ذرا بہار کی دیکھو تو گرم رفتاری

مَیں اُس مقام پہ ہُوں ضبطِ عشق کے ہاتھوں
جہاں سکوت، صدا کی ہے آئنہ داری

گجر سحر کا بجا لوں تو ہر سزا منظور
مرا گناہ سہی نصف شب کی بیداری

ہے ان کے پاس تبسّم ہی ہر ستم کا جواب
وہ جن کے دل پہ رہی درد کی علم داری

نئی زباں میں مہذّب اسی کو کہتے ہیں
بلند جس کا ہو معیارِ مردم آزاری

ندیمؔ، چاند پہ انسان کے پہنچنے تک
اُبھر نہ جائے عناصر کی چار دیواری

اپریل ۱۹۶۲ء

غزل

پھُولوں سے لہو کیسے ٹپکتا ہُوا دیکھوں
آنکھوں کو بجھا لوُں کہ حقیقت کو بدل دُوں

حق بات کہوں گا، مگر اے جرأتِ اظہار
جو بات نہ کہنی ہو، وہی بات نہ کہہ دُوں
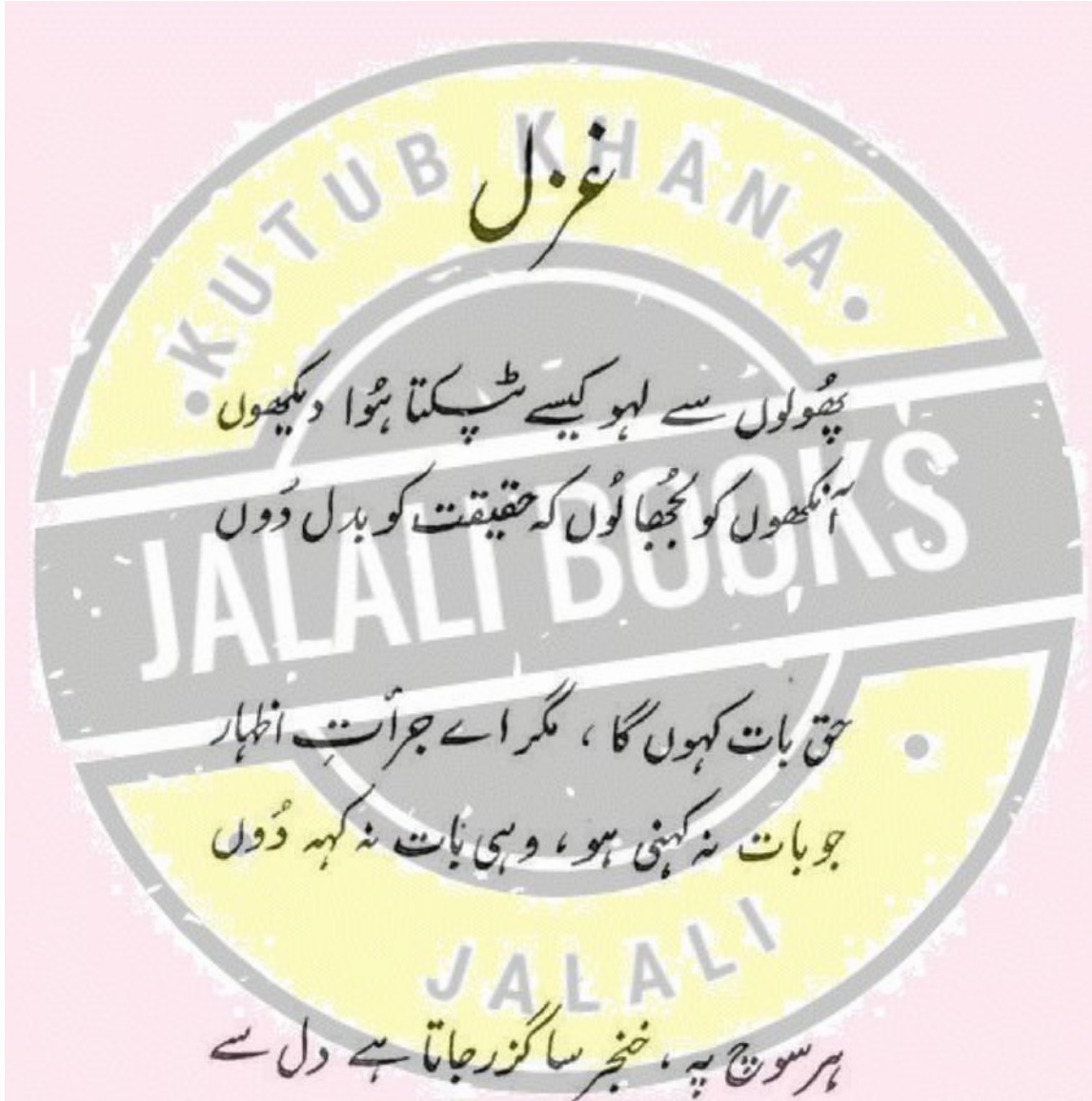
ہر سوچ پہ، خنجر سا گزر جاتا ہے دل سے
حیراں ہُوں کہ سوچوں تو کس انداز سے سوچوں

سنّاٹے اُڑا دیتے ہیں آواز کے پُرزے
یاروں کو اگر دشتِ مصیبت میں پکاروں

آنکھیں تو دکھاتی ہیں فقط برف سے پیکر
جل جاتی ہیں پوریں جو کسی جسم کو چھو لوں

چہرے ہیں کہ مرمر سے تراشی ہوئی لوحیں
بازار ہیں یا شہرِ خموشاں میں کھڑا ہوں

جینے پہ جو مجبور ہو، جی کر وہ کرے کیا
صحرا میں کبھی خضر جو مل جائے تو پوچھوں

ملتی نہیں جب موت بھی مانگے سے تو یارب
ہو اِذن تو میں اپنی صلیب آپ اُٹھا لوں

یاد آنے لگا ہے مجھے انجامِ بہاراں
اے ابرِ کرم، تیری اجازت ہو تو رو لوں

سوکھا ہوا پتّہ ہوں مگر اے شبِ تاریک
مَیں ایک ستارہ ہوں اگر شاخ سے ٹوٹوں

مارچ ۱۹۶۲ء

غزل

دیارِ عشق کا یہ حادثہ عجیب سا تھا
رُخِ رقیب پہ بھی پرتوِ حبیب سا تھا

فراق زخم سہی، کم نہ تھی جراحتِ وصل
معانقہ مرے محبوب کا، صلیب سا تھا

ترے جمال کی سرحد سے کبریا کا مقام
بہت قریب تو کیا تھا، مگر قریب سا تھا

سُنی ہے مَیں نے صدائے شکستِ نکہت و رنگ
خزاں کی راہ میں ہر پھُول، عندلیب سا تھا

برادرانِ وطن کے سلوک کی سوگند
ندیمؔ یوسفِ کنعاں کا ہم نصیب سا تھا

فروری ۱۹۶۲ء

غزل

کیا کہوں، اب تجھ کو اپنا کر بھی کیوں افسردہ ہُوں
مَیں ترے پندار کی افتاد سے آزردہ ہُوں

مَیں جدید انسان، باوصفِ غرور و تمکنت
پتھّروں کے دیوتاؤں کی نگاہِ مُردہ ہُوں

دوستوں کی نفرتیں بھی کیوں مجھے پیاری نہ ہوں
مَیں تو اپنے دشمنوں تک کا محبّت خوردہ ہُوں

منحصر ہے میرے مٹنے پر شگفتِ صد چمن
میں بظاہر شاخِ ہستی کا گُلِ پژمردہ ہُوں

میری سانسیں سنسناہٹ شہپرِ جبریل کی
کیا بتاؤں، کن بہشتوں کی متاعِ بُردہ ہُوں

جنوری ۱۹۶۲ء

غزل
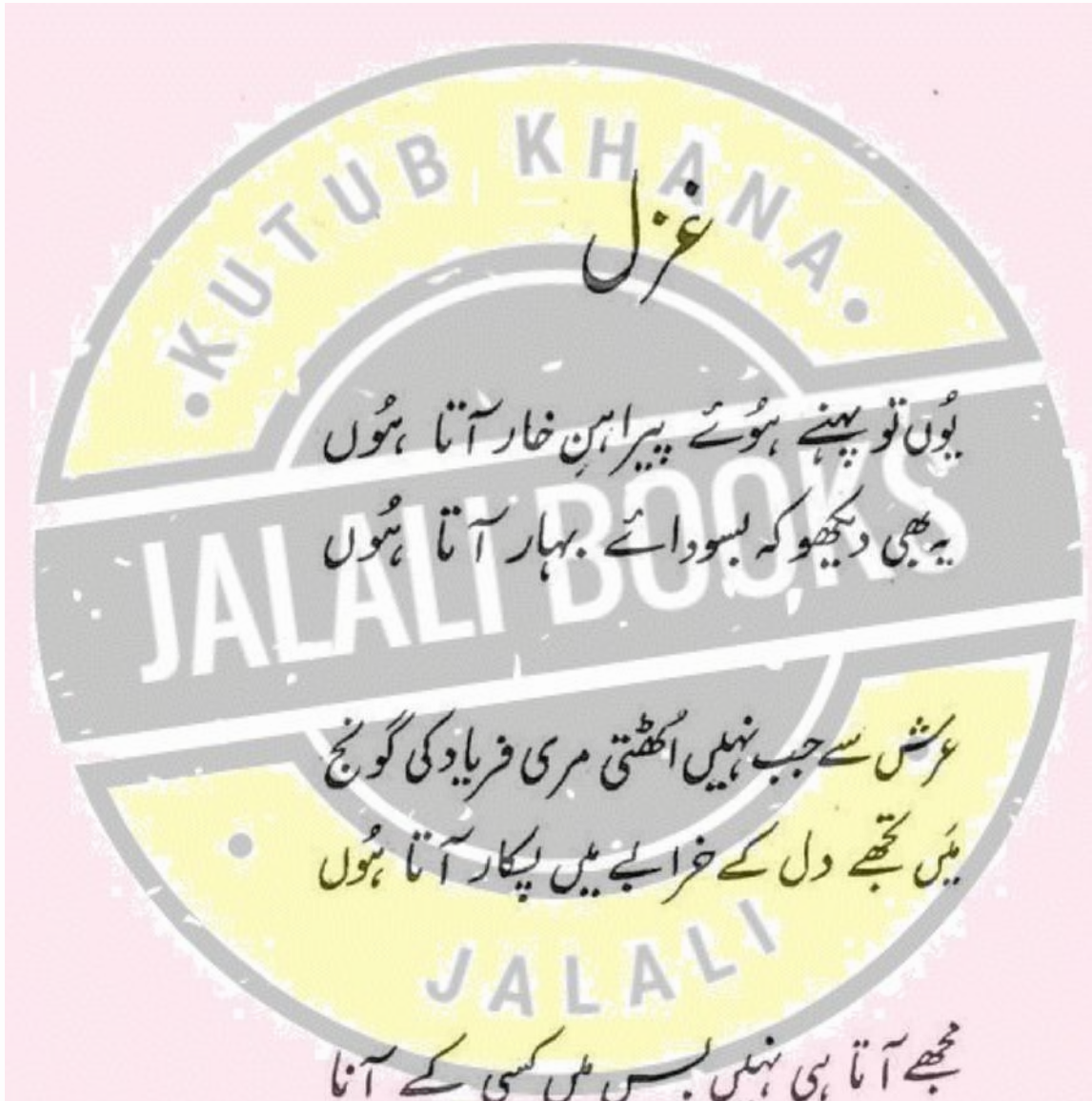
یُوں تو پہنے ہُوئے پیراہنِ خار آتا ہُوں
یہ بھی دیکھو کہ بسودائے بہار آتا ہُوں

عرش سے جب نہیں اُٹھتی مری فریاد کی گونج
مَیں تجھے دل کے خرابے میں پکار آتا ہُوں

مجھے آتا ہی نہیں بس میں کسی کے آنا
آؤں بھی تو بکفِ آبلہ دار آتا ہُوں

تُو وہاں، زیرِ افق، چند گھڑی سستا لے
مَیں ذرا دن سے نمٹ کر، شبِ تار! آتا ہُوں

تجھ سے چھُٹ کر بھی، تری سرخیِ عارض کی قسم
چپکے چپکے ترے دل میں کئی بار آتا ہُوں

میرا ایثار اس الزام سے کیا کم ہو گا
جانبِ دار بو ہم قدِ یار آتا ہُوں

یہ الگ بات، کہ پھُولوں پہ ہو زخموں کا گماں
مَیں تو جب آتا ہُوں، ہم رنگِ بہار آتا ہُوں

وحشتِ ہر فکر سے، مَیں عصرِ رواں کا اِنساں
ہو کے خود اپنی ذہانت کا شکار آتا ہُوں

انہی دو باتوں میں کٹ جاتی ہے سب عمر ندیمؔ
اے غمِ دہر! نہ چھیڑ، اے غمِ یار! آتا ہُوں

جنوری ۱۹۶۲ء

غزل

شبِ فراق کو جب مژدۂ سحر آیا
تو اِک زمانہ ترا منتظر نظر آیا

تمام عمر کی صحرانوردیوں کے بعد
ترا مقام سرِ گردِ رہگزر آیا
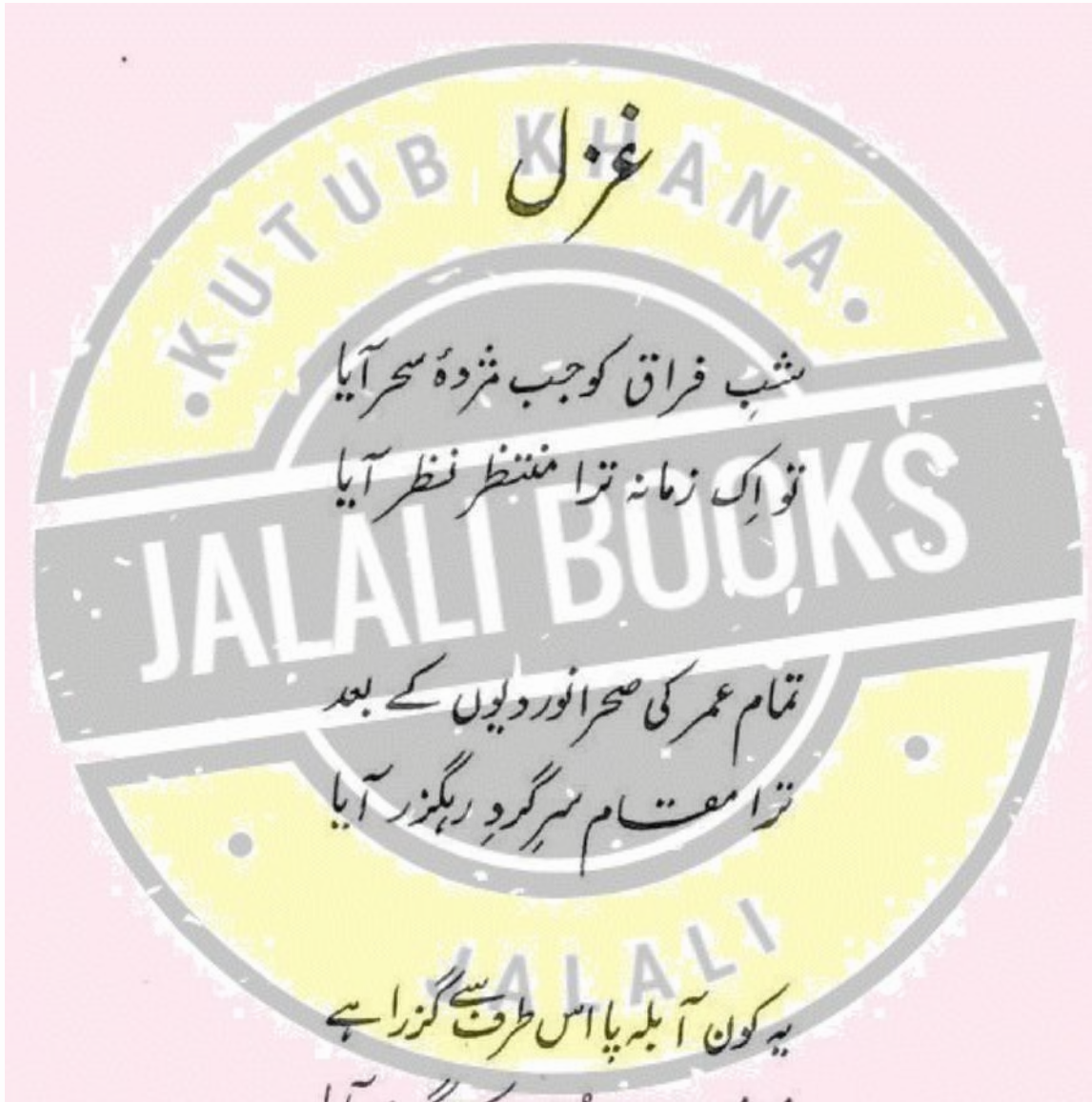
یہ کون آبلہ پا اس طرف سے گزرا ہے
نقوشِ پا میں جو پھولوں کے رنگ بھر آیا

کسے مجال کہ نظارۂ جمال کرے
اس انجمن میں جو آیا، بچشمِ تر آیا

تری طلب کے گھنے جنگلوں میں آگ لگی
مرے خیال میں جب وہمِ رہگزر آیا

سمٹ گیا مری باہوں میں جب وہ پیکرِ رنگ
تو اس کا رنگ مجھے دُور تک نظر آیا

اس آرزو میں، کہ ضدِ کبریا کی پوری ہو
ندیمؔ خاک پہ، افلاک سے اُتر آیا

جنوری ۱۹۶۲ء
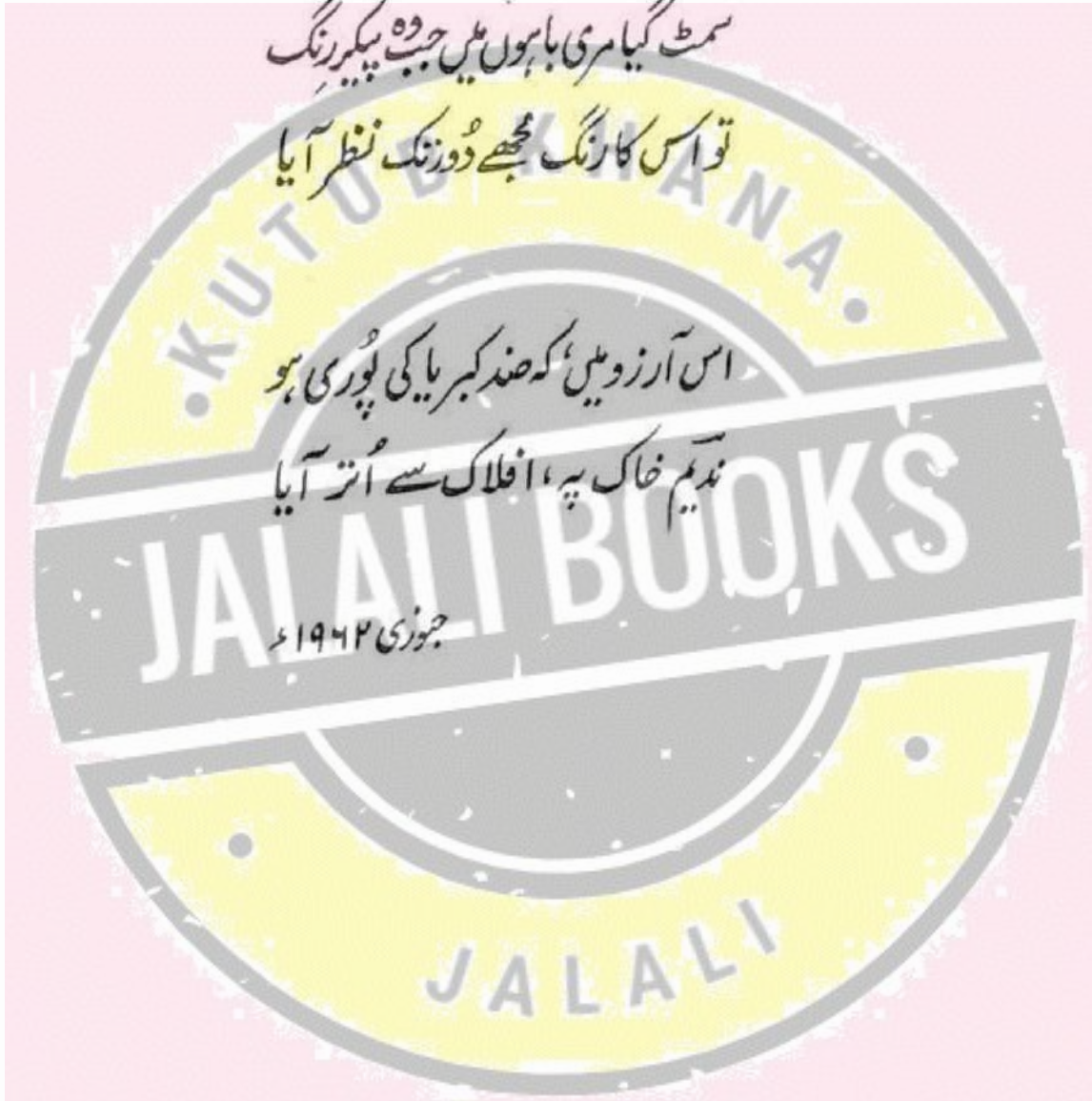
غزل

تو بگڑتا بھی ہے، خاص اپنے ہی انداز کے ساتھ
پھول کھلتے ہیں ترے شعلۂ آواز کے ساتھ

ایک بار اور بھی کیوں عرضِ تمنّا نہ کروں
کہ تو انکار بھی کرتا ہے عجب ناز کے ساتھ

لَے جو ٹوٹی تو صدا آئی شکستِ دل کی
رگِ جاں کا کوئی رشتہ ہے رگِ ساز کے ساتھ

تو پکارے تو چمک اُٹھتی ہیں میری آنکھیں
تیری صُورت بھی ہے شامل تری آواز کے ساتھ

جب تک ارزاں ہے زمانے میں کبوتر کا لہو
ظلم ہے، ربط رکھوں گر کسی شہباز کے ساتھ

پست اتنی تو نہ تھی میری شکست اے یارو
پر سمیٹے ہیں، مگر حسرتِ پرواز کے ساتھ

پھرے بیٹھے ہیں قفس پر، کہ ہے صیّاد کو وہم
پر شکستوں کو بھی اِک ربط ہے پرواز کے ساتھ

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

جنوری ۱۹۶۲ء

غزل

عرش پر جا کے بھی جو خاک نشیں ہوتا ہے
خاک ہو جائے تو آزردہ نہیں ہوتا ہے

وہ بہشتوں کے محل ہوں، کہ فرشتوں کی اُڑان
سایہ ہر چیز کا بر رُوئے زمیں ہوتا ہے

وہ عقیدت کا نشہ ہو کہ محبّت کا خمار
وہم بڑھ جائے تو بنیادِ یقیں ہوتا ہے

صِرف دیکھو تو تجلّی بھی ہے ظلمت کا نقاب
اور پرکھو تو اندھیرا بھی حسیں ہوتا ہے

حشر بھی آئے تو سر جھک نہ سکے جس کے بعد
وہی سجدہ ہے جو معراجِ جبیں ہوتا ہے

دیکھنا چاہو تو نظروں کو ٹھکانا نہ ملے
حسن اس رنگ سے بھی پردہ نشیں ہوتا ہے

اب نہ وہ ہم نہ وہ ہنگامۂ اُمید ندیمؔ
پھر تماشا سا یہ کیا دل کے قریں ہوتا ہے

جنوری ۱۹۶۲ء

غزل

(نذرِ سودا)

محور ہے یہی خواجگیِ کون و مکاں کا
نازک سا جو اک ربط ہے دل سے رگِ جاں کا

میں خوش ہوں اگر دادِ وفا پائی کسی نے
اتنا تو بتا دو کہ یہ قصّہ ہے کہاں کا

مہمل ہے بہاروں کے لیے اسلحہ بندی
کیا کام ہے کلیوں کے چٹکنے میں سناں کا

اے کارگہِ حسن میں خود حسن کے منکر
مجھ کو تو ہے دل پر بھی گماں شہرِ بتاں کا

صحرا بھی جھمکتے ہوں جہاں لالہ رخوں سے
ہے کفر وہاں صرف تصوّر بھی خزاں کا

چھوتی ہے تجھے لہر تو گھل جاتا ہے سونا
کل تک تو کوئی رنگ نہ تھا آبِ رواں کا

لفظوں میں ترا رنگ ہے، شعروں میں ترا سحر
کہنے کو تو شہرہ ہے مرے حسنِ بیاں کا

اکتوبر ۱۹۶۱ء

غزل
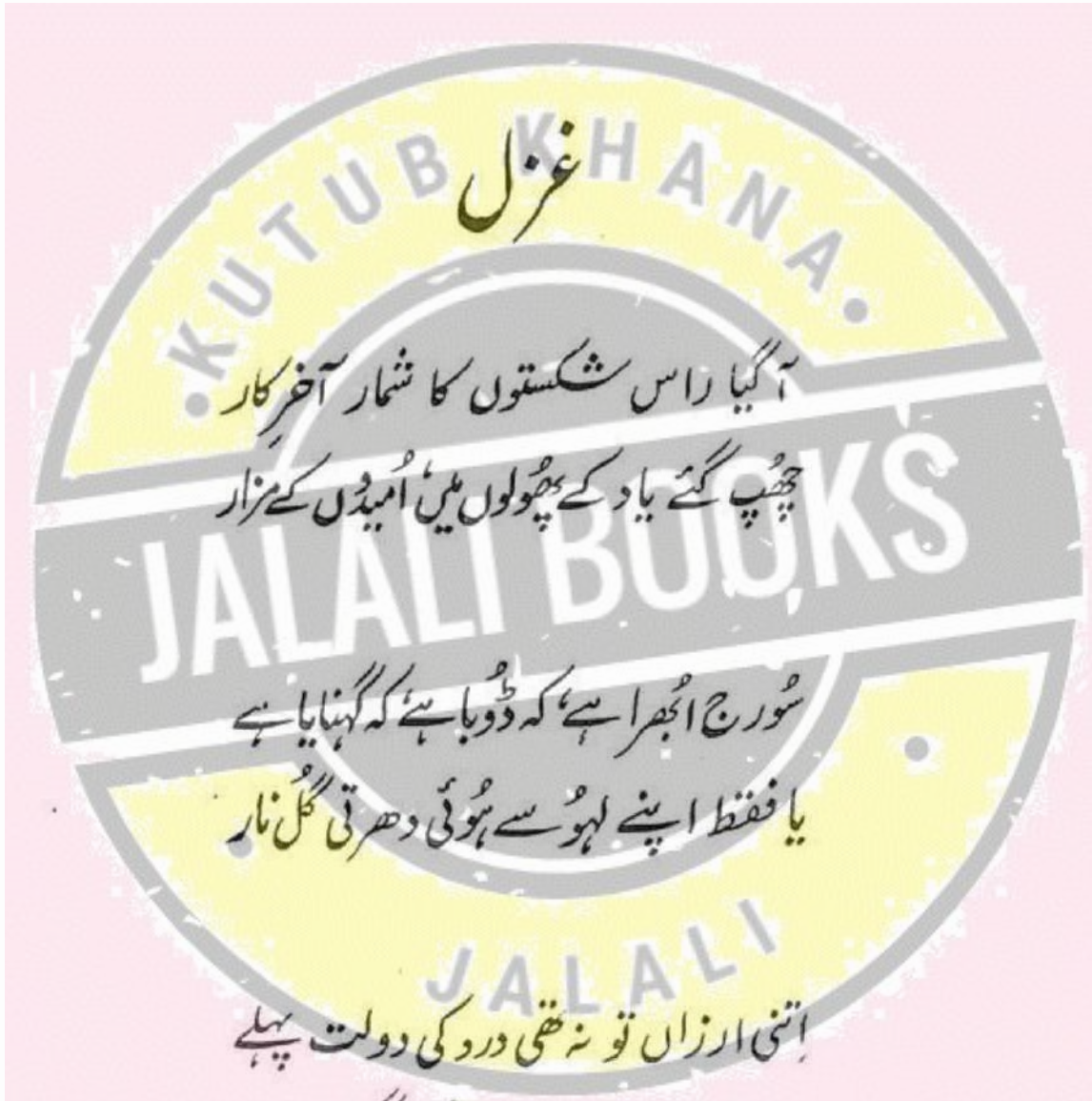
آ گیا راس شکستوں کا شمار آخرِ کار
چھُپ گئے یاد کے پھُولوں میں اُمیدوں کے مزار

سُورج اُبھرا ہے، کہ ڈُوبا ہے، کہ گہنایا ہے
یا فقط اپنے لہُو سے ہُوئی دھرتی گُل نار

اِتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے
جس طرف جائیے، زخموں کے لگے ہیں بازار

بُوندیں بجتی ہیں کہ کنکر درِ تنہائی پر
ابر گھِر آیا ہے یا ٹوٹ پڑے ہیں کہسار

سر بچا لائے ہو، لیکن یہ زیاں تو دیکھو
کتنا ویران ہے، تا حدِّ نظر، منظرِ دار

آدمی لاکھ بڑھے، فاصلے گھٹتے ہی نہیں
ہٹتا جاتا ہے، مگر چھٹ نہیں پاتا ہے غبار

جوئے شیر آج بھی شیریں کے قدم دھوتی ہے
آج بھی تیشۂ فرہاد سے اُڑتے ہیں شرار

وسعتِ دہر اک اُجڑا ہوا معبد ہوتی
روزِ اوّل اگر ابلیس نہ کرتا انکار

نام اس طرح جو مٹتا ہے تو مٹ جائے ندیمؔ
کسی قیمت پہ نہ کم ہو مرے فن کا معیار

جولائی ۱۹۶۱ء

غزل
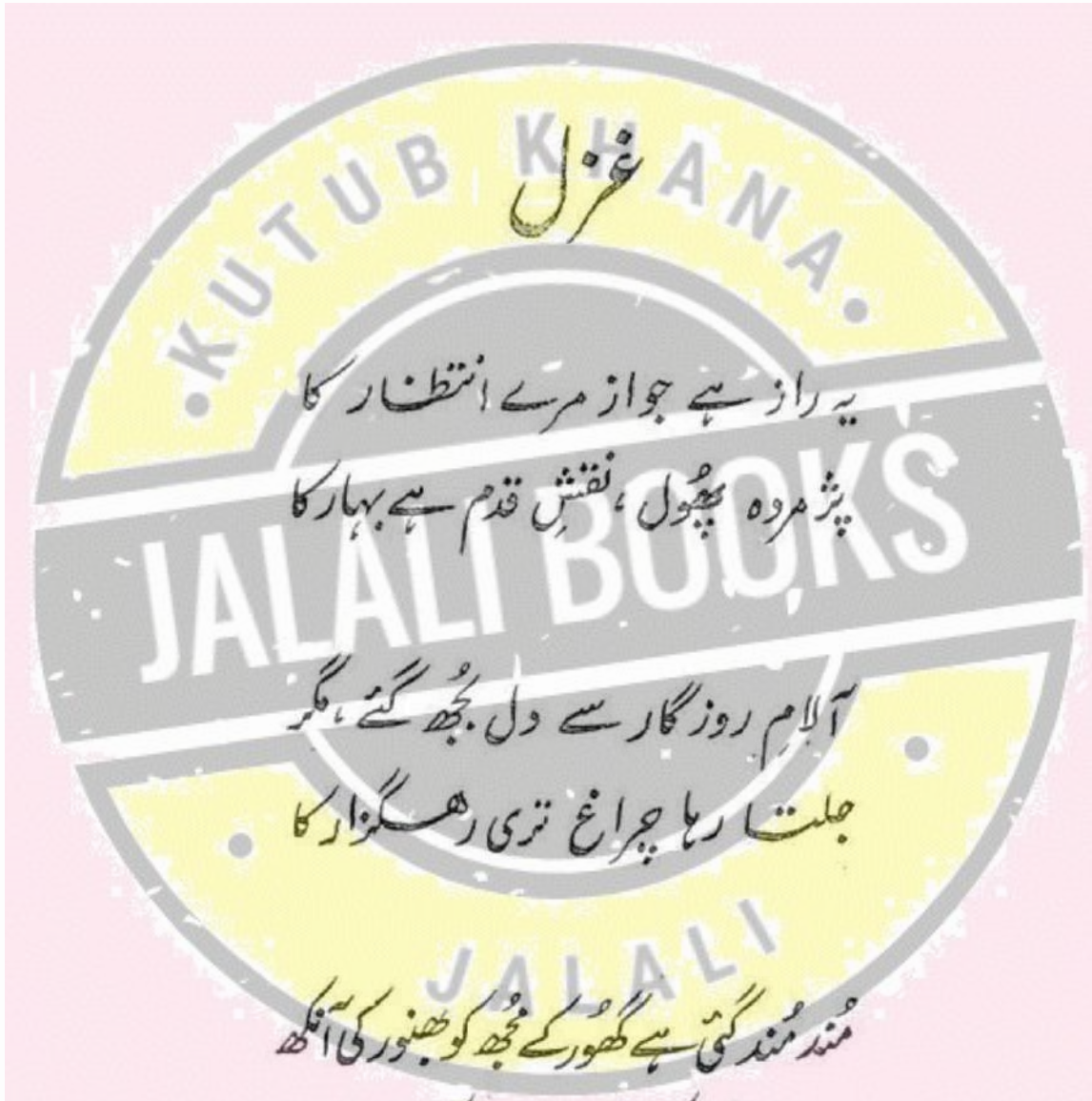
یہ راز ہے جواز مرے انتظار کا
پژمردہ پھول، نقشِ قدم ہے بہار کا

آلامِ روزگار سے دل بجھ گئے، مگر
جلتا رہا چراغ تری رہگزار کا

مُند مُند گئی ہے گھور کے مجھ کو بھنور کی آنکھ
ممنون ہوں کسی کے غمِ بے کنار کا

کیا پوچھتے ہو میرے گناہوں کی سرگزشت
مجرم ہوں صرف پیرہن تار تار کا

ہے آفتابِ مغربیاں مائلِ غروب
مشرق کی سمت ڈھلنے لگا سایہ، دار کا

کاٹیں گے کیسے شب کو جوانانِ عصرِ نو
اُن کو تو دھوپ پر بھی گماں ہے غبار کا

کلیاں تو زُلفِ یار میں گُوندھوں، مگر ندیمؔ
ماتم تو کر لُوں اُجڑی ہُوئی شاخسار کا

جون ۱۹۶۱ء

غزل

فضا۔ بہتی ہُوئی آنسو، ہَوا — بھرتی ہُوئی آہیں
نہ جانے کس جہاں کو لے چلیں سُونی گزر گاہیں

وہی تشنہ لبی ہے اور وہی دشتِ غمِ دوراں
بزعمِ خویش، یاروں نے تراشی تھیں نئی راہیں

خبر کیا تھی کہ یُوں حساس ہو گا شب کا سنّاٹا
کراہیں بن کے گونج اُٹھیں گی جب روکی ہُوئی آہیں

اُسے چھُونا بھی ممکن، سوچنا بھی تجھ کو ناممکن
تری دُنیا میں یارب تجھ کو پُوجیں یا اُسے چاہیں

زمیں کچھ اور اُبھری، آسماں کچھ اور سنولایا
ذرا انگڑائی لینے کو جب اُٹھیں حُسن کی باہیں

تمھارے بعد اِک حُسنِ ازل ہے، وہ بھی آوارہ
تمھارے چاہنے والے خدا سے اور کیا چاہیں

خراشیں دل کی، اُمڈیں گی ندیم اِک سیلِ خوں بن کر
یہی پگڈنڈیاں مِل جُل کے بن جائیں گی شہراہیں

مئی ۱۹۶۱ء

غزل

(نذرِ غالبؔ)

ہنسی آتی ہے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر
گھٹا کعبے سے اُٹھتی ہے، برستی ہے برہمن پر

خمارِ خانہ ویرانی میں یُوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے بجلیوں نے رنگ چھڑکے ہیں نشیمن پر

چلو، دشتِ طلب میں ایک انساں تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جان رکھ دُوں دستِ رہزن پر

جفائے دوست کی مجھ سے شکایت ہو تو کیونکر ہو
وہ دیوانہ ہُوں جس کو پیار آجاتا ہے دشمن پر

شمیمِ گُل تو رنگِ گُل کے بس میں بھی نہیں رہتی
خزاں کیوں ہاتھ پھیلاتی رہی دیوارِ گُلشن پر

قفس کی تیرگی کچھ کم نہ تھی ہول آفرینی کو
کرن کے رُوپ میں تلوار رکھ دی کس نے روزن پر

خدا کے سامنے کس مُنہ سے جائیں گے، خدا جانے
محبّت کا کوئی دھبّا نہیں ہے جن کے دامن پر

عناصر سے نمٹ کر، کیا بتاؤں، کس سے نمٹے گا
ندیم اب آدمی کے ہاتھ ہیں خود اپنی گردن پر

مارچ ۱۹٦۱ء

غزل

مرا غرور، تجھے کھو کے، ہار مان گیا
مَیں چوٹ کھا کے مگر اپنی قدر جان گیا

کہیں افق نہ ملا میری دشت گردی کو
مَیں تیری دھن میں بھری کائنات چھان گیا

خدا کے بعد تو بے انتہا اندھیرا ہے
تری طلب میں کہاں تک نہ میرا دھیان گیا

جبیں پہ بل بھی نہ آیا گنوا کے دونوں جہاں
جو تُو چھنا، تو مَیں اپنی شکست مان گیا

بدلتے رنگ تھے تیری امنگ کے غمّاز
تُو مجھ سے بچھڑا، تو مَیں تیرا راز جان گیا

خوَد اپنے آپ سے مَیں شکوہ سنج آج بھی ہُوں
ندیمؔ، یُوں تو مجھے اِک جہان مان گیا

فروری ۱۹۶۱ء
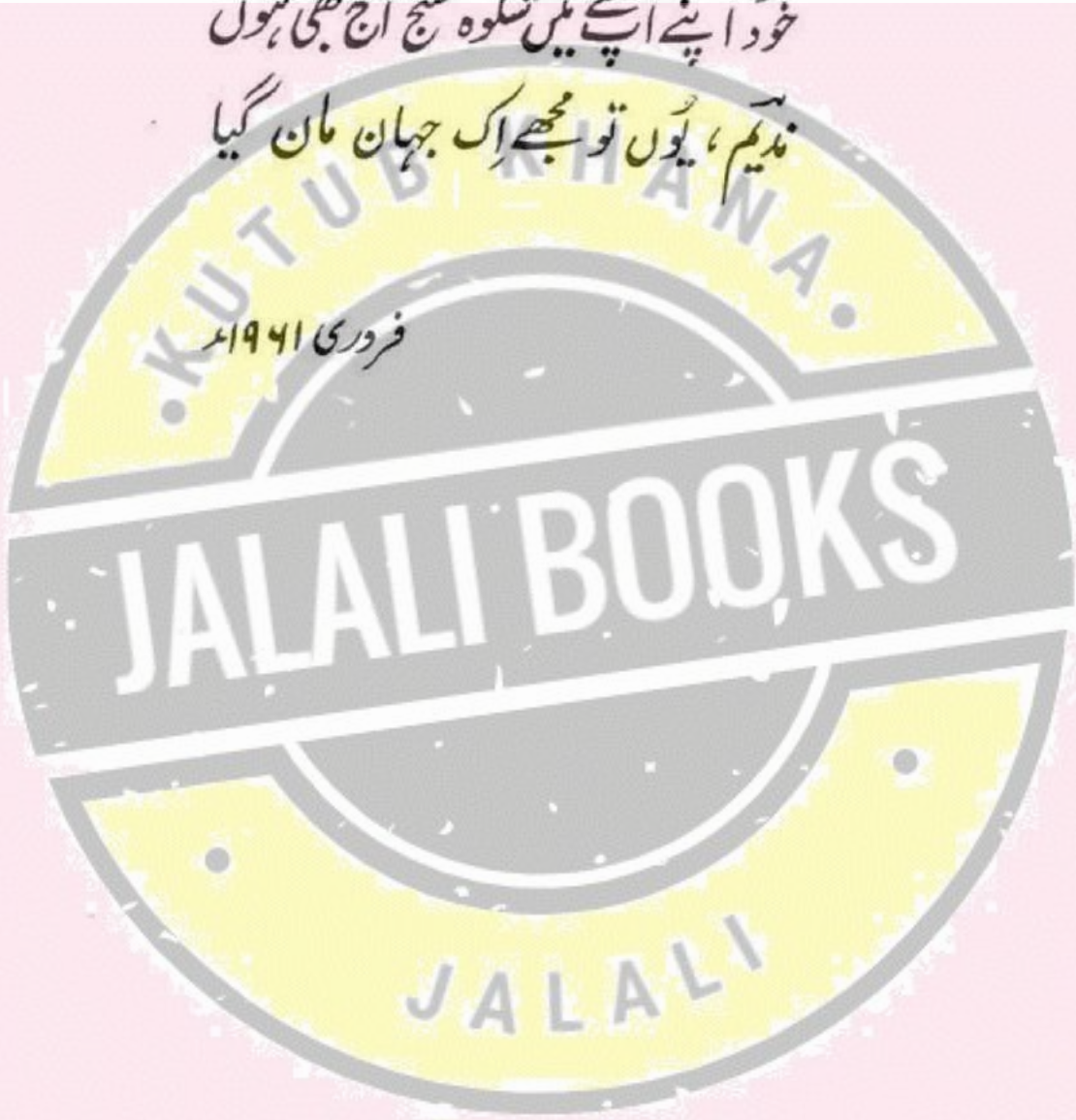
غزل

ہر ذہن میں منزل کا تصوّر تھا ہوائی
اپنے قدم اُٹھے تو زمانے کی بن آئی

اندازِ نظر کی ہے سب اعجاز نمائی
رنگت ہے سُلگتے ہُوئے صحرا کی حنائی

آوارہ نگاہی بھی اِک اندازِ وفا ہے
ہر حُسن، ترے حُسن کی ہے جلوہ نمائی

شب کو تو ذرا مشعلِ رُخسار کی لَو دے
دن کو تو مرے سائے نے کی راہ نمائی

طے کر بھی سکوں گا کہ نہیں، کون بتائے
پھیلا ہُوا تجھ تک ہے مرا دشتِ جُدائی

ہر نقشِ قدم، گلشنِ فردا کی کلی ہے
صحراؤں کی رونق ہے مری آبلہ پائی

سچ ہے کہ جہاں تابعِ آئینِ خدا ہے
ویرانۂ دل پر ہے مگر میری خُدائی

دامن مرا تر ہے، مگر اے داورِ محشر
اِک دردِ محبّت ہے مری نیک کمائی

اشکوں سے جو بچ نکلی ہے، شعروں میں ڈھلی ہے
جو بات مری خلوتِ دل میں نہ سمائی

فروری ۱۹۶۱ء

غزل

اپنی آنکھوں میں بسالی تری حیرت مَیں نے
کہ پلک تک بھی نہ جھپکی دمِ رخصت مَیں نے

فن کے پردے میں بھی کی تیری عبادت مَیں نے
اپنے اشعار کو دی تیری صباحت مَیں نے

سچ کہوں، اپنی محبّت پہ ندامت سی ہُوئی
جب بھی دیکھی تری اُتری ہُوئی صُورت مَیں نے

چمک اُٹھتا ہے سرِ شام تری یاد کا چاند
کبھی تاریک نہ دیکھی شبِ فرقت مَیں نے

آج بھی ہے مرے غم پر وہی ماضی کی بہار
توڑ دی گردشِ ایّام کی ہیبت مَیں نے

انتہا عشق کی یہ ہے کہ ترے ظلم میں بھی
کی ہے محسوس ترے پیار کی شدّت مَیں نے

ایک شہپارۂ فن کی طرح محفوظ رکھا
اپنے دل میں ترا اندازِ جراحت مَیں نے

میرا دشمن بھی مرے پیار کا حق دار بنا
تجھ سے کی ہے کہ زمانے سے محبّت مَیں نے

اِک دیا ہے جو نہ بُجھتا ہے نہ پاس آتا ہے
عمر کاٹی کہ گزاری شبِ غربت مَیں نے

آج انا الانس کا مفہوم انا الحق ہے ندیمؔ
دار پر کھنچ کے بھی بدلی نہیں نیّت مَیں نے

جنوری ۱۹۶۱ء

غزل
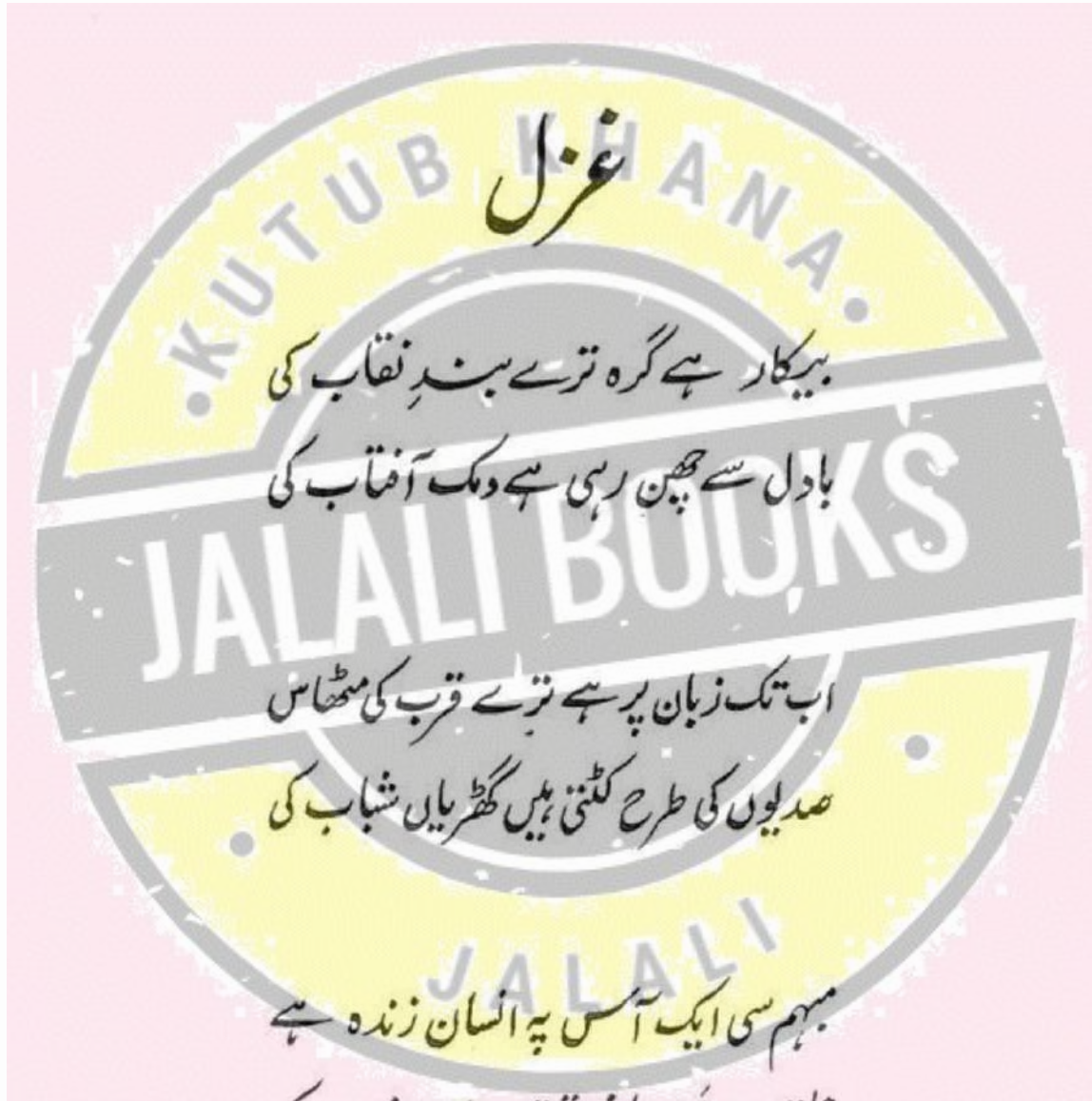
بیکار ہے گرہ ترے بندِ نقاب کی
بادل سے چھن رہی ہے دمک آفتاب کی

اب تک زبان پر ہے ترے قرب کی مٹھاس
صدیوں کی طرح کٹتی ہیں گھڑیاں شباب کی

مبہم سی ایک آس پہ انسان زندہ ہے
جلتی ہے لَو، چراغِ حقیقت میں، خواب کی

مجھ کو تو حسن و خیر کے پھولوں کی ہے تلاش
لڑھکا رہا ہے شیخ چٹانیں ثواب کی

فصلِ بہار میں بھی وہ تھی ہیبتِ خزاں
دستِ دعا بنی رہی پتّی گلاب کی

دامانِ شب میں دن کے اُجالے کی بھیک ہے
تاروں میں بٹ گئی ہے کرن آفتاب کی

اِک پل کی زندگی ابدیّت سے کم نہیں
کس شان سے چلی ہے سواری حباب کی

ٹھہرا ہوں اس خطا پہ سزاوار دار کا
سب نعمتوں سے مَیں نے حیات انتخاب کی

ہر ہر قدم پہ طُور بُلاتے رہے، مگر
فرصت کسے ندیمؔ سوال و جواب کی

جنوری ۱۹۶۱ء

غزل

انقلاب اپنا کام کر کے رہا
بادلوں میں بھی چاند اُبھر کے رہا

ہے تری جستجو گواہ، کہ تُو
عُمر بھر سامنے نظر کے رہا

رات بھاری سہی، کٹے گی ضرور
دن کڑا تھا مگر گزر کے رہا
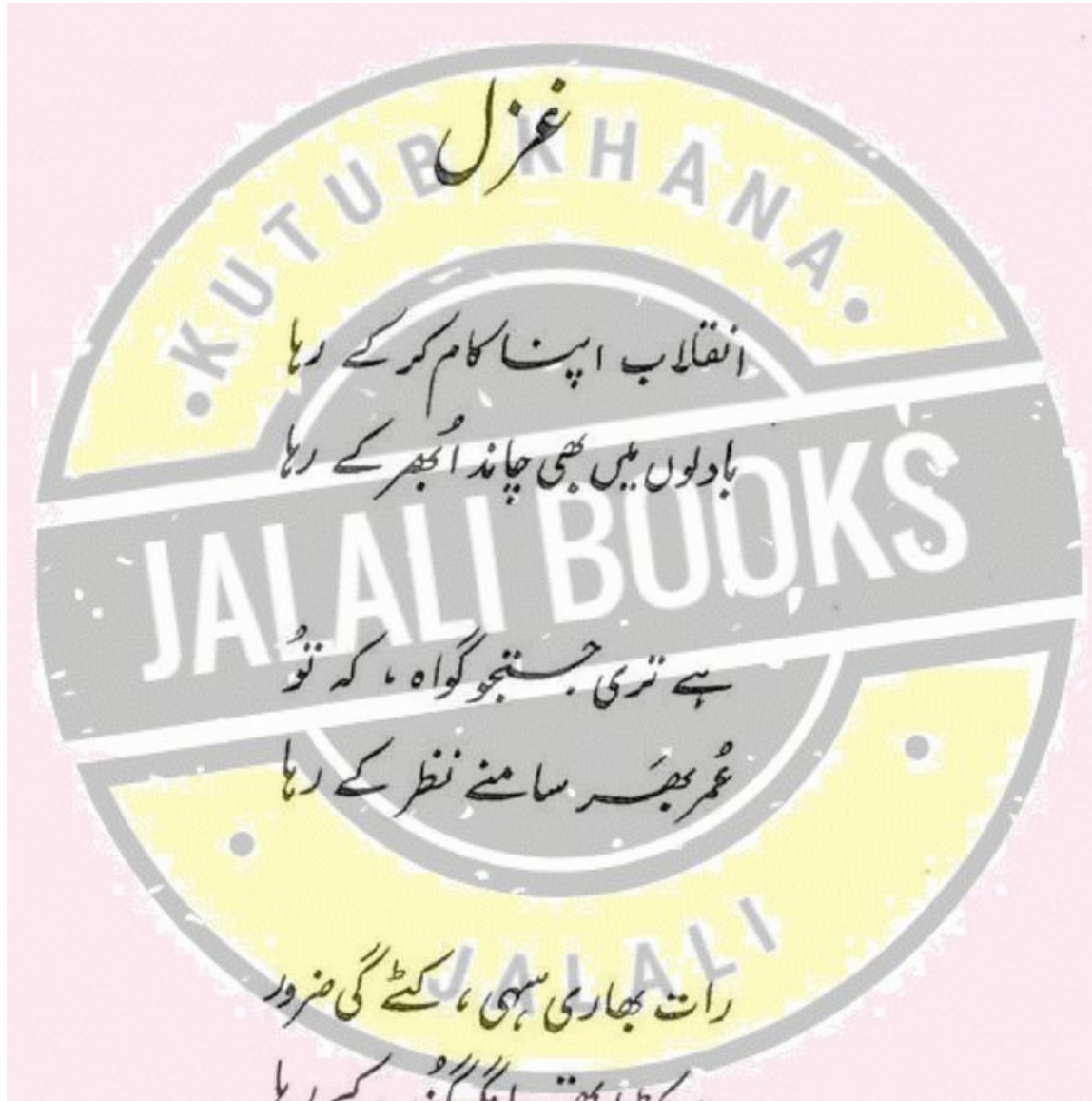
گُل کِھلے آہنی حصاروں میں
یہ تعطّر مگر بکھر کے رہا

عرش کی خلوتوں سے گھبرا کر
آدمی فرش پر اُتر کے رہا

ہم چھپاتے پھرے دلوں میں چمن
وقت پھولوں پہ پاؤں دھر کے رہا

موتیوں سے کہ ریگِ ساحل سے
اپنا دامن ندیمؔ بھر کے رہا

دسمبر ۱۹۶۰ء

غزل

گُل ترا رنگ چُرا لائے ہیں گلزاروں میں
جل رہا ہُوں بھری برسات کی بوچھاروں میں

مُجھ سے کترا کے نِکل جا، مگر اے جانِ حیا
دل کی لَو دیکھ رہا ہوں ترے رخساروں میں

حُسن بیگانۂ احساسِ جمال اچھا ہے
غنچے کِھلتے ہیں تو بِک جاتے ہیں بازاروں میں

ذکر کرتے ہیں ترا مجھُ سے، بعنوانِ جفا
چارہ گر پھُول پرو لائے ہیں تلواروں میں

زخم چھُپ سکتے ہیں، لیکن مجھے فن کی سوگند
غم کی دولت بھی ہے شامل مرے شہکاروں میں

منتظر ہیں کہ کوئی تیشۂ تخلیق اُٹھائے
کتنے اصنام ابھی دفن ہیں کہساروں میں

مُجھ کو نفرت سے نہیں، پیار سے مصلُوب کرو
مَیں تو شامل ہوں محبّت کے گنہگاروں میں

نومبر ۱۹۶۰ء

غزل
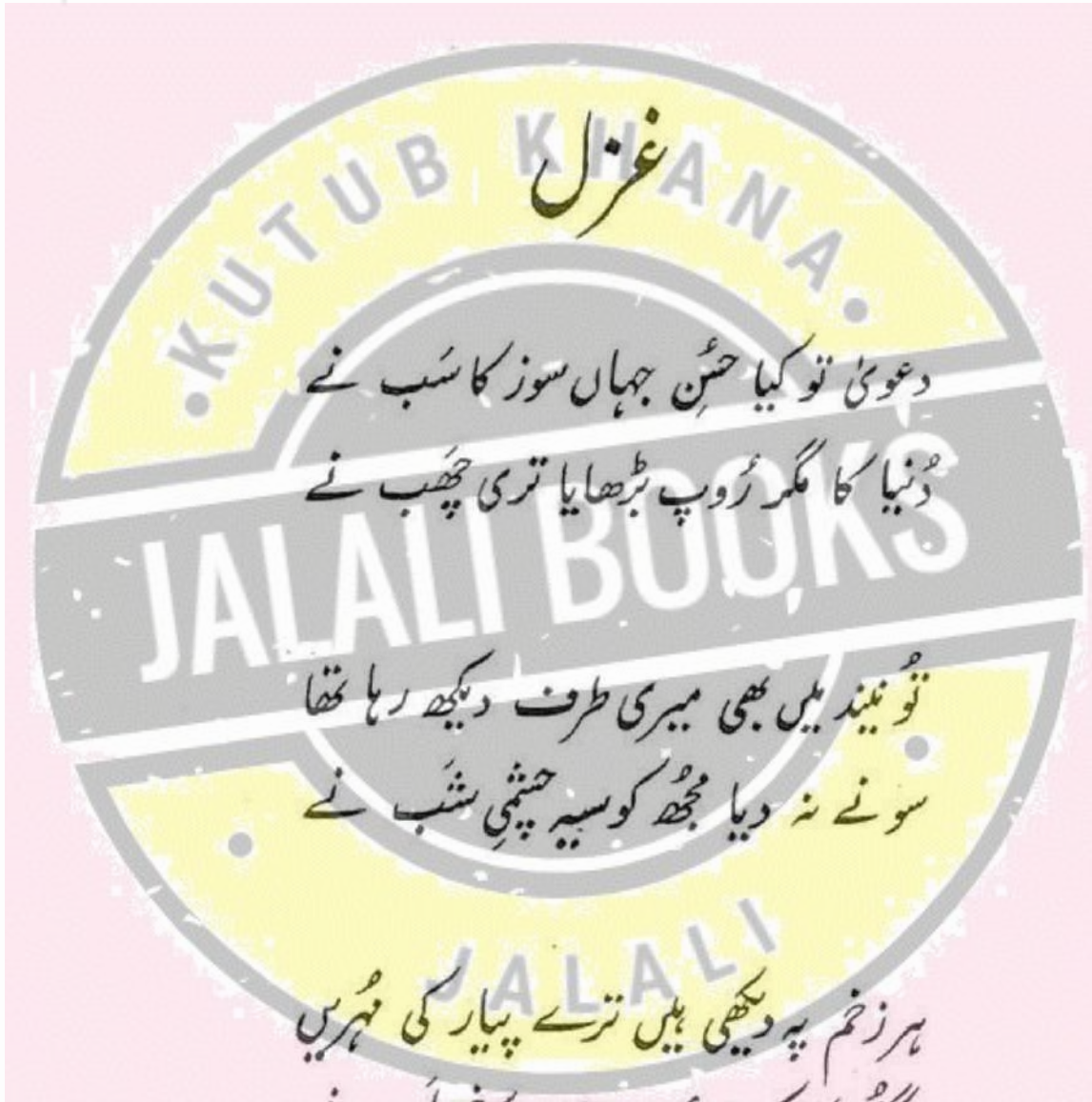
دعویٰ تو کیا حسنِ جہاں سوز کا سب نے
دُنیا کا مگر رُوپ بڑھایا تری چھب نے

تُو نیند میں بھی میری طرف دیکھ رہا تھا
سونے نہ دیا مجھ کو سیہ چشمیِ شب نے

ہر زخم پہ دیکھی ہیں ترے پیار کی مُہریں
یہ گُل بھی کھلائے ہیں تری سُرخیِ لب نے

خوشبوئے بدن آئی ہے پھر موجِ صبا سے
پھر مجھ کو پکارا ہے ترے شہرِ طرب نے

درکار ہے مجھ کو تو فقط اذنِ تبسّم
پتھّر سے اگر پھُول اُگائے مرے رب نے

وہ حُسن ہے انسان کی معراجِ تصوّر
جس حُسن کو پُوجا ہے مرے شعروادب نے

نومبر ۱۹۶۰ء

غزل
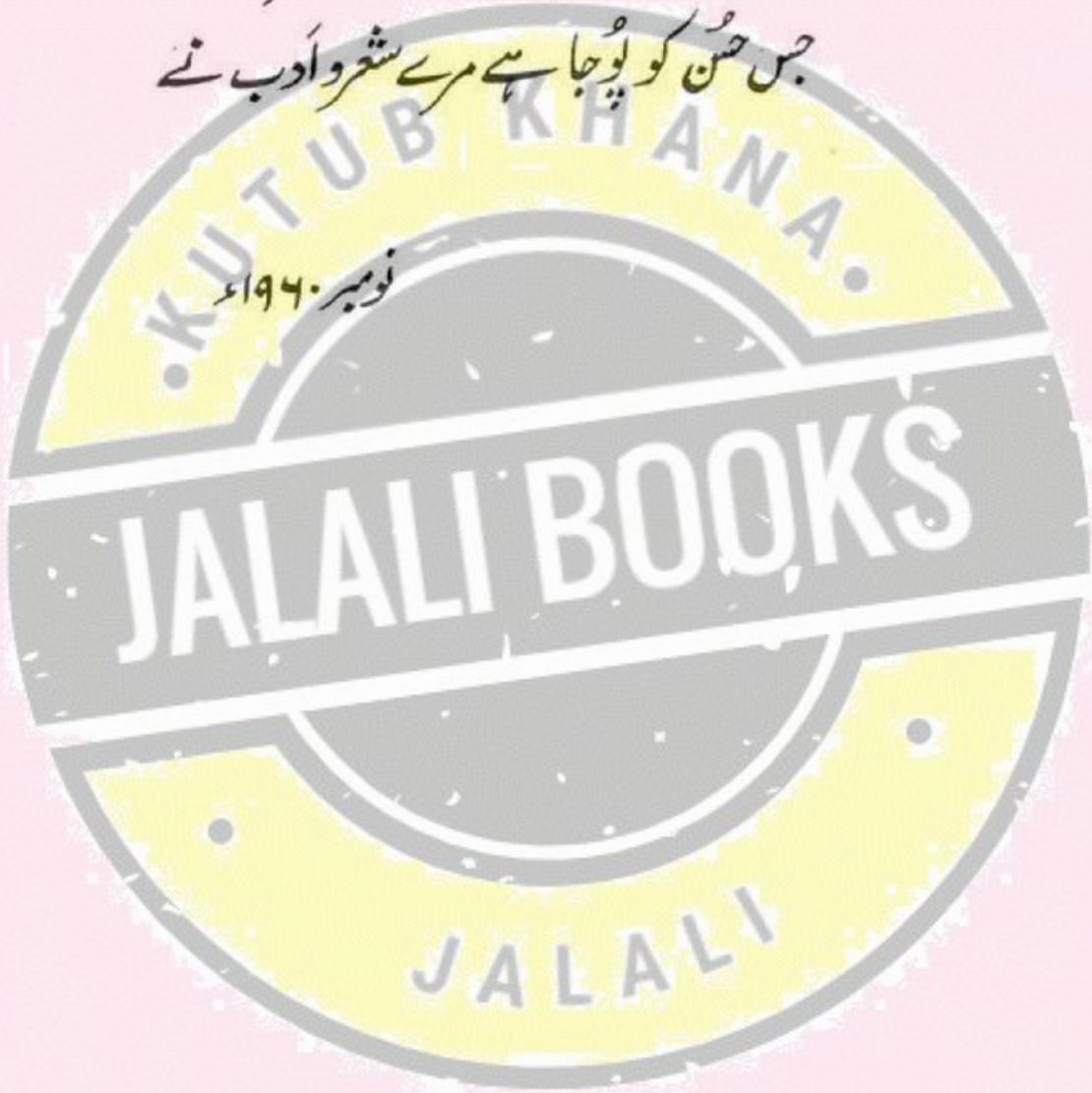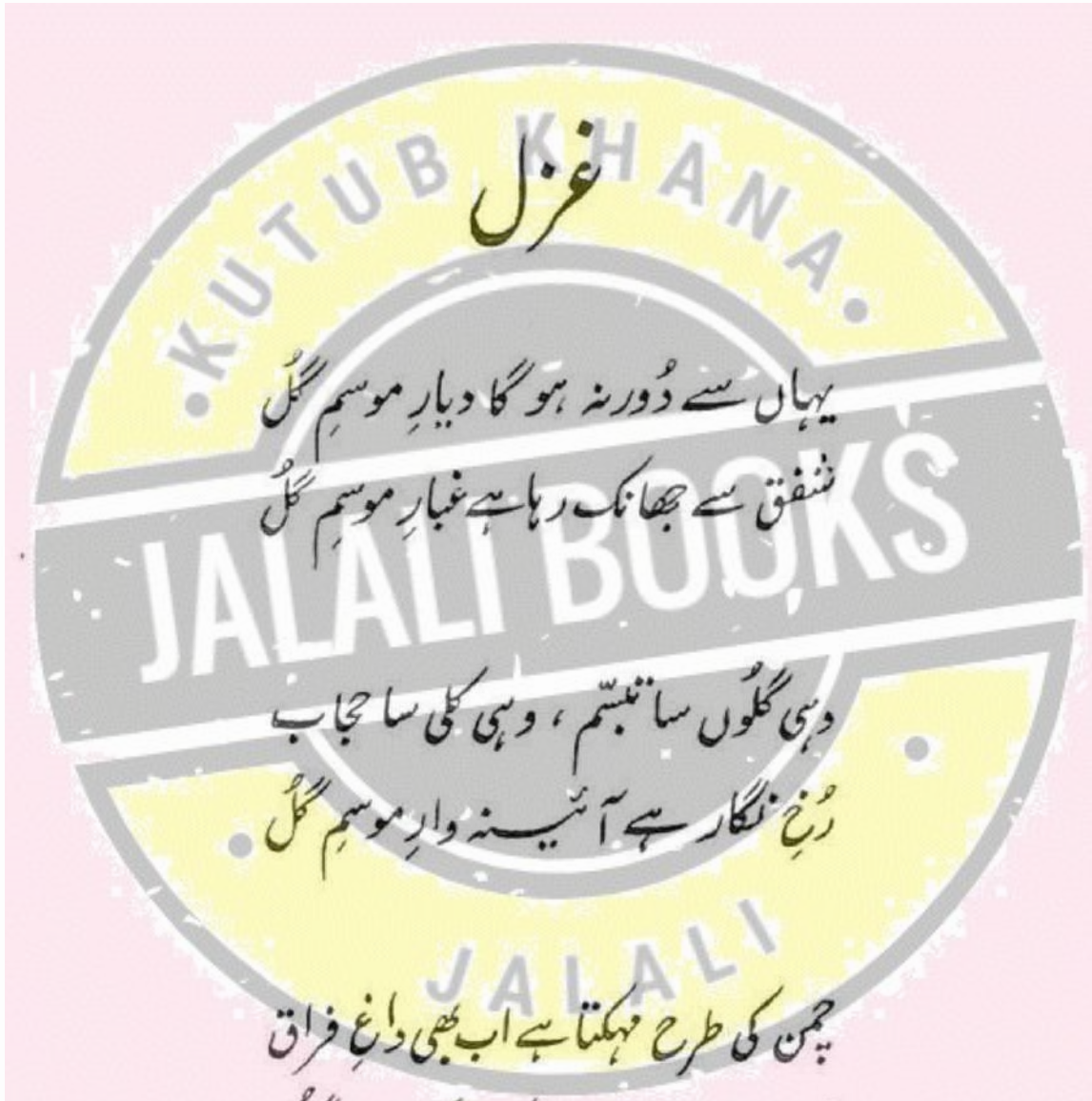
یہاں سے دُور نہ ہو گا دیارِ موسمِ گُل
شفق سے جھانک رہا ہے غبارِ موسمِ گُل

وہی گلُوں سا تبسّم ، وہی کلی سا حجاب
رُخِ نگار ہے آئینہ دارِ موسمِ گُل

چمن کی طرح مہکتا ہے اب بھی داغِ فراق
تمھاری یاد رہی یادگارِ موسمِ گُل

ملا نہ ایک بھی گُل ، ورنہ دیکھ سکتا ہُوں
عذارِ گُل میں رُخِ تابدارِ موسمِ گُل

شرر جو سنگ سے ٹوٹے تو پھول بن کے کھلے
جنوں میں بھی نہ اُٹھا اعتبارِ موسمِ گل

خزاں دلوں میں جڑیں چھوڑنے کی دُھن میں ہے
کہاں گیا مرا پروردگارِ موسمِ گل

اُٹھو، کہ اٹھ کے سجائیں اِک ایک خار پہ پھول
چلو، کہ چل کے بڑھائیں وقارِ موسمِ گل

بنائیے سرِ راہِ بہار، میرا مزار
مری سرشت میں ہے انتظارِ موسمِ گل

ندیمؔ، اپنی بہار آفریں غزل کی قسم
بدل سکیں گے نہ لیل و نہارِ موسمِ گل

نومبر ۱۹۶۰ء

غزل
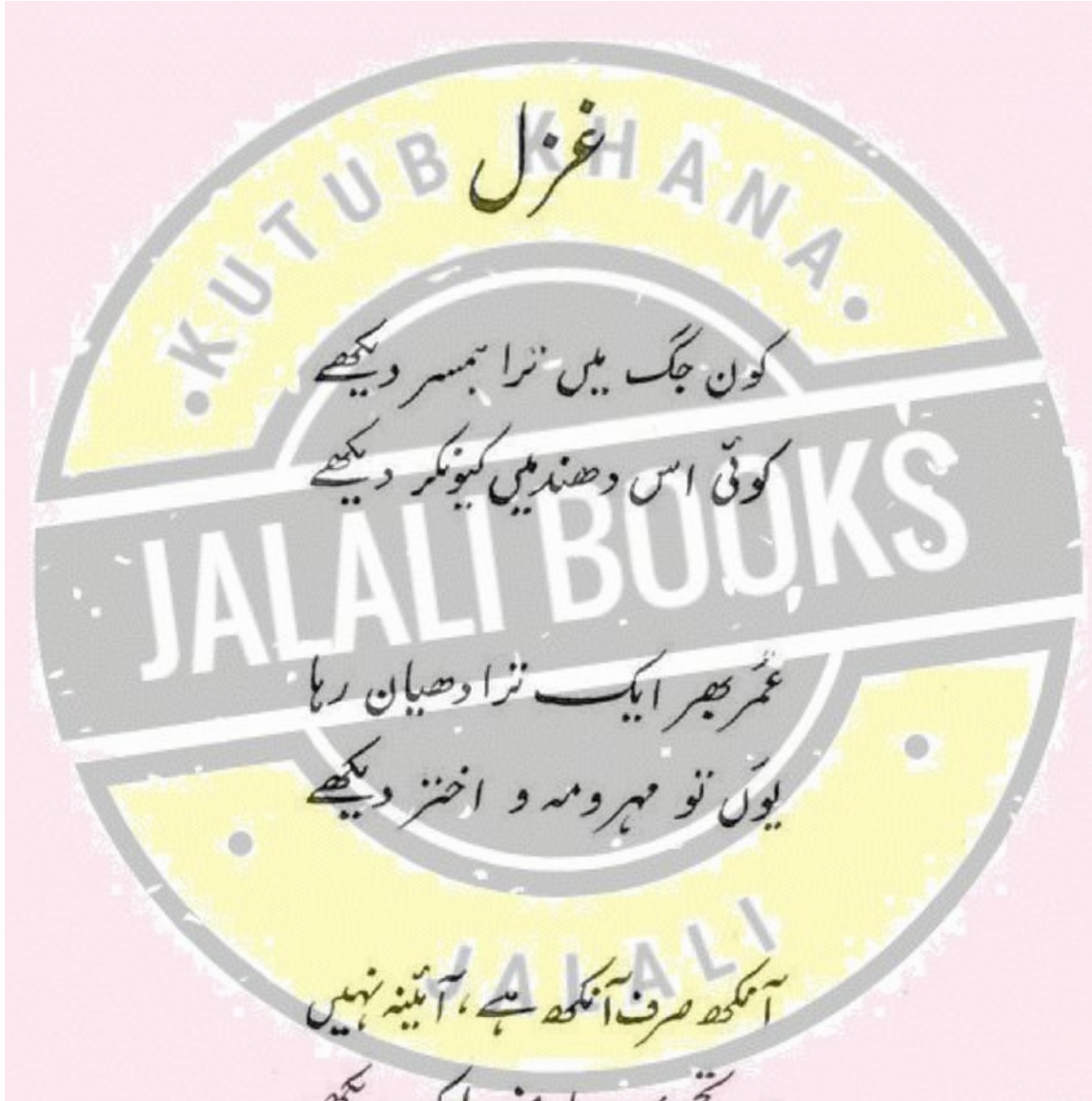
کون جگ میں ترا ہمسر دیکھے
کوئی اس دھند میں کیونکر دیکھے

عمر بھر ایک ترا دھیان رہا
یوں تو مہر و مہ و اختر دیکھے

آنکھ صرف آنکھ ہے، آئینہ نہیں
جو تجھے سامنے پا کر دیکھے

تیرے جاتے ہی یہ محسوس ہُوا
عُمر گزُری تجھے پل بھر دیکھے

دُور ہی دُور سلگنے والے
کاش تو پاس بھی آ کر دیکھے

ہم تو تھے حسن کے تاریخ نگار
ہم نے قیصر نہ سکندر دیکھے

لوگ ماضی کے دُھوئیں میں ڈُوبے
ہم نے گیسوئے معنبر دیکھے

نظر آئے انھیں سبزے میں بھی سانپ
ہم نے صحرا بھی ثمر ور دیکھے

انھیں جسموں سے بُتوں نے جھانکا
ہم نے پتھر میں بھی پیکر دیکھے

انھیں دریاؤں نے پیاسا مارا
ہم نے آنکھوں میں سمندر دیکھے

کون غالبؔ سا سخن ور ہے ندیمؔ
سیکڑوں یوں تو ہنر ور دیکھے

جولائی ۱۹۶۰ء

غزل
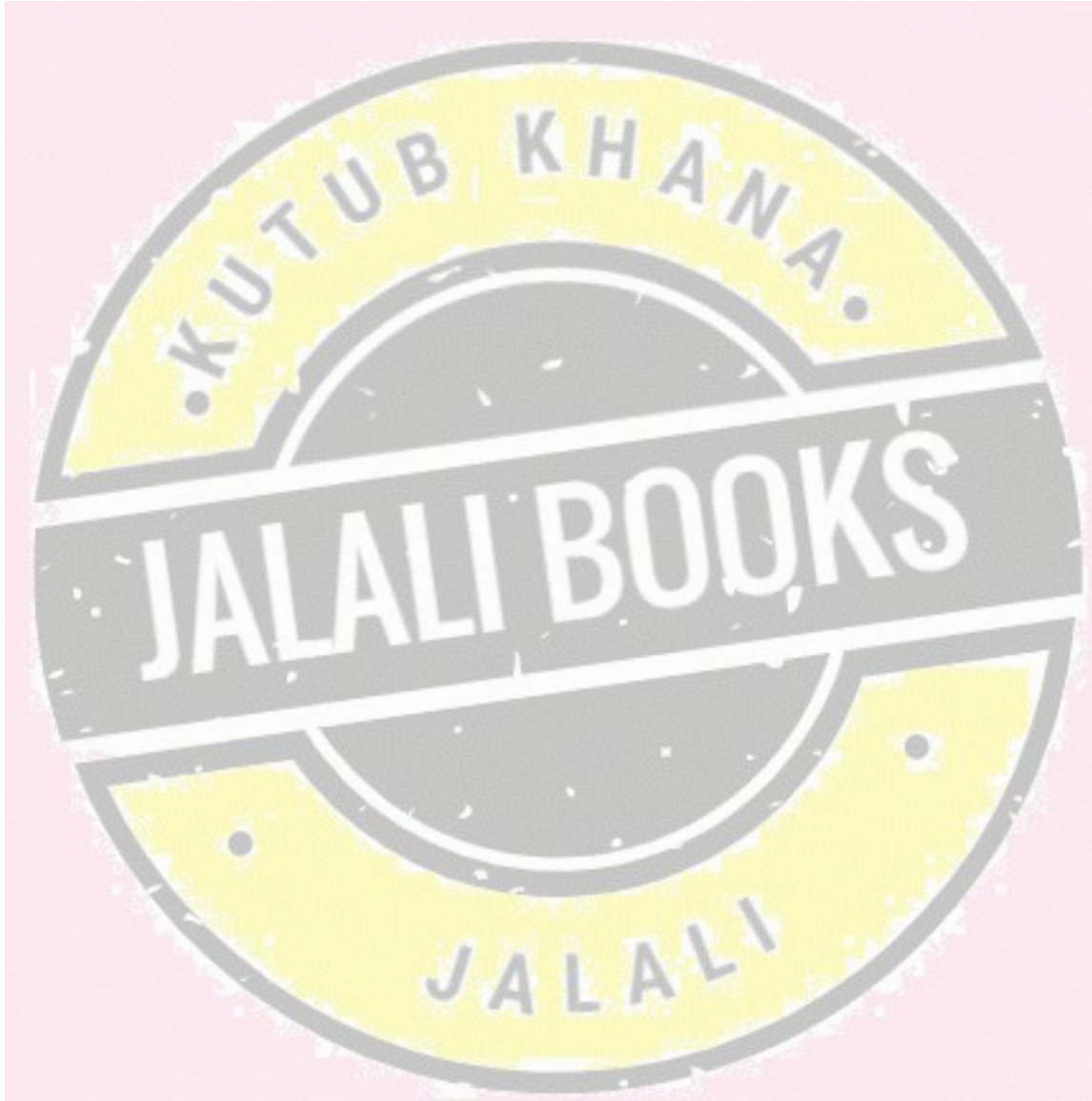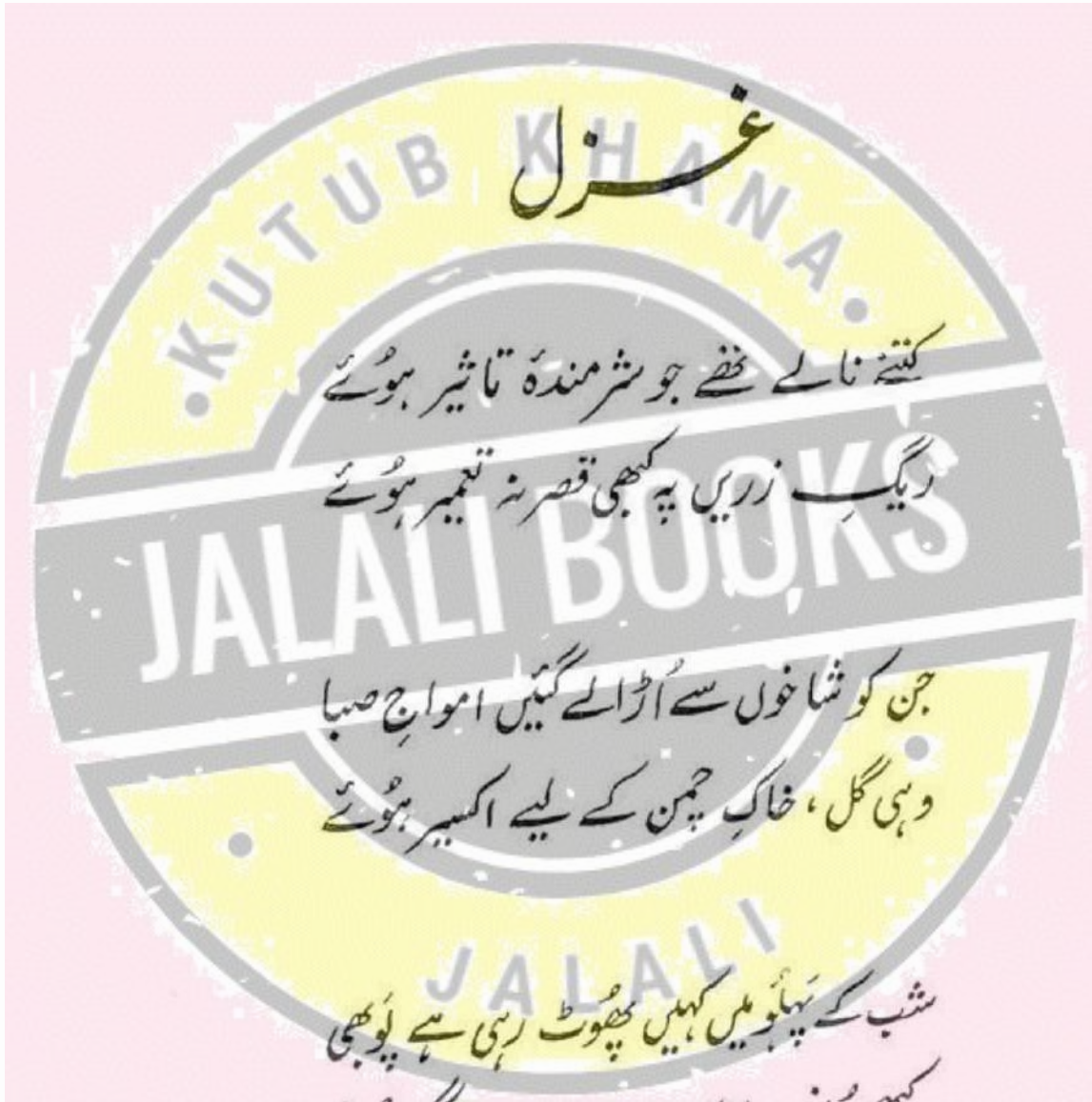
کتنے نالے تھے جو شرمندۂ تاثیر ہوئے
ریگِ زریں پہ کبھی قصر نہ تعمیر ہوئے

جن کو شاخوں سے اُڑا لے گئیں امواجِ صبا
وہی گُل، خاکِ چمن کے لیے اکسیر ہوئے

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی ہے پَو بھی
کبھی دُنیا میں اندھیرے نہ جہانگیر ہوئے

ہم اصُولوں کے حصاروں میں چھپے لاکھ، مگر
اِک نگاہِ غلط انداز سے تسخیر ہوئے

وہی آواز کی قوسیں، وہی تانوں کے خطوط
چند نغمے تھے جو مِل کر تری تصویر ہُوئے

ایک انداز تو ہے بے سروسامانی کا
ہم تری دُھن میں ترے غم سے بغل گیر ہُوئے

ایک اُمیدِ مُلاقاتِ نے مرنے نہ دیا
تیرے پیماں مری سانسوں کے عناں گیر ہُوئے

تجھ سے مِل کر تجھے پا لینے کی حسرت جاگی
کچھ نئے خواب، ترے خواب کی تعبیر ہُوئے

اِک خلا طے ہُوئی ایک اور خلا کی حد پر
اپنے شہپر نہ ہُوئے، حلقۂ زنجیر ہُوئے

ہم نے ہر شعر میں تصویرِ جراحت کھینچی
لوگ وارفتۂ رنگینیٔ تحریر ہُوئے

جون ۱۹۶۰ء

غزل
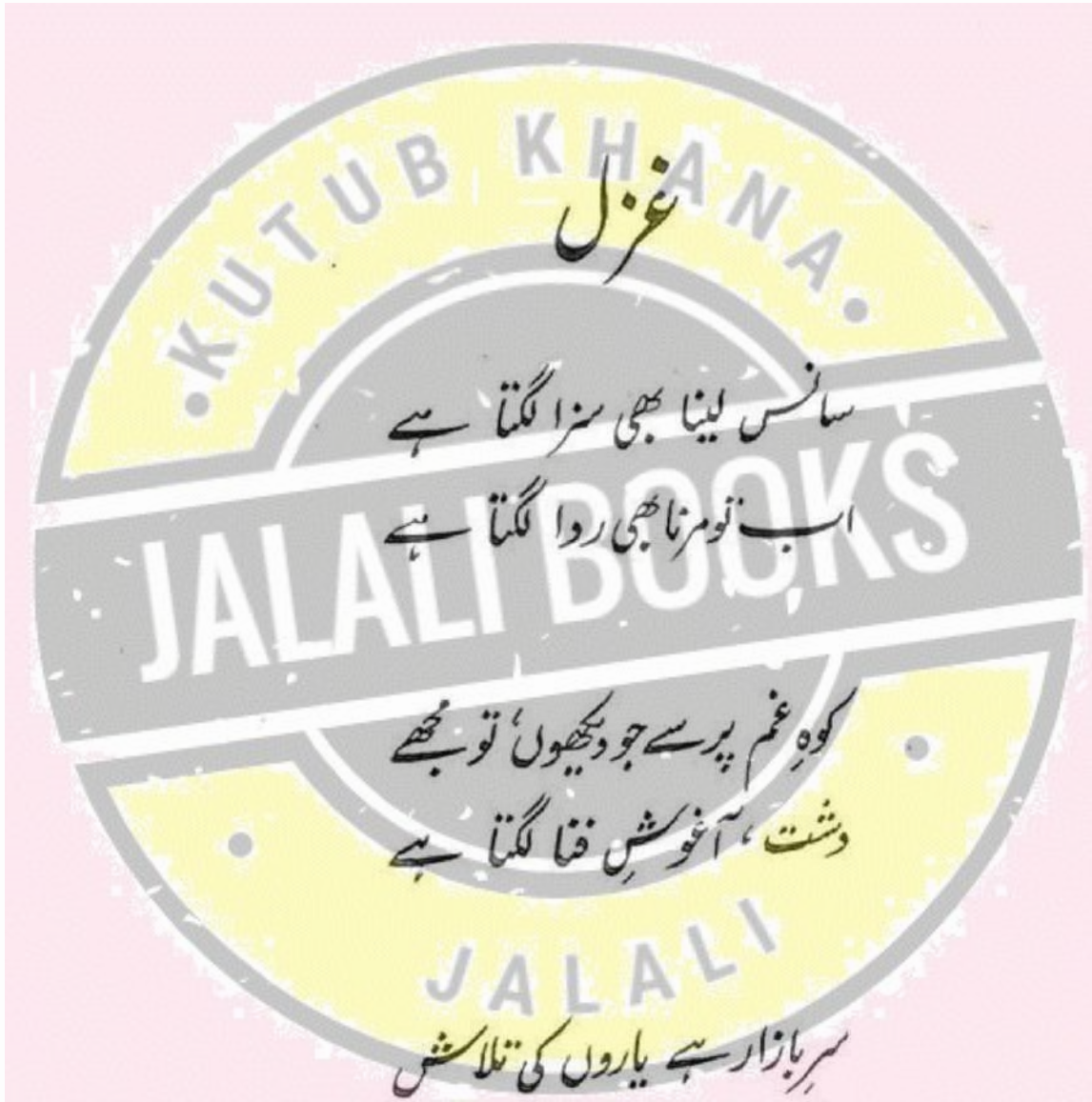
سانس لینا بھی سزا لگتا ہے
اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے

کوہِ غم پر سے جو دیکھوں، تو مجھے
دشت، آغوشِ فنا لگتا ہے

سرِ بازار ہے یاروں کی تلاش
جو گزرتا ہے، خفا لگتا ہے

موسمِ گُل میں سرِ شاخِ گلاب
شعلہ بھڑکے تو بجا لگتا ہے

مُسکراتا ہے جو اِس عالم میں
بخدا، مجھ کو خُدا لگتا ہے

اتنا مانوس ہُوں سنّاٹے سے
کوئی بولے تو بُرا لگتا ہے

اُن سے مِل کر بھی نہ کافور ہُوا
درد یہ سب سے جُدا لگتا ہے

نطق کا ساتھ نہیں دیتا ذہن
شُکر کرتا ہُوں، گِلہ لگتا ہے

اِس قدر تُند ہے رفتارِ حیات
وقت بھی رشتہ بپا لگتا ہے

مئی ۱۹۶۰ء

غزل

نارسائی کی قسم ، اتنا سمجھ میں آیا
حُسن جب ہاتھ نہ آیا تو خُدا کہلایا

سب حجاباتِ نظر، دل کے نہ دکھنے تک تھے
درد چمکا تو اندھیرا بھی نہ رہنے پایا

جانے کیوں اب شبِ ہجراں پہ بھی پیار آتا ہے
تیرا غم میری محبّت کو کہاں لے آیا

میں تری بزم سے اُٹھ کر بھی تری بزم میں ہُوں
میں نے جب خود کو گنوایا تو تجھے اپنایا

رات کا شکر کر اے دوست، کہ دن ہوتے ہی
تیرے پیکر سے اچٹ آئے گا تیرا سایا

ابر کے چاک سے جب، رات، ستارے جھانکے
اے مرے بھُولنے والے، تو بہت یاد آیا

اشک آنکھوں میں جب آئے، چمک اُٹھیں صدیاں
یوں، کہ جس دَور کو دیکھا اسے گریاں پایا

جب بھی دیکھوں کوئی شہ پارۂ فن، سوچتا ہوں
کتنے لوگوں نے مرا قصّۂ غم دُہرایا

خشک شاخوں پہ نمو کے یہ نگینے کیا ہیں
زندگی ہے اگر اک پیڑ کی ڈھلتی چھایا

بیچ دوں کیوں اسے اِک نانِ جویں کے بدلے
مَیں نے جس دل کے لیے ایک جہاں ٹھکرایا

اس توقع پہ کہ شاید کبھی انساں سنبھلے
ہر نئے ظلم نے جینے پہ مجھے اُکسایا

اپریل ۱۹۶۰ء

غزل

یوں تو اس جلوہ گہِ حسن میں کیا کیا دیکھا
جب تجھے دیکھ چکے، کوئی نہ تجھ سا دیکھا

جب تری دھن میں کہیں لالۂ صحرا دیکھا
ہم یہ سمجھے کہ ترا نقشِ کفِ پا دیکھا
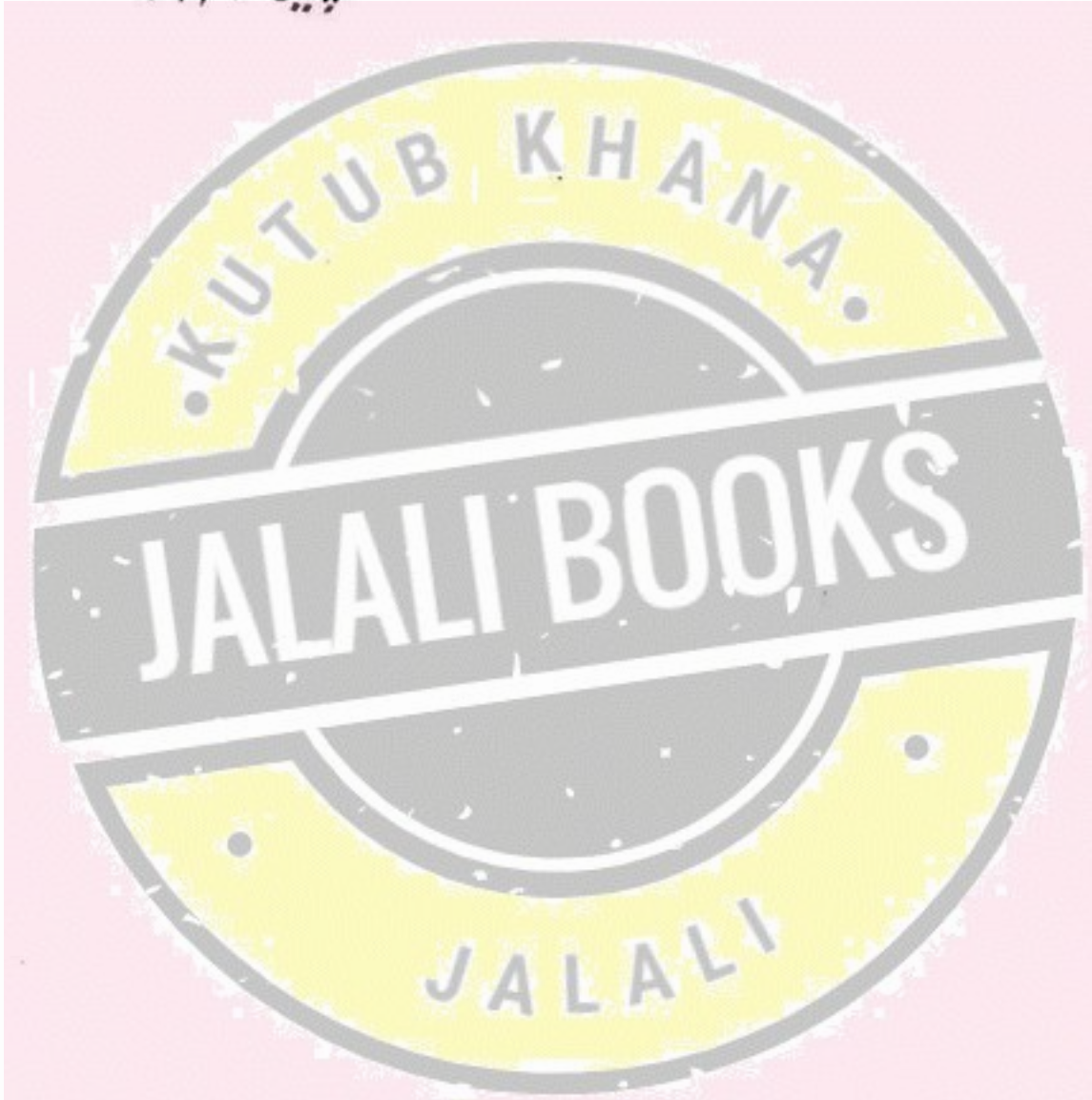
جب بھی سوچا کہ ترے شہر کے ابھرے ہیں نقوش
اِک بگولا سا رواں بر سرِ صحرا دیکھا

تارے ٹوٹے تو فضا میں تری آہٹ گونجی
چاند نکلا تو ترا چہرۂ زیبا دیکھا

شہرِ اغیار سہی ، اتنی خوشی کیا کم ہے
ہم نے دیکھا تجھے ، اور انجمن آراء دیکھا

ہم کو ٹھکرا کے کچھ ایسے ترے تیور بدلے
جب سرِ بزم بھی دیکھا تجھے ، تنہا دیکھا

ہم تو سمجھے تھے ، قیامت ہے فراقِ محبوب
تجھ سے مل کر بھی مگر حشر ہی برپا دیکھا

صُبح جب دُھوپ کے چشمے سے نہا کر نکلی
ہم نے ، آئینہ بہ دل ، تیرا سراپا دیکھا

بجلیاں اب تو ترے ابرِ کرم کی برسیں
عُمر بھر اپنے سُلگنے کا تماشا دیکھا

ہم جو بھٹکے بھی تو کس شانِ وفا سے بھٹکے
ہم نے ہر لغزشِ پا میں ترا ایما دیکھا

ہم، بایں تیرہ نصیبی، نہ بنے تیرہ نظر
ہم نے ہر رات کی چتون میں ستارا دیکھا

تیری قدرت کی سیاست نہ سمجھ میں آئی
حرم و دَیر کو ہر دَور میں یک جا دیکھا

آنکھ کھولی، تو جہاں کانِ جواہر تھا ندیمؔ
ہاتھ پھیلائے تو ہر چیز کو عنقا دیکھا

دسمبر ۱۹۵۹ء

غزل

شانِ عطا کو، تیری عطا کی خبر نہ ہو
یُوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو

چُپ ہُوں کہ چُپ کی داد پہ ایمان ہے مرا
مانگوں دُعا جو میرے خدا کو خبر نہ ہو
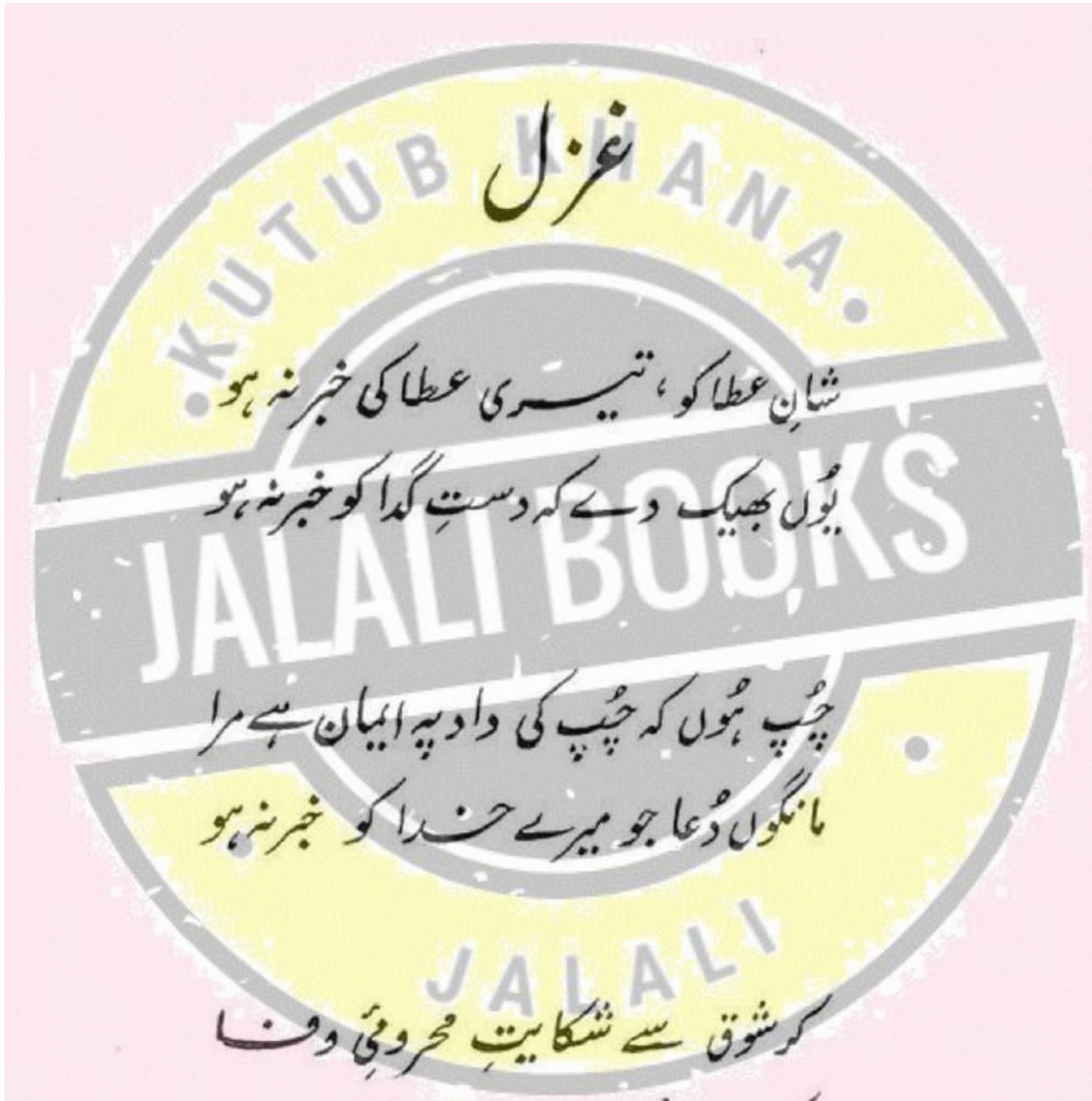
کر شوق سے شکایتِ محرومیٔ وفا
لیکن مرے غرورِ وفا کو خبر نہ ہو

اِک روز اس طرح بھی مرے بازوؤں میں آ
میرے ادب کو، تیری حیا کو خبر نہ ہو

ایسی بھی کیا بلندیِ معیارِ فصلِ گُل
یُوں گُل کِھلیں کہ موجِ صبا کو خبر نہ ہو

آزادیِ خطا بھی تو ہے آدمی کی شان
بھٹکوں تو میرے راہنما کو خبر نہ ہو

نذرانۂ حیات سلیقے سے کر قبول
اے موت، میرے ذوقِ بقا کو خبر نہ ہو

نومبر ۱۹۵۹ء

غزل
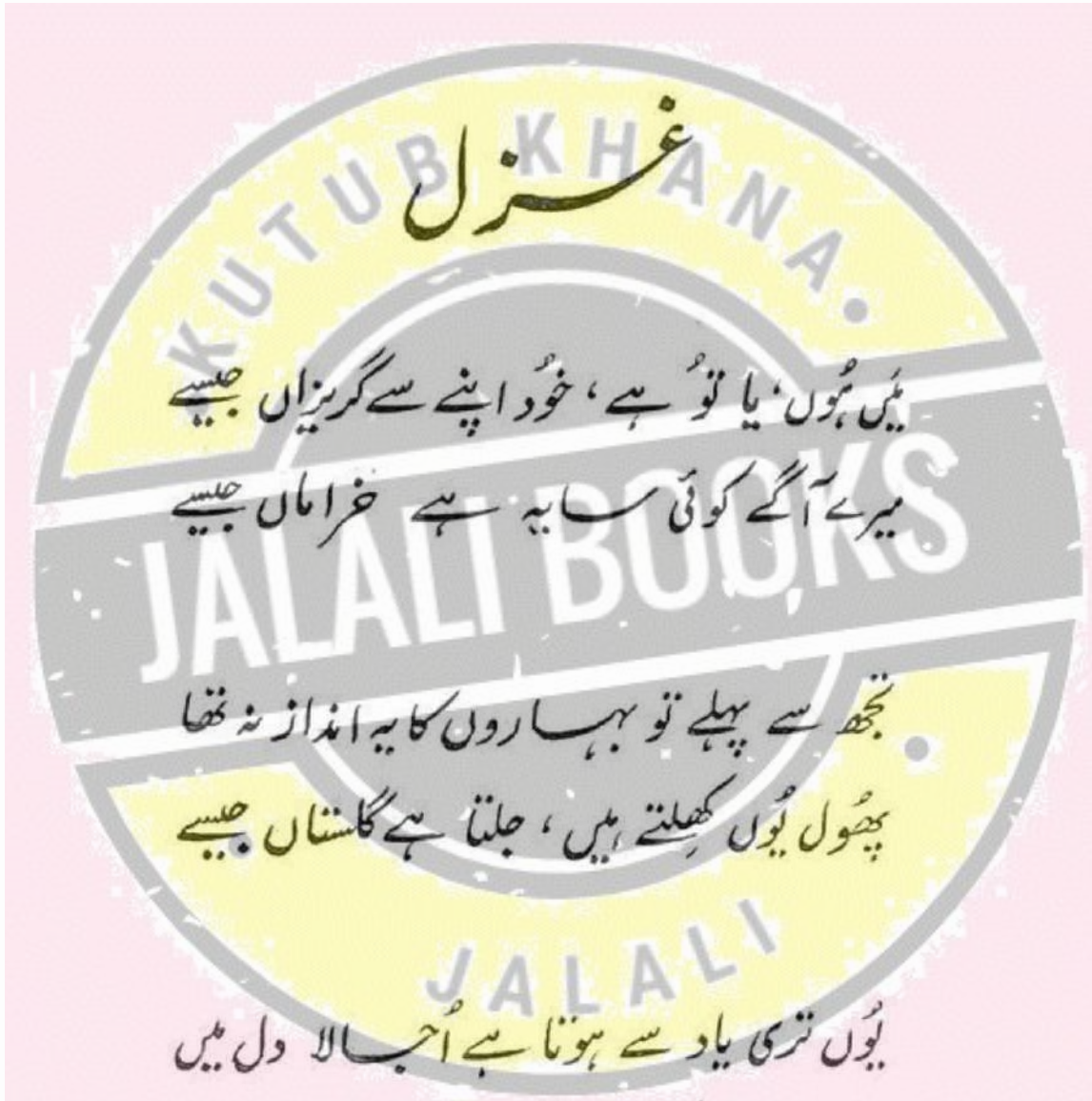
مَیں ہُوں، یا تُو ہے، خُود اپنے سے گریزاں جیسے
میرے آگے کوئی سایہ ہے خراماں جیسے

تجھ سے پہلے تو بہاروں کا یہ انداز نہ تھا
پھُول یُوں کھِلتے ہیں، جلتا ہے گلستاں جیسے

یُوں تری یاد سے ہوتا ہے اُجالا دل میں
چاندنی میں چمک اُٹھتا ہے بیاباں جیسے

دل میں روشن ہیں ابھی تک ترے وعدوں کے چراغ
ٹُوٹتی رات کے تارے ہوں فروزاں جیسے

تجھے پانے کی تمنّا، تجھے کھونے کا یقیں
تیرے گیسو مرے ماحول میں غلطاں جیسے

وقت بدلا، یہ نہ بدلا مرا معیارِ وفا
آندھیوں میں سرِ کہسار چراغاں جیسے

اشک آنکھوں میں چمکتے ہیں تبسّم بن کر
آ گیا ہاتھ ترا گوشۂ داماں جیسے

تجھ سے مل کر بھی تمنّا ہے کہ تجھ سے ملتا
پیار کے بعد بھی لب رہتے ہیں لرزاں جیسے

میرے اشعار میں یوں دفن ہیں اسرار ترے
پردۂ ساز میں آواز ہو پنہاں جیسے

بھری دُنیا میں نظر آتا ہوں تنہا تنہا
مرغزاروں میں کوئی قریۂ ویراں جیسے

غمِ جاناں، غمِ دوراں کی طرف یُوں آیا
جانبِ شہر چلے دُخترِ دہقاں جیسے

عصرِ حاضر کو سُناتا ہُوں اِس انداز میں شعر
موسمِ گُل ہو مزاروں پہ گُل افشاں جیسے

زخم بھرتا ہے زمانہ، مگر اس طرح ندیمؔ
سی رہا ہو کوئی پھُولوں کے گریباں جیسے

جولائی ۱۹۵۹ء
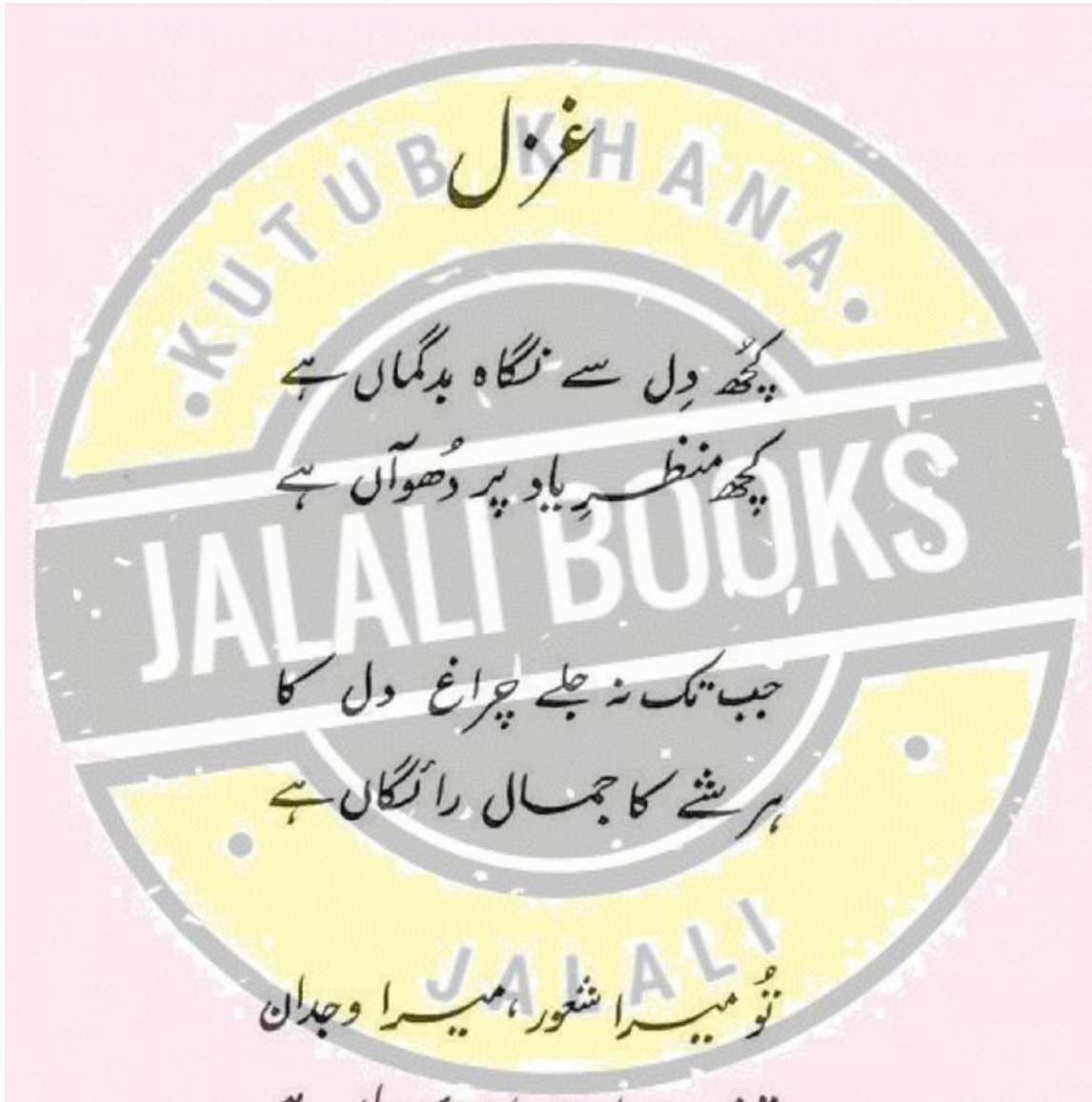
غزل

کچھ دِل سے نگاہ بدگماں ہے
کچھ منظرِ یاد پر دُھواں ہے

جب تک نہ جلے چراغ دل کا
ہر شے کا جمال رائگاں ہے

تُو میرا شعور، میرا وجدان
تو میرا وجود، میری جاں ہے

تُو اتنا قریب ہے، کہ تجھ سے
مَیں پُوچھ رہا ہوں، تُو کہاں ہے

شاہد ہے مری وفا شعاری
انسان بلا کا سخت جاں ہے

ٹوٹی ہُوئی شاخ ہو کہ دل ہو
ہر زخم، بہار کا نشاں ہے

اِک جست کا فاصلہ ہے شر تک
لیکن ترا پیار درمیاں ہے

مَیں عشق ہُوں اور جاوداں ہُوں
تُو حُسن ہے اور بے کراں ہے

تُو ہو کہ ندیم ہو کہ یزداں
جو کچھ بھی ہے، زیرِ آسماں ہے

جون ۱۹۵۹ء

غزل

تیری محفل بھی مداوا نہیں تنہائی کا
کِتنا چرچا تھا تری انجمن آرائی کا

داغِ دل نقش ہے اِک لالۂ صحرائی کا
یہ اثاثہ ہے مری بادیہ پیمائی کا

جب بھی دیکھا ہے تجھے، عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہُوا تیری شناسائی کا

وہ ترے جسم کی قوسیں ہوں کہ محرابِ حرم
ہر حقیقت میں ملا خم تری انگڑائی کا

افقِ ذہن پہ چمکا ترا پیمانِ وصال
چاند نکلا ہے مرے عالمِ تنہائی کا

بھری دُنیا میں فقط مجھ سے نگاہیں نہ چُرا
عشق پر بس نہ چلے گا تری دانائی کا

ہر نئی بزم تری یاد کا ماحول بنی
مَیں نے یہ رنگ بھی دیکھا تری یکتائی کا

نالہ آتا ہے جو لب پر تو غزل بنتا ہے
میرے فن پر بھی ہے پَرتَو تری رعنائی کا

جنوری ۱۹۵۹ء
(جیل میں)

غزل
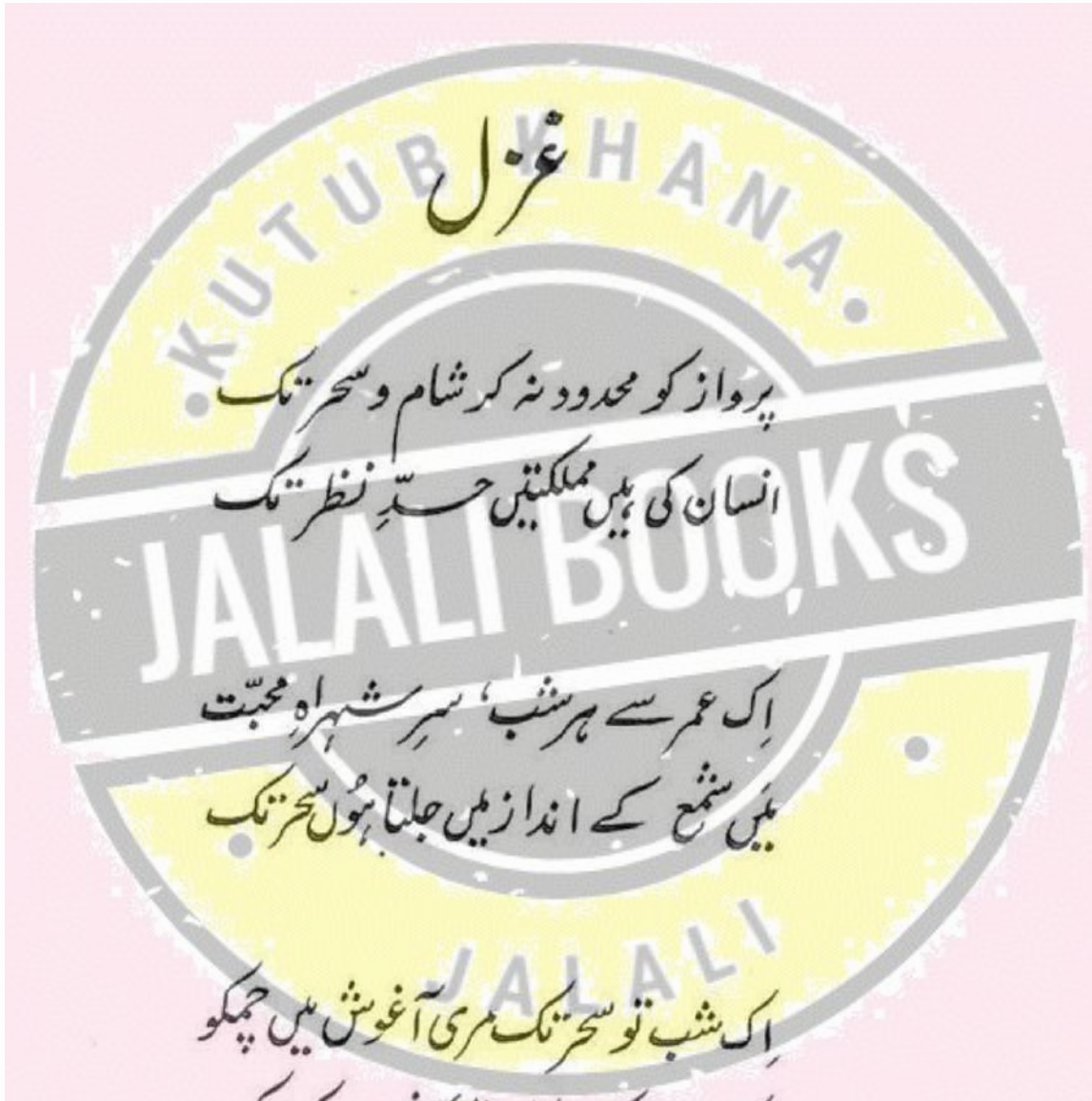
پرواز کو محدود نہ کر شام و سحر تک
انسان کی ہیں مملکتیں حدِّ نظر تک

اِک عمر سے ہر شب، سرِ شہراہِ محبّت
مَیں شمع کے انداز میں جلتا ہوں سحر تک

اِک شب تو سحر تک مری آغوش میں چمکو
اِک رات کی زلفیں تو پہنچنے دو کمر تک

لبریزِ جمال ایک کا دِل، ایک کا پہلو
اتنا سا فقط فاصلہ ہے خیر سے شر تک

انسان نے تخلیق سے اب تک جو کیے طے
وُہ مرحلے گزرے ہیں تری راہگزر تک

اِک بار بگڑ کر جو تری بزم سے اُٹھوں
پھر آکے ترے پاس نہ لُوں اپنی خبر تک

پندارِ محبت کے وہی لوگ امیں ہیں
پہنچے غمِ جاناں سے جو غمہائے دگر تک

آدم کی سُلگتی ہُوئی تاریخ رقم ہے
جبریل کے شہپر سے مرے دامنِ تر تک

اُبھرو بھی ندیمؔ اپنی شکستوں کے کھنڈر سے
ٹُوٹے تو بلندی کو لپکتا ہے شرر تک

جنوری ۱۹۵۹ء
(جیل میں)

غزل

دامن کو نہ تار تار کر لے!
اِس رُت کو سدا بہار کر لے

حالات سے پنجہ آزما ہو
حالات کو سازگار کر لے

اے لذّتِ زندگی کے مُنکر
اِک بار کسی سے پیار کر لے
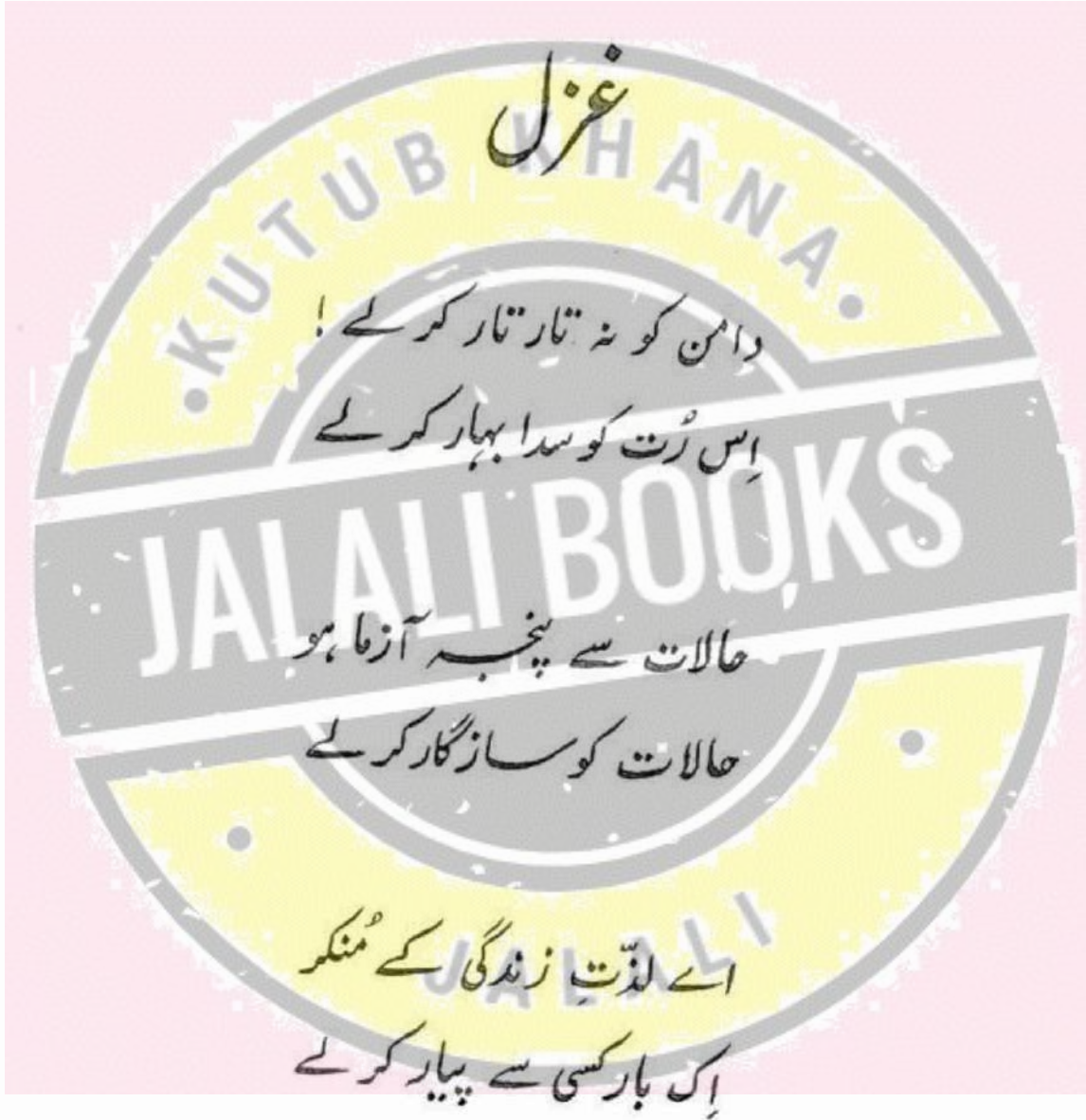
غمّاز ہے حُسن آپ اپنا
جو رنگ بھی اختیار کر لے

زنداں پہ گمانِ فرشِ گُل ہے
جو چاہے مزاجِ یار کر لے

اب تو تری آبرو ہے مُجھ سے
اب تو مرا اعتبار کر لے

جب تک میں ترا جمال دیکھوں
تو زخم مرے شمار کر لے

یا حُسن کو بخشش بے کناری
یا عِشق کو ہمکنار کر لے

برسوں سے تری طرف رواں ہُوں
ہمّت ہے تو انتظار کر لے

جنوری ۱۹۵۹ء
(جیل میں)

غزل
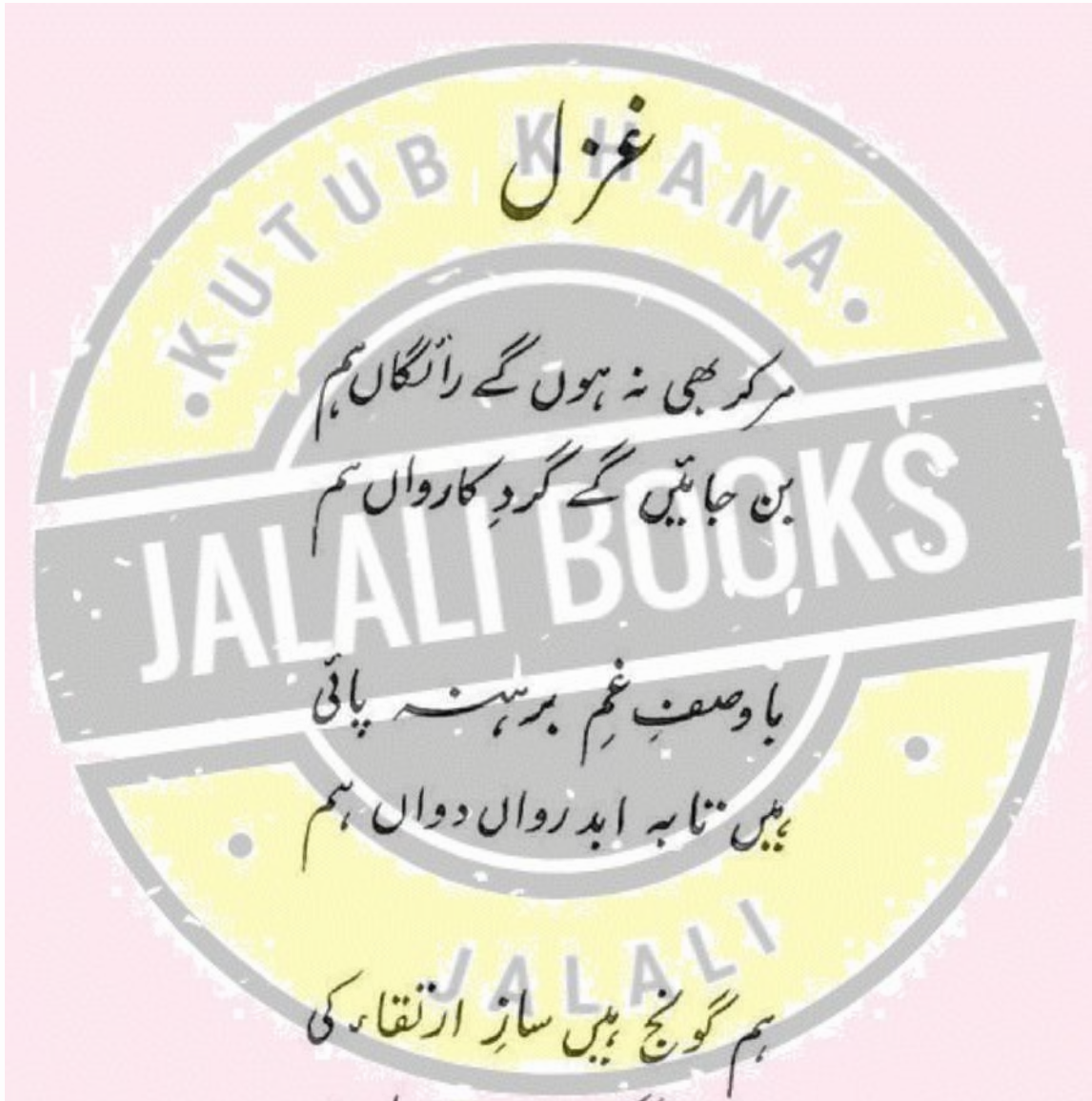
مر کر بھی نہ ہوں گے رائگاں ہم
بن جائیں گے گردِ کارواں ہم

با وصفِ غمِ برہنہ پائی
ہیں تا بہ ابد رواں دواں ہم

ہم گونج ہیں سازِ ارتقاء کی
گونجیں گے ابھی زماں زماں ہم

با وصفِ گمان بے زبانی
ہیں عصرِ جدید کی زباں ہم

کیوں پھیر میں آتے اہرمن کے
یزداں کے بھی ہیں مزاج داں ہم

غزل

فاصلے کے معنی کا کیوں فریب کھاتے ہو
جتنے دُور جاتے ہو، اتنے پاس آتے ہو

رات ٹوٹ پڑتی ہے جب سکوتِ زنداں پر
تم مرے خیالوں میں چھُپ کے گنگناتے ہو

میری خلوتِ غم کے آہنی دریچوں پر
اپنی مسکراہٹ کی مشعلیں جلاتے ہو

جب تنی سلاخوں سے جھانکتی ہے تنہائی
دل کی طرح پہلو سے لگ کے بیٹھ جاتے ہو

تم مرے ارادوں کے ڈولتے ستاروں کو
یاس کی خلاؤں میں راستہ دکھاتے ہو

کتنے یاد آتے ہو، پوچھتے ہو کیوں مجھ سے
جتنا یاد کرتے ہو اُتنے یاد آتے ہو

دسمبر ۱۹۵۸ء
(جیل میں)

غزل

لبِ خاموش سے افشا ہوگا
راز ہر رنگ میں رسوا ہوگا

دل کے صحرا میں چلی سرد ہوا
ابر گلزار پہ برسا ہوگا
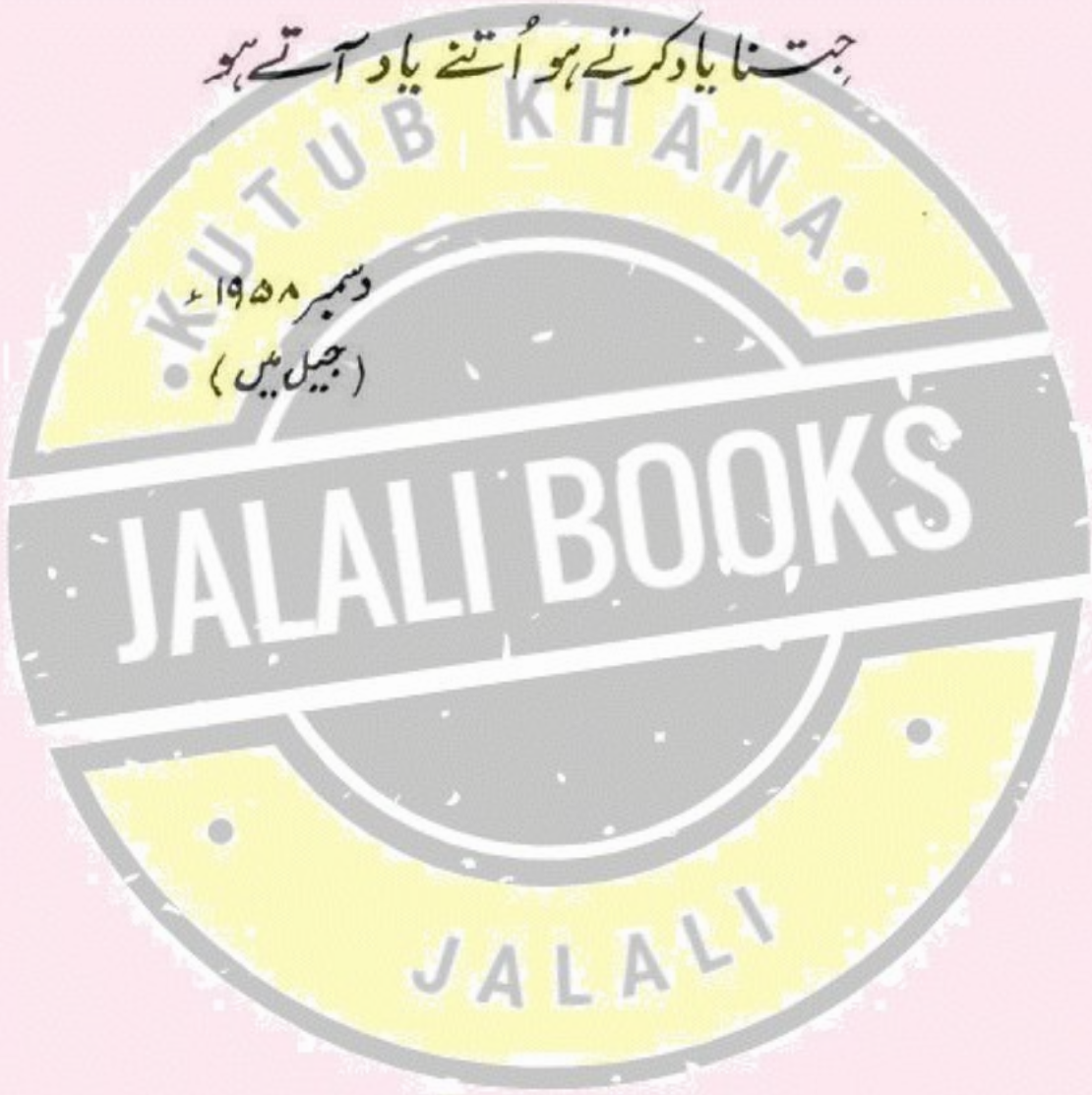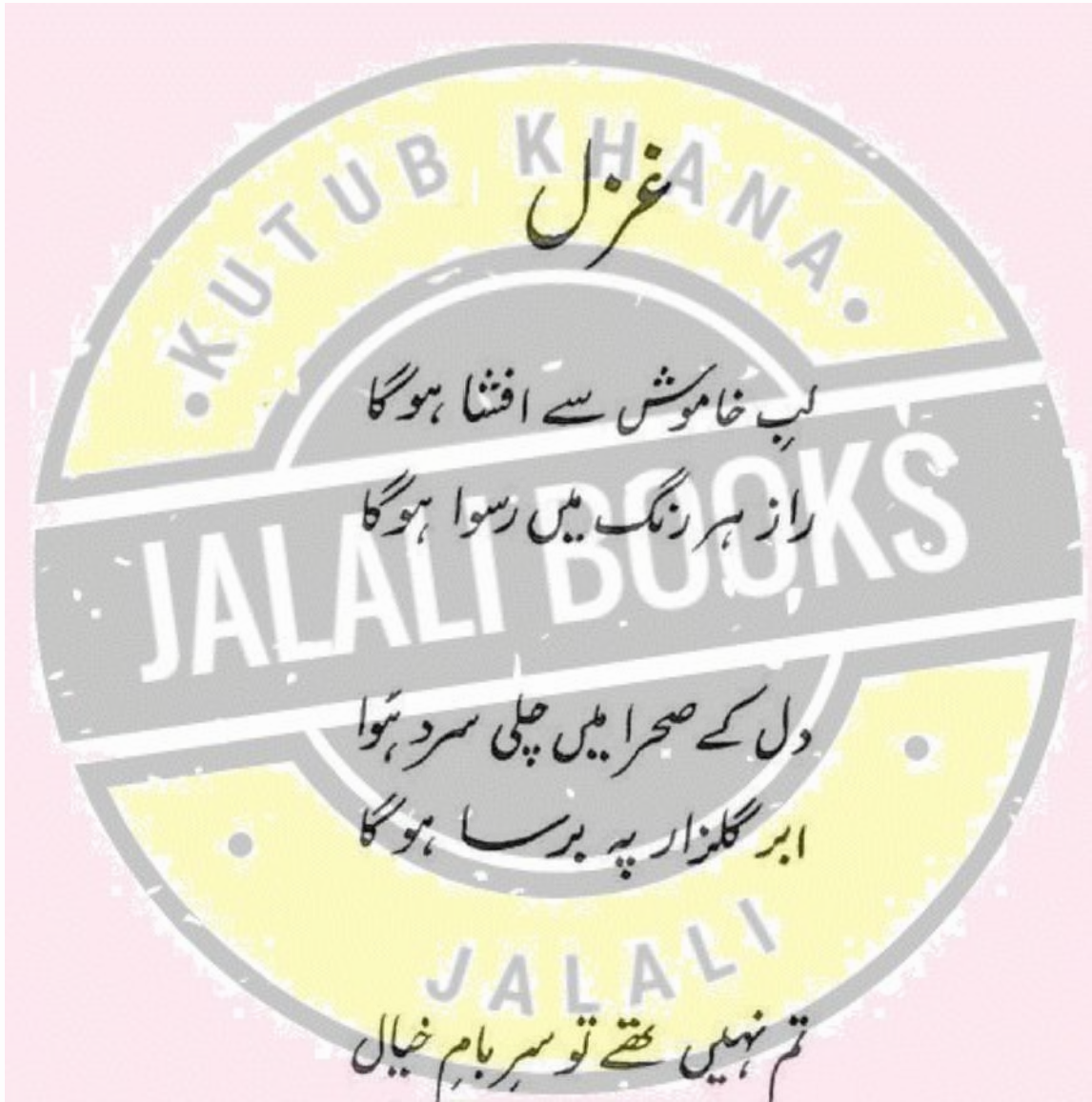
تم نہیں تھے تو سرِ بامِ خیال
یاد کا کوئی ستارا ہوگا

کس توقع پہ کسی کو دیکھیں
کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہوگا

جس بھی فنکار کے شہکار ہو تم
اُس نے صَدیوں تمھیں سوچا ہوگا

زینتِ حلقۂ آغوش بنو
دُور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا

ظلمتِ شب میں بھی شرماتے ہو
درد چمکے گا تو پھر کیا ہوگا

آج کی رات بھی تنہا ہی کٹی
آج کا دن بھی اندھیرا ہوگا

کس قدر کرب سے چٹکی ہے کلی
شاخ سے گُل کوئی ٹوٹا ہوگا

عُمر بھر روئے فقط اس دھن میں
رات بھیگی تو اُجالا ہوگا

ساری دُنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

ستمبر ۱۹۵۸ء

غزل
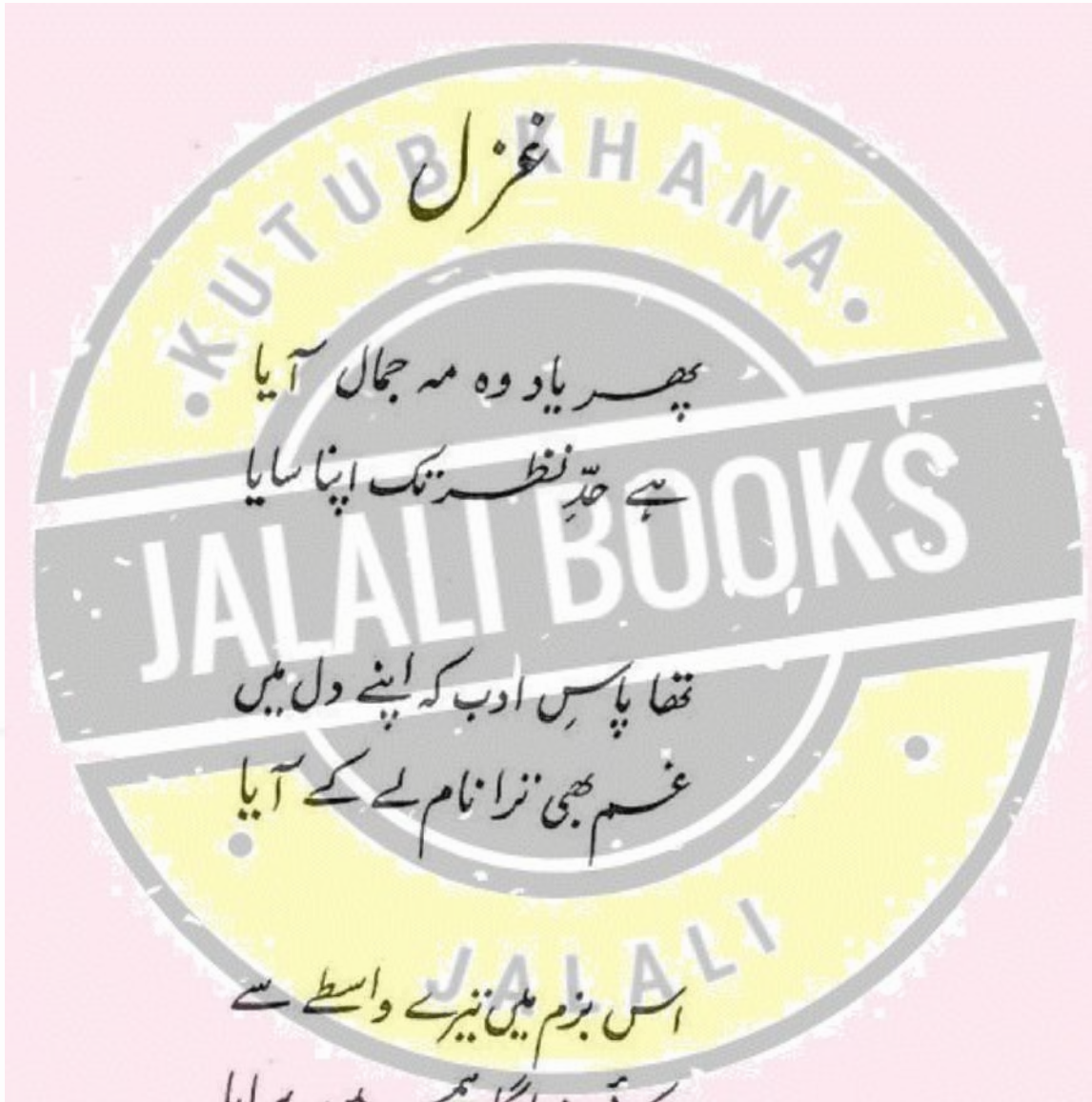
پھر یاد وہ مہ جمال آیا
ہے حدِّ نظر تک اپنا سایا

تھا پاسِ ادب کہ اپنے دل میں
غم بھی ذرا نام لے کے آیا

اس بزم میں تیرے واسطے سے
کوئی نہ لگا ہمیں پرایا

ہائے وُہ سپُردگی کی مستی
لُٹ کر بھی جبیں پہ بَل نہ آیا

— ق —

خورشید بدست جستجو کی
لیکن تُو کہیں نظر نہ آیا

ہم دل کا دِیا جلا کے لائے
جب جا کے ترا سُراغ پایا

— ق —

ہم ہیں ترا نقشِ خود نمائی
پندار ہمیں سے کیوں خدایا

تخلیقِ زمیں کا طنز مت کر
ہم نے ترا آسماں بنایا

اگست ۱۹۵۸ء

غزل

جیسے جیسے لوگ حق کے راز داں بنتے گئے
جو حقائق تھے وہ سب وہم و گماں بنتے گئے

جن گلوں کا حسن تھا قندیلِ شہراہِ حیات
ٹہنیوں سے ٹوٹ کر سنگِ گراں بنتے گئے

اوّل اوّل چند دھبّے تھے وفورِ رنگ کے
شدّتِ تخلیقِ فن سے جو جہاں بنتے گئے

کچھ نہ کچھ پاتا بھی ہے انسان محرومی کے ساتھ
جن کے دل بجھتے گئے، برقِ تپاں بنتے گئے

ہر غبارِ کارواں سے کارواں بنتا گیا
کارواں یوں تو غبارِ کارواں بنتے گئے

تیرگی میں اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے
جانے والے پھوٹتی پو کا سماں بنتے گئے

دُور سے دیکھا تو پلکوں تک کے سائے گن لیے
جیسے جیسے تم قریب آئے، دُھواں بنتے گئے

تم جب آئے، پھول بھی تحلیل ہو کر رہ گئے
جب گئے، موجِ ہوا تک پر نشاں بنتے گئے

اب فقط اک ٹیس میں سمٹی ہوئی ہے ان کی یاد
حلقۂ آغوش میں جو بے کراں بنتے گئے

اگست ۱۹۵۸ء

غزل
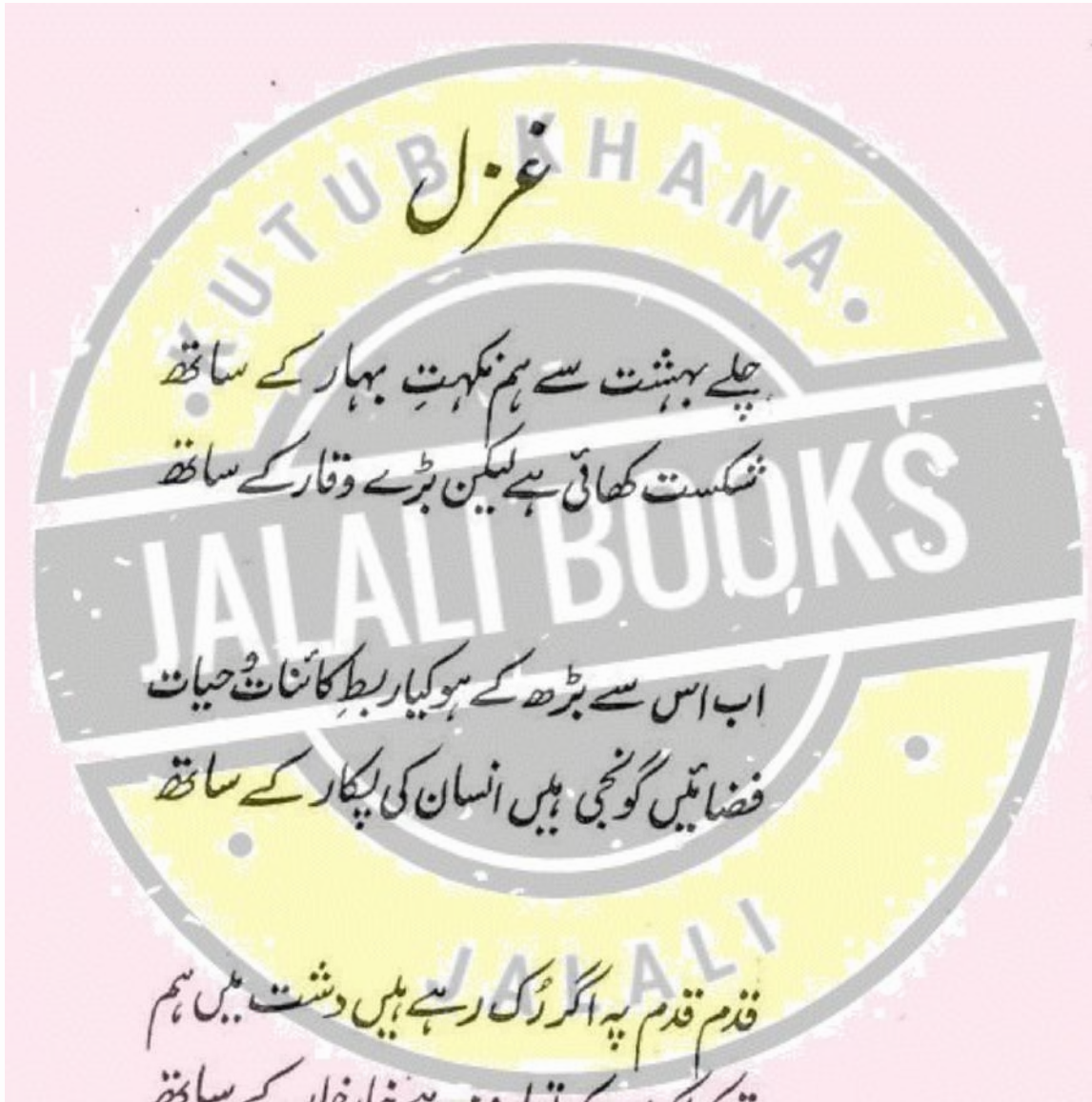
چلے بہشت سے ہم نکہتِ بہار کے ساتھ
شکست کھائی ہے لیکن بڑے وقار کے ساتھ

اب اس سے بڑھ کے ہو کیا ربطِ کائناتِ حیات
فضائیں گونجی ہیں انسان کی پکار کے ساتھ

قدم قدم پہ اگر رُک رہے ہیں دشت میں ہم
تو کیا کریں، کہ تعارف ہے خار خار کے ساتھ

نہ جانے کون سا جادُو تھا پیار کی رُت میں
بدلتے دیکھے ہیں موسم مزاجِ یار کے ساتھ

وہ احترامِ روایات ہو کہ مجبوری
نبھا رہے ہیں ستم ہائے روزگار کے ساتھ

جو بات ذہن میں آئی، زباں سے کہہ دیں گے
ندیمؔ جن کے مقدّر بندھے ہیں دار کے ساتھ

مارچ ۱۹۵۸ء
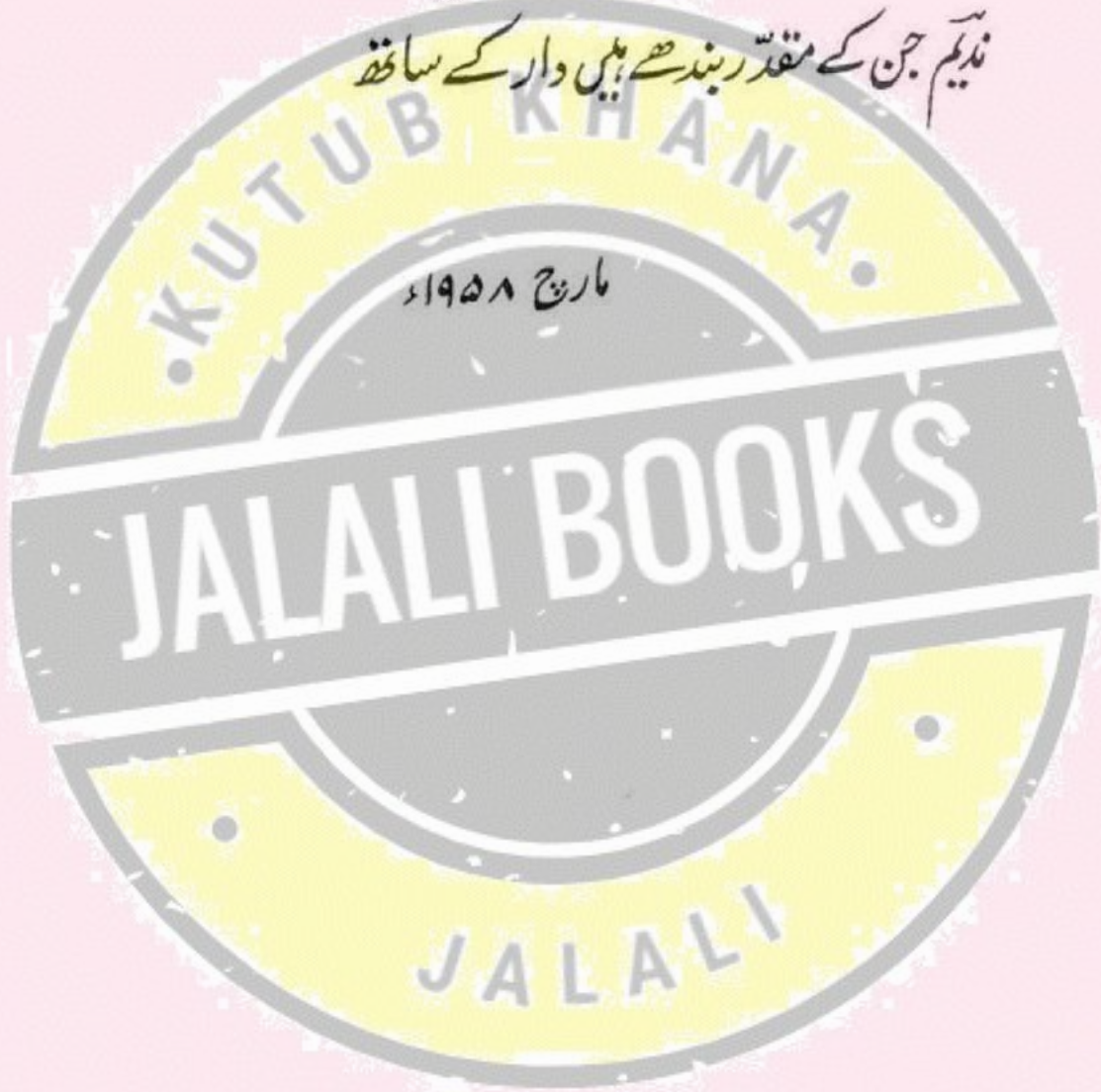
غزل

وہ دھندلکا جسے سب حدِّ نظر کہتے ہیں
اب تو انسان کی ہے راہگزر، کہتے ہیں

اپنا نعرہ بھی انا الحق ہے، مگر فرق یہ ہے
ہم وہی بات باندازِ دگر کہتے ہیں

شیخ نے جس کو دیا نامۂ اعمال کا نام
ہم گنہگار اسے دامنِ تر کہتے ہیں

طاق پر جس کے کبھی ایک دیا تک نہ جلا
ہم تو اُس گھر کو بھی اللہ کا گھر کہتے ہیں

کاش انساں کو شرر ہی کی چمک دے سکتے
زندگی کو جو فقط رقصِ شرر کہتے ہیں

رات جل اُٹھتی ہے جب شدّتِ ظلمت سے ندیمؔ
لوگ اُس وقفۂ ماتم کو سحر کہتے ہیں

دسمبر ۱۹۵۷ء
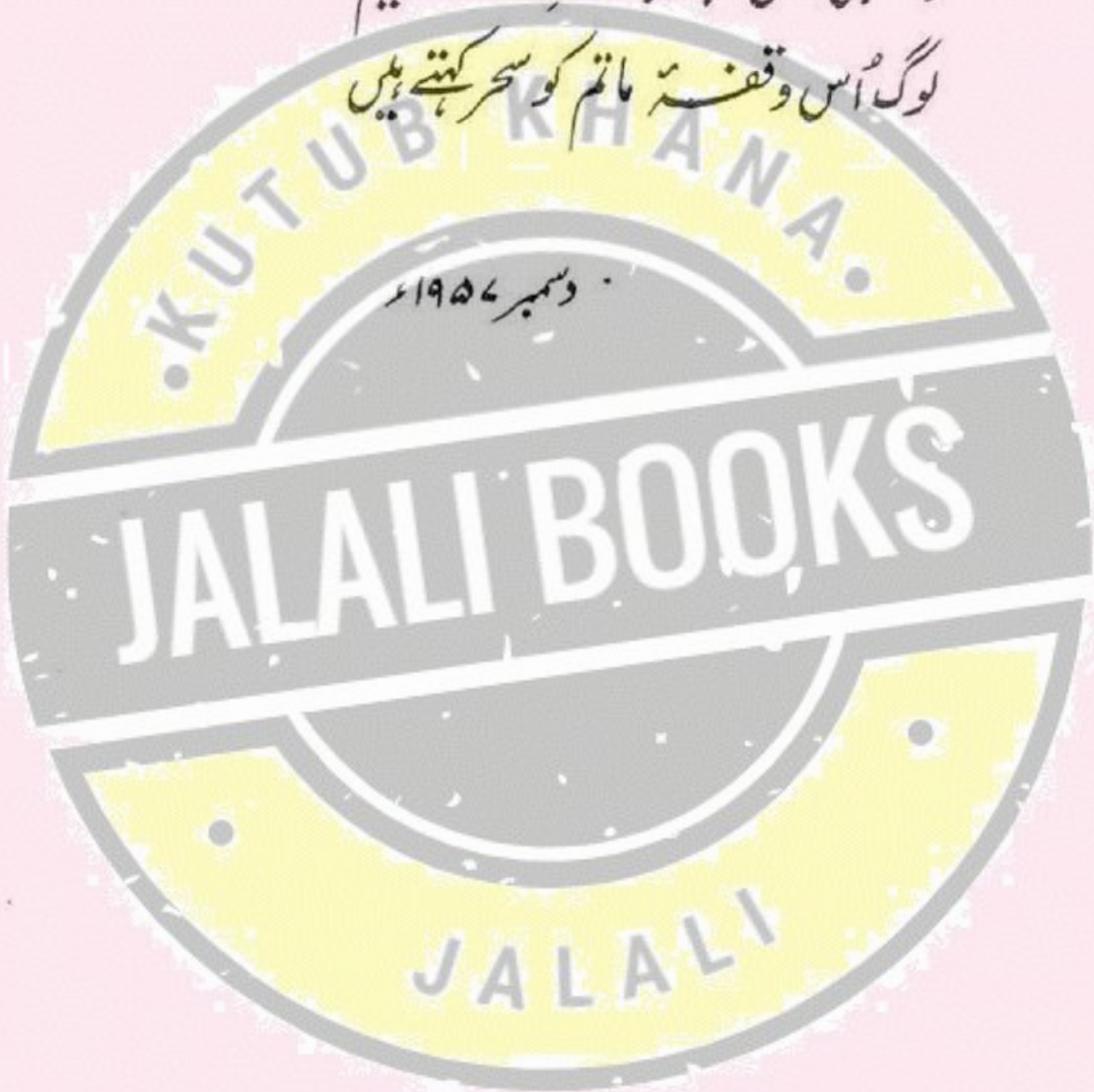
غزل

ہم اپنے چراغ کیوں بجھائیں
دیتی رہے چاندنی صدائیں

یزداں کو زمین پر بلائیں
انسان کو آئینہ دکھائیں

وسعت تھا بہانہ بے پری کا
اُڑتے ہی سمٹ چلیں فضائیں

آدم کی رسائیوں سے ڈر کر
اسرارِ حیات تھرتھرائیں

لازم ہے کہ روحِ عصر پر سے
ماضی کی کھلی لِٹیں ہٹائیں

طوفانِ خود آگہی کی زد میں
شاہوں کی قبائیں پھڑپھڑائیں

اِس دَور کے ایک ایک پل میں
صدیوں کی جبلّتیں جھلملائیں

تصویرِ شمیمِ گُل اُتاریں
یعنی ان کا سُراغ پائیں

یوں روئیں کہ ان کی انکھڑیاں بھی
اشکوں کی زباں میں مُسکرائیں

یوں گائیں کہ جیسے نصف شب کو
تاروں کے خرام گنگنائیں

جب تک نہ سمجھ میں آئے انساں
ہم اپنی سمجھ میں خاک آئیں

اکتوبر ۱۹۵۷ء

غزل

اِک دمکتا ذہن بھی ہُوں، اِک سُلگتا دل بھی ہُوں
"اپنا ماضی بھی ہُوں مَیں اور اپنا مُستقبل بھی ہُوں"[1]

میری دُنیا پر اگر ظلمت مسلّط ہے تو کیا
ابر میں لپٹی ہُوئی شب کا مہِ کامل بھی ہُوں

مَیں بظاہر اِک بھنور ہُوں چیختے جذبات کا
لیکن اس بپھرے ہُوئے طوفان کا ساحل بھی ہُوں

کفر کے انکار کی عظمت کا گو مُنکر نہیں
مَیں کسی قوّت کے حسنِ ربط کا قائل بھی ہُوں

[1] PONGE :

زندگی تیرا ارادہ ـــــ موت تیرا فیصلہ
سوچتا ہُوں، تیرے ہوتے مَیں کِسی قابل بھی ہُوں

آبلوں پر جو حنا باندھے، مجھے یہ بھی بتائے
کیوں بایں درماندگی، وارفتۂ منزل بھی ہُوں

شمع، میری چشمِ گریاں۔ گُل؛ مرے پامال خواب
راندۂ محفل ہُوں، محفل میں مگر شامل بھی ہُوں

زندگی کا ذائقہ تھا ان لبوں کے لمس میں
فکر کا شاعر ہُوں لیکن حُسن کا گھائل بھی ہُوں

ستمبر ۱۹۵۷ء

غزل

نہ محبّت نہ صباحت فانی
یہ سمندر ہیں سدا طُوفانی

تجُھ کو چاہا تو تجُھی کو چاہا
اِک یہ قصّہ نہ ہُوا طولانی
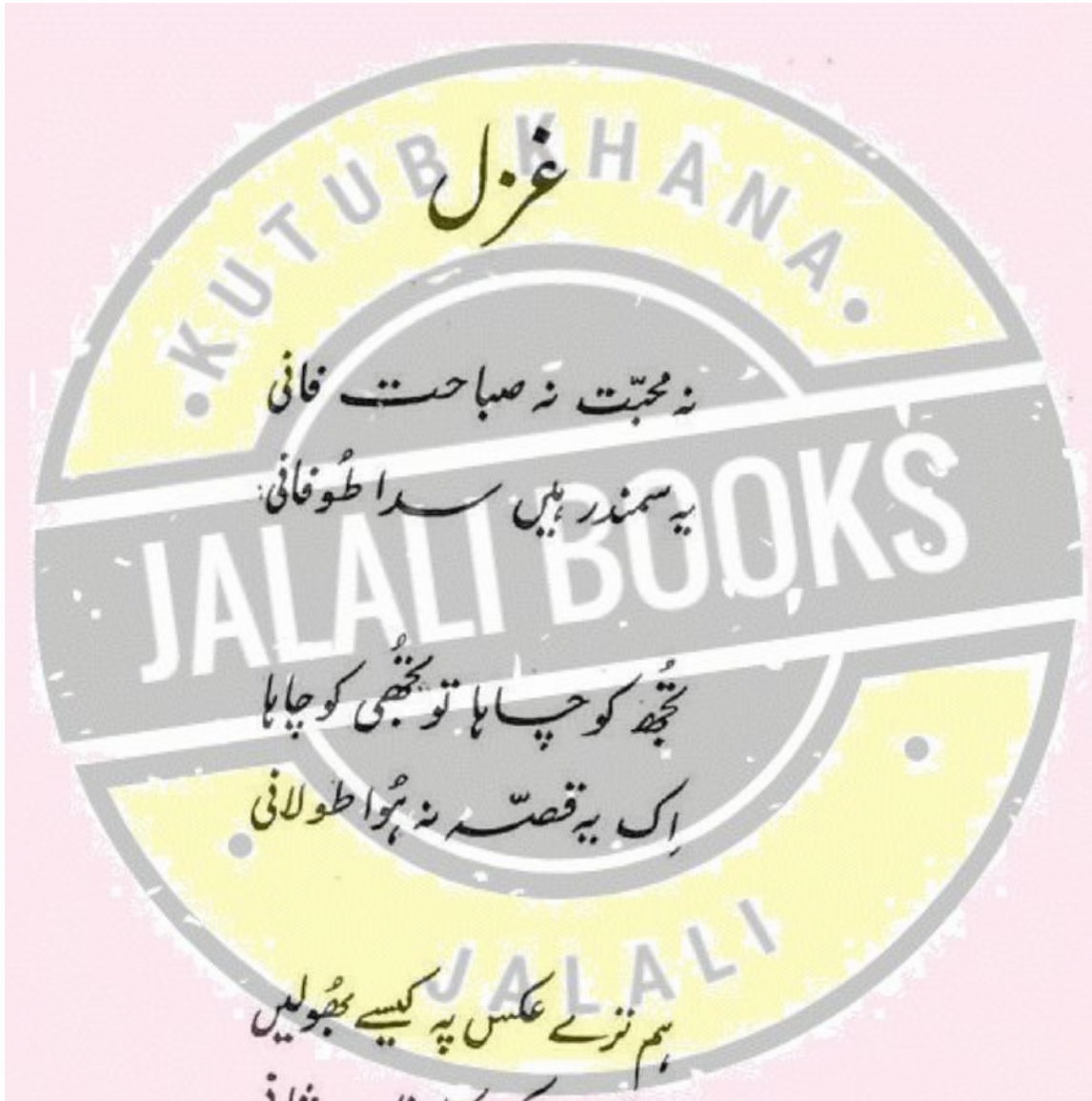
ہم ترے عکس پہ کیسے بھُولیں
آئینہ کس کا بنا ہے ثانی

ہم تری دُھن میں تجھے چھوڑ گئے
ہم نے صُورت نہ تری پہچانی

ہم سے پُوچھے کوئی رونے کا سبب
اس قدر کون کرے قربانی

جیتے جیتے کِسی قابل نہ رہے
قدر جینے کی نہ ہم نے جانی

کچھ سمجھتے تو کچھ آگے بڑھتے
اپنے پلّے تو پڑی حیرانی

مینہ کے جھالوں نے تو پربت چاٹے
چلمنوں سے نہ رُکے گا پانی

اُن کو لُوٹا تو اُجڑ جاؤ گے
جن کا سامان ہے بے سامانی

ستمبر ۱۹۵۷ء

غزل

کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں
ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں

ذہن پر تنگ ہوا جب بھی اندھیرے کا حصار
چند یادوں کے دریچے ہیں، جو کام آئے ہیں

کون کہتا ہے، محبّت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اِک دل کے عوض حشر اُٹھا لائے ہیں

کتنے پل کے لیے وہ زینتِ آغوش رہے
کتنے برسوں کے مگر زخم نکھر آئے ہیں

گونج گونج اُٹھتی ہے آوازِ شکستِ دل کی
جب بھی تارہ کوئی ٹوٹا ہے وہ یاد آئے ہیں

داستانِ غمِ دُنیا ہو کہ افسانۂ دل
وہی قصّے ہیں جو ہر دَور نے دہرائے ہیں

سینۂ ارض میں بیدار ہے احساسِ جمال
جب سے فن کار ستاروں سے اُتر آئے ہیں

اے سحر، آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اُڑا
ہم نے جل جل کے ترے راستے چمکائے ہیں

اگست ۱۹۵۷ء

غزل

نیا فلک ہو رہا ہے پیدا، نئے ستارے نکل رہے ہیں
حیات کے تنگ دائرے میں گھرے ہوئے جسم جل رہے ہیں

یہاں ابھی پٹ رہا ہے ماضی، وہاں لُٹا جا رہا ہے فردا
اِدھر فقط کٹ رہی ہیں گھڑیاں، وہاں زمانے بدل رہے ہیں

بکھر گئے ہیں جبینِ ایّام پر نئی صُبح کے اُجالے
افق سے شعلے نکل رہے ہیں، الاؤ راتوں کے جل رہے ہیں

جنھیں کسی دور میں ڈبویا تلاطمِ بحرِ زندگی نے
تلاطمِ بحرِ زندگی سے وہی سفینے اُچھل رہے ہیں

اِک ایک آنسو قرن کی لَو ہے، اِک ایک پل رُوحِ عصرِ نَو ہے
یہی نقوشِ حیات، صدیوں سے آبروئے غزل رہے ہیں

اپریل ۱۹۵۷ء

غزل
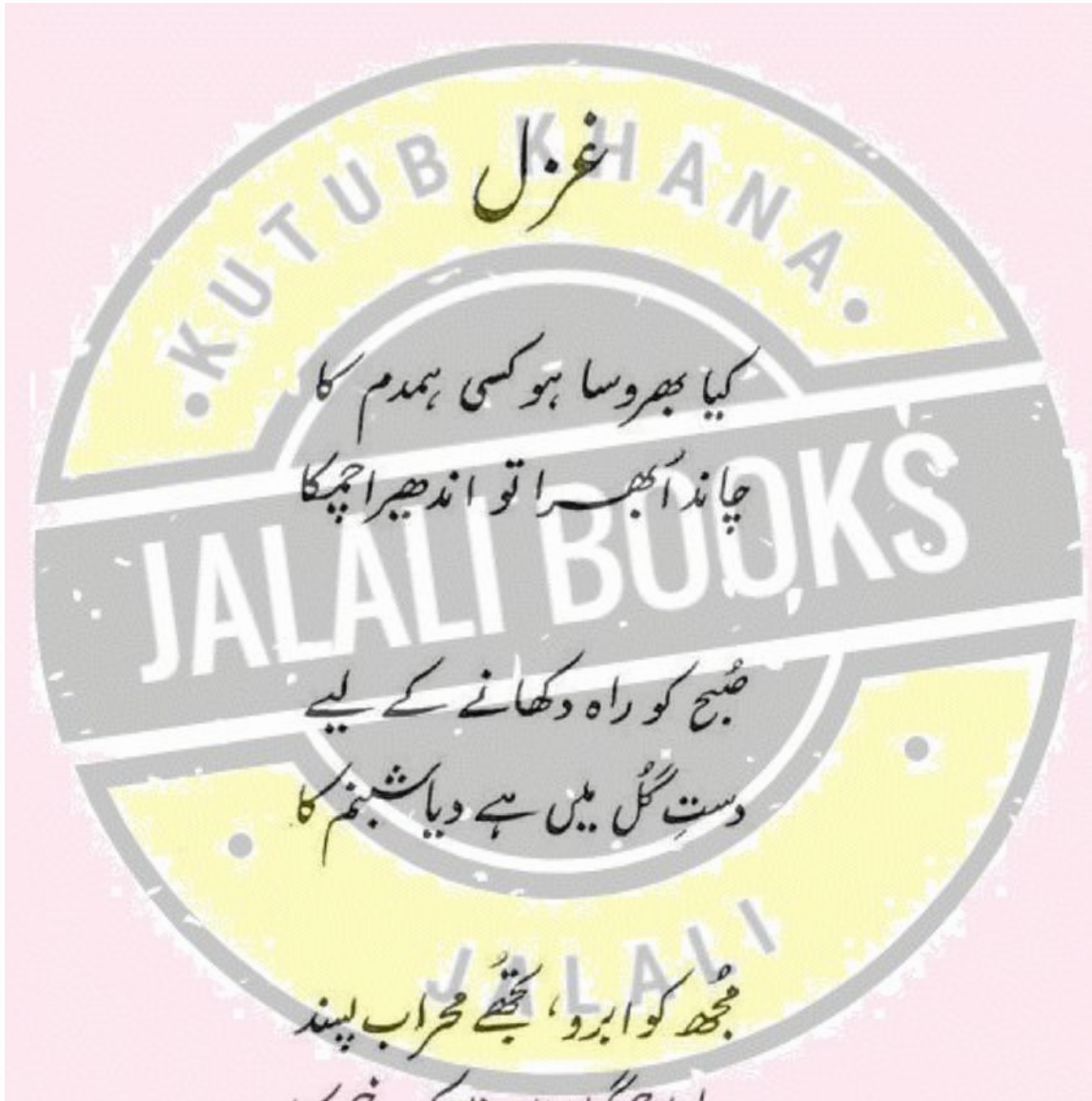
کیا بھروسا ہو کسی ہمدم کا
چاند ابھرا تو اندھیرا چمکا

صُبح کو راہ دکھانے کے لیے
دستِ گُل میں ہے دیا شبنم کا

مُجھ کو ابرو، تجھے محراب پسند
سارا جھگڑا اسی نازک خم کا

حُسن کی جستجوئے پیہم میں
ایک لمحہ بھی نہیں ماتم کا

ہوئے اس دور میں فتوے جاری
کہ غزالوں کو جنوں ہے رم کا

مجھ سے مر کر بھی نہ توڑا جائے
ہائے یہ نشہ زمیں کے نم کا

اب سیو چاکِ گریبانِ حیات
کہ تقاضا ہے یہی موسم کا

اپریل ۱۹۵۷ء

غزل

بزمِ انساں میں بھی اِک رات بسر کر دیکھو
ایک بار اپنی زمیں پر بھی اُتر کر دیکھو

اِس افق پر نہ اگر جنّتِ موعودہ ملی
اُس افق تک بھی جو چاہو تو سفر کر دیکھو

کوئی ڈوبی ہوئی کشتی ہے کہ ساحل کا نشاں
اپنی سوچوں کے سمندر سے اُبھر کر دیکھو

خود کو دیکھو مرے معیار کے آئینے میں
اِک ذرا مجھ پہ یہ احسان بھی دھر کر دیکھو

موسمِ گُل ہے تو کردارِ چمن کیوں بدلے
آگ پھولوں کو تو شبنم کو شرر کر دیکھو

ہر زمانے میں بجھے تو نہیں رہتے خورشید
گردشو، آج مری شب کو سحر کر دیکھو

مارچ ١٩٥٧ء
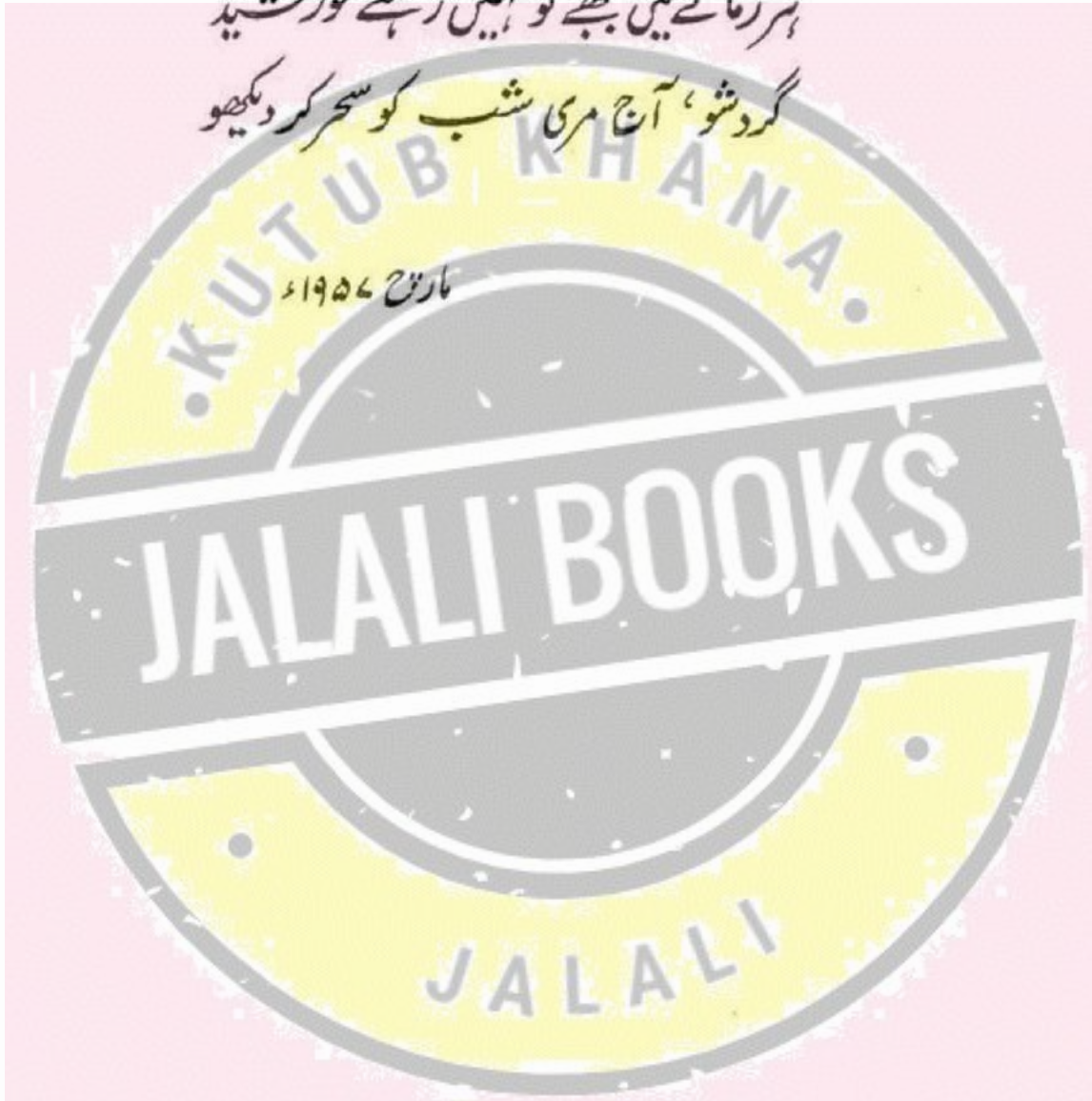
غزل

تُو جو بدلا تو زمانہ ہی بدل جائے گا
گھر جو سُلگا تو بھرا شہر بھی جل جائے گا

سامنے آ، کہ مرا عشق ہے منطق میں اسیر
آگ بھڑکی تو یہ پتّھر بھی پگھل جائے گا

دل کو مَیں منتظرِ ابرِ کرم کیوں رکھوں
پھُول ہے، قطرۂ شبنم سے بہل جائے گا

موسمِ گُل اگر اس حال میں آیا بھی تو کیا
خونِ گُل، چہرۂ گُلزار پہ مَل جائے گا

وقت کے پاؤں کی زنجیر ہے رفتار، ندیمؔ
ہم جو ٹھہرے تو اُفق دُور نکل جائے گا

اکتوبر ۱۹۵۶ء

غزل

انجمنیں اُجڑ گئیں، اُٹھ گئے اہلِ انجمن
چند چراغ رہ گئے، جن کی لویں ہیں سینہ زن

اب ترا التفات ہے، حادثۂ جمال و فن
اندھے عقاب کی اُڑان، زخمی ہرن کا بانکپن

ہائے یہ مختصر حیات، ہائے یہ اِک طویل رات
اے مرے دوست اِک نظر، اے مرے چاند اِک کرن

حُسن اگر جھکا رہا، بر درِ خسروانِ دہر
کٹتے رہیں گے کوہسار، مرتے رہیں گے کوہکن

آ نرتے ہیں برگہائے زرد، لالہ و گُل کے رُوپ میں
ایسے نحیف جسم پر، اتنا مہین پیرہن

اپریل ۱۹۵۶ء

غزل

خود فریبی کے نکل آئے ہیں کتنے پہلو
ہو گئے اپنے طراروں میں گرفتار آہُو

یہ نہ شبنم ہے، نہ بھٹکے ہُوئے تاروں کا ہجوم
رات کی لاش پہ ٹپکے ہیں سحر کے آنسُو

مَیں تو چُپ تھا مگر اب موجِ حیا کے ہاتھوں
پھیلی جاتی ہے ترے حُسن کی خوشبُو ہر سُو

توڑکر جب بھی پرستش کا قفس دیکھا ہے
خمِ محراب سا لگتا ہے ھلالِ ابرو

جب بھی اُٹھی کوئی چلمن، مجھے محسوس ہُوا
میری آنکھوں پہ ہیں بکھرے ہُوئے تیرے گیسو

نہ ترے حسن کی خوشبو، نہ ترے عشق کا رنگ
یُوں تو گزرے مری نظروں سے ہزاروں گُل رو

کن جہانگیر بہاروں کی تمنّا میں ندیم
موسمِ گُل میں بھی اُجڑا ہُوا لگتا ہے تُو

اپریل ۱۹۵۶ء

غزل

اب ساری خدائی ہے تماشائی ہماری
کچھ روز سے آباد ہے تنہائی ہماری

مٹ کر بھی ہیں دھرتی کے رگ و پے میں رواں ہم
دیکھو تو ذرا انجمن آرائی ہماری

اب دامنِ صحرا پہ بھی دھوکا ہے چمن کا
گلگشت ہے اب بادیہ پیمائی ہماری

ہر لفظ میں ماضی کے کئی گیت گندھے ہیں
تاریخ کی اِک گُونج ہے گویائی ہماری

جو پھول کھلا، اُس میں گھُلا خُوں ہمارا
جو جام بجا، اس میں کھنک آئی ہماری

جب حریّتِ فکر کا دستور ہُوا طے
خود جبرِ مشیّت نے قسم کھائی ہماری

اگست ۱۹۵۵ء
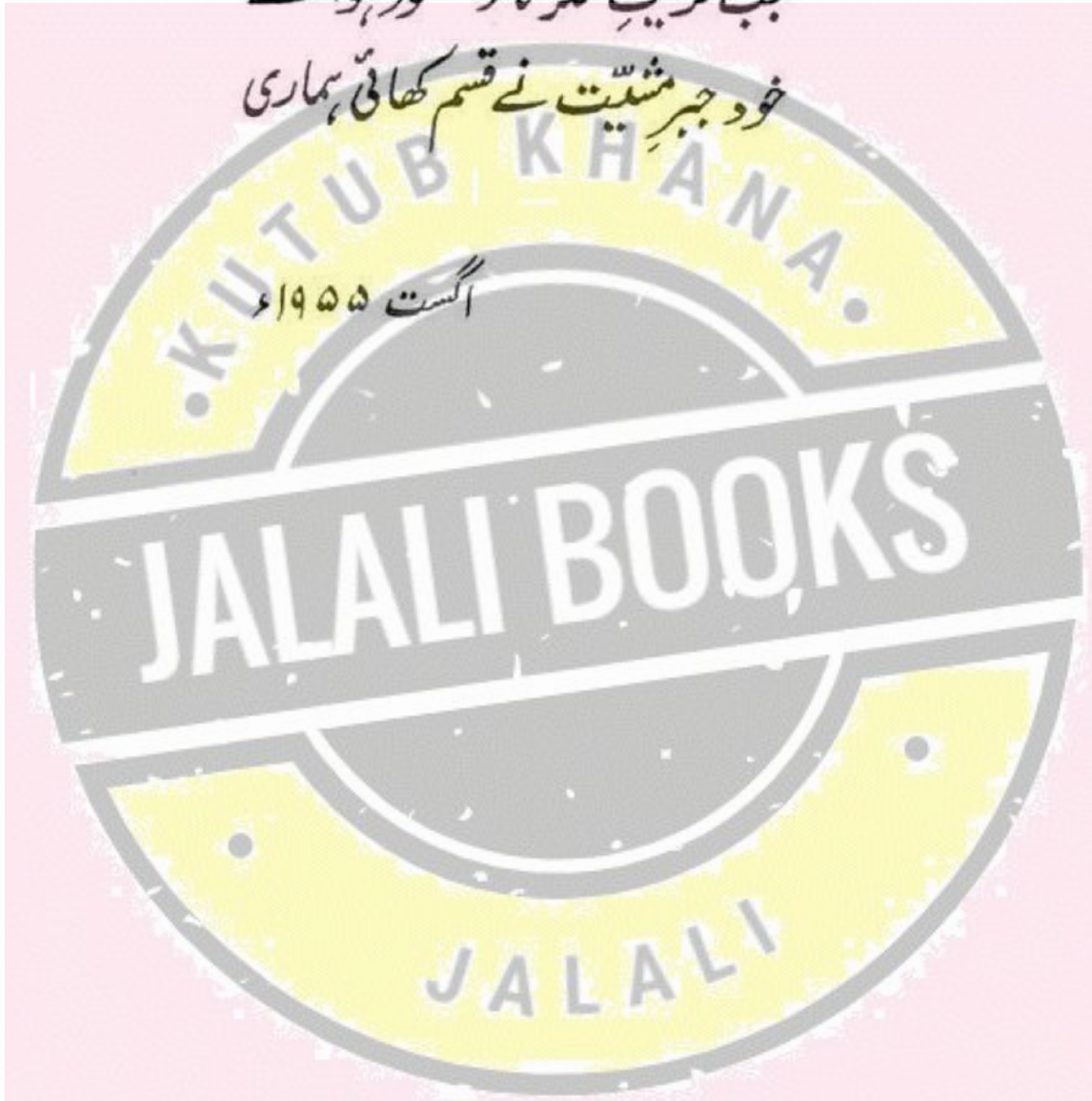
غزل

لالہ و گُل کے جو سامان بہم ہو جاتے
فاصلے دشت و چمن زار میں کم ہو جاتے

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمہاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جاتے

ق

خود کو کھویا تو نہیں، تم کو نہ پایا، نہ سہی
تم کو پاتے تو اسی کیف میں ضم ہو جاتے

صرف ہم پر ہی نہ یہ حادثہ ہوتا موقوف
تم بھی اِک معبدِ ویراں کے صنم ہو جاتے

فقط اِک ذوقِ پرستش کی نقوش آرائی
دَیر اگر دَیر نہ ہوتے تو حَرم ہو جاتے

ہم اگر دار پہ کھنچتے بھی تو اے صاحبِ دار
اپنی ناکردہ گناہی کی قسم ہو جاتے

جون ۱۹۵۴ء
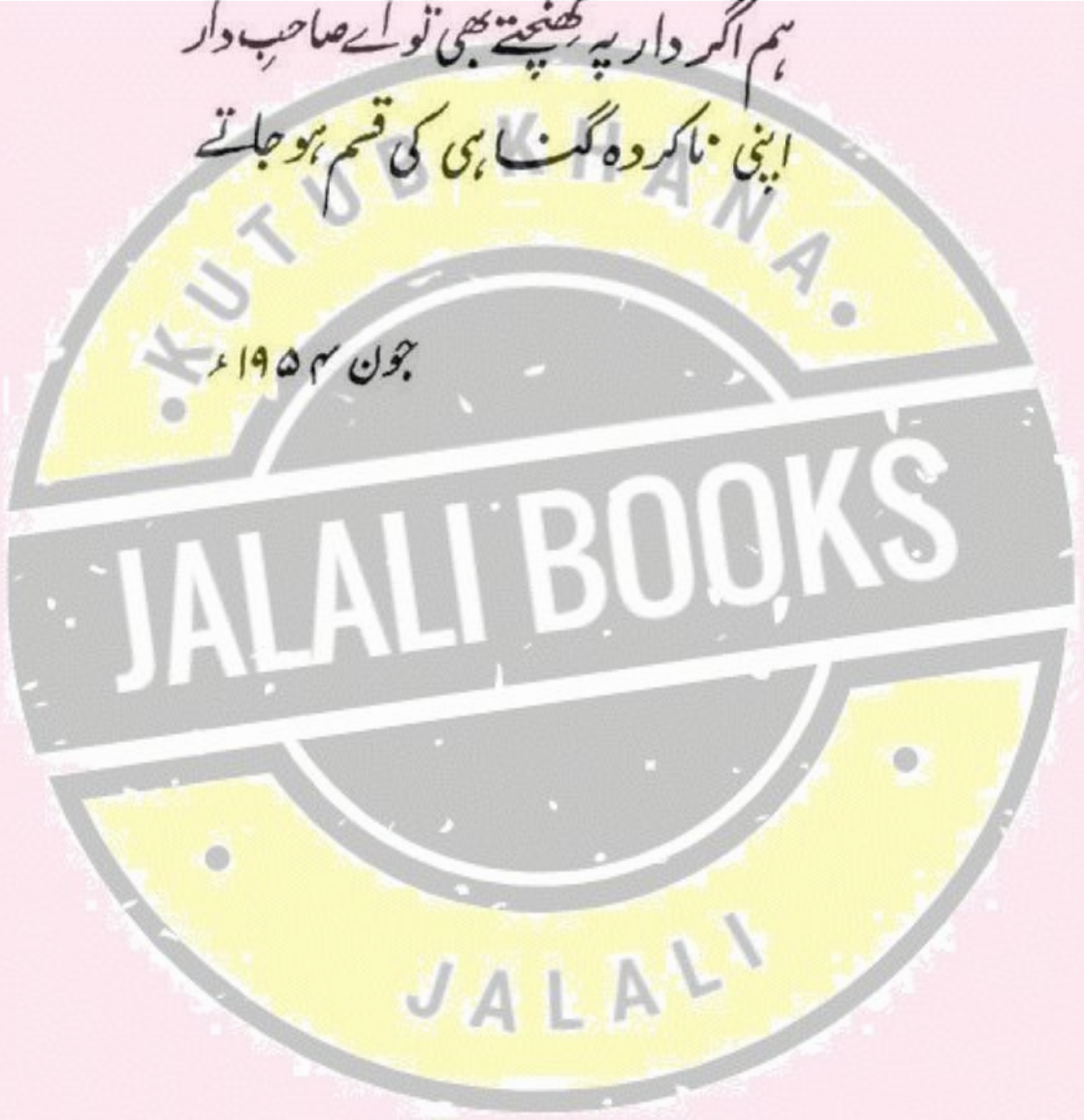
غزل

پلک پلک پہ جلائے ہیں اشکِ تر کے چراغ
بھڑک اُٹھے ہیں شبِ ہجر کی سحر کے چراغ

جُدائیوں کے گھنے جنگلوں میں عُمر کٹی
لویں سمیٹ کے، سوتے رہے سفر کے چراغ

یہ گُل ہیں یا ترے روکے ہوئے تبسّم ہیں
یہ کون دشت میں لایا ہے میرے گھر کے چراغ

جُھکا لیا ہے بھری ڈالیوں کو گلچیں نے
بجھا رہا ہے کوئی میرے بام و در کے چراغ

مُسافروں سے کہو، رات سے شکست نہ کھائیں
مَیں لا رہا ہُوں خُود اپنے لہُو سے بھر کے چراغ

مکالماتِ فلاطوں ہوں یا ندیم کے شِعر
کوئی بجُھا نہ سکا فطرتِ بَشر کے چراغ

نومبر ۱۹۵۳ء
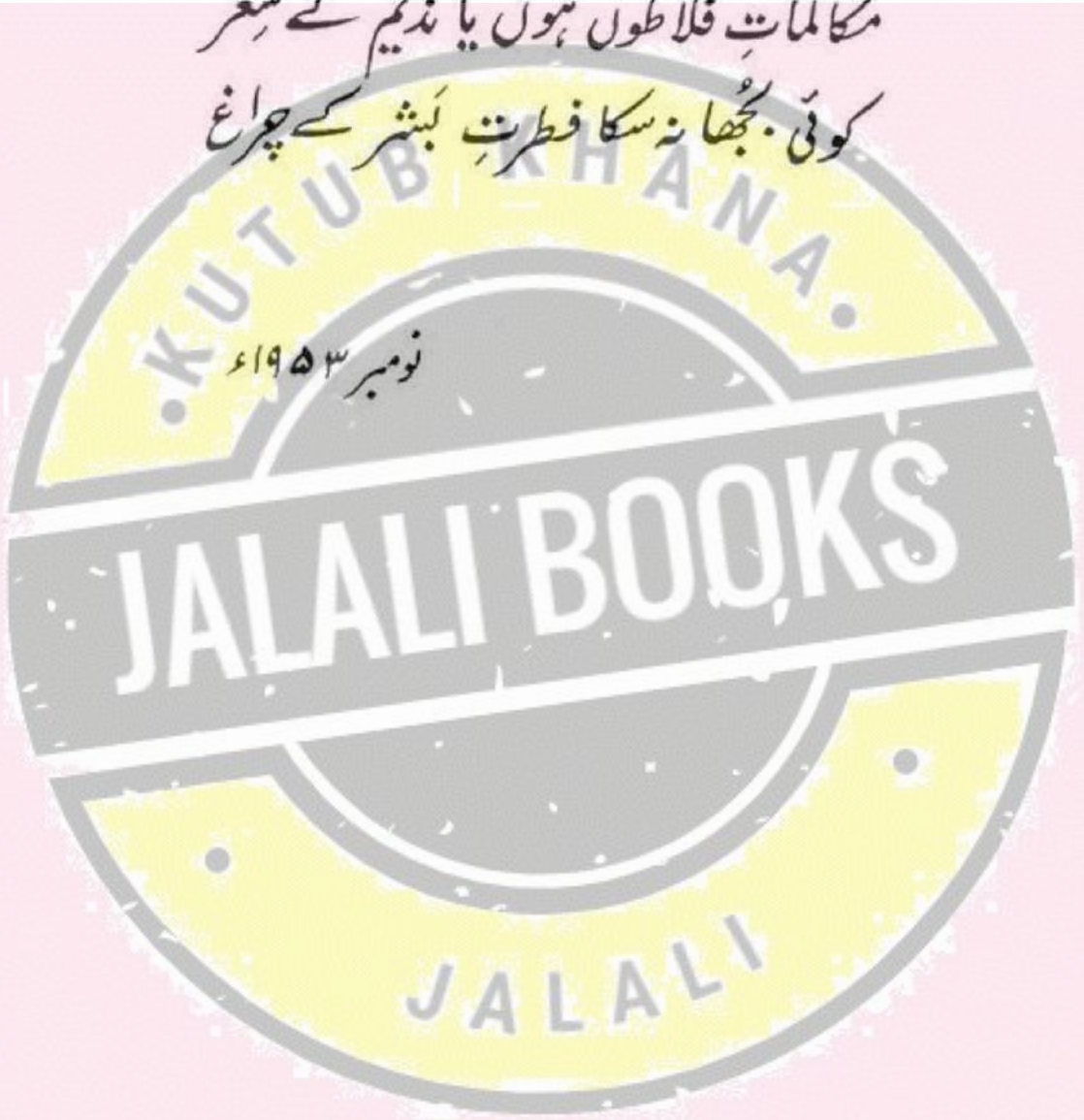
غزل

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

چاند جب دور افق پر ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

دن شعاعوں سے اُلجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

فروری ۱۹۵۳ء

غـــزل

حیراں حیراں کونپل کونپل، کیسے کِھلتے پھول یہاں
تنے ہوئے کانٹوں کے ڈر سے پوچ گئی ببول یہاں

کلیاں نوکِ سناں سے چٹکیں، غنچے کٹ کے شگفتہ ہوئے
کاش یہ فصلِ خونِ بہاراں اور نہ کھینچے طول یہاں

شاید آج بھی جاری ہے آدم کا سلسلۂ اُفتاد
تھی نہ وہاں جنّت بھی گوارا اور قبول ہے دُھول یہاں

یارو یہ سنّاٹا توڑو، گیت نہیں تو چیخ سہی
رُلوانا قانون یہاں کا، رو لینا معمول یہاں

پل پل میں تاریخ چھپی ہے، گھڑی گھڑی گرداں ہے ندیمؔ
ایک صدی کی ہار بنے گی ایک نظر کی بھول یہاں

دسمبر ۱۹۵۲ء

غزل

گو دُھند میں تا کمر گیا چاند
نظروں میں مگر بٹھر گیا چاند

شبنم کو شرار کر گیا چاند
آنکھوں میں غبار بھر گیا چاند
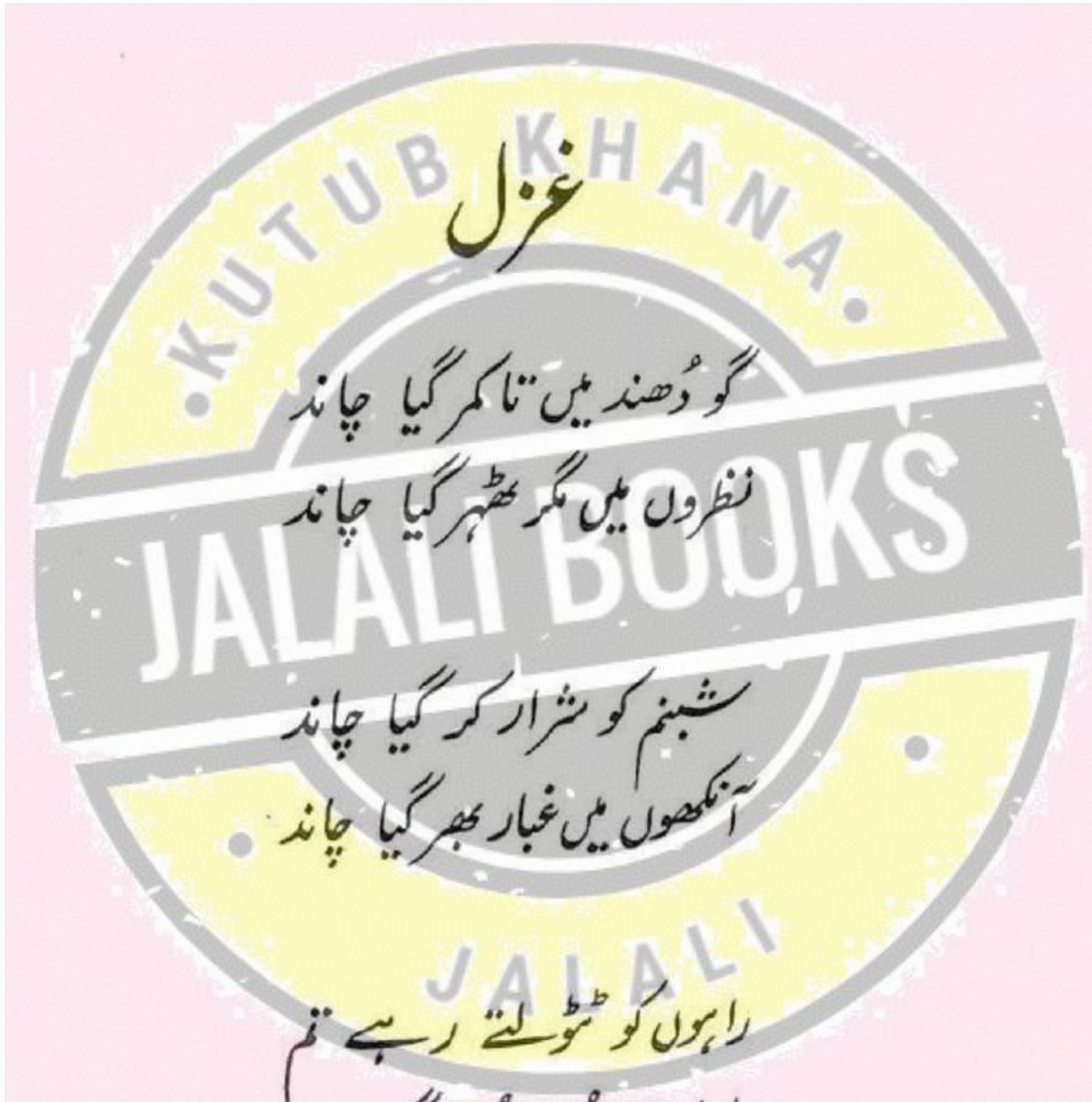
راہوں کو ٹٹولتے رہے تم
بادل میں اُدھر اُتر گیا چاند

جب ہجر کی رات چاند ڈوبا
دل چیخ اُٹھا کہ مر گیا چاند

اے دردِ فراق کے اندھیرو
کیا ہو گئے گُل؟ کدھر گیا چاند

اُجلا سا غبار ہے اُفق پر
اس راہ سے کس کے گھر گیا چاند

اے ٹوٹتے آسرے، لُٹے ہم
اے سوچتے رہگزر، گیا چاند

تم کاش، کرن کی چاپ سُنتے
میرے لیے در بدر گیا چاند

اب آئے ہو آفتاب لے کر
ظلمات سے جب گزر گیا چاند

آنسو بھی نہیں کہ دل کو رو لیں
تارے بھی گئے، جدھر گیا چاند

دسمبر ۱۹۵۲ء

شعلۂ گل

○
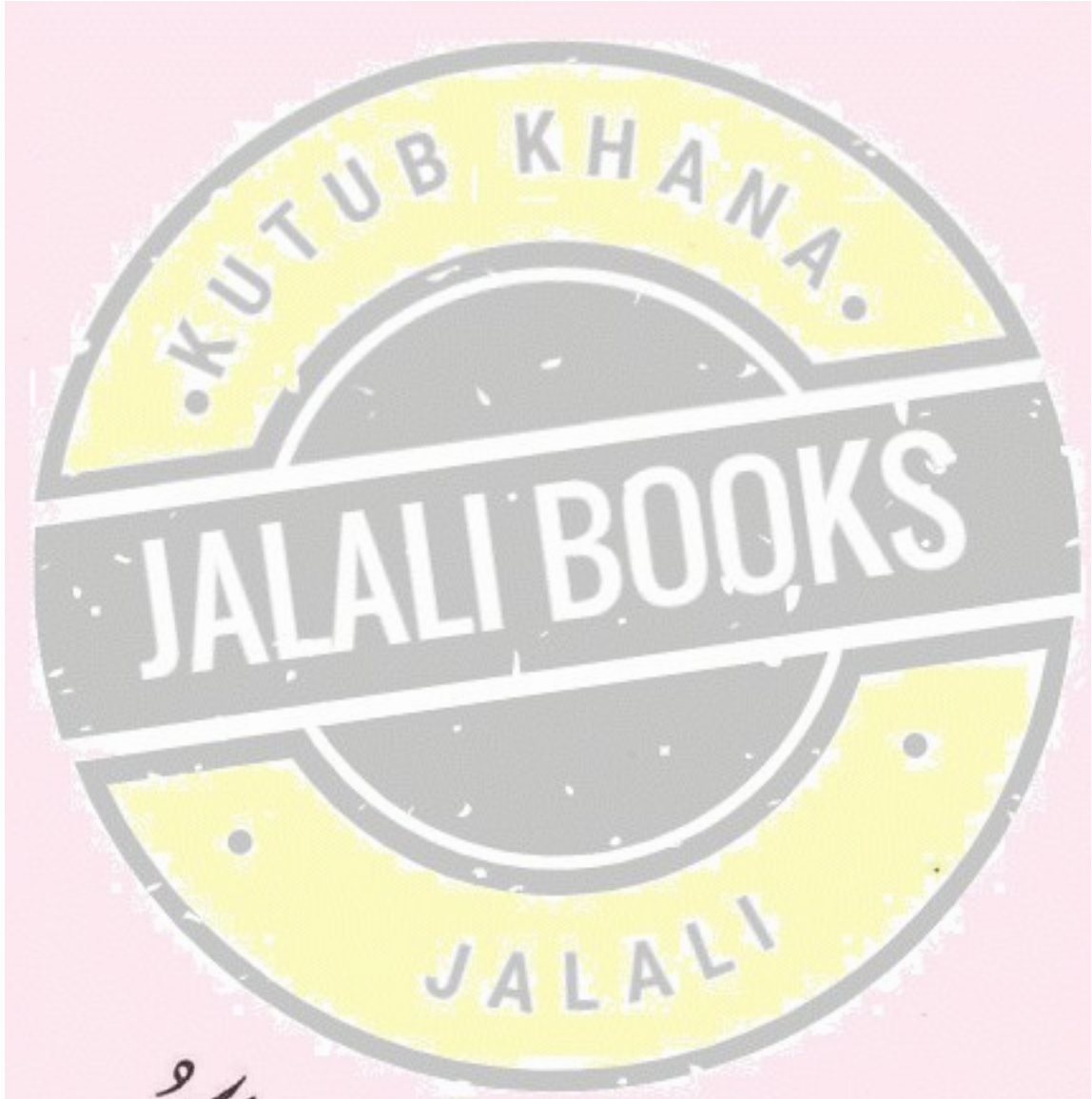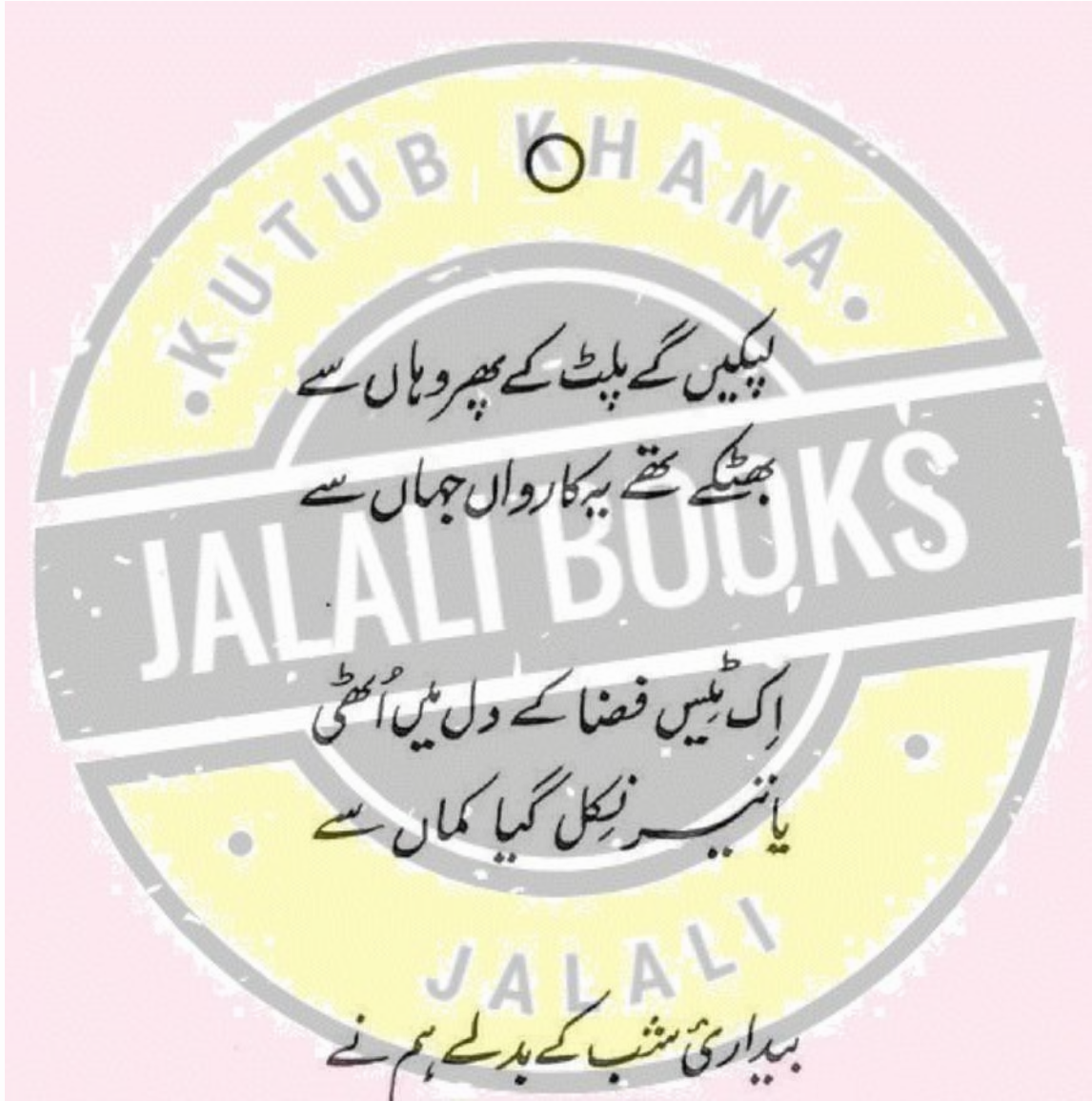
پلکیں گے پلٹ کے پھر وہاں سے
بھٹکے تھے یہ کارواں جہاں سے

اِک ٹیس فضا کے دل میں اُٹھی
یا تیر نکل گیا کماں سے

بیداریٔ شب کے بدلے ہم نے
دن پائے، مگر دُھواں دُھواں سے

ہر گُل ہے پناہ گاہِ زنبور
گُل چیں کو گِلہ ہے باغباں سے

پھُولوں کی بھی خاک اُڑا رہے ہیں
لِپٹے ہیں جو دامنِ خزاں سے

جو پیار نہ کر سکے زمیں سے
پائیں گے نہ بھیک آسماں سے

کچھُ اور نہیں تو حشر ٹُوٹے
اب خواب تو ہو چلے گراں سے

ہم آبلہ پا ہی، اے زمانے!
اُلجھیں گے ترے یمِ رواں سے

اُڑتا ہے مذاق بجلیوں کا
اب پھُول گریں گے آسماں سے

یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس
انسان ہٹا جو درمیاں سے

گنجینۂ وقت بن گئی ہے
جو بات نکل گئی زباں سے

۱۹۵۲ء

قرارِ جاں بھی تمھی، اضطرابِ جاں بھی تمھی
مرا یقیں بھی تمھی ہو، مرا گماں بھی تمھی

تمھاری جان ہے نکہت، تمھارا جسم بہار
مری غزل بھی تمھی، میری داستاں بھی تمھی
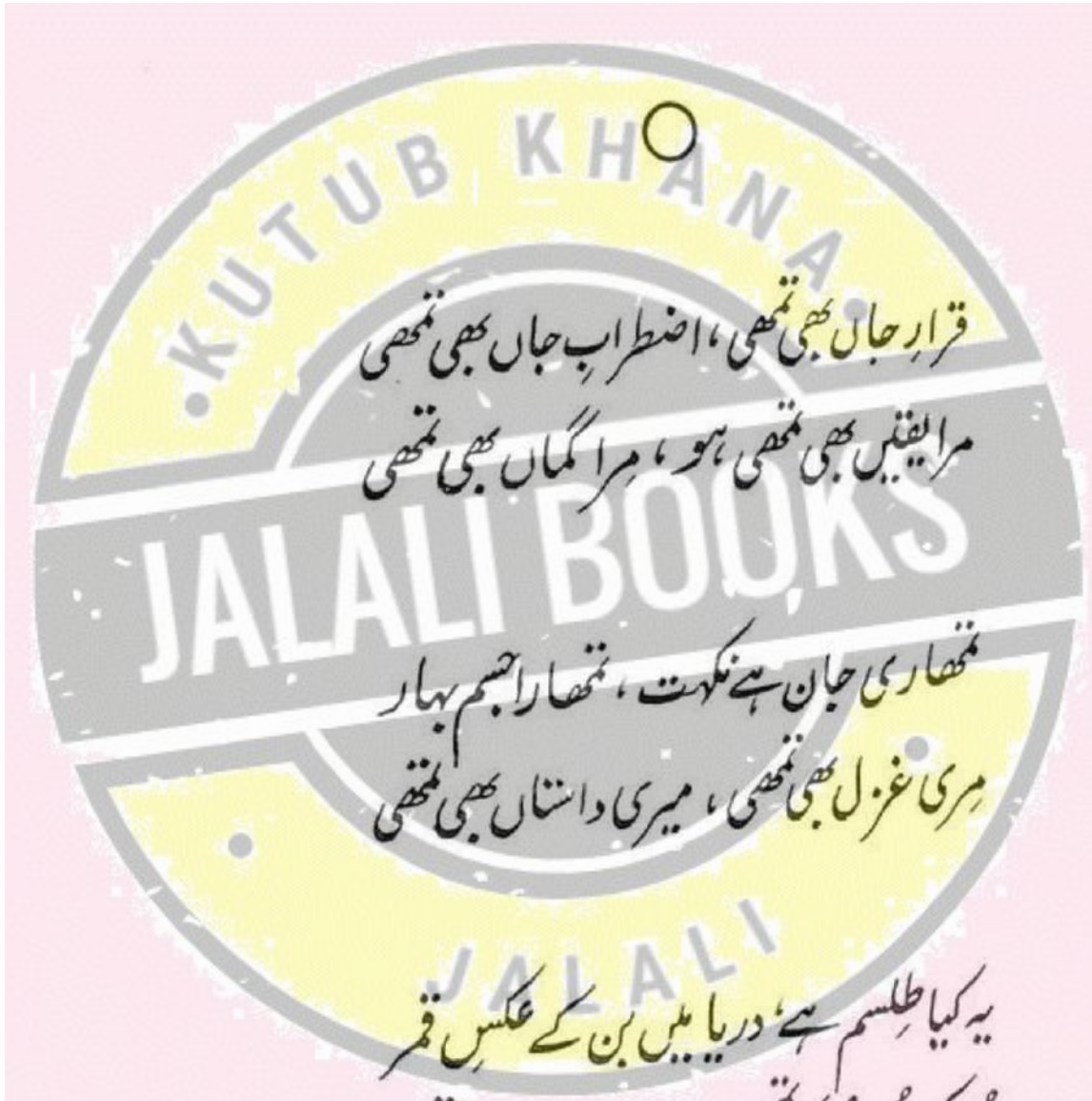
یہ کیا طِلسم ہے، دریا میں بن کے عکسِ قمر
رُکے ہوئے بھی تمھی ہو، رواں دواں بھی تمھی

خدا کا شکر، مرا راستہ معیّن ہے
کہ کارواں بھی تمھی، میرِ کارواں بھی تمھی

تمھی ہو جس سے ملی مجھ کو شانِ استغنا
کہ میرا غم بھی تمھی، غم کے رازداں بھی تمھی

نہاں ہو ذہن میں وجدان کا دھواں بن کر
افق پہ منزلِ ادراک کا نشاں بھی تمھی

تمام حسنِ عمل ہوں، تمام حسنِ بیاں
کہ میرا دل بھی تمھی ہو، مری زباں بھی تمھی

۱۹۵۲ء

دمک رہا ہے رُخِ شام پر ستارۂ شام
غروبِ مہر پہ اب کون دھر سکے الزام

اِس ایک پل میں یہاں ایک عمر بیت گئی
تری نگاہِ کرم ہے کہ گردشِ ایّام
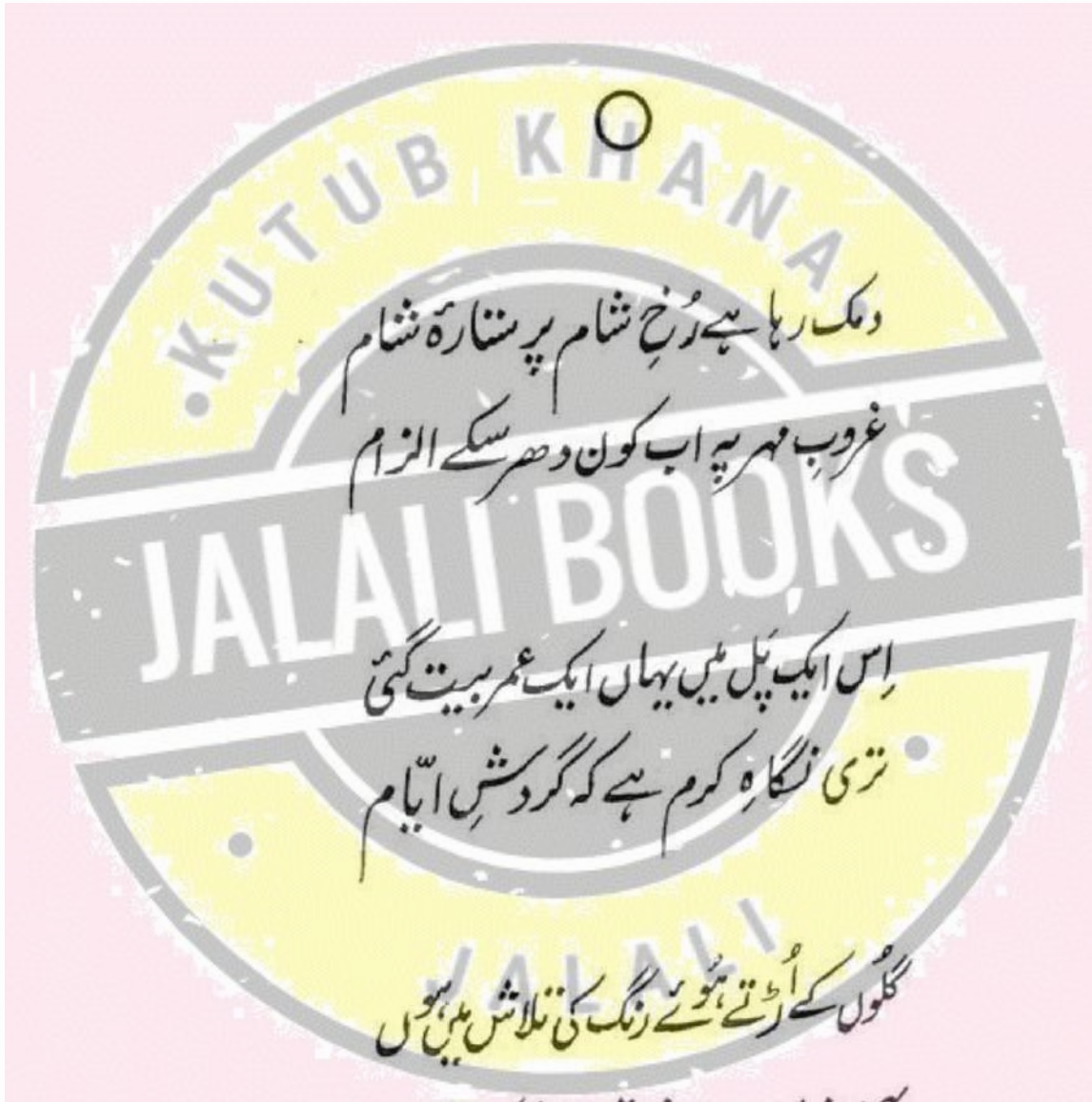
گلوں کے اُڑتے ہوئے رنگ کی تلاش میں ہوں
یہی نہ ہو مرے ذوقِ جمال کا انجام

بایں خمار، زمانے کا ساتھ دیتا ہوں
زمیں سے اُٹھ نہ سکا میری سرخوشی کا مقام

یہ سوچتا ہُوں کہ پھُولوں کے رقص کی بُنیاد
نہ جانے بادِ چمن ہے کہ تیرا حُسنِ خرام

بھٹک رہا ہُوں حقیقت کی تیرگی میں، مگر
چراغِ فکر ہے اب تک مرا گلاب اندام

کسی کی تشنہ لبی رنگ لا رہی ہے، کہ آج
لہُو لہُو ہے ترے ہاتھ میں شراب کا جام

ضرور دامنِ شب سے ڈھلک رہی ہے سحر
کہ بھیجتے ہیں ستارے بھی تیرگی کو سلام

ندیمؔ سینۂ گیتی سے جب بھی ہُوک اُٹھی
مری نگاہ جمی رہ سکی نہ برسرِ بام

۱۹۵۲ء

رہے اسیرِ قفس در قفس بہار میں ہم
مگر حقیر نہ تھے چشمِ روزگار میں ہم

کسی نے جس میں اُمیدِ سحر دلائی تھی
بھٹک رہے ہیں اسی رات کے غبار میں ہم

وہ ایک درد بنا زندگی کا سرمایہ
جسے پرو نہ سکے آنسوؤں کے تار میں ہم
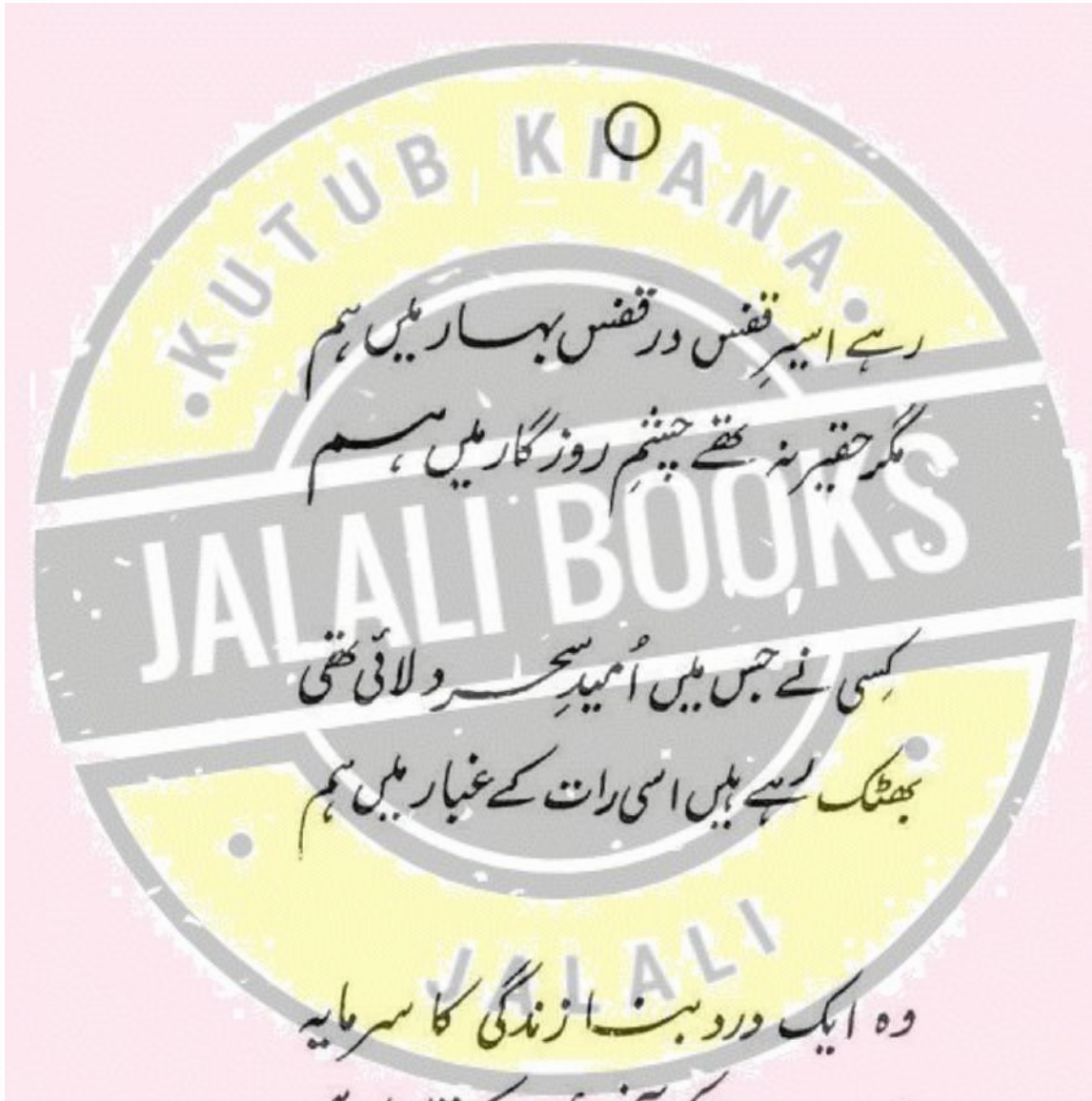
وہ آئے بھی تو بگولے کی طرح آئے گئے
چراغ بن کے جلے جن کے اِنتظار میں ہم

یہ اور بات کہ انجان بن گئے، ورنہ
ترے خرام کو پہچان لیں ہزار میں ہم

ترا جمال ہے یا خوابِ سایۂ گُل میں
پگھل رہے ہیں اُترتے ہُوئے خمار میں ہم

کبھی بہار بنے اور کبھی شکستِ بہار
ندیمؔ! جم نہ سکے حسن کے حصار میں ہم

۱۵۲/۱/ م
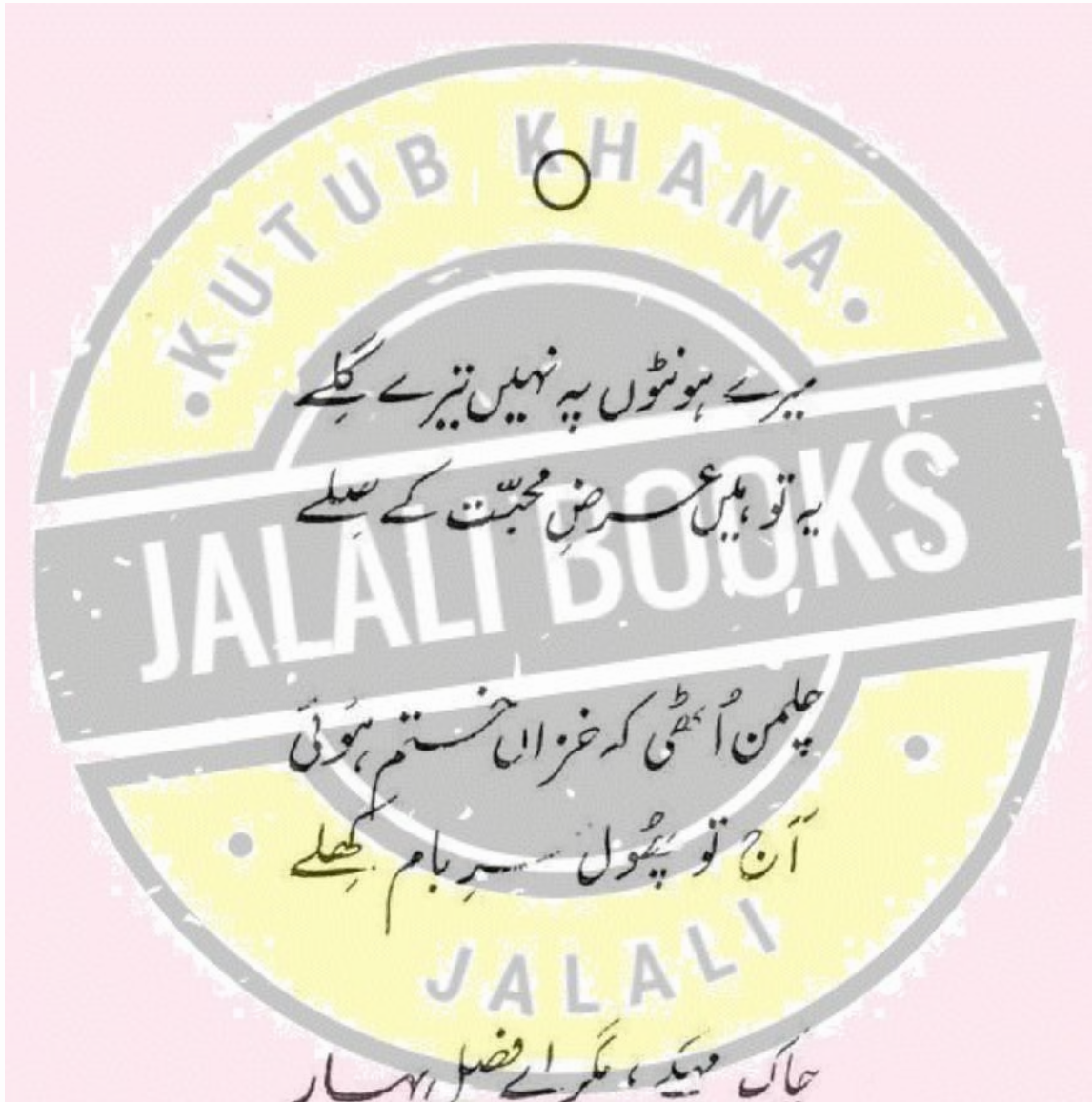
میرے ہونٹوں پہ نہیں تیرے گلے
یہ تو ہیں عرضِ محبّت کے صلے

چلمن اُٹھی کہ خزاں ختم ہوئی
آج تو پھول سرِ بام کھلے

چاک مہکے، مگر اے فصلِ بہار
ریشۂ گُل سے گریباں نہ سِلے

وقت ساکن بھی ہے، جولاں بھی ہے
چاند جس طرح ببولوں میں ہلے

غیر فانی ہی رہیں اُمیدیں
جب بھی یہ زخم سِلے اور چھلے

جُستجو موت سے کیا بہلے گی
ٹوٹ کر بھی تو ستارے نہ مِلے

۱۹۵۲ء
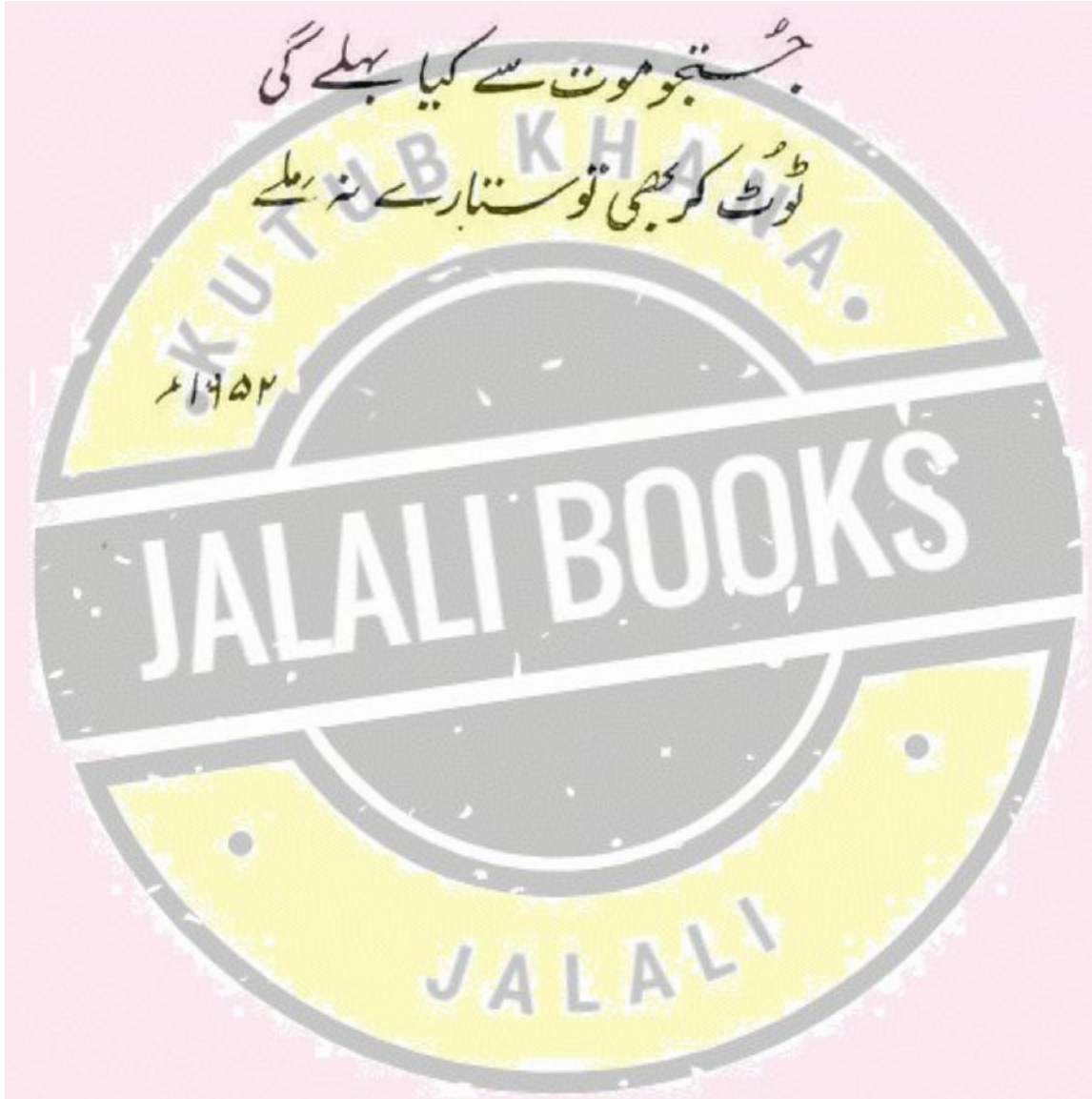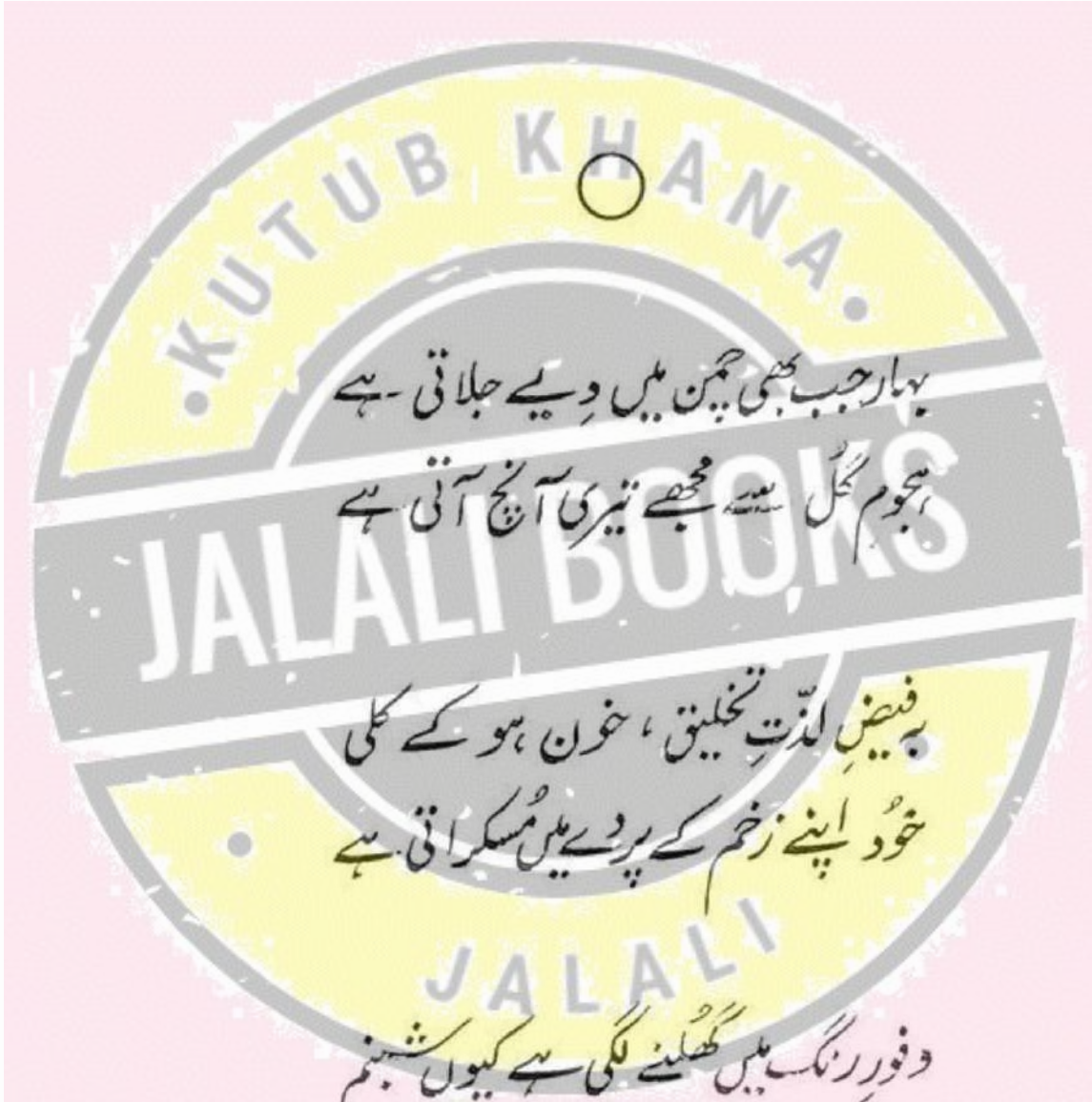
بہار جب بھی چمن میں دِیے جلاتی ہے
ہجومِ گُل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے

بہ فیضِ لذّتِ تخلیق، خون ہو کے کلی
خُود اپنے زخم کے پردے میں مُسکراتی ہے

وفورِ رنگ میں گھُلنے لگی ہے کیوں شبنم
عروسِ گُل کو اگر آئینہ دکھاتی ہے

یہ شب ہے یا شفق افشانیوں سے گھبرا کر
نگارِ شام حیا سے لٹیں گراتی ہے

یہ کائنات کا آہنگ ہے کہ سحرِ حیات
چٹک، کلی کی، ستاروں کو گدگداتی ہے

یہ رودِ آب، یہ تارے، یہ شہرِ لالہ و گل
ابھی وہ آنکھ نہ جھپکے اور رات جاتی ہے

۱۹۵۲ء

ہمہ سرمایۂ دامانِ چمن
ریشۂ گُل ہو کہ سُورج کی کرن

ہمہ اضداد ہے کردارِ جمال
صُبح کا نور ہے تاروں کا کفن

ٹُوٹتا ہے جو ستارہ کوئی
پھیلتی ہے مرے ماتھے کی شکن
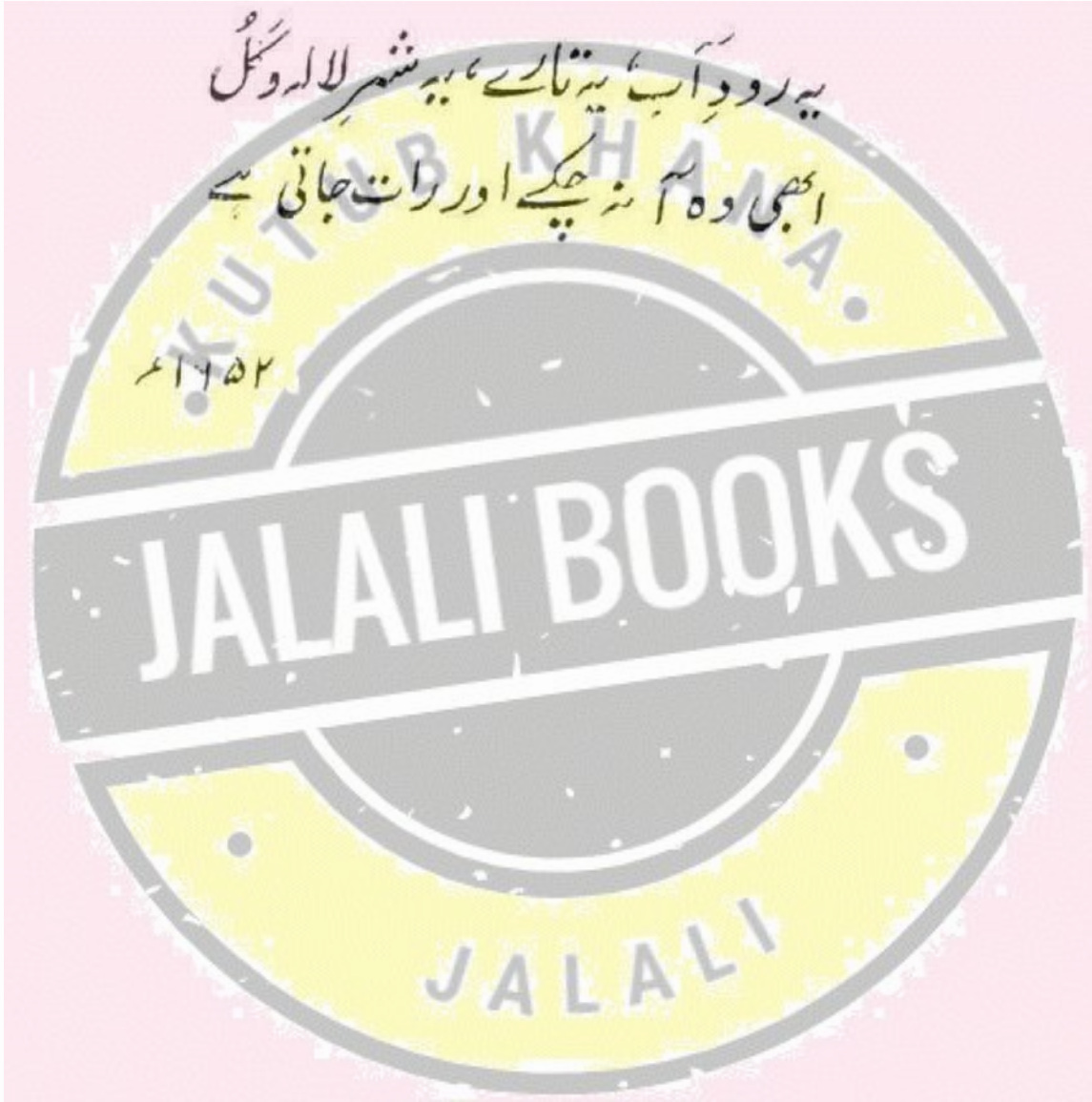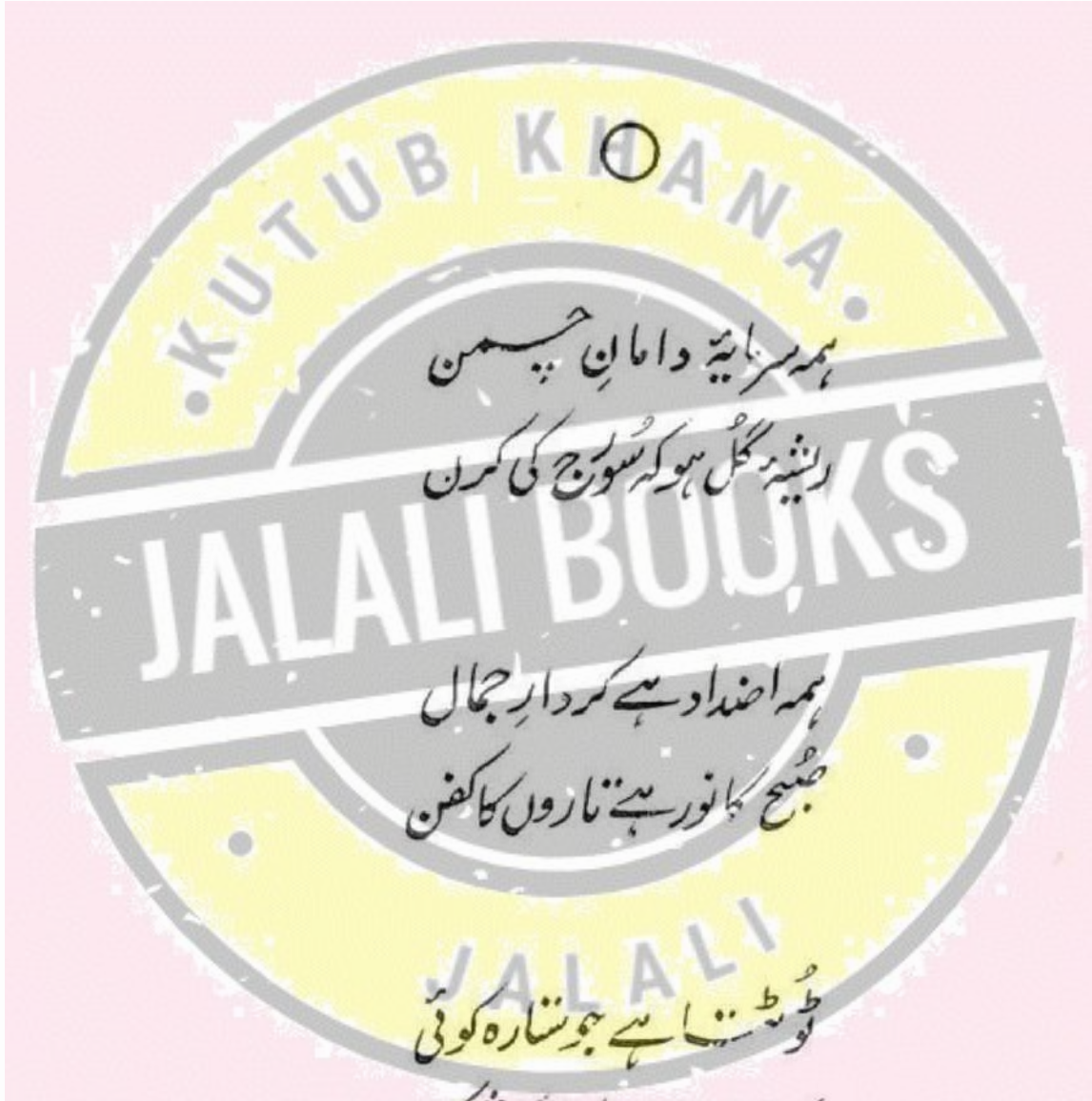
وقت کی آنکھ بنا جاتا ہے
تیرہ و تار قفس کا روزن

آج کچھ ذکر رفو کا بھی چلے
کب تلک چاک کروں پیراہن

مجھ کو آنکھوں کی چکاچوند سے کام!
ذہن روشن ہے تو دُنیا روشن

ہم نہ بدلیں گے اگر اپنا آپ
کون بدلے گا زمانے کے چلن

رات کو آگ نہ لگ جائے کہیں
آنچ دیتے ہیں ستاروں کے بدن

فن کے صحراؤں پہ ساون کی گھٹا
میرا بدلا ہُوا اندازِ سخن

۱۹۵۲ء

ہوتا نہیں ذوقِ زندگی کم
بنیادِ حیات ہے ترا غم

احساسِ جمال اُبھر رہا ہے
جب سے ترا التفات ہے کم

تیرے ہی غموں نے مجھ کو بخشی
کوندے کی لپک، غزال کا رَم
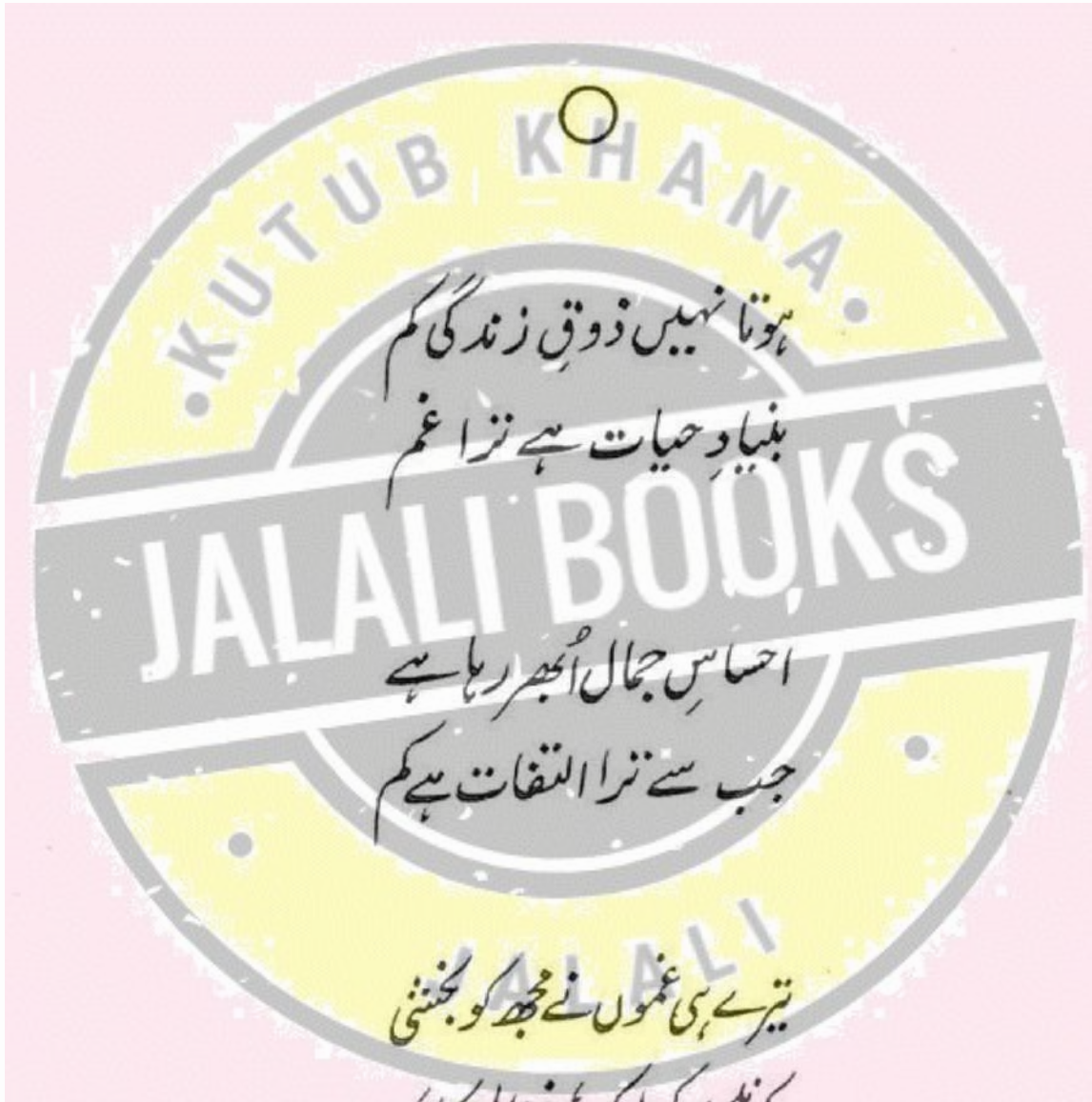
سامانِ ثبات ہیں سفر میں
اُمید کے پیچ، راہ کے خم

زخموں میں چٹک رہی ہیں کلیاں
ہوتی ہے یونہی بساطِ برہم

شمعوں کی لویں ہیں بازبانیں
آنسو ہیں کہ احتجاجِ بیہم

انجم سے کھلائے گی شگوفے
شبنم سے لدی ہوئی شبِ غم

طوفان کا منتظر کھڑا ہے
یہ عین سحر کو شب کا عالم

ڈسٹرکٹ جیل کیمبل پور ۱۹۵۱ء

آشوب بدل، خاک بسر، جاں بلب آئے
جب آئے تری بزم میں ہم با ادب آئے

جب تک تری دزدیدہ نگاہی ہے حیا بیز
کس طرح ہمیں آنکھ ملانے کا ڈھب آئے

وعدہ تو ہے شب کا، مگر اب دن نہ کٹے گا
حیراں ہوں کہ یہ آج کی شب جانے کب آئے

آفاق میں پھولوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا
جب میرے لبوں تک کسی کافر کے لب آئے

نومیدئ جاوید کا اللہ رے اعجاز
آئے مری آغوش میں، اور بے طلب آئے

میں وقت کے ظلمات میں حیران کھڑا ہوں
اللہ! مرا انجمن افروزِ شب آئے

کیمبل پور جیل ۱۹۵۱ء
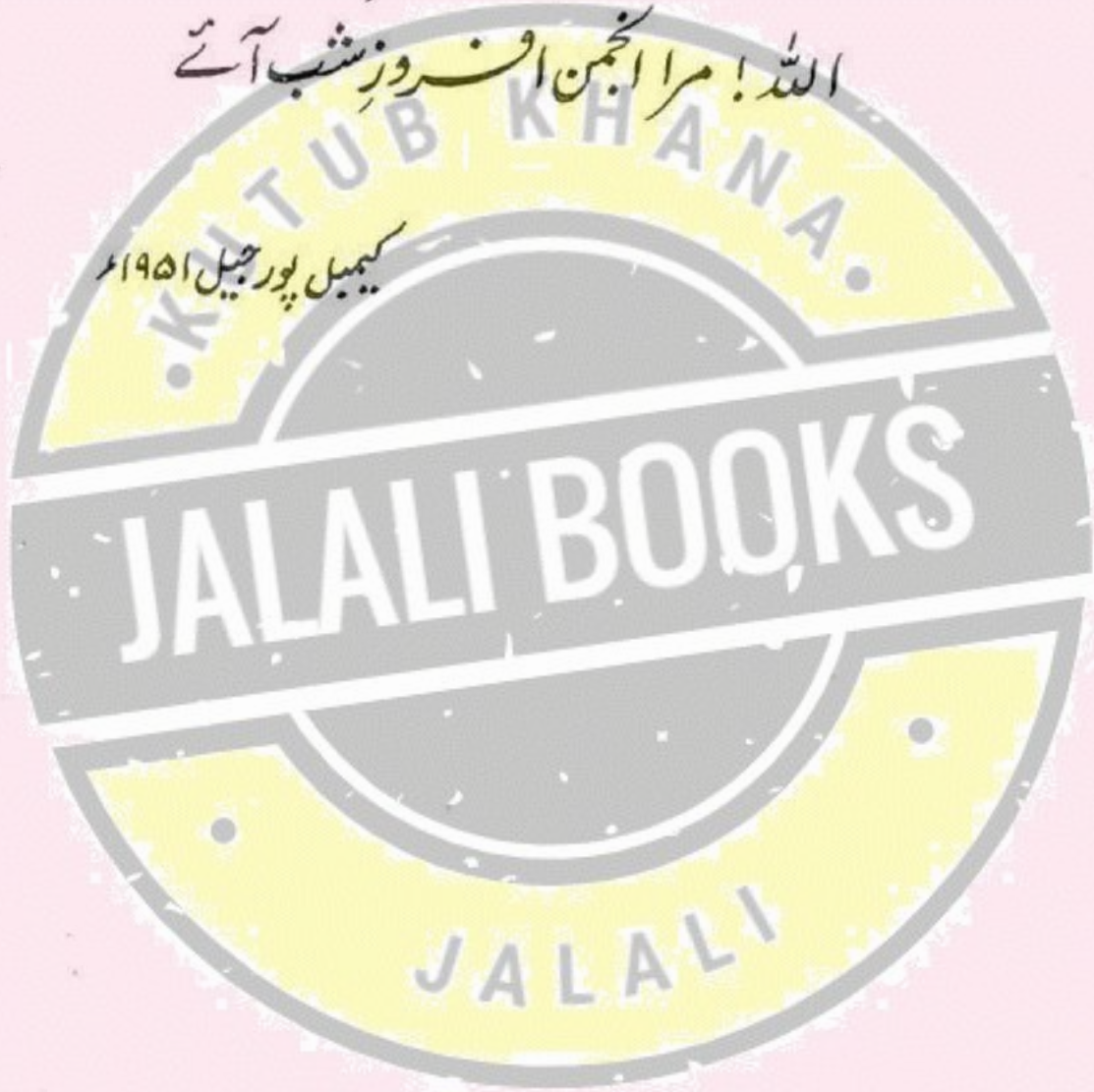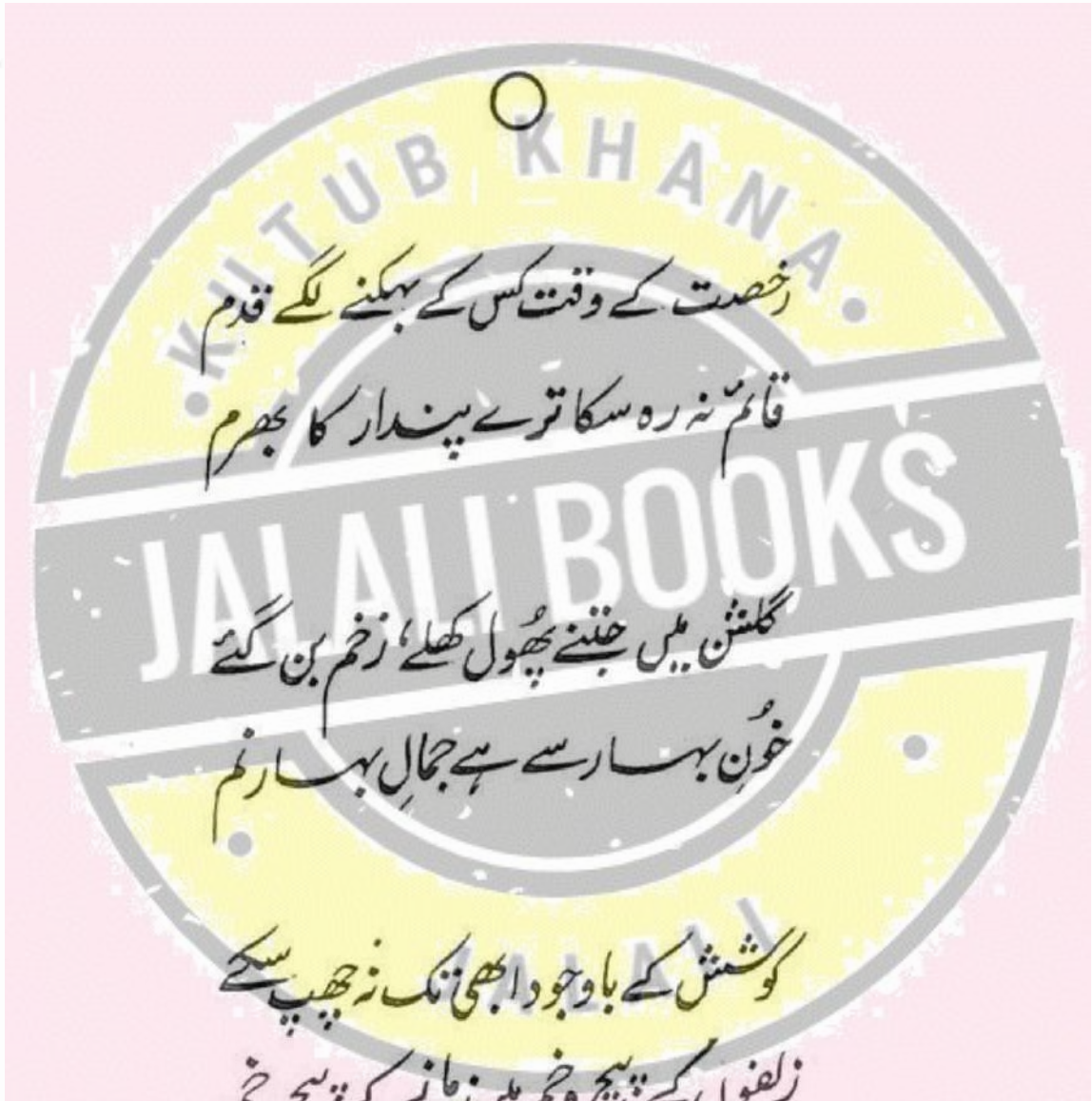
رخصت کے وقت کس کے بہکنے لگے قدم
قائم نہ رہ سکا ترے پندار کا بھرم

گلشن میں جتنے پھول کھلے، زخم بن گئے
خونِ بہار سے ہے جمالِ بہار نم

کوشش کے باوجود ابھی تک نہ چھپ سکے
زلفوں کے پیچ و خم میں زمانے کے پیچ و خم

صد شکر، تو نے خواب سے چونکا دیا مجھے
صد شکر، ہو رہا ہے ترا التفات کم

ذوقِ عبودیت ہے بہر رنگ حیلہ ساز
سجدے کے ساتھ ذہن میں ڈھلنے لگا صنم

تخلیقِ فن کروں گا بعنوانِ ارتقاء
جس ہاتھ میں قلم ہے اسی ہاتھ کی قسم

۱۹۵۱ء

○
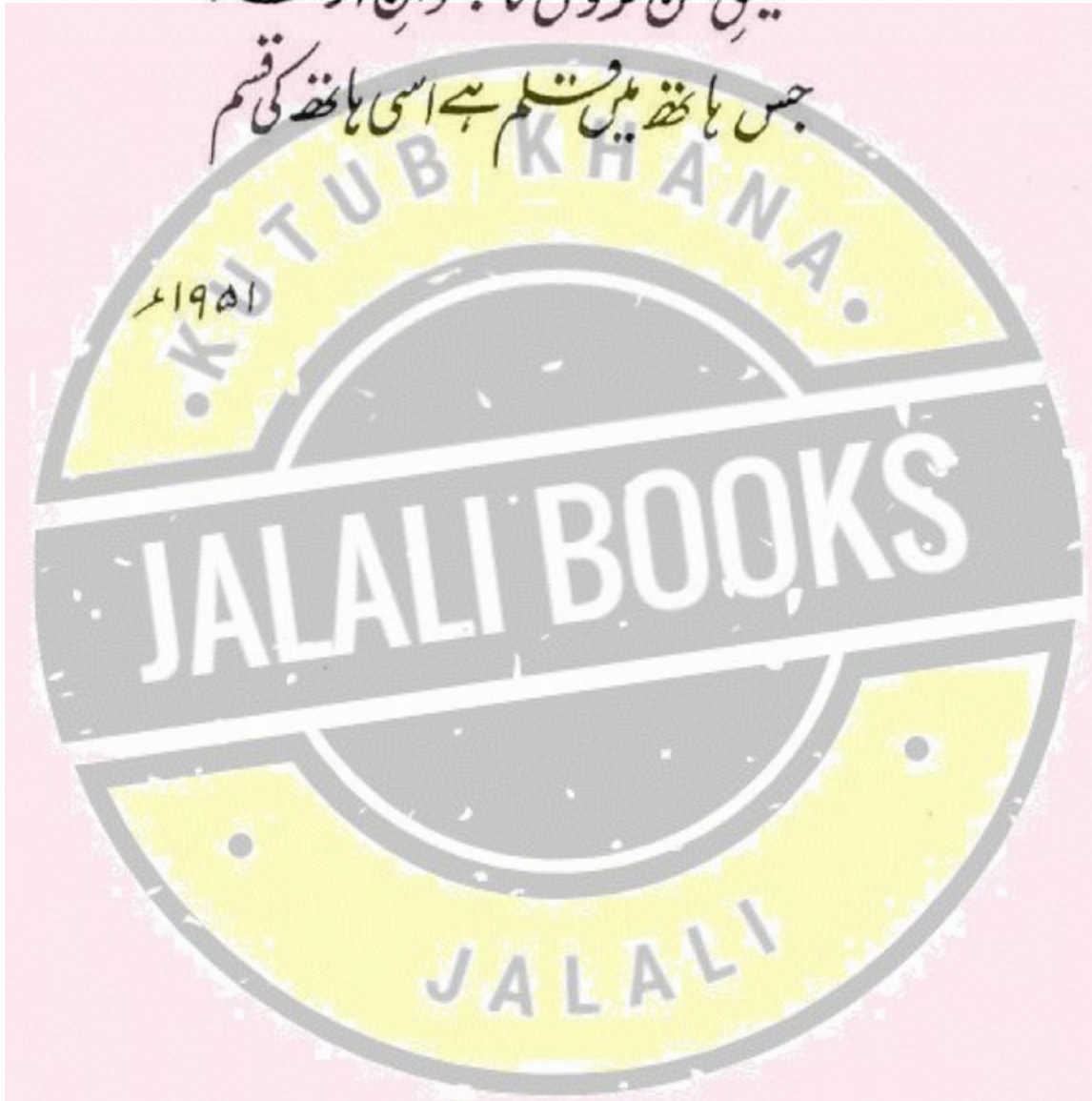
کیا ترے لطف کا معیار زباں بندی ہے؟
بات بے بات بدل جاتے ہیں تیور تیرے

اِک ہمیں کو نہ تجھے اپنا بنانا آیا
انجمن تیری ہے، مے تیری ہے، ساغر تیرے

یہی عنوانِ کرم ہے تو زہے لطف و کرم
سانس چلتی ہے تو چلتے رہیں نشتر تیرے

مَیں ترا عذرِ ستم مان تو لوں گا لیکن،
اس طرح اور بھی کھُل جائیں گے جوہر تیرے

اے مری قوم! مرا ذوقِ سفر کفر سہی
اور اگر دائرے بنتے رہیں رہبر تیرے!

۱۹۵۱ء

○

نمی میں ڈوب کے ٹھنڈی ہوائیں آئی تو ہیں
برس بھی جائیں گی آخر، گھٹائیں چھائی تو ہیں

خدا کا شکر، دھواں چھوڑتی ہوئی شمعیں
کسی خیال کے آتے ہی جگمگائی تو ہیں

لہو کے ساتھ شرارے جھڑیں تو بات بنے
بجا کہ آپ نے چوٹیں دلوں پہ کھائی تو ہیں

یہیں سے رنگِ رُخِ روزگار بدلے گا
کتھائیں دل کی بالآخر لبوں تک آئی تو ہیں

اب اس کے بعد مجھے فکر کیا کہ ہوگا کیا
وہ آنکھیں آج مرے غم پہ ڈبڈبائی تو ہیں

۱۹۵۱ء
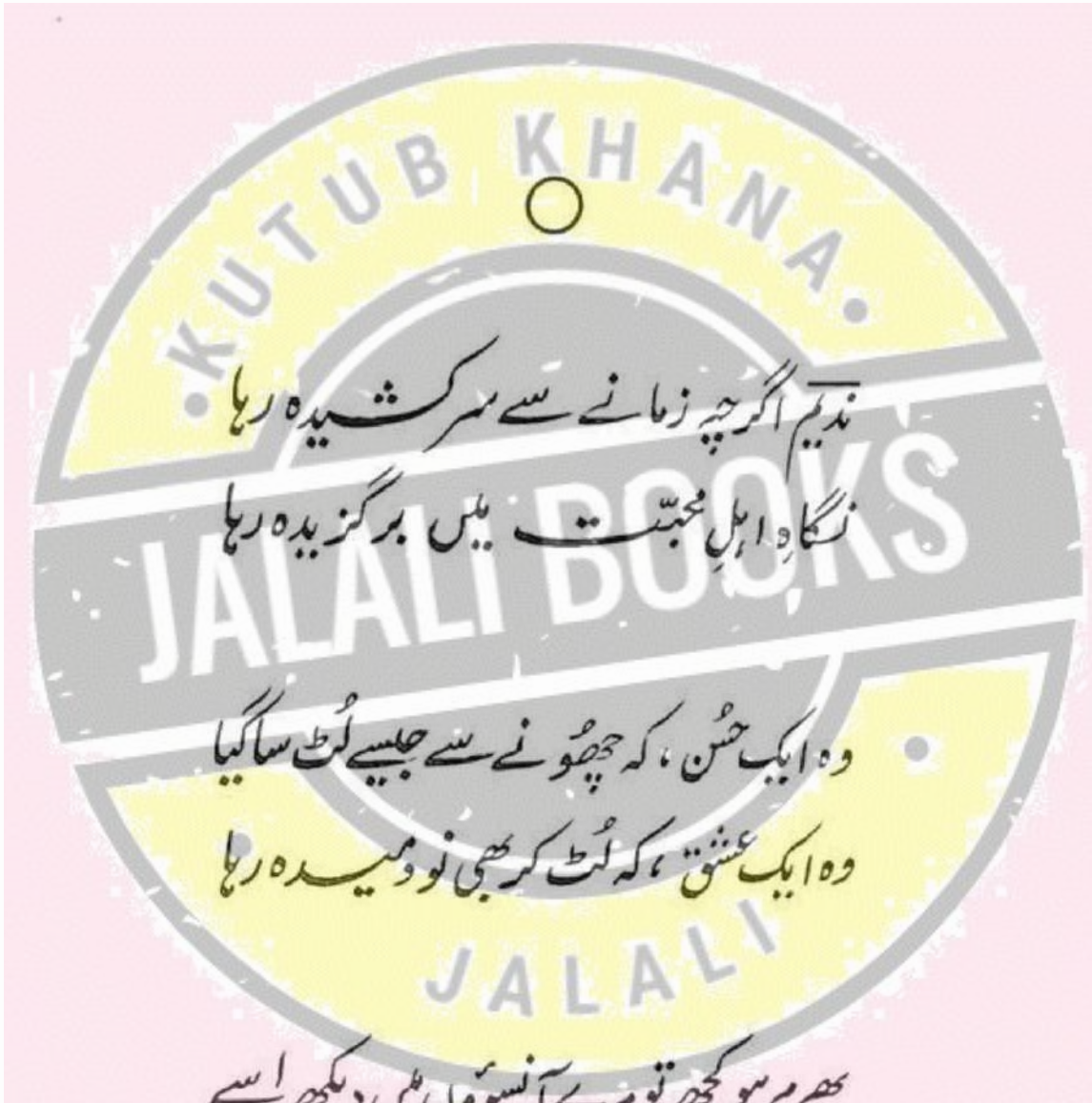
ندیم اگرچہ زمانے سے سرکشیدہ رہا
نگاہِ اہلِ محبت میں برگزیدہ رہا

وہ ایک حسن، کہ چھونے سے جیسے لُٹ سا گیا
وہ ایک عشق، کہ لُٹ کر بھی نو دمیدہ رہا

بھرم ہو کچھ تو مرے آنسوؤں میں دیکھ اسے
جو راز کھل بھی گیا اور ناشنیدہ رہا

الٰہی! حشر میں انساں سے یہ مواخذہ کیوں!
تُو نارسیدہ رہا، وہ فریب دیدہ رہا

شکایت اپنے توکّل سے ہے، خدا سے نہیں،
کہ میرا دامنِ امید ہی دریدہ رہا

خرد جو عام ہوئی، حُسنِ کائنات بنی
خود اپنی دُھن میں دلِ کائنات دیدہ رہا

سُنا ہے آج مشیّت پہ ڈالتا ہے کمند
وہ آدمی جو ازل سے ستم رسیدہ رہا

۱۹۵۱ء
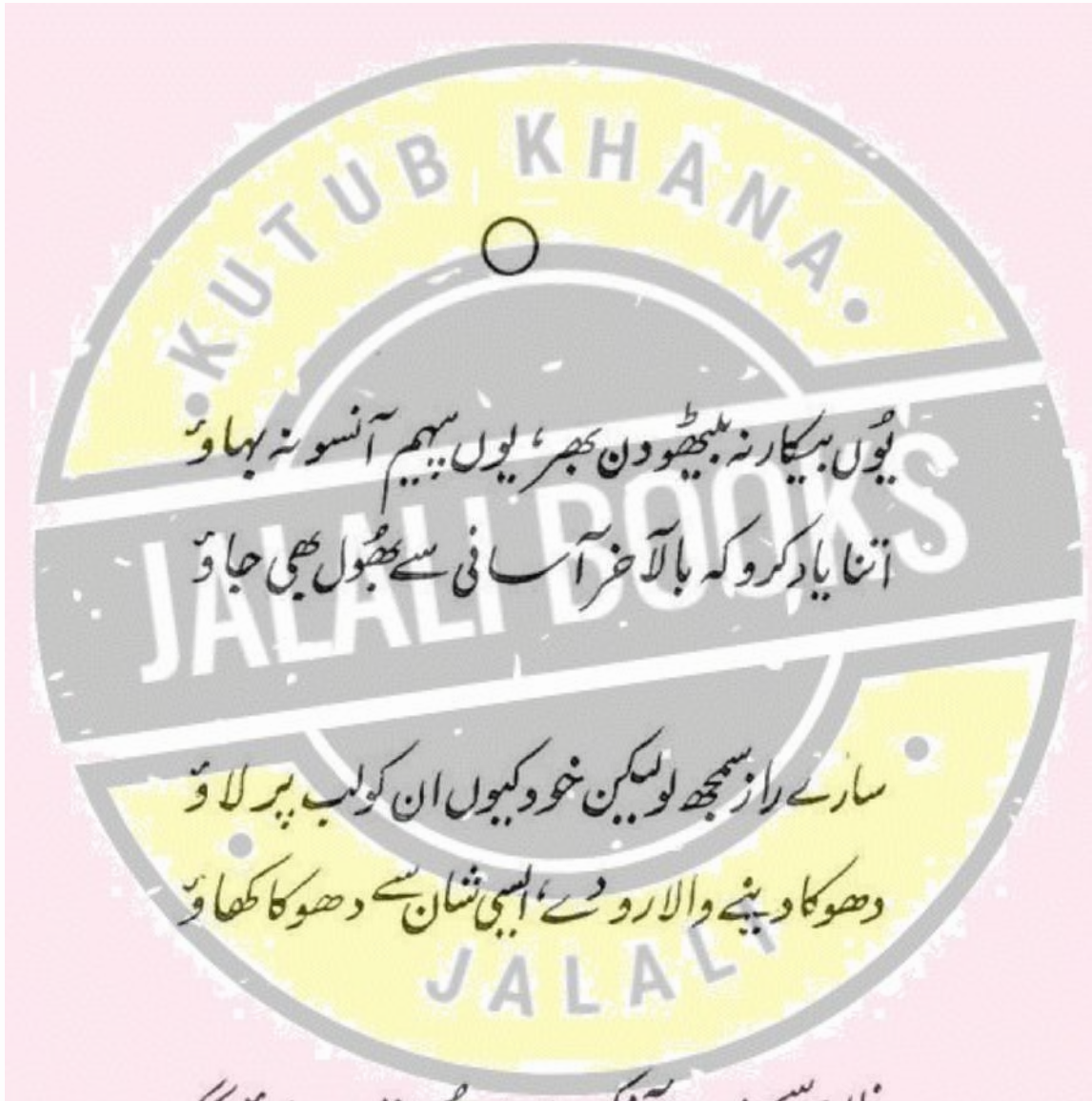
یوں بیکار نہ بیٹھو دن بھر، یوں پیہم آنسو نہ بہاؤ
اتنا یاد کرو کہ بالآخر آسانی سے بھول بھی جاؤ

سارے راز سمجھ لو لیکن خود کیوں ان کو لب پر لاؤ
دھوکا دینے والا رو دے، ایسی شان سے دھوکا کھاؤ

ظلمت سے مانوس ہیں آنکھیں، چاند ابھرا تو مند جائیں گی
بالوں کو الجھا رہنے دو، اک الجھاؤ سو سلجھاؤ

کل مجھ پر الزام تھا سارا، آج تو فق ہے رنگ تمھارا
کل تم مجھ سے شرمائے تھے، آج آئینے سے شرماؤ

پہلو تو لُٹ جائے گا لیکن آنکھیں تو ویراں نہ رہیں گی!
بے شک میرے پاس نہ بیٹھو لیکن اِتنی دُور نہ جاؤ

رَس کا زمانہ بیت چکا ہے، اب مَس ہے معراجِ محبّت
مَیں اِس دَور کا دیوانہ ہُوں، دل میں نہیں، نظروں میں سماؤ

کل کو کل پر رکھو، جب کل آئے گا دیکھا جائے گا
آج کی رات بہت بھاری ہے آج کی رات یہیں رہ جاؤ

کب تک یُوں پردے پردے میں حُسنِ محبّت کو جُھٹلاتا
موت کا دن بھی حشر کا دن ہے، چُھپنے والو، سامنے آؤ

دَورِ خزاں میں سُنتا ہُوں تخلیق کا یہ آہنگِ مسلسل
کلی کلی کی نرم چٹک میں چُھو لو! میری آہٹ پاؤ

مرنے سے کچھ کام چلا تو اے دم سازو مر بھی لیں گے
مرنا تو برحق ہے لیکن تم جینے سے باز نہ آؤ

۱۹۵۱ء

ہوا لپکتی رہے، میرا کارواں تو چلے
بُرا نہیں اگر اِک بار پھر چراغ جلے

غمِ حیات سے لُوں گارمِ حیات کا درس
تمام عُمر شکستوں پہ کون ہاتھ ملے

کِسے خبر کہ دھڑکتا ہے آفتابِ سحر
ٹھٹھرتے بھیگتے تاروں کی نرم چھاؤں تلے
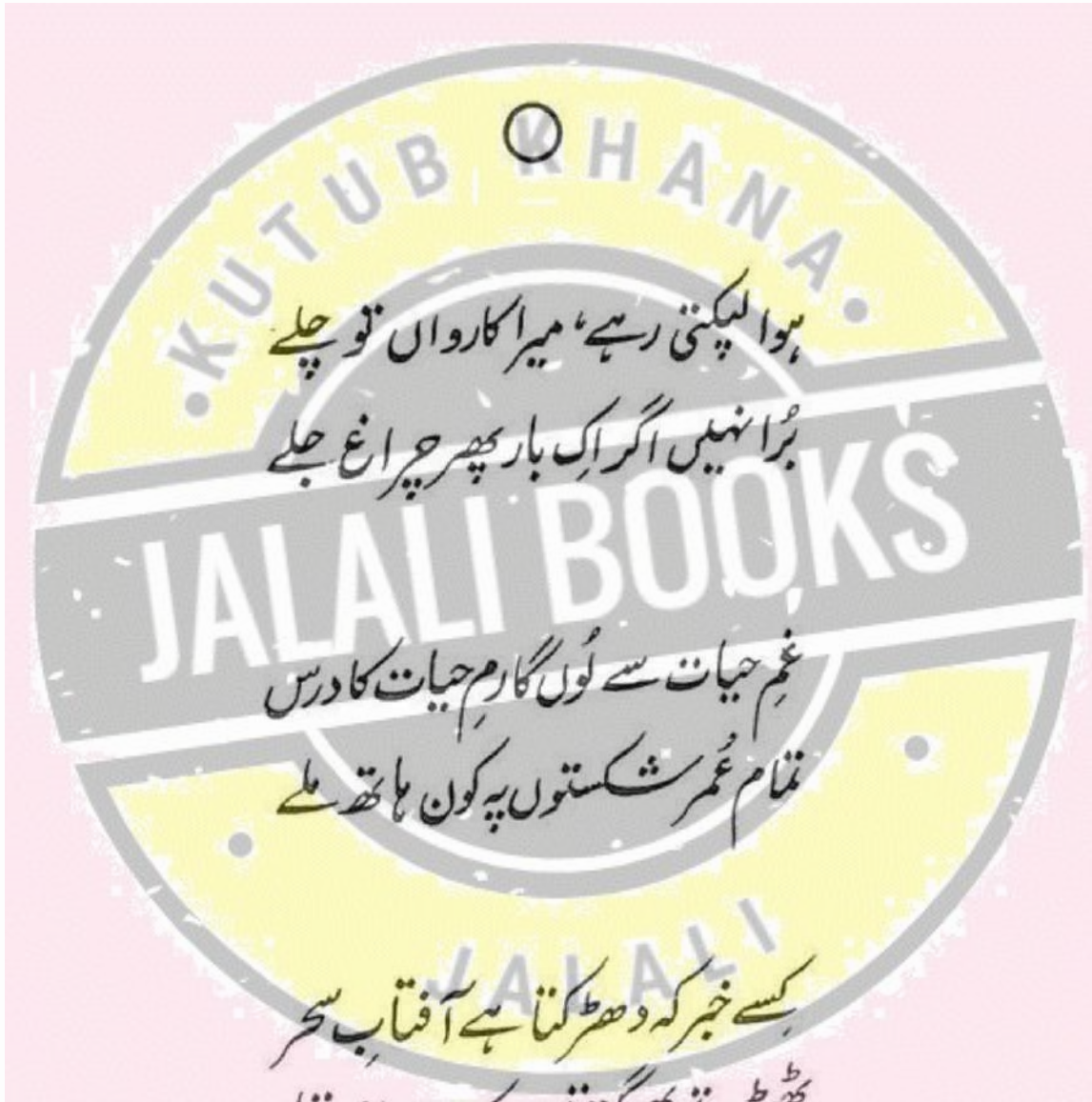
کڑھو نہ راہنماؤں کے عہد و پیماں پر
یہ وہ چمن ہیں جو پھُولے مگر کبھی نہ پھَلے

کسی کے طرزِ بیاں کا فریب کیوں کھاؤں
کہ بات ایک ہے۔ سائے بڑھیں کہ دھوپ ڈھلے

زمیں کا درسِ نمو کس طرح قبول کریں
جو ایک عُمر خلا میں رہے، فلک میں پلے

ندیمؔ! جن کے ارادوں میں ڈھل رہی ہے حیات
ہم ایسے "فن کے اماموں" سے وہ عوام بھلے

۱۹۵۰ء

○
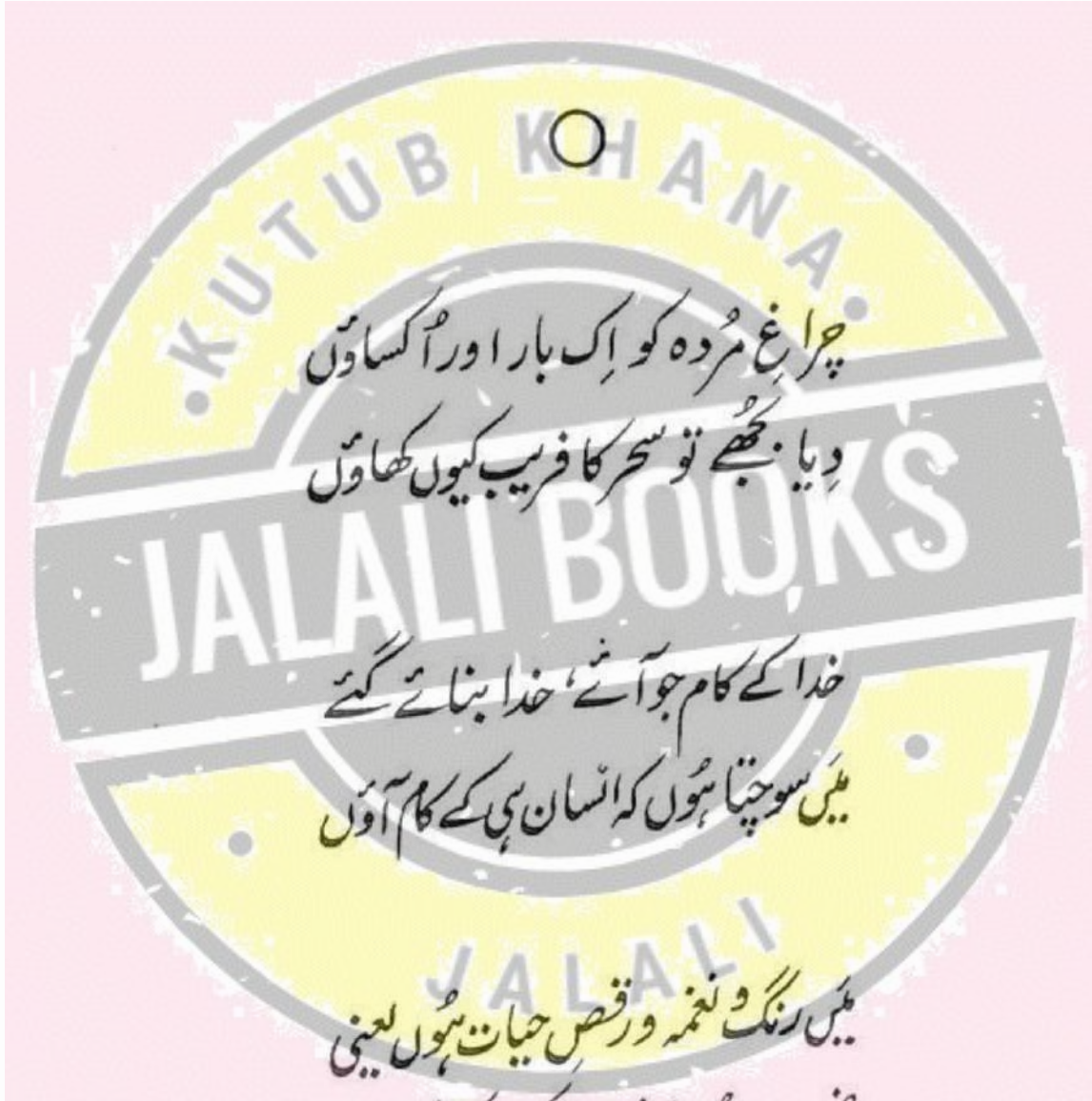
چراغِ مُردہ کو اِک بار اور آکساؤں
دِیا بُجھے تو سحر کا فریب کیوں کھاؤں

خدا کے کام جو آئے، خدا بنائے گئے
مَیں سوچتا ہُوں کہ انسان ہی کے کام آؤں

مَیں رنگ و نغمہ و رقصِ حیات ہُوں یعنی
ضمیرِ دہر ہُوں، شاہوں کے ہاتھ کیا آؤں

رچی ہُوئی ہے رفاقت مرے رگ و پے میں
کچھ اس طرح کہ اکیلا چلوں تو گھبراؤں

ستارے ٹوٹ کے کلیوں کے رُوپ میں چٹکیں
ذرا زمین کے پندار کو جو اُکساؤں

کسی کی زلف بھی منّت پذیرِ شانہ سہی
مگر میں گیسوئے گیتی تو پہلے سلجھاؤں

کئی برس سے مجھے مل رہا ہے درسِ خودی
یہی کہ تیرگیوں میں ہوا سے ٹکراؤں

میں اب سے دُور فرشتوں کے گیت لکھتا رہا
یہ آرزو ہے کہ اب آدمی کو اپناؤں

۱۹۵۰ء
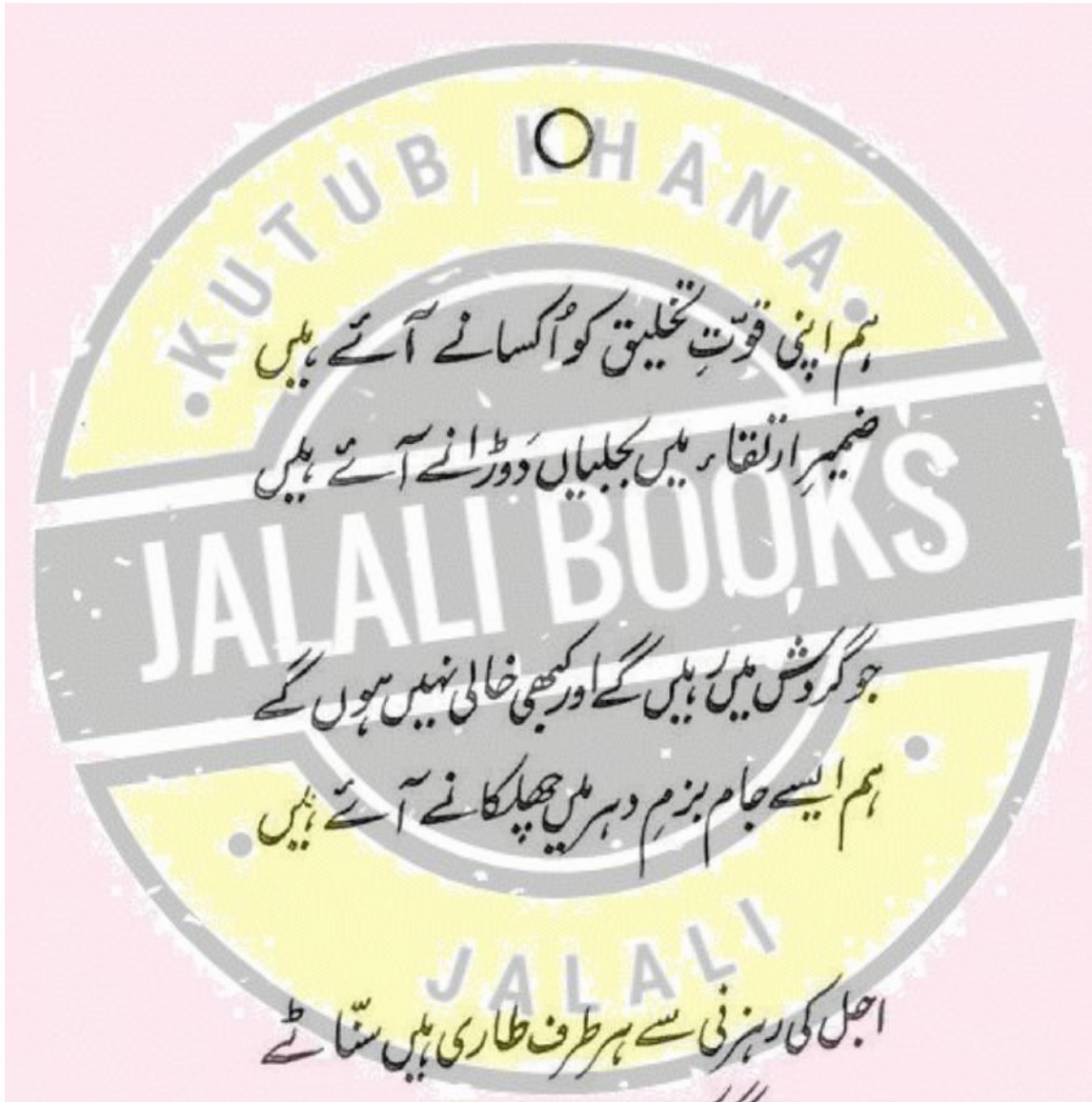
ہم اپنی قوتِ تخلیق کو اُکسانے آئے ہیں
ضمیرِ ارتقاء میں بجلیاں دوڑانے آئے ہیں

جو گردش میں رہیں گے اور کبھی خالی نہیں ہوں گے
ہم ایسے جام بزمِ دہر میں چھلکانے آئے ہیں

اجل کی رہزنی سے ہر طرف طاری ہیں سنّاٹے
سرودِ زندگی کو نیند سے چونکانے آئے ہیں

ہوائیں تیز ہیں، جل جل کے بجھتے ہیں چراغ اپنے
ارادے تند ہیں، ہم شمعِ نو بھڑکانے آئے ہیں

وہ دیوانے جو ہمّت ہار کر بیٹھے تھے صدیوں سے
اب اپنی منجمد تقدیر سے ٹکرانے آئے ہیں

عروسِ زندگانی کا سوئمبر رچنے والا ہے
نئے ارجن مشیّت کی کماں لچکانے آئے ہیں

اگست ۱۹۵۰ء

اگرچہ آج وہ اگلا سا التفات نہیں
میں شکوہ سنج نہیں ہا تو خدا کی ذات نہیں

وہ نغمہ گر نہیں صرف ایک مرثیہ خواں ہے
کہ جس کے چنگ میں آہنگِ کائنات نہیں

مری شکست میں انسانیت ہے نالہ کناں
یہ سانحات فقط میرے سانحات نہیں
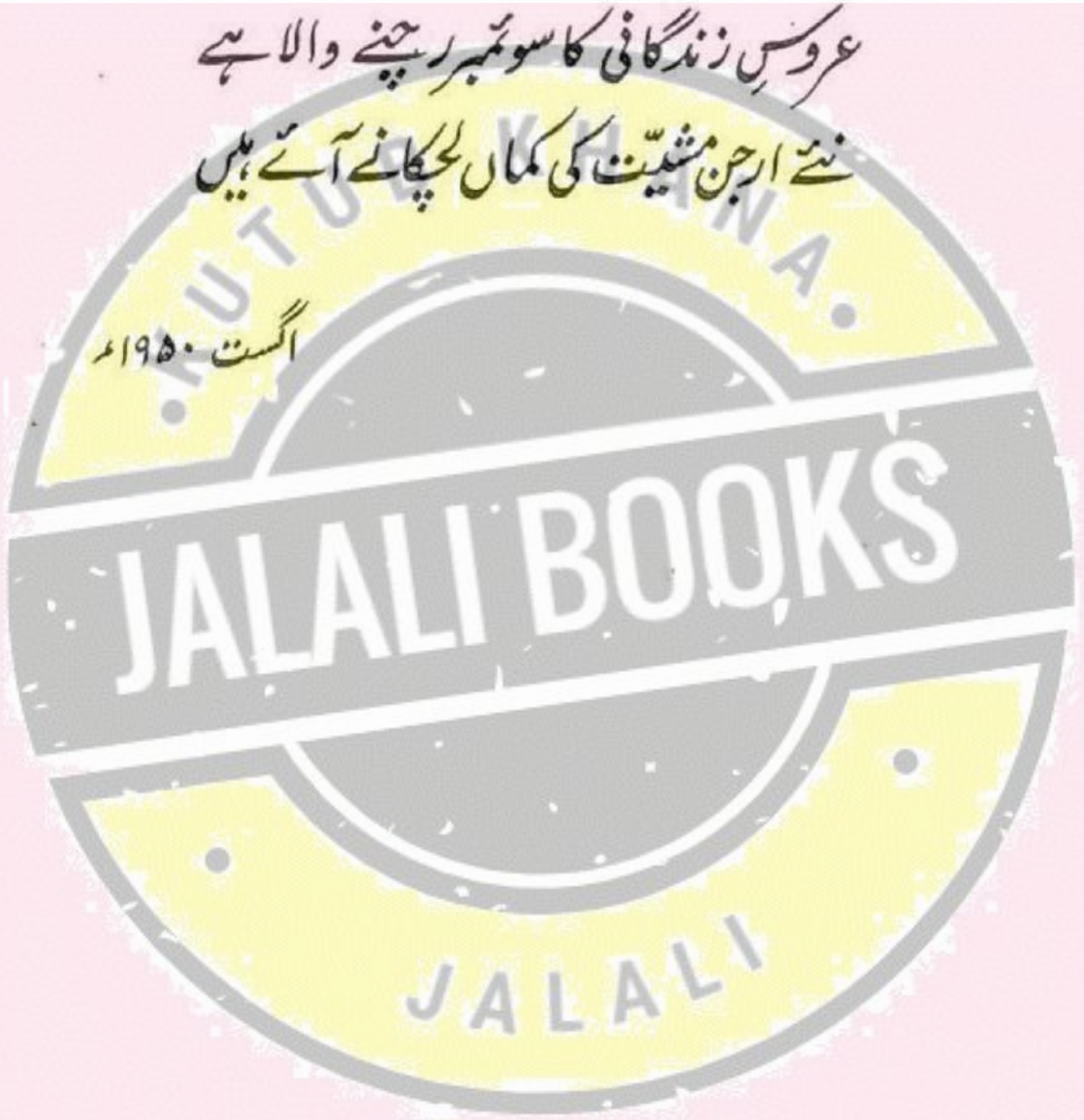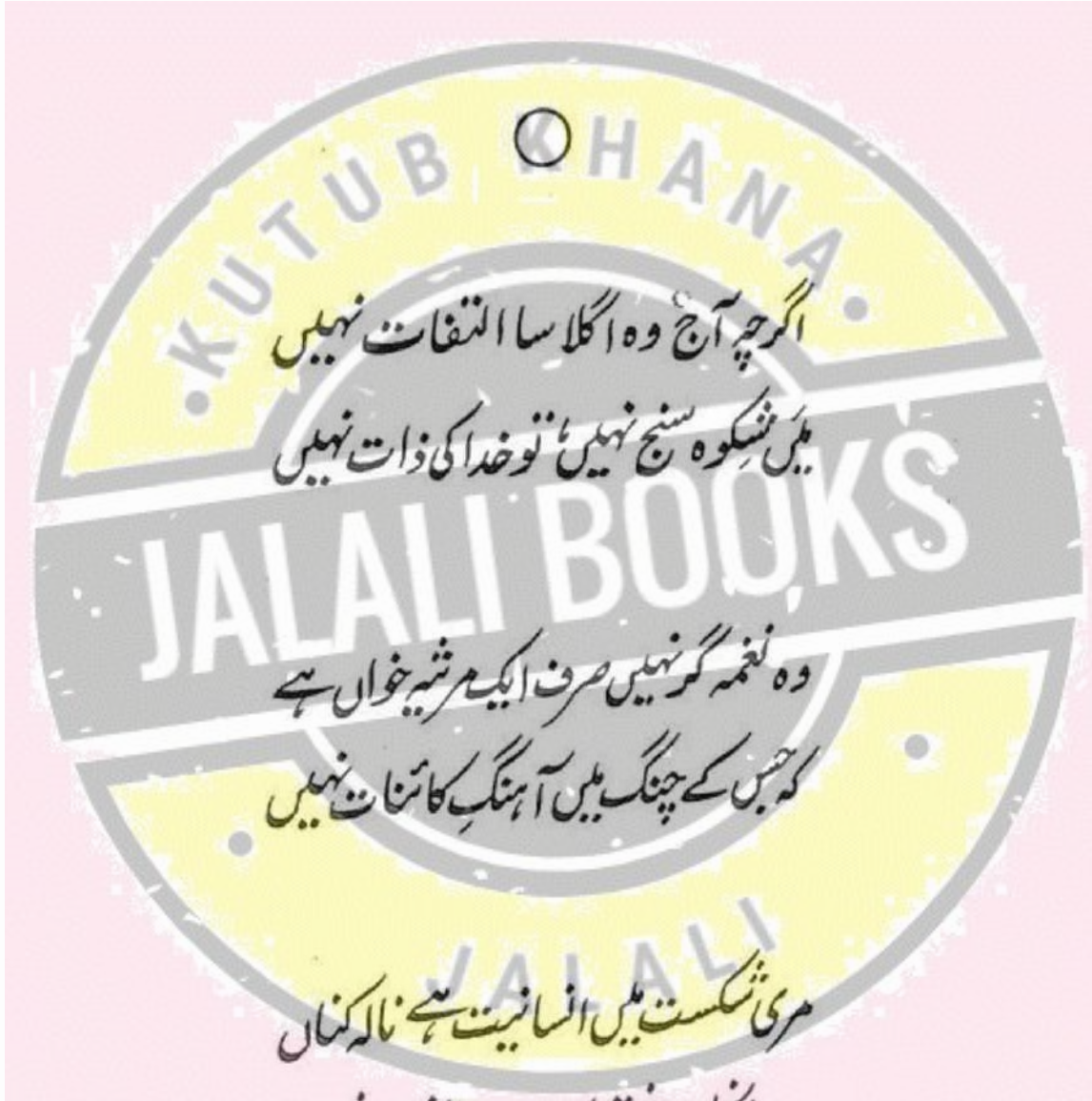
چراغِ راہ ہے میرا غرورِ خود نگری
فقط خدا کی پرستش رہِ نجات نہیں

میں گُل کو دیکھ کے تخلیقِ گُل کی سوچتا ہوں
گلوں کو دیکھتے رہنا تو کوئی بات نہیں

یہ راستے تو مرے ہاتھ کی لکیریں ہیں
جو تُو رفیقِ سفر ہو تو رات، رات نہیں

۱۹۵۰ء

○

ہجومِ فکر و نظر سے دماغ جلتے ہیں
وہ تیرگی ہے کہ ہر سُو چراغ جلتے ہیں

کچھ ایسا تند ہُوا جا رہا ہے بادۂ زیست
کہ ہونٹ کانپتے ہیں اور ایاغ جلتے ہیں

چمک رہے ہیں شگوفے، دہک رہے ہیں گلاب
وفورِ موسمِ گُل ہے کہ باغ جلتے ہیں

نہیں قریب تو کچھ دُور بھی نہیں وہ دَور
شفق کے رُوپ میں جس کے سراغ جلتے ہیں

ترے نصیب میں راتیں، مرے نصیب میں دن
ترے چراغ، مرے دل کے داغ جلتے ہیں

۱۹۵۰ء

○

بڑی مانوس لَے میں ایک نغمہ سُن رہا ہُوں مَیں
کِسی ٹُوٹی ہُوئی چھاگل کی کڑیاں چُن رہا ہُوں مَیں

یہاں اب اُن کے اظہارِ محبّت کا گزر کیا ہو
کہ سنّاٹے کی موسیقی پہ بھی سَر دُھن رہا ہُوں مَیں

شبِ وعدہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی
کہ برسوں سے مسلسل ایک آہٹ سُن رہا ہُوں مَیں

تصوّر میں ترے پیکر کا سونا گھُل گیا ہو گا
ابھی تک لمس کی کیفیّتوں میں بھُن رہا ہُوں مَیں

خدا کا شکر، احساسِ زیاں مرنے نہیں پایا
ستارے چُگنے نِکلا تھا، شرارے چُن رہا ہُوں مَیں

۱۹۵۰ء

افق نہاں ہے تو حدِ نظر کا ذکر کریں
ستارے ڈوب رہے ہیں، سحر کا ذکر کریں

فضا کا ذکر کریں، بحر و بر کا ذکر کریں
بہت بلند ہے فردوس — گھر کا ذکر کریں

صدف کو سامنے پا کر گہر کا ذکر کریں
نظر کے ساتھ ہی حسنِ نظر کا ذکر کریں
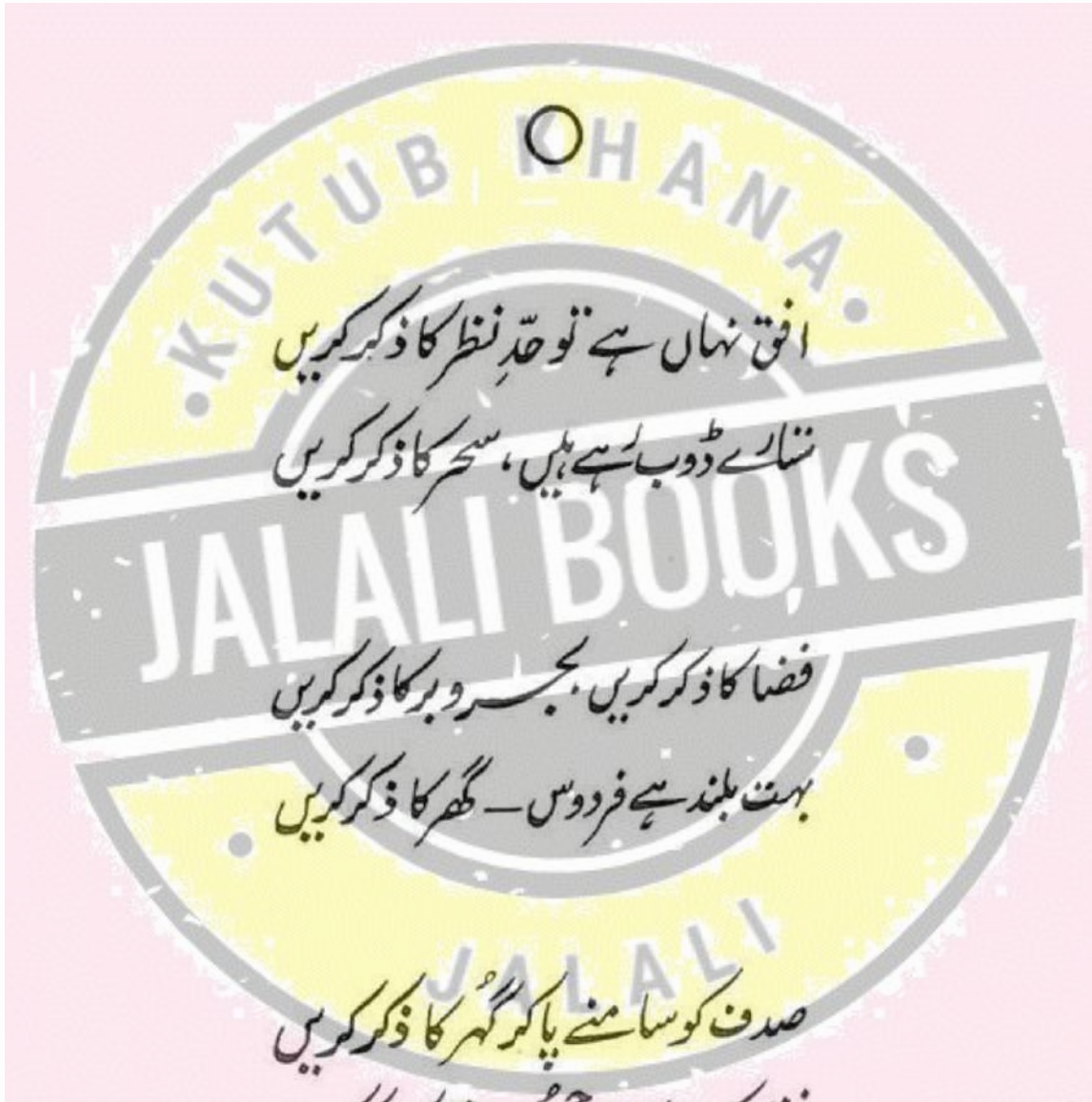
خزاں کو بوئے گل و نسترن سے چھلکا دیں
اگر بہار نہیں، برگ و بر کا ذکر کریں

ہمیں تو عظمتِ انساں کو آزمانا ہے
حضور فلسفۂ خیر و شر کا ذکر کریں

فرار کا یہ نیا روپ ہے، اگر ہم لوگ
چراغ توڑ کے نورِ سحر کا ذکر کریں

ستارے کون چنے گا بدستِ زخم آلود
چلو غبارِ سرِ رہگزر کا ذکر کریں

اگر نہایتِ بے چارگی ہے چارہ گری
تو کس امید پہ زخمِ جگر کا ذکر کریں

تمام عمر کیے چاک دامنی کے گلے
بعزمِ بخیہ گری بخیہ گر کا ذکر کریں

مرے ندیم! مری ذات کو سمجھ کر آپ
مرے کلام کے نقص و اثر کا ذکر کریں

۱۹۵۰ء

بن ہو، ابر ہو، تیز ہوا ہو
تیرے حُسن کا دِیا جلا ہو

پو بھی پھٹی، طوفان بھی اُٹھا
اب کوئی کیا جانے کیا ہو
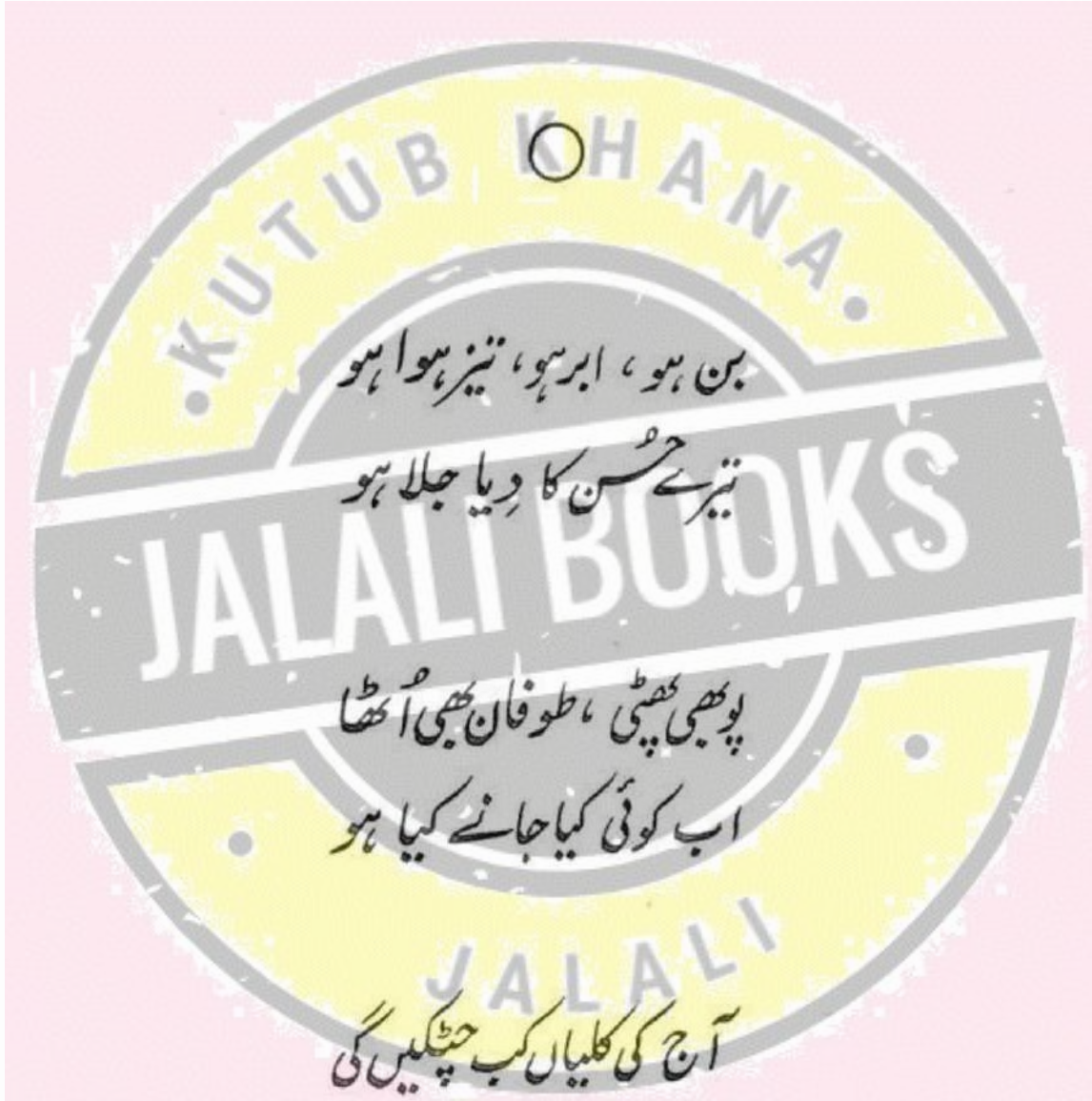
آج کی کلیاں کب چٹکیں گی
شاید مستقبل کو پتا ہو

چاند بھی ساکن، وقت بھی ساکن
شاید تُو کچھ سوچ رہا ہو

پت جھڑ میں کیوں پھول نہ ڈھونڈے
جس نے تجھے کھو کر پایا ہو

بیلیں سی بل کھاتی ہیں جب
کوئی سہارا ٹوٹ چلا ہو

تُو نے یُوں شرما کر دیکھا
جیسے تھک کر دیا بُجھا ہو

میری تنہائی کی دُعا ہے
تیرے ساتھ بھری دُنیا ہو

وقتِ سحر یُوں کلیاں چٹکیں
جیسے تیرا نام لیا ہو

انساں کا معیار یہی ہے
خوب دُکھی ہو، خوب اچھا ہو

دِیے بُجھے ہیں، پھول کھلے ہیں
شاید یہ شہراہِ صبا ہو

تو کہتا ہے تارا ٹُوٹا
اور اگر آنسُو ٹپکا ہو!

۱۹۴۹ء
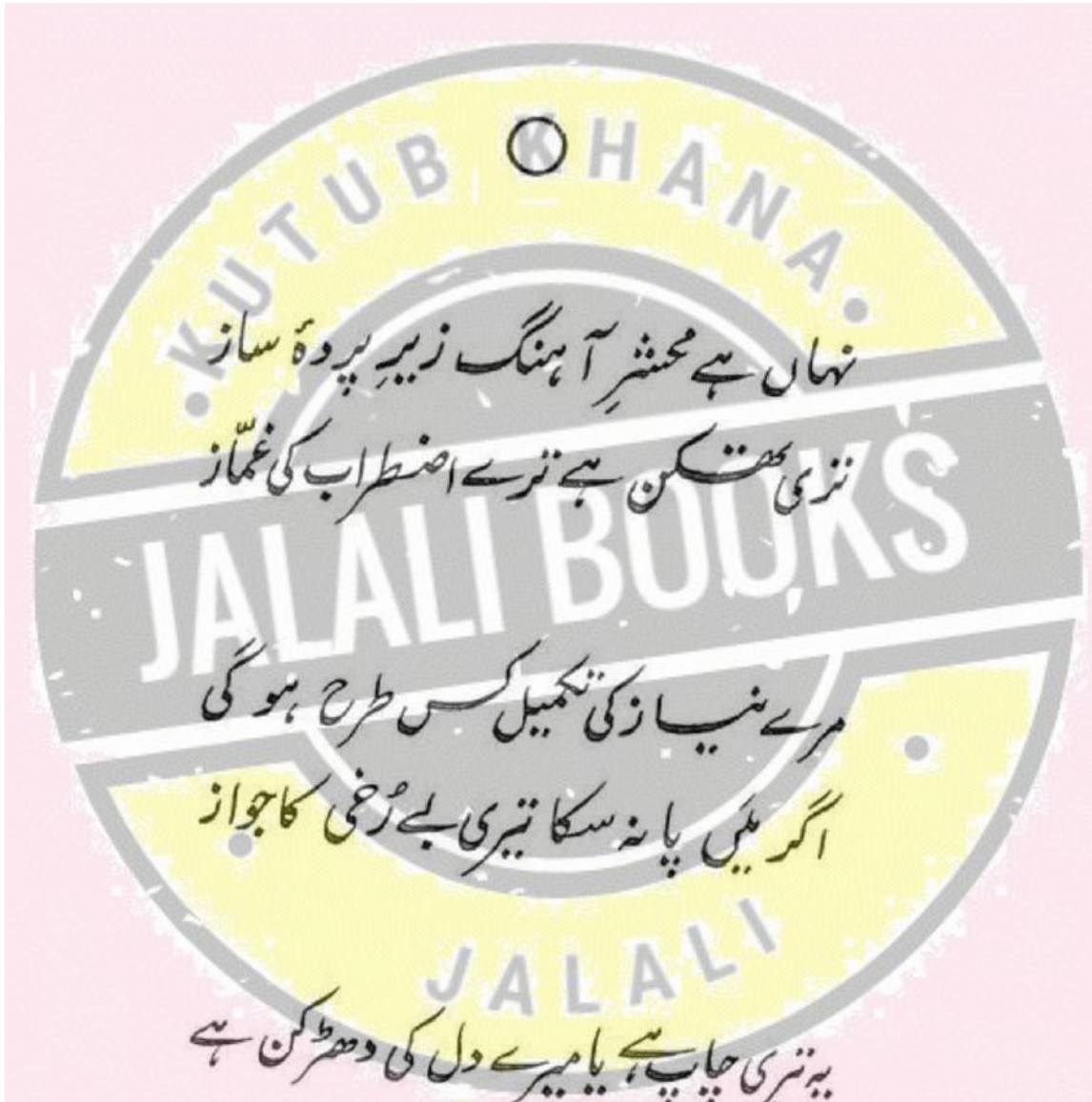
نہاں ہے محشرِ آہنگ زیرِ پردۂ ساز
تری دھڑکن ہے ترے اضطراب کی غمّاز

مرے نیاز کی تکمیل کس طرح ہو گی
اگر میں پا نہ سکا تیری بے رُخی کا جواز

یہ تیری چاپ ہے، یا میرے دل کی دھڑکن ہے
بہت قریب سے آئی ہے دُور کی آواز

بُرا نہ مان، تو دامن سے چُن لوں اشک ترے
کہ میں ہی تھا تری دوشیزگی کا آئینہ ساز

ترے غرور میں پنہاں مرا غرورِ شکست
میں تیرے راز نہ کھولوں گا، میرے محرمِ راز

ابھی کچھ اور سُلگنا ہے وقت کی لَو پر
ابھی نہیں مرے معیارِ زندگی میں گداز

غبار، اوجِ بصارت۔ ستارے بارِ نظر
بہت لطیف ہیں احساس کے نشیب و فراز

کچھ ایسا نرم ہُوا میرا ذوقِ خودنگری
مرے لیے مرا دشمن بھی ہے مرا دمساز

ندیمؔ! فلسفۂ صبر کو دعائیں دیں
بایں غریب کُشی، جور ہے غریب نواز

اگست ۱۹۴۹ء

○

گو مرے دل کے زخم ذاتی ہیں
ان کی ٹیسیں تو کائناتی ہیں

آدمی شش جہات کا دُولھا
وقت کی گردشیں براتی ہیں

فیصلے کر رہے ہیں عرش نشیں
آفتیں آدمی پہ آتی ہیں

کلیاں کس دَور کے تصوّر میں
خُون ہوتے ہی مُسکراتی ہیں

تیرے وعدے ہوں جن کے شاملِ حال
وہ اُمنگیں کہاں سماتی ہیں

۱۹۴۹ء

○

رَس میں جو بات ہے وہ مَس میں نہیں
اب مرا عشق میرے بس میں نہیں

جس میں گھُل جائے خود جرس کا وجود
اِک وہ نغمہ ابھی جرس میں نہیں

کِس نے ڈھالا تھا پیکرِ آدم
کوئی لذّت اگر ہوس میں نہیں

کاکلیں کھیلتی ہیں شانوں پر
کائنات اب کسی کے بس میں نہیں

شانِ اظہار آنسوؤں کی ندیم
میری فریادِ دُور رَس میں نہیں

۱۹۴۸ء
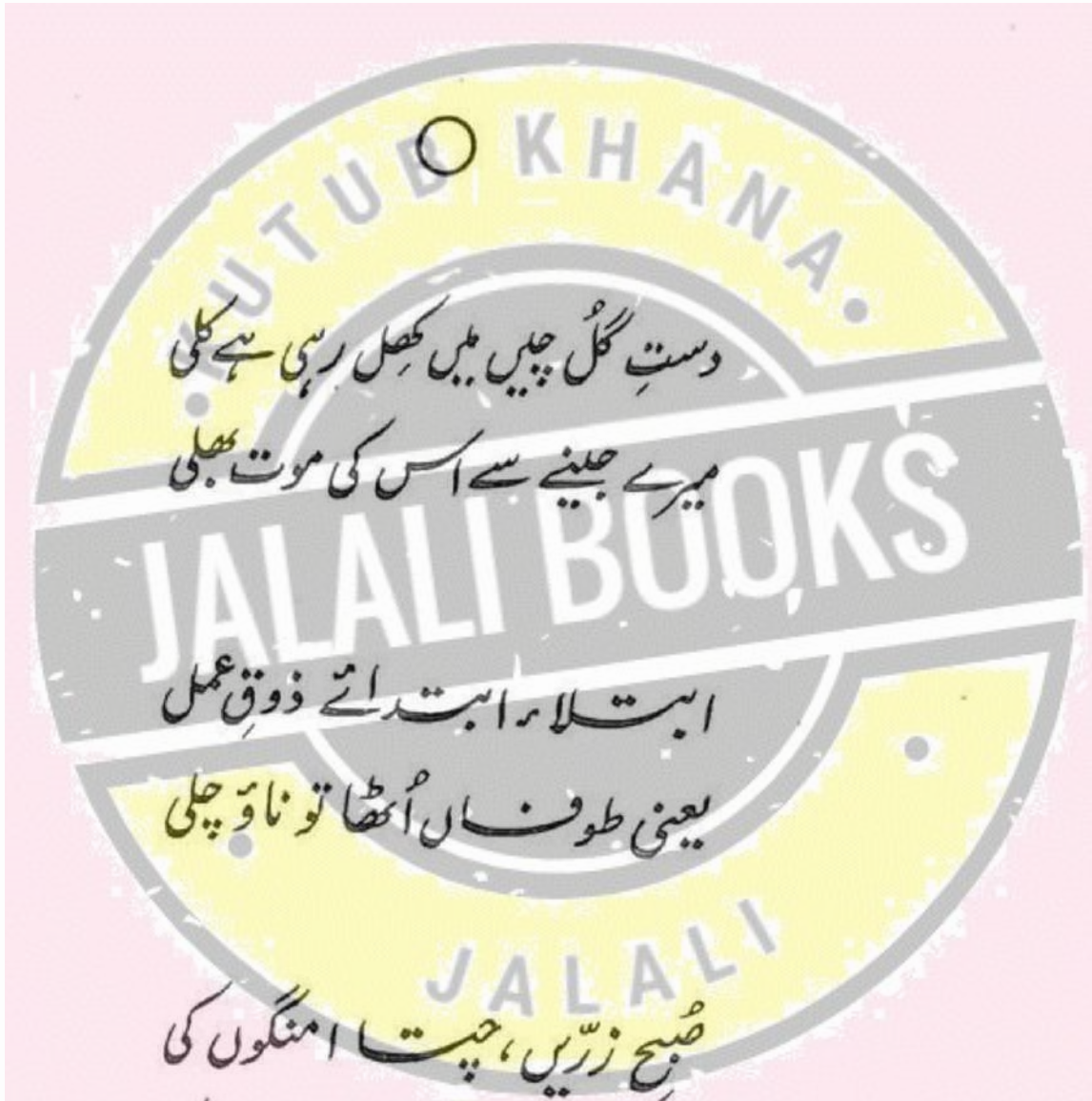
دستِ گُل چیں میں کھِل رہی ہے کلی
میرے جلنے سے اُس کی موت بھلی

ابتلاء ابتدائے ذوقِ عمل
یعنی طوفاں اُٹھا تو ناؤ چلی

صُبحِ زرّیں، جیتا امنگوں کی
رات کے ساتھ ہی وہ بات ٹلی

شاخِ اُمّید کی بہار نہ پوچھ
برسوں پھُولی مگر کبھی نہ پھلی

چشمِ سرشار میں حیا چمکی
ساغرِ مے میں چاندنی کی ڈلی

گردشِ چشم ہے کہ گردشِ دہر
پلکیں جھکنے لگیں کہ دھوپ ڈھلی

کائنات ایک دشتِ بے انجام
اب کہاں ڈھونڈیے کسی کی گلی

۱۹۴۸ء

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے
ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے

ہائے خوابوں کی خیاباں سازیاں
آنکھ کیا کھولی، چمن مُرجھا گئے

کون تھے آخر جو منزل کے قریب
آئینے کی چادریں پھیلا گئے
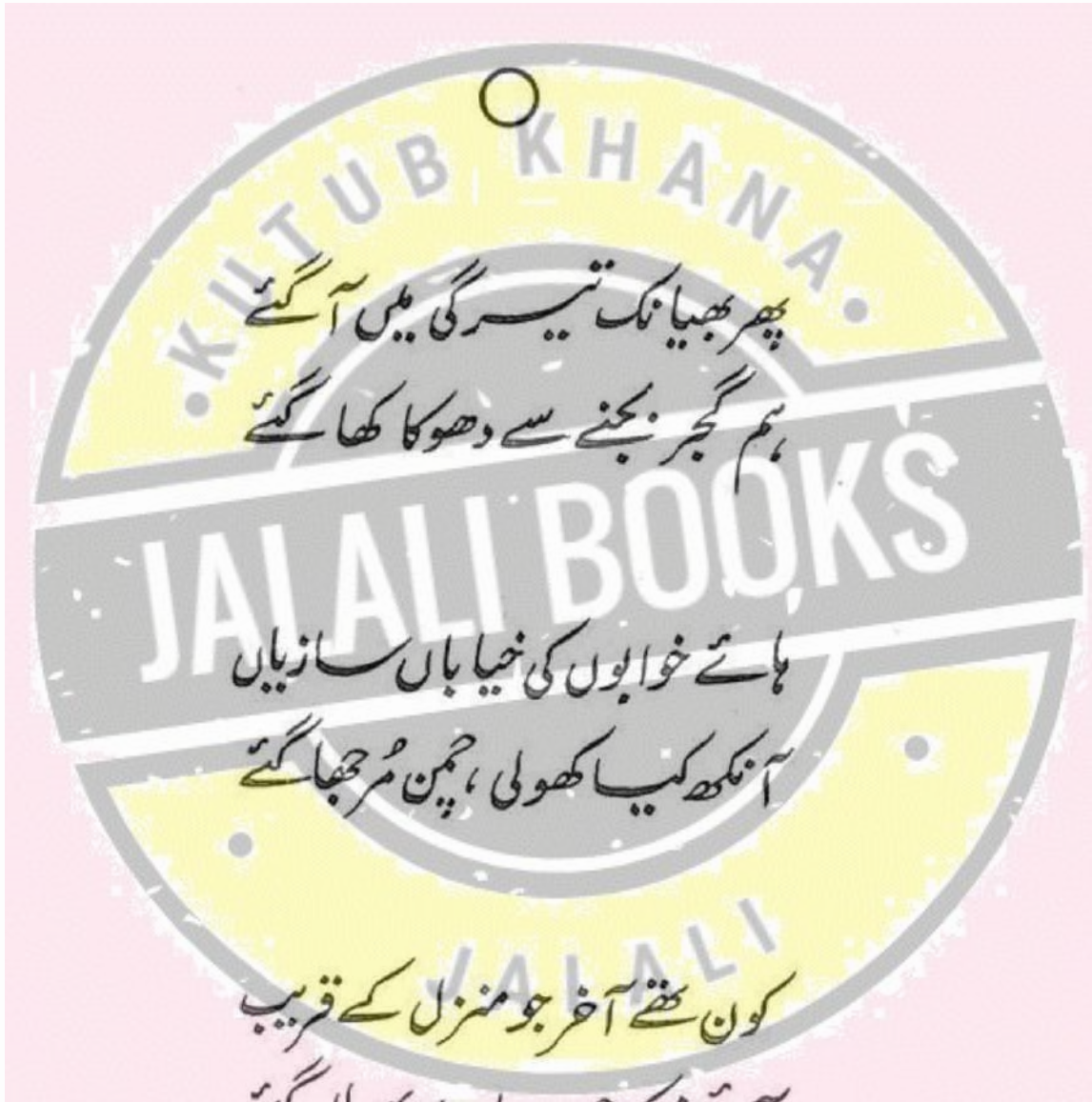
کِس تجلّی کا دیا ہم کو فریب
کِس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

اُن کا آنا حشر سے کچھ کم نہ تھا
اور جب پلٹے قیامت ڈھا گئے

اِک پہیلی کا ہمیں دے کر جواب
اِک پہیلی بن کے ہر سُو چھا گئے

پھر وہی اختر شماری کا نظام
ہم تو اس تکرار سے اُکتا گئے

رہنماؤ! رات ابھی باقی سہی!
آج سیّارے اگر ٹکرا گئے؟

جن کو ہم سمجھا کیے ابرِ بہار
وہ بگولے کِتنے گُلشن کھا گئے

کیا رسا نِکلی دُعائے اجتہاد
دیکھیے! اگلے زمانے آ گئے

آدمی کے ارتقا کا مدّعا
وہ چھپاتے ہی رہے، ہم پا گئے

اب کوئی طوفاں ہی لائے گا سحر
آفتاب اُبھرا تو بادل چھا گئے

۱۹۴۸ء

فریبِ رنگ عیاں ہے، جدھر نگاہ کروں
ضمیرِ پاک، بتا، کس کے دل میں راہ کروں

نئے چراغ جلا لوں، مگر یہ عزمِ صمیم
کہ شمعِ کشتہ سے ہر حال میں نباہ کروں
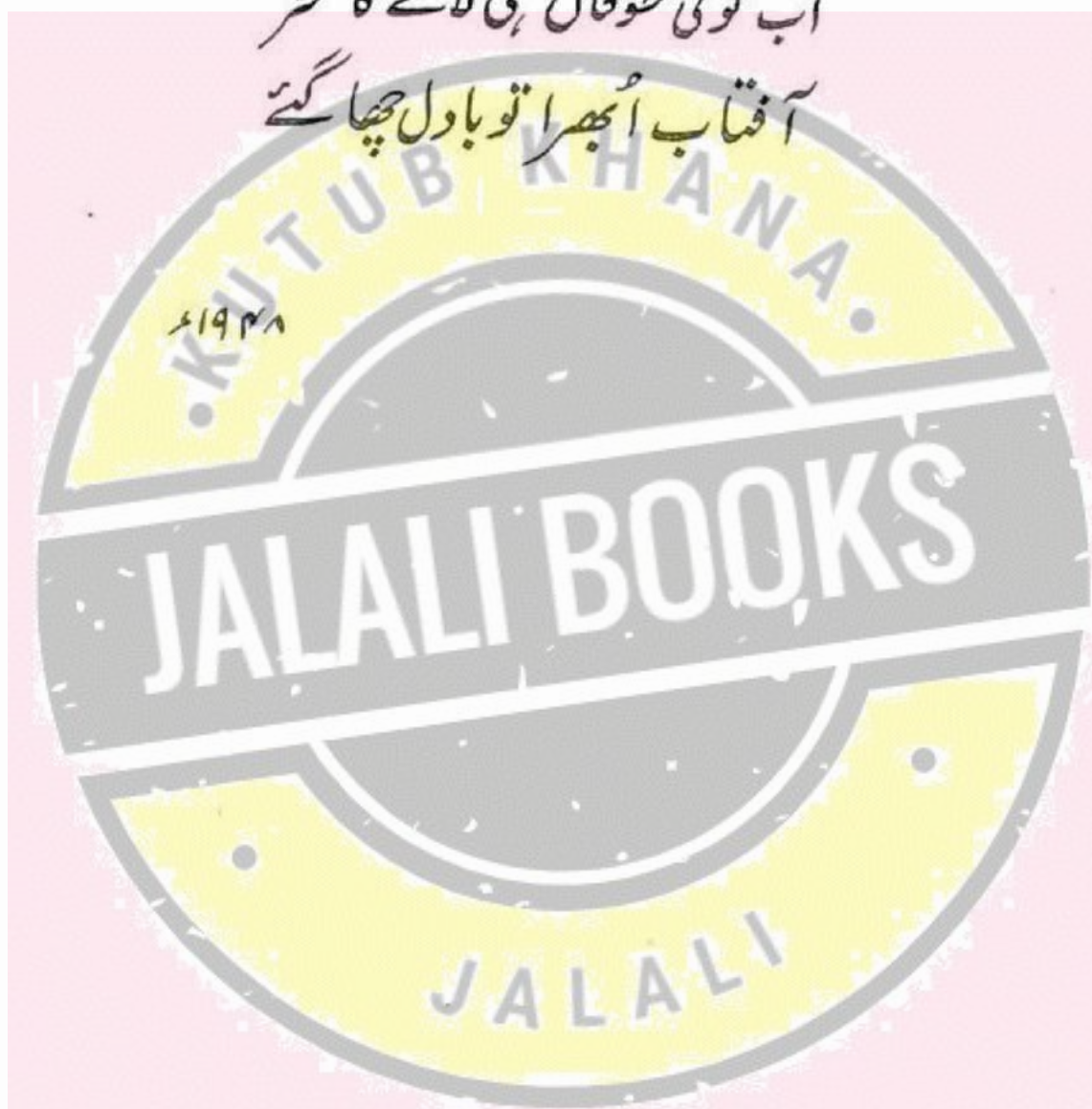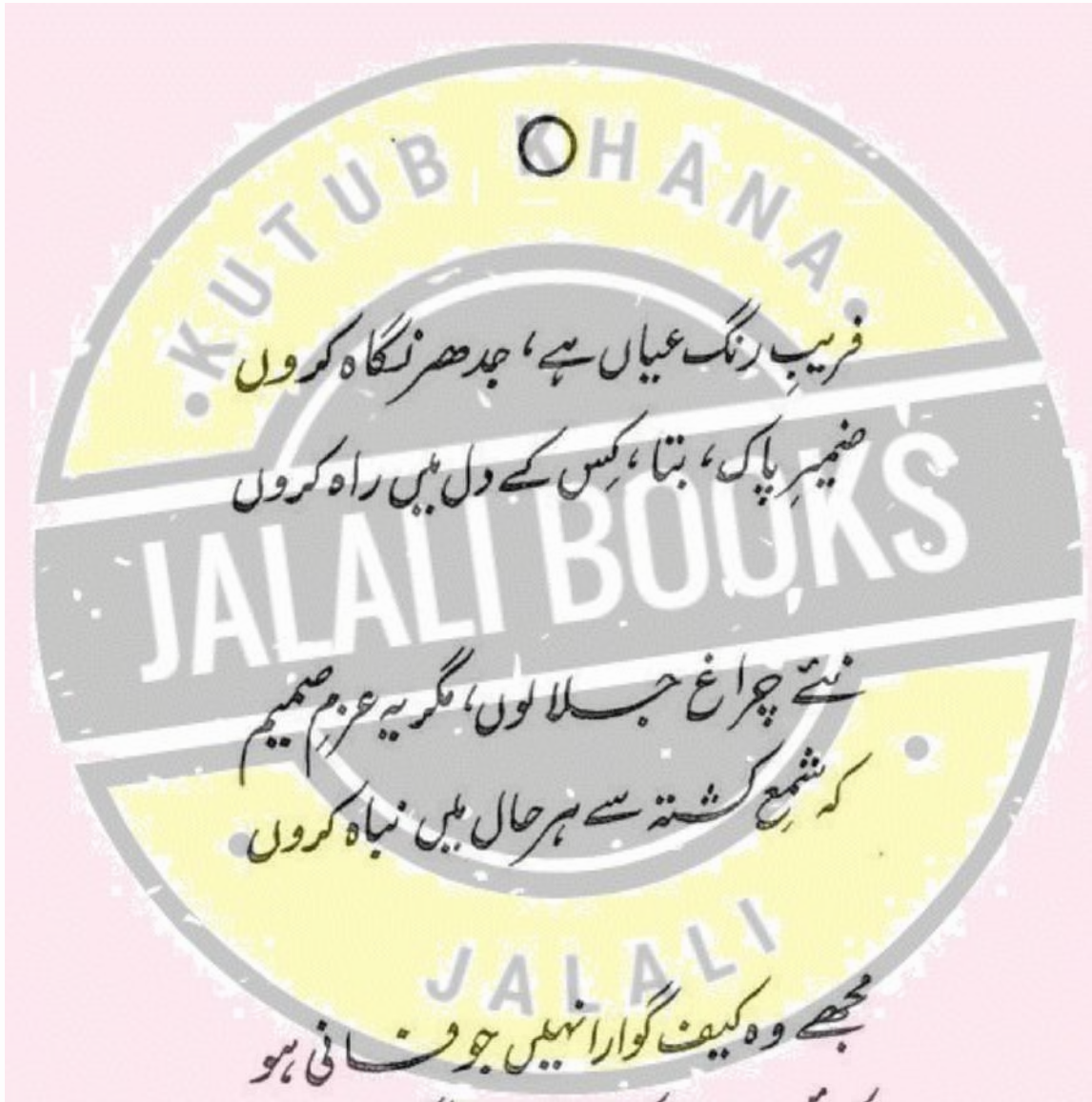
مجھے وہ کیف گوارا نہیں جو فانی ہو
کوئی بتائے کہ اب کون سا گناہ کروں

کلی کلی کی رگوں میں رواں ہے میرا لہو
کسے گلے سے لگاؤں، کسے نباہ کروں

یہ جُرم ہے کہ مَیں گردوں پرست کیوں نہ ہُوا
جو اذن ہو تو ترے حُسن کو گواہ کروں

یہ آرزو ہے کہ تیری پناہ کو تج کر
مَیں تیرے لُطف و کرم کو جہاں پناہ کروں

۱۹۴۷ء

○

یہ رزم گاہِ عناصر کسی کے کام آئے
خدا کرے مرے بس میں ترا انتظام آئے

شباب، گردِ سفر — زندگی، فریبِ نظر
تری تلاش میں ایسے کئی مقام آئے

شکستہ پر ہے ابھی فلسفہ اسیروں کا
قفس کو توڑ کے نکلے تو زیرِ دام آئے

سمجھ میں آ نہ سکا یہ طلسمِ لیل و نہار
کہ دن طلوع نہ ہو پائے، اور شام آئے

نہ جانے کون سا آدم ہے آپ کا معیار
کہ ہم تو عرش پہ جا کر بھی ناتمام آئے

لبوں میں نرم تبسم رچا کے گھل جائیں
خدا کرے مرے آنسو کسی کے کام آئیں

جو ابتدائے سفر میں دیے بجھا بیٹھیں
وہ بد نصیب کسی کا سراغ کیا پائیں
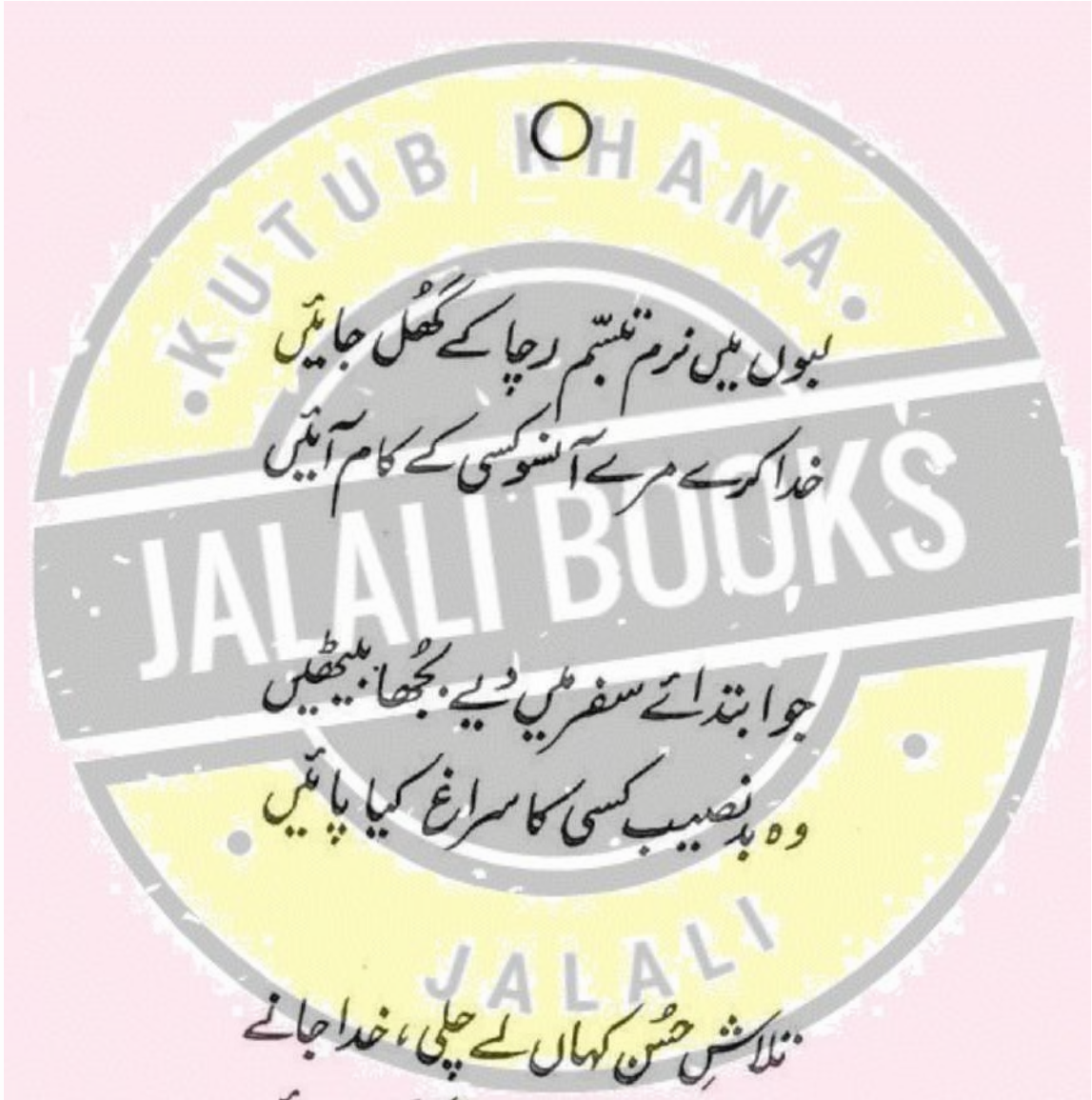
تلاشِ حُسن کہاں لے چلی، خدا جانے
امنگ تھی کہ فقط زندگی کو اپنائیں

تمام میکدہ سنسان، ہمیگسار اُداس
لبوں کو کھول کے کچھ سوچتی ہیں مینائیں

بلا رہے ہیں اُفق پر وہ زرد رُو ٹیلے
کہو تو ہم بھی فسانوں کے راز ہو جائیں

نہ کر خدا کے لیے بار بار ذکرِ بہشت
ہم آسماں کا مکرّر فریب کیوں کھائیں

نہیں نہیں، ترے عرفان کا سوال نہیں
جو اذن ہو تو حدِ آگہی سے بڑھ جائیں

ندیمؔ کو بھی تو مڈبھیڑ کی اُمید نہ تھی
اس اتفاق پہ آپ اس قدر نہ شرمائیں

۱۹۴۷ء

○
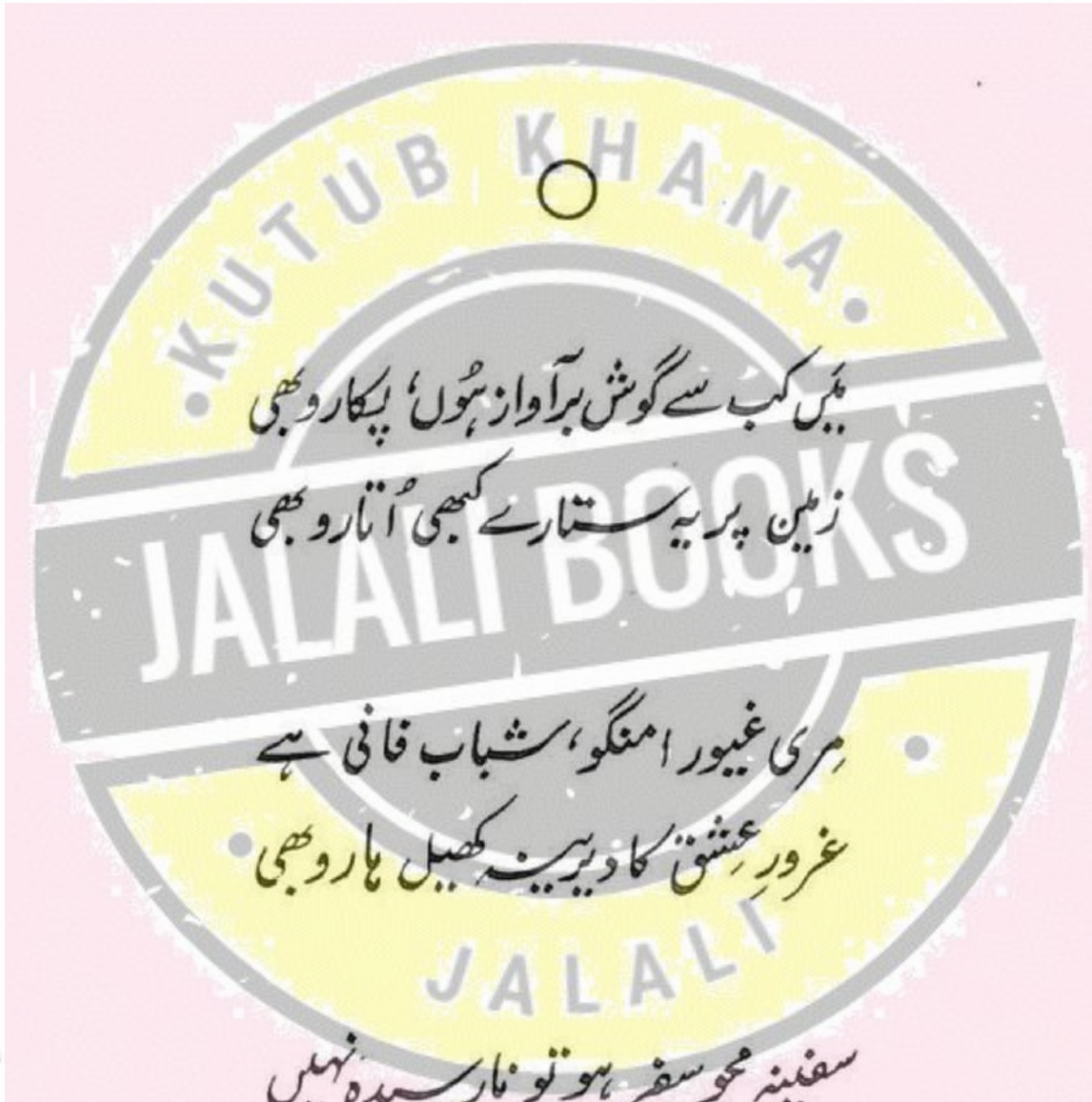
مَیں کب سے گوش بر آواز ہُوں، پکارو بھی
زمین پر یہ ستارے کبھی اُتارو بھی

مِری غیور امنگو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں، تم سدھارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداکش نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمھی لیکن
نقاب اٹھاؤ، نشانِ سفر ابھارو بھی

یہ کائناتِ ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم! تم اس بوجھ کو سہارو بھی

۱۹۴۷ء

ابھی نہیں اگر اندازۂ سپاس، ہمیں
تو کیوں ملی تھی بھلا تابِ التماس ہمیں

افق افق پہ نقوشِ قدم نمایاں ہیں
تلاش لائی کہاں سے تمھارے پاس ہمیں
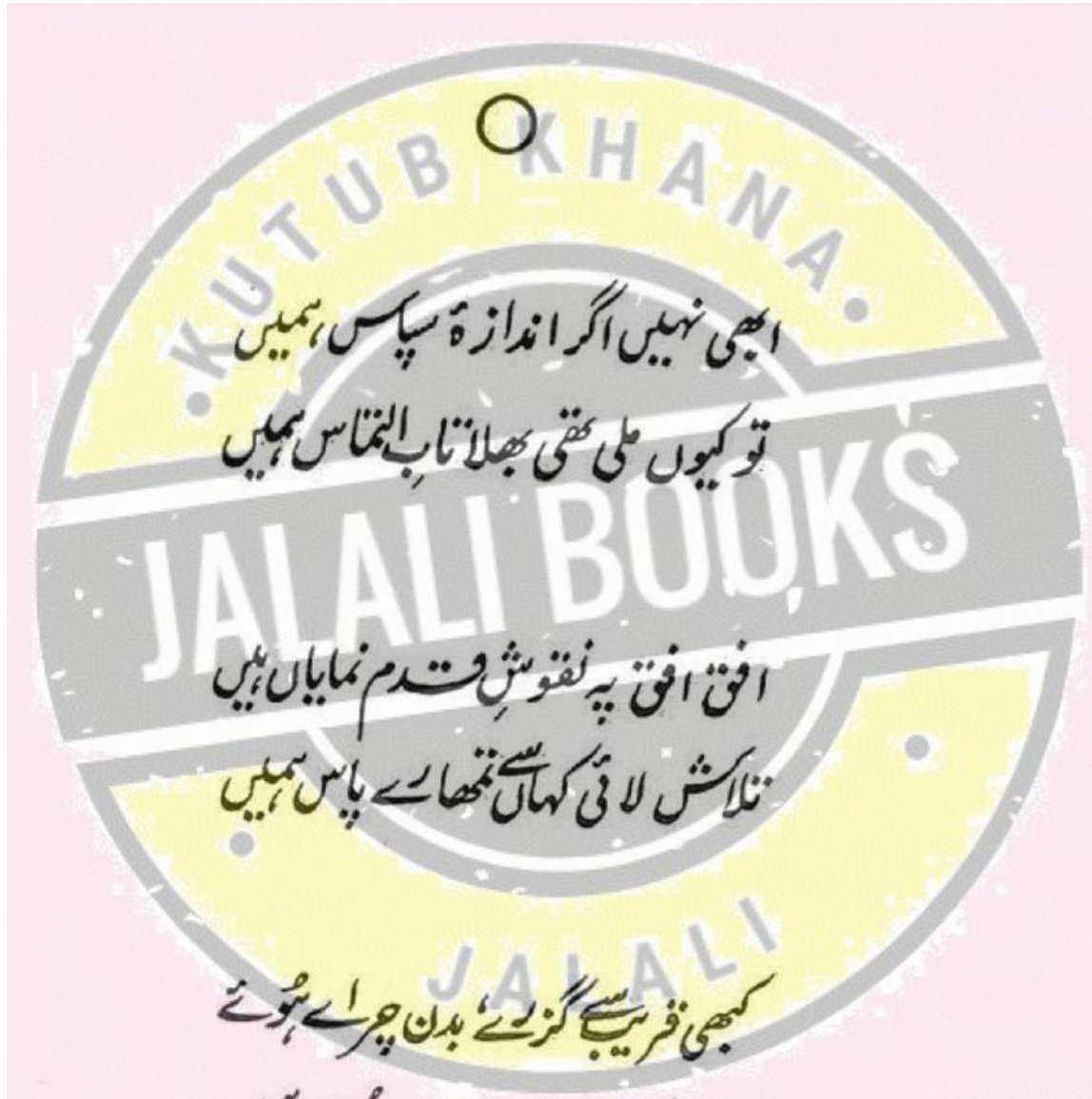
کبھی قریب سے گزرے، بدن چرائے ہوئے
تو دُور تک نظر آتے رہے اُداس ہمیں

جو ہو سکے تو اس ایثار پر نگاہ کرو
ہماری آس جہاں کو، تمھاری آس ہمیں

ڈبو چکا ہے امنگوں کو جس کا سناٹا
بلا رہا ہے اسی بزم سے قیاس ہمیں

یہ پُوچھنا ہے، کب آدم زمیں پہ اُترے گا
جو لے چلے کوئی کامل، خدا کے پاس ہمیں

یہیں ملیں گے تمھیں پھول بھی، ستارے بھی
بتا رہی ہے دلآویزیٔ لباس ہمیں

۱۹۴۷ء

○

مرے سبو میں مری زیست کا لہو تو نہیں!
کہیں مزاجِ زمانہ بہانہ جُو تو نہیں!

ندی کی رَو میں رواں ہے جو ایک برگِ گلاب
کہیں شباب کا ایوانِ رنگ و بُو تو نہیں!

مچل مچل کے اُبھرتی ہے جب چراغ کی لَو
مَیں سوچتا ہُوں کہ ان لرزشوں میں تُو تو نہیں

یہ سب درست، شبِ ہجر کی سحر تو ہُوئی
مگر شفق میں مرا خُونِ آرزُو تو نہیں

اُفق کی سمت تو قرنوں سے چل رہا ہے ندیم
کہیں یہ راہنما مجھ سا راہ جُو تو نہیں

فروری ۱۹۴۷ء
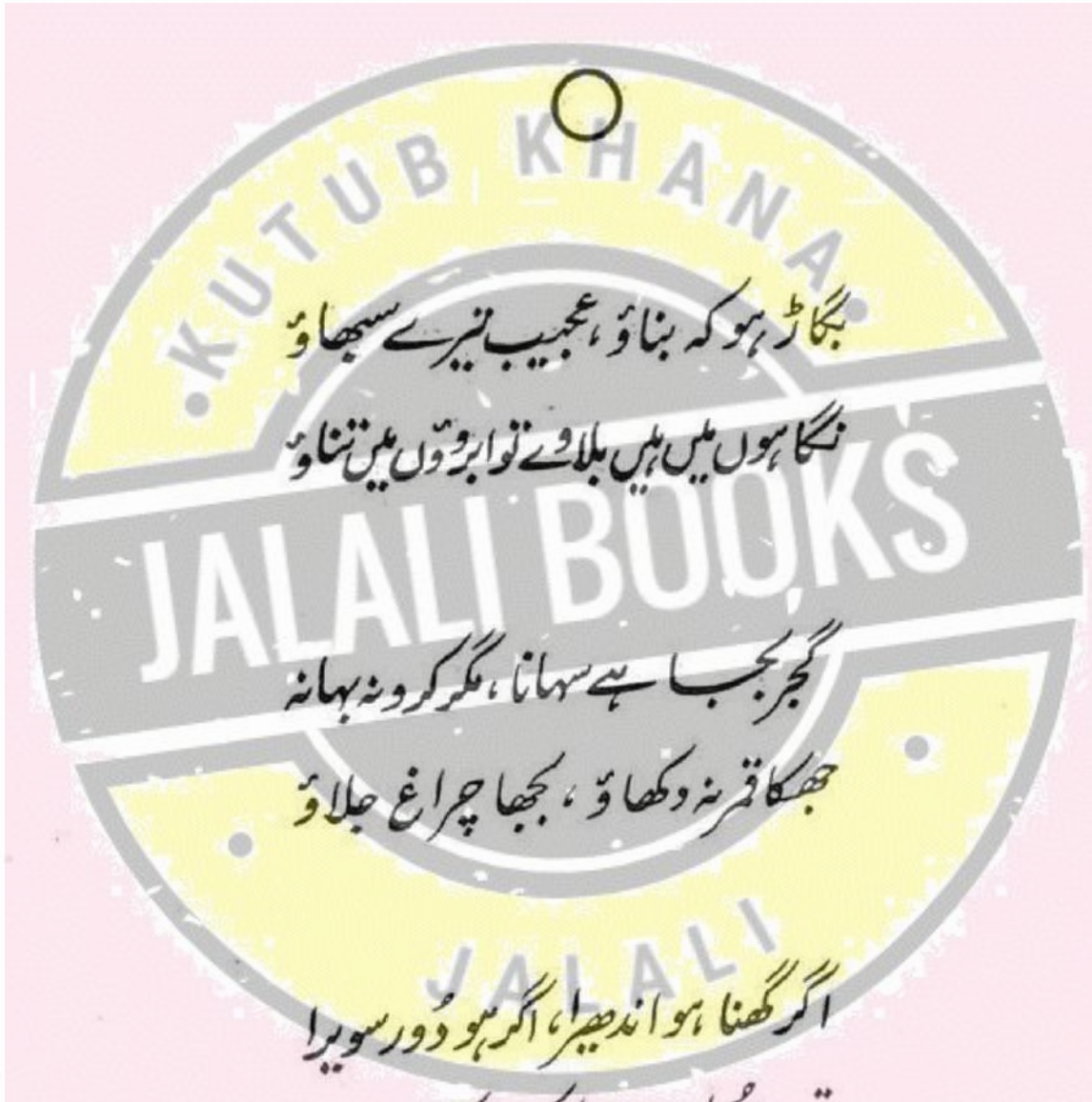
بگاڑ ہو کہ بناؤ، عجیب تیرے سبھاؤ
نگاہوں میں ہیں بلاوے تو ابروؤں میں تناؤ

گجر بجا ہے سہانا، مگر کرو نہ بہانہ
جھکا قمر نہ دکھاؤ، بجھا چراغ جلاؤ

اگر گھنا ہو اندھیرا، اگر ہو دُور سویرا
تو یہ اصُول ہے میرا، کہ دل کے دیپ جلاؤ

اُجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں دوانے، اُتار ہو کہ چڑھاؤ

خدا کے لب پہ ہنسی ہے، خدائی جھوم رہی ہے
تمھاری بات چلی ہے، مری حسین خطاؤ

ادھر شباب کا مس ہے، اُدھر شراب کا رس ہے
قدم قدم پہ قفس ہے، ندیم دیکھتے جاؤ

۱۹۴۷ء

❖

اگر حضور ابھی مائلِ ظہور نہ تھے
تو تشنگانِ محبت بھی ناصبور نہ تھے

افق کی دُھند میں لپٹے ہوئے چراغ سے ہیں
وہ دن جب آپ کے انداز پُرغرور نہ تھے
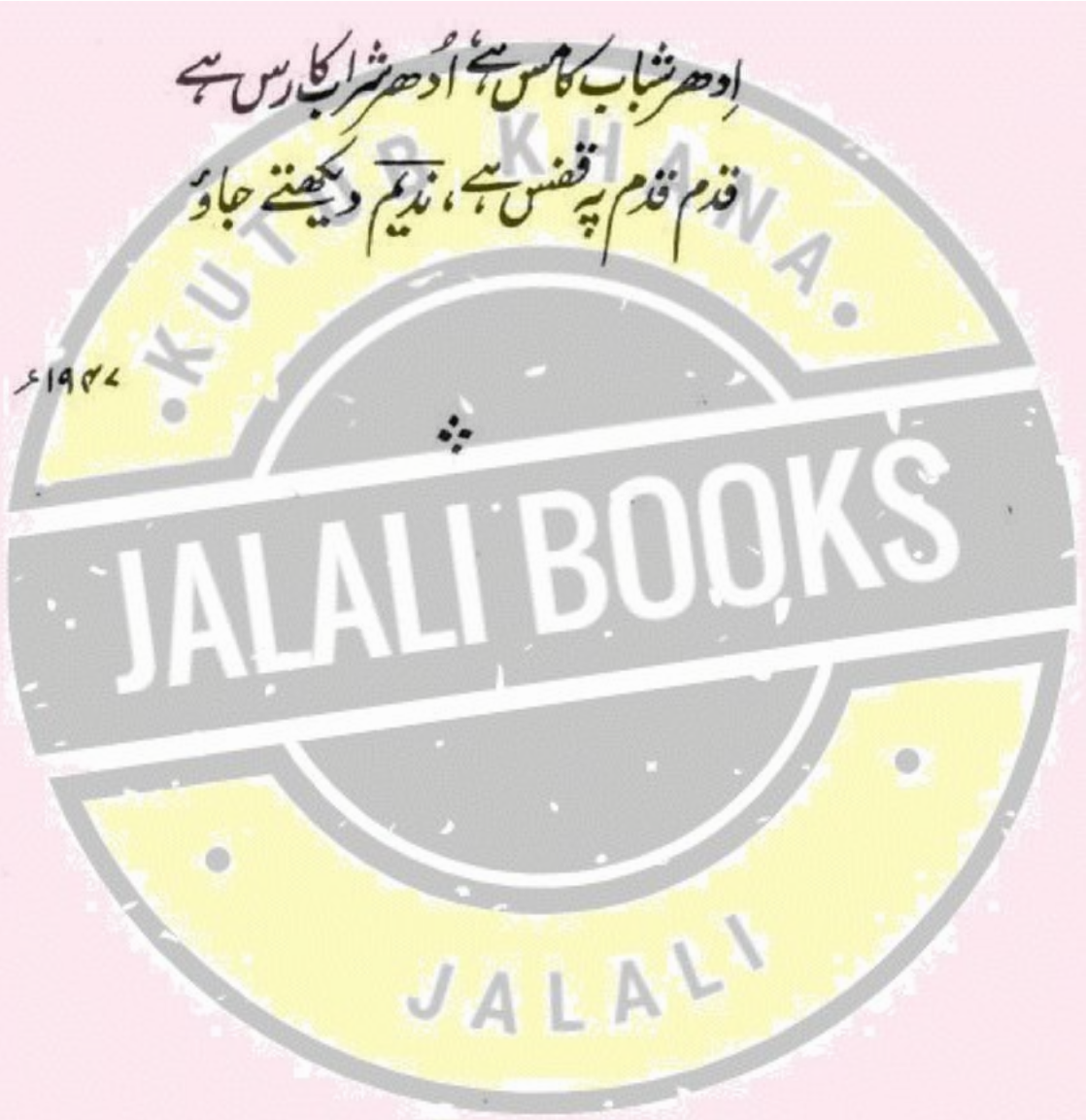
جزا تو خیر، سزا کے لیے ترستے رہے
غلام آپ کے، اتنے تو بے قصور نہ تھے

پسِ نقاب مری بے بسی پہ قہقہہ زن
مَیں جانتا ہُوں کہ تقدیر تھی، حضور نہ تھے

رسائی اصل میں ہے انتہائے سرشاری
مُسافرانِ محبّت تھکن سے چُور نہ تھے

مرے نصیب کو کیوں تابعِ نجوم کیا
اگر نجوم مری دسترس سے دُور نہ تھے

مَیں مصلحین کا مُنکر نہیں ندیمؔ — مگر
کِسی کے مدِّ نظر عشق کے امُور نہ تھے

مئی ۱۹۷۴ء
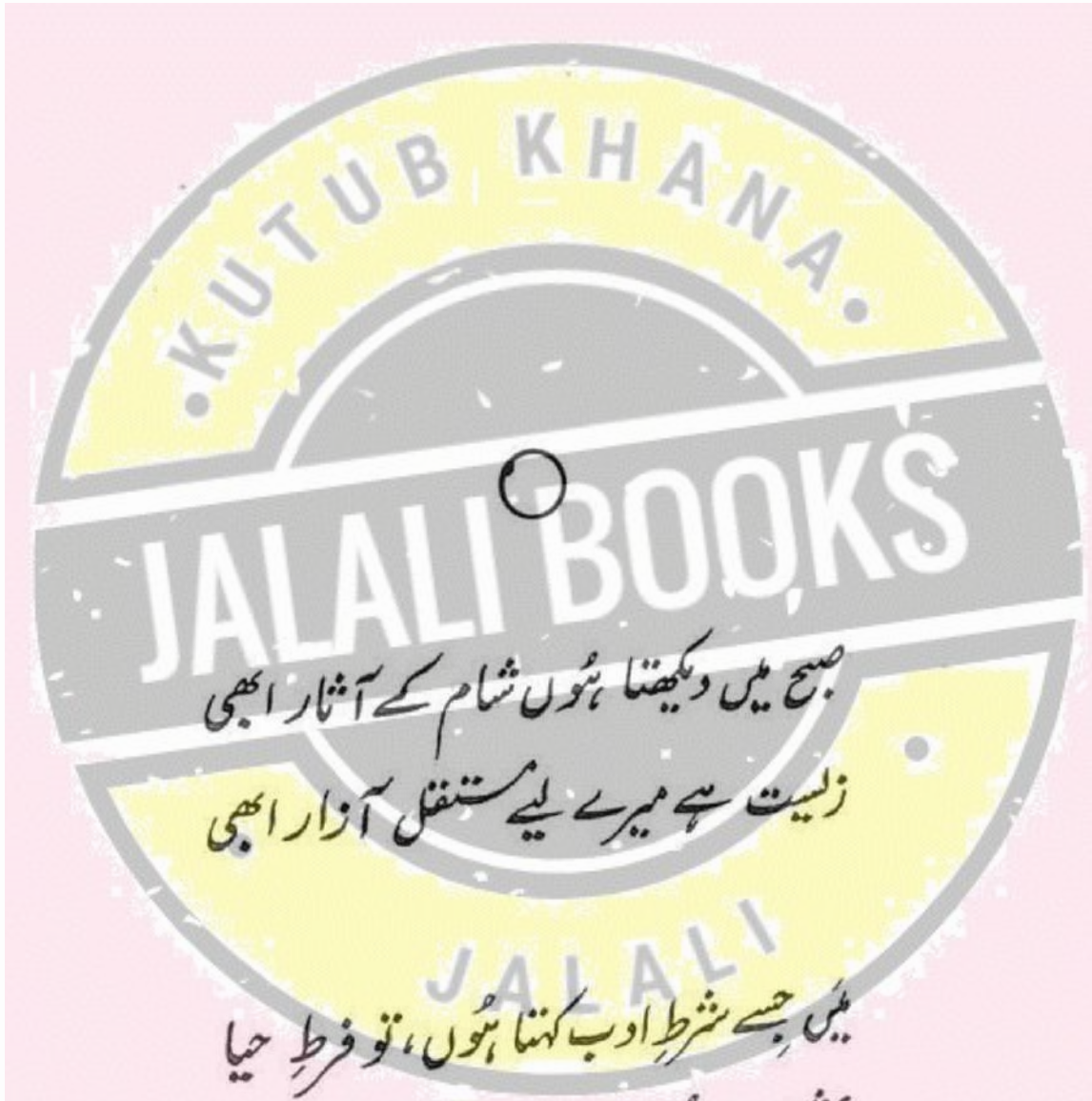
صبح میں دیکھتا ہُوں شام کے آثار ابھی
زِیست ہے میرے لیے مستقل آزار ابھی

مَیں جِسے شرطِ ادب کہتا ہُوں، تو فرطِ حیا
عِشق اور حُسن میں حائل ہے وہ دیوار ابھی

راہیں لُٹ سی گئیں، مٹ سے گئے قدموں کے نقوش
سُن رہا ہُوں تری پازیب کی جھنکار ابھی

تیرے پیکر کے تصوّر سے، خزاں کے باوصف
شاخِ گُل صحنِ گلستاں میں ہے گُل بار ابھی

پرفشاں کب سے فضا میں ہے مری مشتِ غبار
تیری آنکھوں کے ثوابت نہیں سیّار ابھی

کشتِ ویراں! ابھی برسات کی رُت باقی ہے
بدلیاں جھوم رہی ہیں سرِ کہسار ابھی

ابھی انساں کو مانوسِ زمیں ہونا ہے
مہر و مہتاب کے ایواں نہیں درکار ابھی

کتنے ساگر ہیں سنبھالے ہوئے ناسفتہ گہر
کتنے اسرار ہیں آمادۂ اظہار ابھی

ضبط، اے شوخیٔ گفتار، سنبھل اور سنبھال
ڈھل رہا ہے مرے احساس میں کردار ابھی

ابھی نسلوں کے اِک انبوہ میں محبوس ہُوں مَیں
آدمیّت کے تقاضے نہیں بیدار ابھی

مژدۂ حرّیّتِ فکر سُنانے والو!
کِتنے منصُور ہیں موجُود سرِ دار ابھی

مئی ۱۹۴۷ء
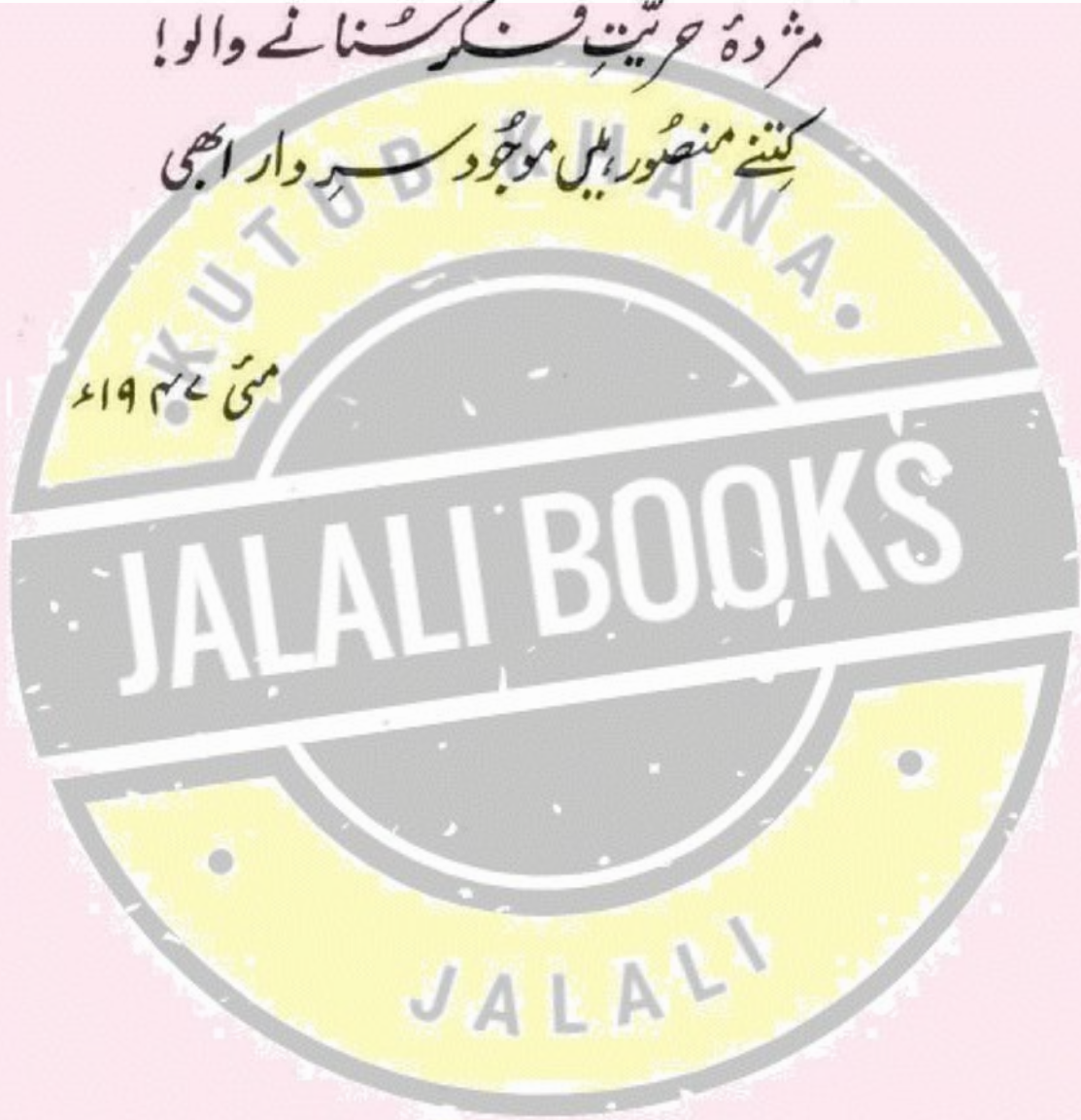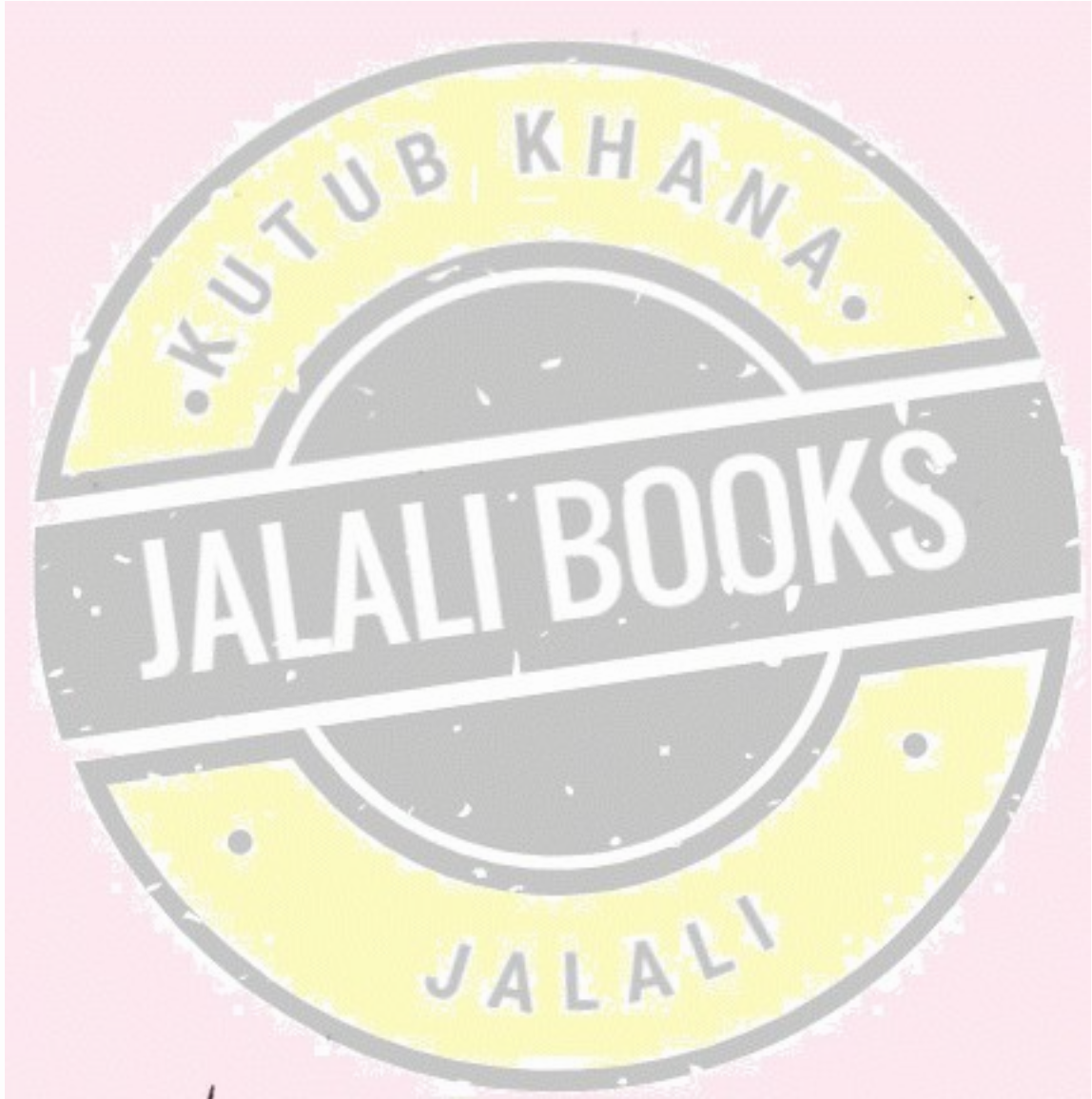
جلال و جمال

○

پلٹنا چاہو، تو جاؤ، ابھی اُجالا ہے
مرا حریمِ طلب تو بعید و بالا ہے

خودی نے خلد سے انسان کو نکلوایا
خودی نے خلد کا پھر راستہ نکالا ہے

یہ میرے ذہن میں ہے عزمِ انقلاب کہ واں
کہ جھٹپٹے میں لپکتی ہوئی غزالہ ہے

میں دم بخود ہوں پرستش کروں کہ عشق کروں
جمالِ حُور کا، انسانیت کا ہالہ ہے

یہ پھول بھی تو اسی دھول سے اُگے ہیں ندیمؔ
مرا خدا مری دنیا کا رہنے والا ہے

۱۹۴۷ء

زُلفِ سیاہ خم بہ خم، نُورِ جمال یم بہ یم
رازِ حیات کی قسم، جلوۂ ذات کی قسم

تیرا رواج رہنما، میرا مزاج رہنما
میرا عدم بھی عینِ زیست، تیرا وجود بھی عدم
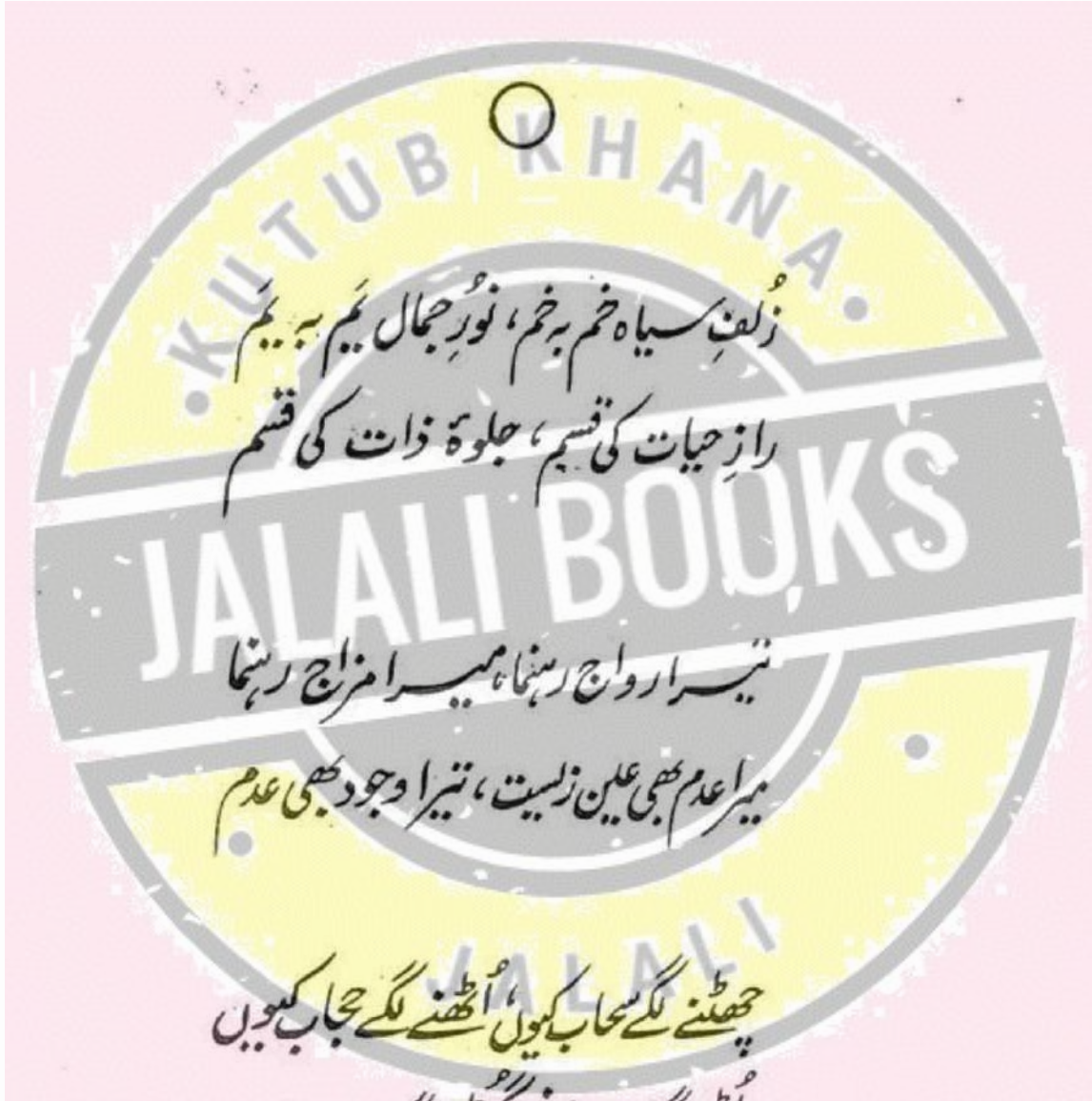
چھٹنے لگے سحاب کیوں، اُٹھنے لگے حجاب کیوں
لُٹنے لگا ہے میرا غم، گھُٹنے لگا ہے میرا دم

کیفِ وصال سے سوا، قُربِ جمال سے سوا
میرے خیال سے تِرا میرے خیال ہی میں رم

لہریں مرے جنوں کی ہیں، سُرخیاں میرے خوں کی ہیں
چہرۂ شہریار پر میرا فسانہ ہے رقم

بوئے چمن کی بحث تھی، وہ جو نہیں تو کچھ نہیں
برگِ گلاب پر ابھی رنگ تو ہوں گے مرتسم

۱۹۴۶ء

(۱)

خدا نہیں، نہ سہی، ناخدا نہیں، نہ سہی
ترے بغیر کوئی آسرا نہیں، نہ سہی

تری طلب کا تقاضا ہے زندگی میری
ترے مقام کا کوئی پتا نہیں، نہ سہی
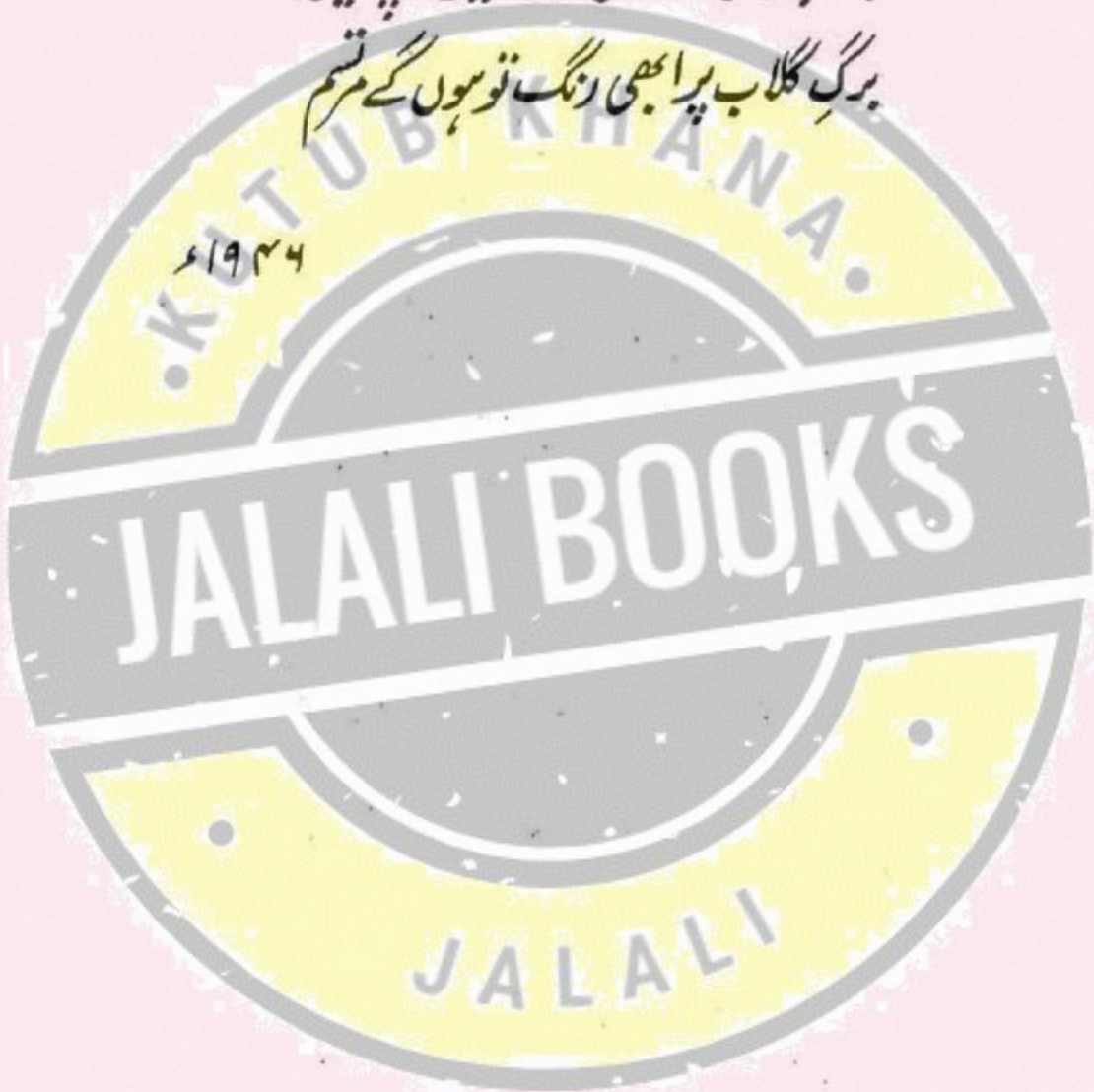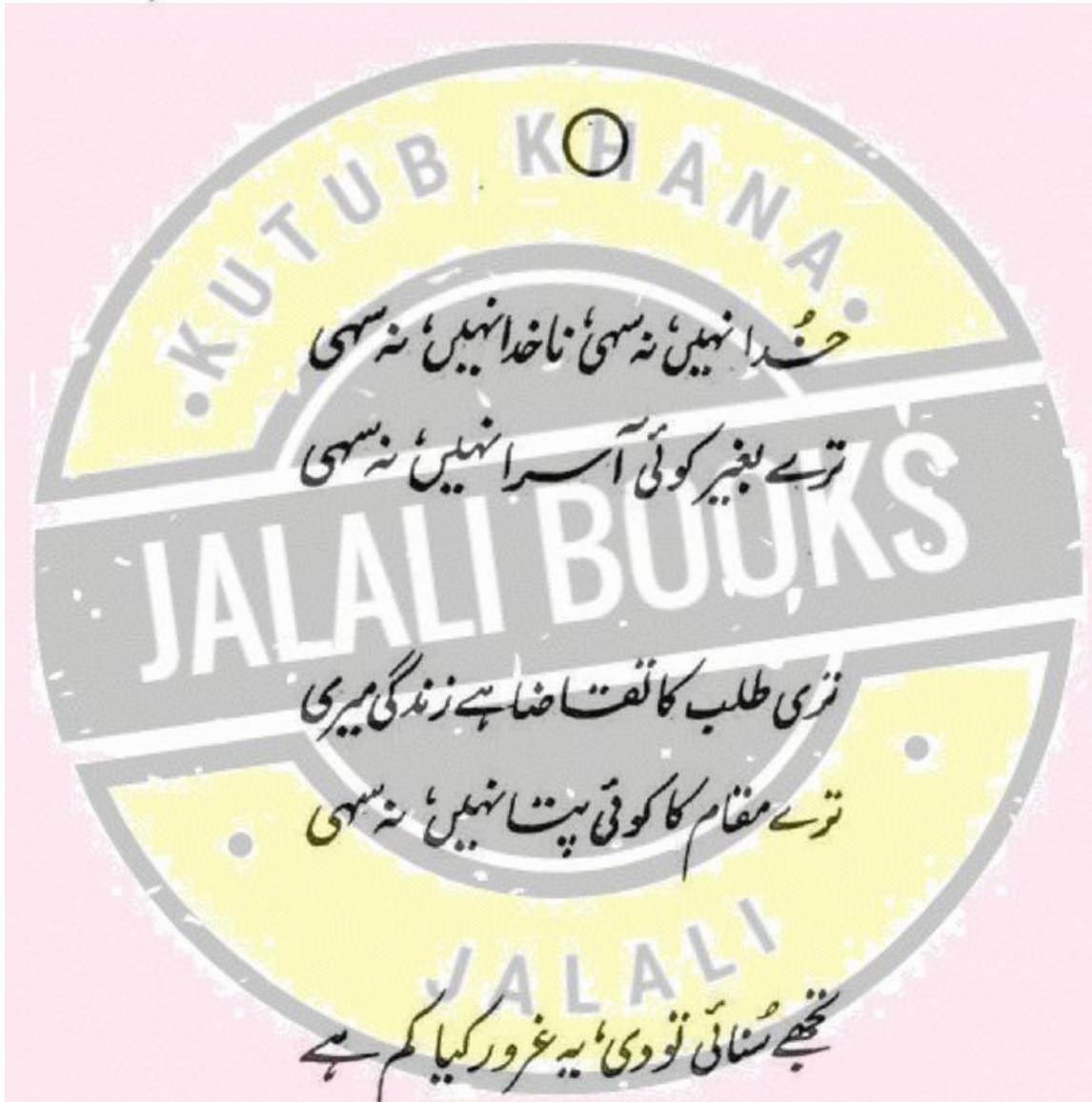
تجھے سنائی تو دی، یہ غرور کیا کم ہے
اگر قبول مری التجا نہیں، نہ سہی

تری نگاہ میں ہوں، تیری بارگاہ میں ہوں
اگر مجھے کوئی پہچانتا نہیں، نہ سہی

شبِ سیاہ کی تاریکیوں کا ساتھ تو ہے
کوئی ستارہ مرا رہنما نہیں، نہ سہی

نہیں ہیں سر د ابھی حوصلے اُڑانوں کے
وہ میری ذات سے بھی ماورا نہیں، نہ سہی

وہی ندیم، وہی حُسن کا قصیدہ نگار
ترے حضور اگر لب کشا نہیں، نہ سہی

۱۹۷۶ء

یہ بھی شبِ تار، وہ بھی شبِ تار

جینا بھی دشوار، مرنا بھی دشوار

ہونٹوں کی لرزش کچھ کہہ رہی ہے

اِک مُدّعا ہے محتاجِ اظہار

بُنیاد جن کی خود آگہی ہو

وہ مستیاں ہیں مستوں کو درکار

سانسوں میں رم ہے آنکھوں میں دم ہے

کس نے بلایا دریا کے اُس پار

اے ذوقِ پرواز اب ضبط کیسا!
اُٹھتی رہے گی زنداں کی دیوار

شہکارِ فطرت! اے وائے فطرت
ہر چیز معصوم، انسان عیار!

حکمِ مساوات اور امتیازات
تارے دل افروز، کلیاں دل افگار

انسان اب کچھ نکھرے تو نکھرے
سُونے پڑے ہیں شاہوں کے دربار

ہم تو ندیم اب اُکتا چلے ہیں
انوار، ظلمات سے تکرار، تکرار

۱۹۴۶ء

یہ میری بے جہتی ہے کہ تیری بے خبری
مرا جنوں عملی ہے، تری خرد نظری

اب آفتاب کی باری ہے، رات بھاری ہے
میں دیکھتا رہوں کب تک ستارۂ سحری
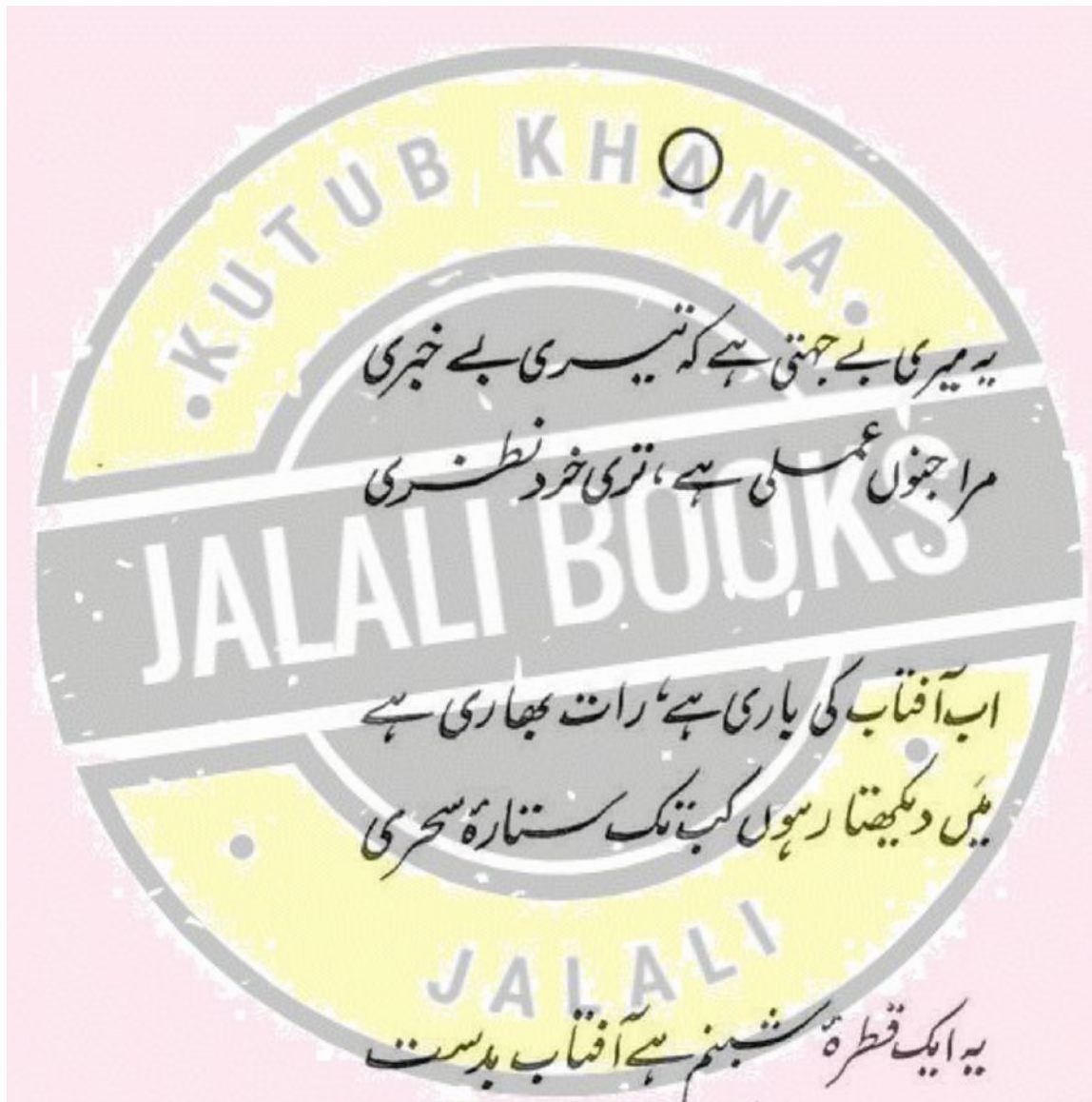
یہ ایک قطرۂ شبنم ہے آفتاب بدست
بہت قریب سے دیکھی ہے فطرتِ بشری

جہاں سے پھول گرا تھا وہیں کلی چٹکی
اگر ہے فتنہ یہی تو نثارِ فتنہ گری

زمیں اُداس، ستارے اُداس، چاند اُداس
یہ پچھلی رات ہے یا تیری شانِ کم نظری

یہ تجھ کو دیکھ کے کیوں لوگ مجھ کو دیکھتے ہیں
یہ تیری جلوہ گری ہے کہ میری پردہ دری

فلک پہ ٹوٹے ستارا، زمیں پہ اشک گرے
مرے ندیم، یہی ہے کمالِ بخیہ گری

۱۹۴۶ء

فروغِ ماہ میں تُو اور شبِ سیاہ میں تُو
بہر لباس نمایاں مری نگاہ میں تُو

ترے غرور کے انداز سے ہویدا ہے
نہ مِل سکے گا مجھے زندگی کی راہ میں تُو

اب اس سے بڑھ کے ثبوتِ بقا نہیں ممکن
تری پناہ میں دُنیا، مری پناہ میں تُو
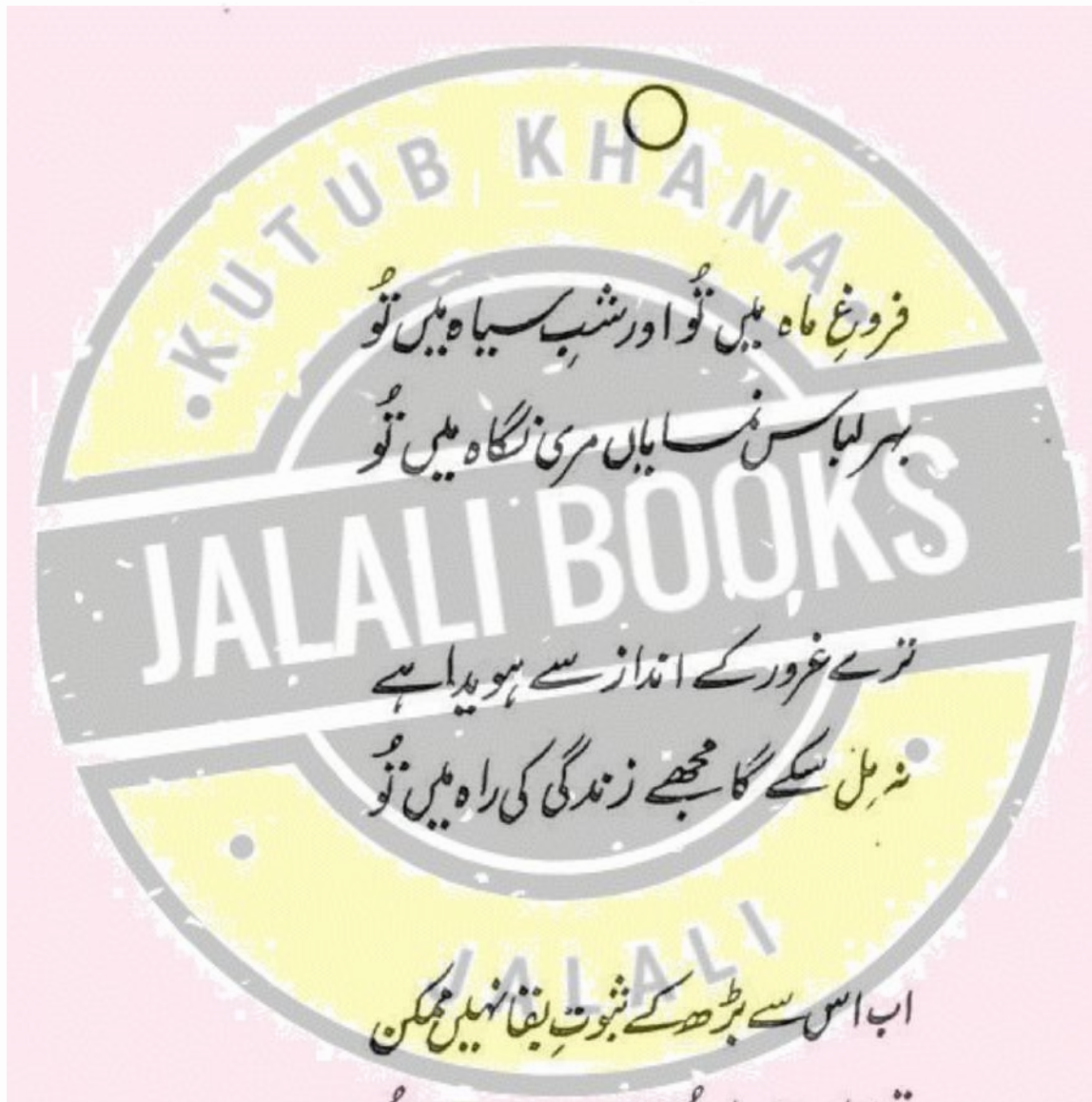
ترے لبوں کے کناروں پہ کپکپی کیسی!
کھڑا ہے جیسے محبت کی بارگاہ میں تُو

وُرُود کی ابدیّت ہے، قربُ کی معراج
نہ کھُل سکے گا مُلاقاتِ گاہ گاہ میں تُو

چراغ نمٹکنے لگے، بھیگنے لگیں آنکھیں
کب آسکے گا مرے خانۂ تباہ میں تُو

اس اجتناب کے صدقے کہوں گا حشر کے دن
کہ منعکس تھا مری خواہشِ گناہ میں تُو

۱۹۴۶ء

○

رہا جائے گا چُپ کیسے خدا کے رُوبرو ہم سے
نہ کر محشر میں تسلیم و رضا کی گفتگو ہم سے

ہمیں سرشار رکھ سکتا ہے جب احساسِ سرشاری
تو کس پندار پر چھپتا ہے ساقی نے سبو ہم سے

سکوتِ شام نے شب کی کہانی عام کی، ورنہ
بہت گھُل مل کے باتیں کر رہا ہے کیوں عدو ہم سے

لبوں کی پپڑیوں نے کھول رکھا ہے بھرم سارا
زمانہ کب سُنے گا داستانِ جستجو ہم سے

سوا تیرے، کئی آئینہ رو حیرت سے کہتے ہیں
ندیم اس عمر میں بیگانہ کیوں رہتا ہے تُو ہم سے

۱۹۴۶ء
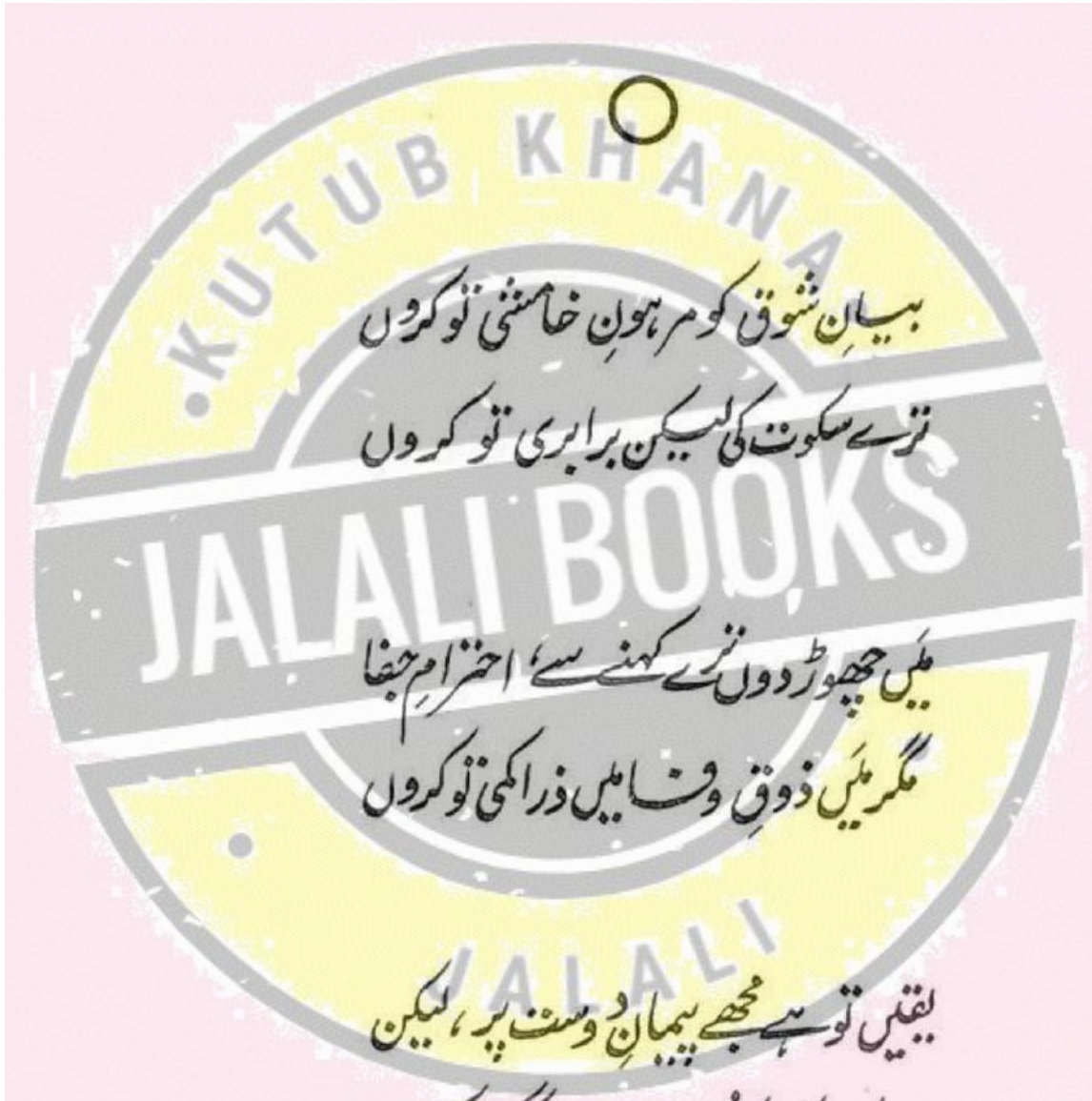
بیانِ شوق کو مرہونِ خامشی تو کروں
ترے سکوت کی لیکن برابری تو کروں

میں چھوڑ دوں ترے کہنے سے، احترامِ جفا
مگر میں ذوقِ وفا میں ذرا کمی تو کروں

یقیں تو ہے مجھے پیمانِ دوست پر، لیکن
میں اپنے آپ کو مجبورِ زندگی تو کروں

مجھے غروب کا پیغام ہے قبول، مگر
میں تیرے چاند ستاروں کی ہمسری تو کروں

مجھے بہشت سے انکار کی مجال کہاں
مگر زمین پہ محسوس یہ کمی تو کروں

اجل کے خوف سے آزاد ہے حیات میری
مگر یہ شوقِ تماشائے جانکنی تو کروں

الٰہی حشر میں دے رخصتِ نمائشِ دل
میں اس بسیط اندھیرے میں روشنی تو کروں

ندیم اوجِ محبت فراقِ یار سہی
مگر میں عشق کے عنوان کو جلی تو کروں

۱۹۴۵ء

وہ کون ہے جو مرے گریز سکوت کا مدّعا نہ سمجھا

مرے ارادوں کی چرخ گیری کو صرف میرا خدا نہ سمجھا

مرے تصوّر کی ظلمتوں میں نہ جھلملائیں بقا کی کرنیں

اگرچہ میں نے ابد کو اپنے خیال سے ماورا نہ سمجھا

مرے اُفق کی حدوں نے بڑھ کر سمیٹ لی کائنات ساری

یہ زندگی پارسائیاں تھیں، جنھیں کوئی پارسا نہ سمجھا

میں تیرے بندوں کی پادشاہی سے کچھ تو مانوس ہو چلا تھا

مگر یہ دِل۔ یعنی میرے احساس کا یہ فرمانروا نہ سمجھا

اُکھڑ چلی ہے اساسِ عالم، تو اس میں میرا قصور کیا ہے
جنونِ معجز نما نہ مانا، جمالِ محشر ادا نہ سمجھا

بس اب ذرا احتیاط سے حکمِ بندگی دے، کہ مدّتوں تک
کسی نے میری تڑپ نہ دیکھی، کوئی مری التجا نہ سمجھا

اگرچہ پائیں قدم قدم پر سرور و مستی کی بارگاہیں
تلاش کے کیف نے مگر انتہا کو بھی انتہا نہ سمجھا

کہیں بڑھاپے کی خوش خرامی کہیں جوانی کی نرم گامی
ندیم سا بندۂ رضا بھی ترا طریقِ عطا نہ سمجھا

۱۹۴۴ء

○

اُمنگ مجھ کو نہیں چرخِ نو بنانے کی
ابھی ہوس ہے ستاروں کی تھاہ پانے کی

جہاں پناہ! مجھے بازوؤں میں لے لیجے
مری تلاش میں ہیں گردشیں زمانے کی

وہ میرے عشق کا مقصودِ خاص پوچھتے ہیں
ضرورت آن پڑی آئینہ دکھانے کی

کس انقلاب کی غمّاز ہیں، خدا جانے
خرامِ یار میں اٹھکیلیاں زمانے کی

ندیم کھیل رہا ہوں پرانی یادوں سے
یہی تو آخری کوشش ہے بھول جانے کی

۱۹۴۴ء

تری جوانی کے پاسباں حشر تک یونہی نوجواں رہیں گے
ترے گلستانِ رنگ و بُو میں نسیم بن کر رواں رہیں گے

قبول ہے تیری کبریائی، مگر کبھی یہ بھی تُو نے سوچا
یہاں بھی تُو ہے، وہاں بھی تُو ہے، غریب انساں کہاں رہیں گے

مَیں ظُلمتوں سے اُلجھ اُلجھ کر وہ دُور نزدیک لا رہا ہُوں
مُسافروں کی تلاش میں جب نجوم کے کارواں رہیں گے

مری بغاوت کا آخری آسرا ہے روزِ حساب تیرا
بہت بڑے معرکے رہیں گے، بہت کڑے امتحاں رہیں گے

یہ تیرے بندے ہیں یا مقدّر کے ہاتھ میں کانچ کے کھلونے
فنا سے ڈرتے رہیں گے، لیکن حیات سے سرگراں رہیں گے

جکڑتی جائیں گی ان کے ذہنوں کو گردشِ نو بنو کی کڑیاں
اگر ترے آسمان انسان پر یونہی مہرباں رہیں گے

مزاجِ فطرت پہ ابنِ آدم کی ہر مسرّت گراں رہی ہے
بہار آئے گی، اور ہم محوِ انتظارِ خزاں رہیں گے

چھپا نہ تا خیر کی حقیقت کہ جھوٹی انگڑائیوں کے نیچے
یہ گال بھی گلفشاں رہیں گے، یہ ہونٹ بھی ارغواں رہیں گے

۱۹۴۴ء

○

چاندنی پر گماں سیاہی کا
شعبدہ تیری کم نگاہی کا

زشت اور خوب کے شعور میں ہے
راز — انسان کی تباہی کا
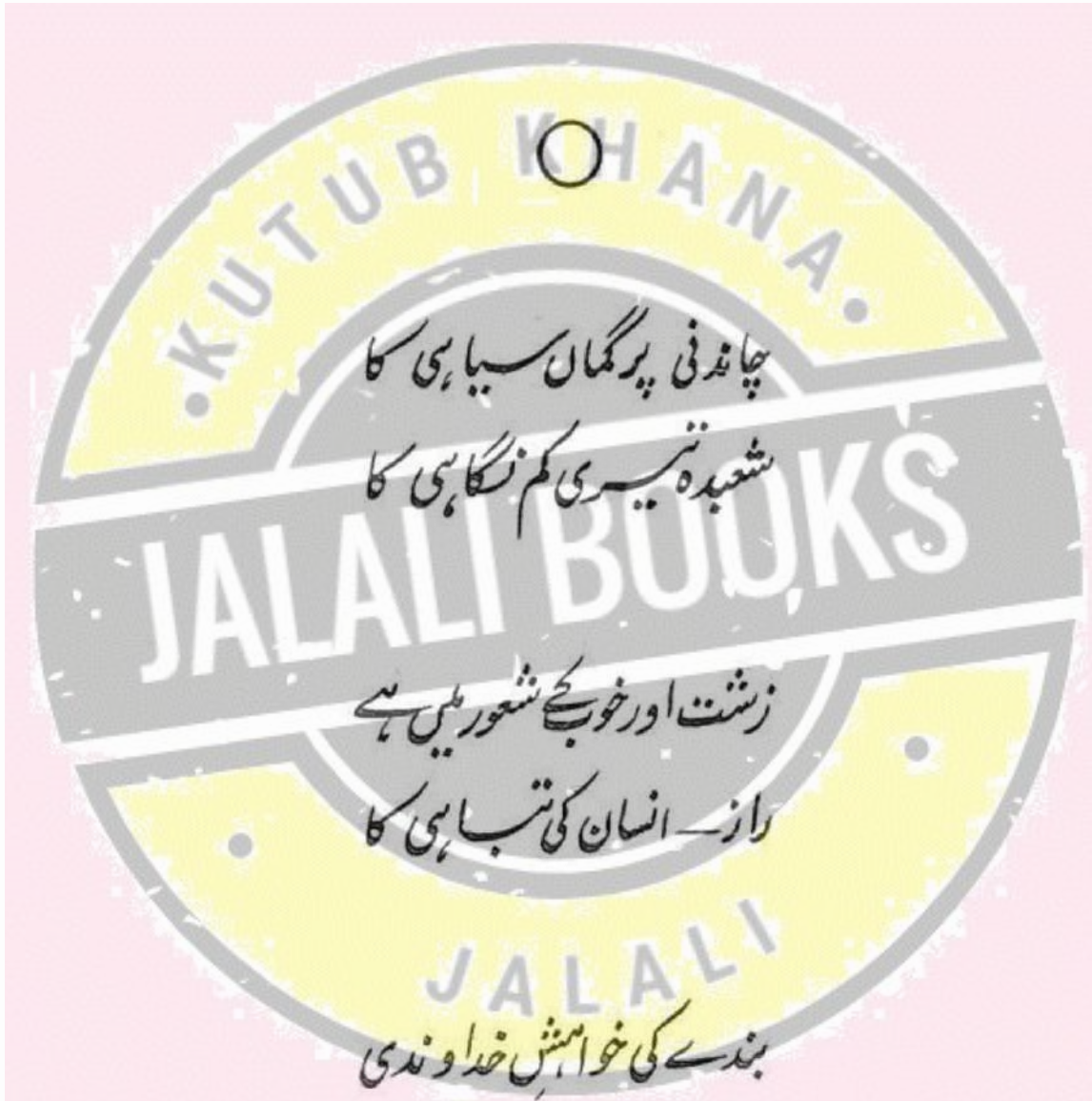
بندے کی خواہشِ خداوندی
زیرِ دریا خرام ماہی کا

صبح کے سیلِ رنگ و نور سے پوچھ
مدّعا رات کی سیاہی کا

مُردنی چھا گئی اوامر پر
ذکر جب چھڑ گیا نواہی کا

پاسبانوں کو جبر کی تاکید
اور دعویٰ جہاں پناہی کا!

اے مرے عشق میری تنہا بھول
وقت آیا تری گواہی کا

ڈوبتا چاند ہے جواب ندیمؔ
میری فریاد صبحگاہی کا

۱۹۴۴ء

خوابوں کی بستیاں نہ بسائیں، تو کیا کریں
ہمت شکن ہوں ان کی جفائیں، تو کیا کریں

رحمت طلب ہے اپنی تہی دامنی، مگر
موتی لٹائیں اودی گھٹائیں، تو کیا کریں
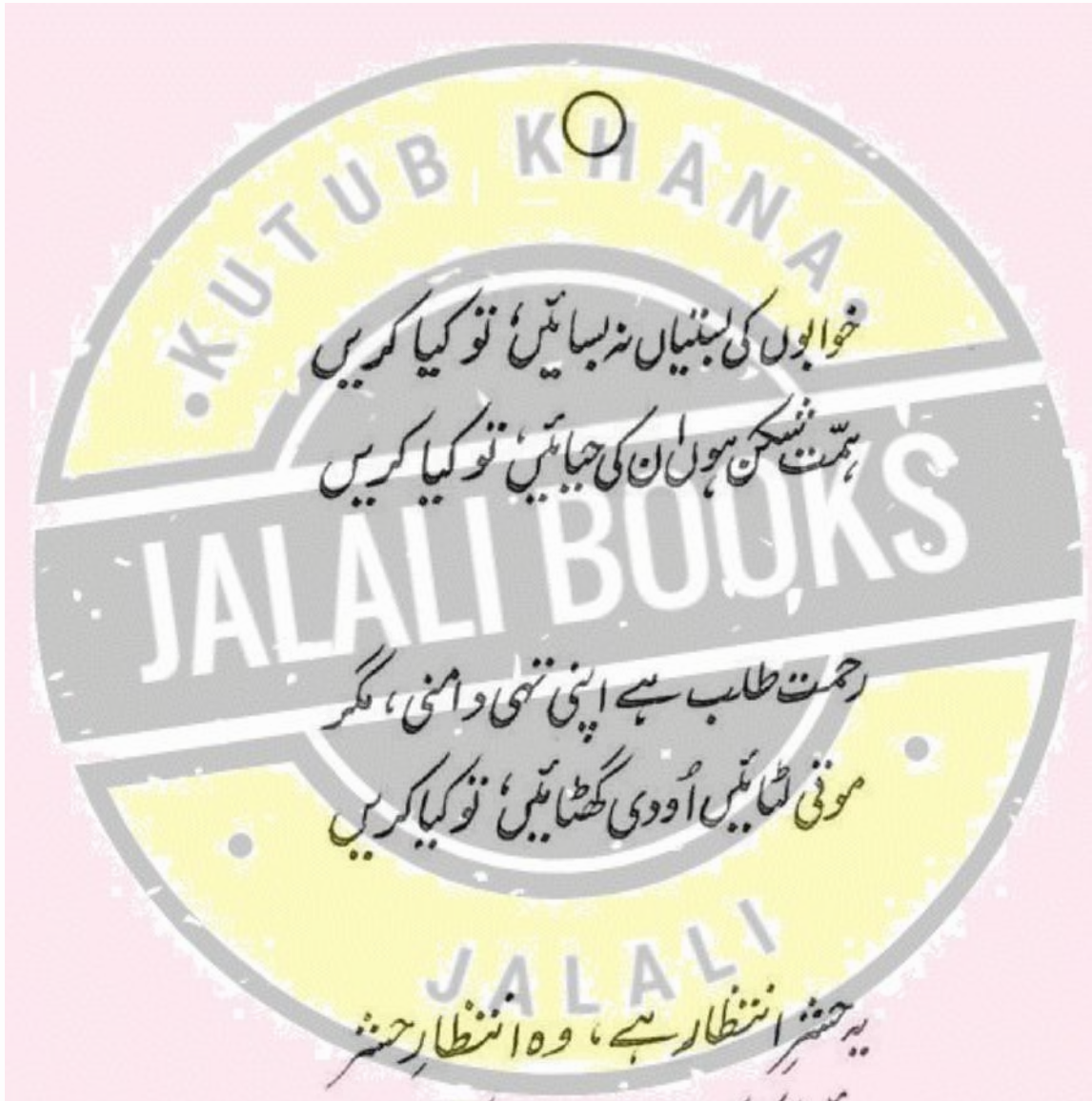
یہ حشرِ انتظار ہے، وہ انتظارِ حشر
جائیں تو کیا کریں، جو نہ جائیں تو کیا کریں

آئینے کی تلاش میں ہے حسنِ خود پسند
گردوں سے آفتاب نہ لائیں، تو کیا کریں

تعمیل کو گناہ سمجھتے ہیں محتسب
کچھ کہہ رہی ہوں تنگ قبائیں تو کیا کریں

جب گردشِ سپہرِ کہن رُک چکی، ندیم
اِک تازہ آسماں نہ بنائیں، تو کیا کریں

۱۹۴۳ء

کروٹیں وقت کی بیکار ہوئی جاتی ہیں
اور بھی درپئے آزار ہوئی جاتی ہیں

خواہشیں مائلِ اظہار ہوئی جاتی ہیں
یعنی ناقابلِ گفتار ہوئی جاتی ہیں
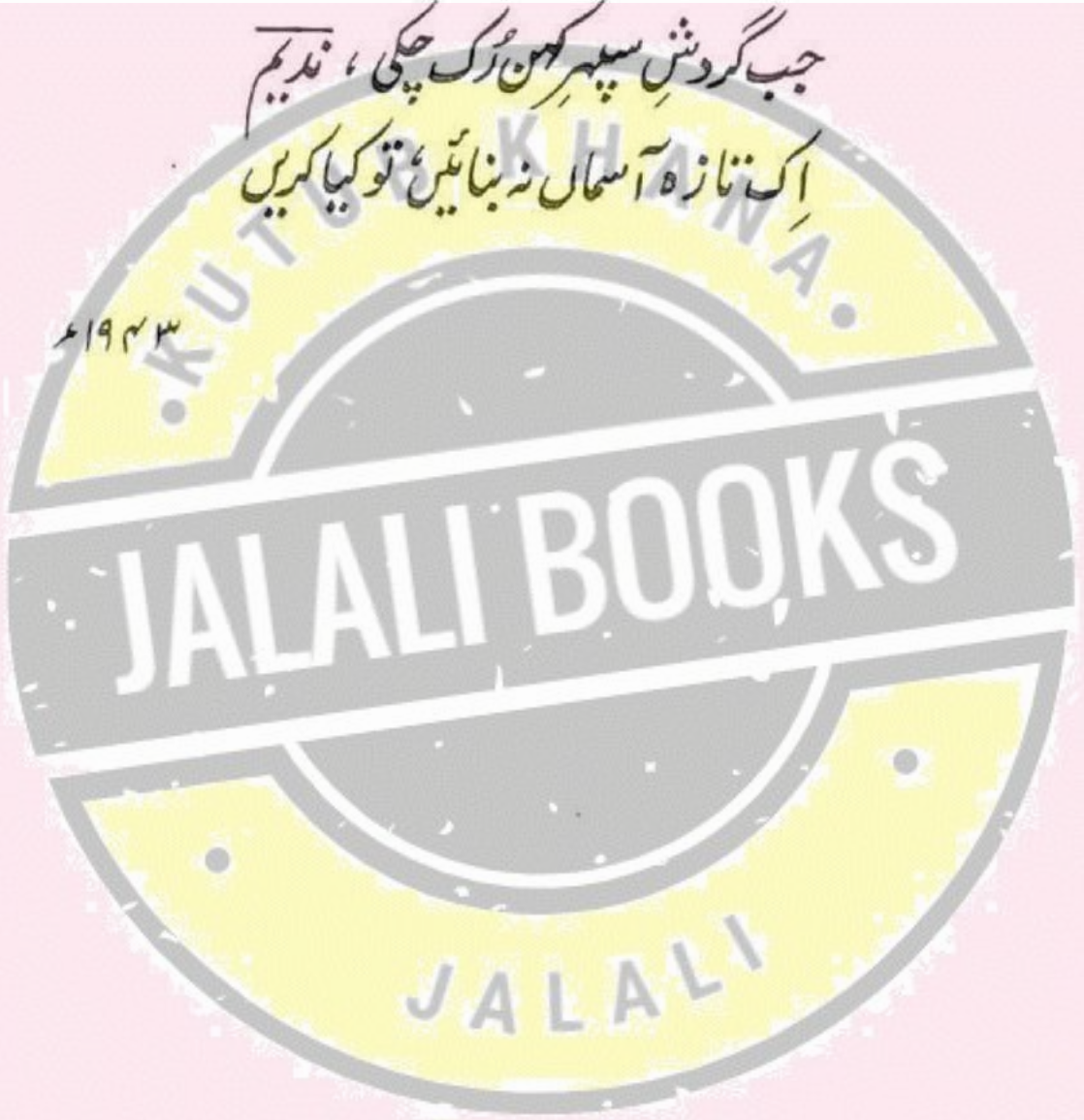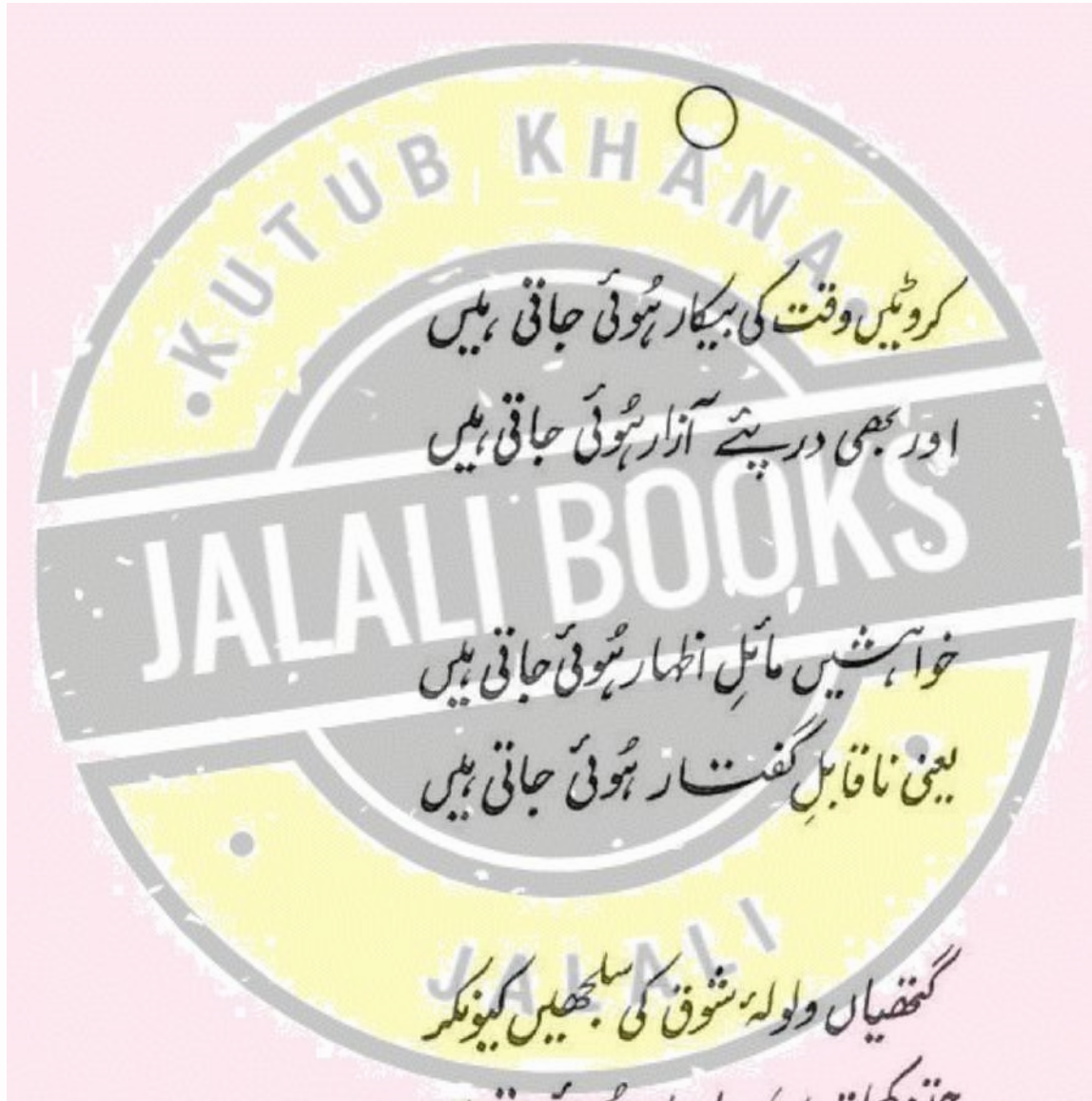
گتھیاں ولولۂ شوق کی سلجھیں کیونکر
جتنی کھلتی ہیں، پراسرار ہوئی جاتی ہیں

ہر تقاضے پہ نیا ضابطہ رہنا ہے سوار
روحیں لفظوں ہیں گرفتار ہوئی جاتی ہیں

شاید اب ابر کے چھٹنے کا گماں باطل ہے
صبحیں ہم رنگِ شبِ تار ہُوئی جاتی ہیں

اتنی ہلکی ہے شبستانِ محبّت کی ہوا
میری سانسیں بھی مجھے بار ہُوئی جاتی ہیں

۱۹۴۳ء

○
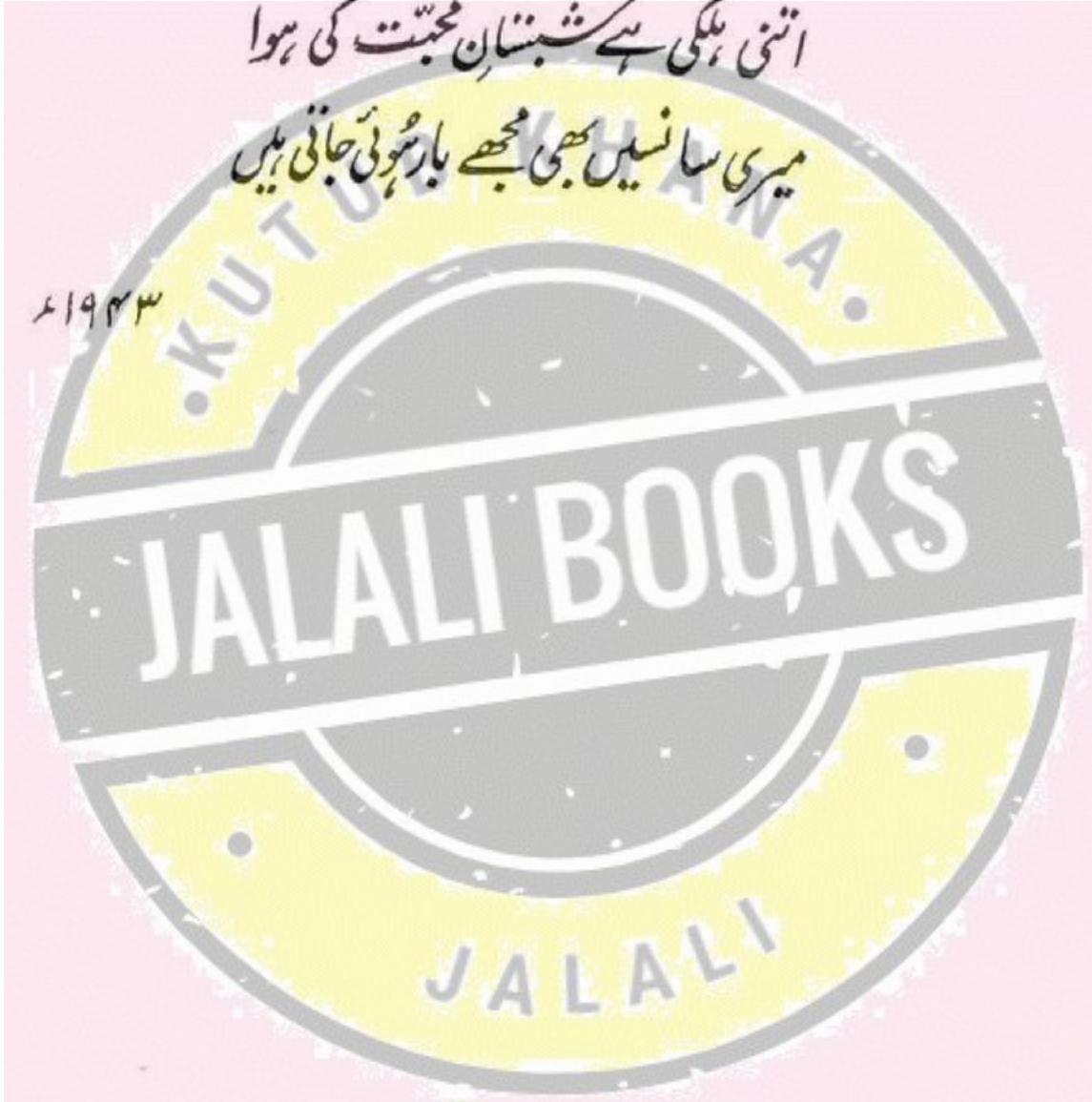
ٹوٹتی راتوں کی خاموشی میں رونا چھوڑ دے
ان ستاروں کو جلی مٹی میں بونا چھوڑ دے

یہ تری طفلانہ تعبیریں شکست انجام ہیں
اوس کے قطروں کو کرنوں میں پرونا چھوڑ دے

جب اُلجھنا ہے تجھے کانٹوں سے، تپتی دھوپ میں
سرد تہ خانے میں پھولوں کا بچھونا چھوڑ دے

اس کے دامن میں اگر شب ہے، ستارے بھی تو ہیں
گردشِ افلاک سے مایوس ہونا چھوڑ دے

تُو اگر اب تک جمالِ یار کا قائل نہیں
صبح کی سرشار تنویروں میں سونا چھوڑ دے

۱۹۴۳ء

○

نہ شعور میں جوانی، نہ خیال میں روانی
کوئی سُن کے کیا کرے گا مری دُکھ بھری کہانی

نہ زوالِ ناگہانی، نہ عرُوجِ جاودانی
مری زندگی کا عنواں۔ فقط ایک لفظ "فانی"

یہ شکست کا جہنّم کہیں پھر بھڑک نہ اُٹھے
مرے عشق کے کھنڈر پر، نہ کریں وہ گلفشانی

نہ گمانِ یاراں پر، نہ جمالِ یاراں میں
ترے کوکبِ قمر سے نہ بہل سکی جوانی

مجھے اور زندگی دے، کہ ہے داستاں اُدھوری
مری موت سے نہ ہوگی، مرے غم کی ترجمانی

۱۹۴۳ء

○

نقش مٹتی ہوئی کرنوں کا ابھارا کس نے؟
بامِ انجم سے کیا مجھ کو اشارا کس نے؟

جانے بھٹکے ہوئے راہی پہ کسے رحم آیا
رات کے اونگھتے سایوں میں پکارا کس نے؟

تیری بھیگی ہوئی پلکوں پہ محبّت کے سوا
ٹمٹماتے ہوئے تاروں کو اُتارا کس نے؟

کشتیِ زیست کنارے پہ لگی ہے شاید
عین طوفاں میں دیا ورنہ سہارا کس نے؟

یہ دھنک ہے تو عناصر کے فریبوں پہ نثار
ورنہ نغما ما ترے آنچل کا کنارا کس نے؟

۱۹۴۳ء
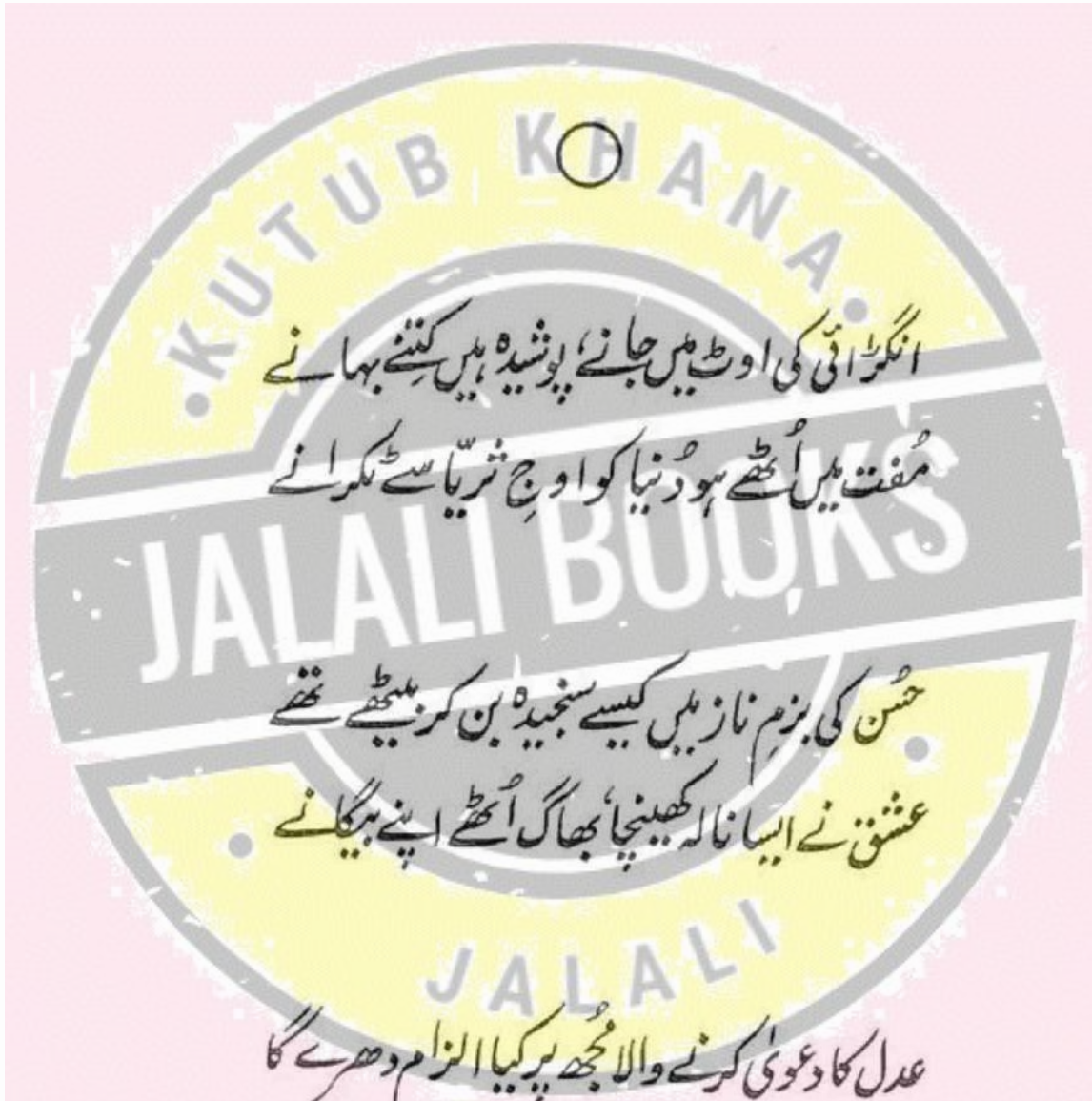
انگڑائی کی اوٹ میں جانے، پوشیدہ ہیں کتنے بہانے
مفت میں اُٹھے ہو دنیا کو اوجِ ثریّا سے ٹکرانے

حسن کی بزمِ ناز میں کیسے سنجیدہ بن کر بیٹھے تھے
عشق نے ایسا نالہ کھینچا، بھاگ اُٹھے اپنے بیگانے

عدل کا دعویٰ کرنے والا مجھ پر کیا الزام دھرے گا
اس نے میرا سچ بھی ٹوکا، میں نے اُس کے جھوٹ بھی مانے

دور بھی کر پُر ہول اندھیرے، روک بھی لے سیلابِ تباہی
ورنہ تھک کر چل نکلوں گا طوفانوں میں دیے جلانے

تیرا پتہ تو خیر نہ پایا، اب گھر کا رستہ تو دکھا
ٹامک ٹوئے مار کے آخر بھول گیا ہوں ٹھور ٹھور ...

سورج کے زرتار کلس پر آ دبکا قسمت کا پنچھی
آؤ چلیں سب خفتہ منّدر، جھٹ کا نیلا گنبد ڈھانے

کانٹوں سے بچنے کی خاطر ہم نے اتنا وقت گنوایا
وہ ندّی کس شان سے لپکی، کہساروں میں راہ بنانے!

عشق کا یہ انداز نہ بھایا، بجھتے دیے پر کوئی نہ آیا
لَو کانپی تو چار طرف سے ٹوٹ پڑے لاکھوں پروانے

آج سراپا گوش ہے عالم، کہہ دے جو کچھ کہنا چاہے
پھر طوفانِ سنگ کی زد میں آنہ سکیں گے آئینہ خانے

آخر اس گھمسان کے رن میں روح کہاں تک جم کر لڑتی
حسن آیا آنکھوں کو رجھانے، عشق چلا دل کو بہکانے

عمر کے ساتھی سے یہ دھڑکا، چلمن سرکی، شعلہ بھڑکا
آنکھوں نے تو بہت کچھ دیکھا، دل کیا جانے، دل کیوں مانے

گلیوں کے موڑوں پہ ٹھٹکنا، رُکنے کی کوشش میں لپکنا
پھر وہ نکلنا اور نہ تھکنا، ہائے وہ نادانی کے زمانے

راتوں کے سُونے محلوں میں تانیں کون اُڑا جاتا ہے
شاید اس تاریک خلا میں لرزاں ہیں ماضی کے ترانے

پھر احساس کے دوراہے پر وہ حیران ندیمؔ کھڑا ہے
پورب تیرا، پچھم تیرا، یہ بدبخت کہاں کی ٹھانے

۱۹۴۲ء
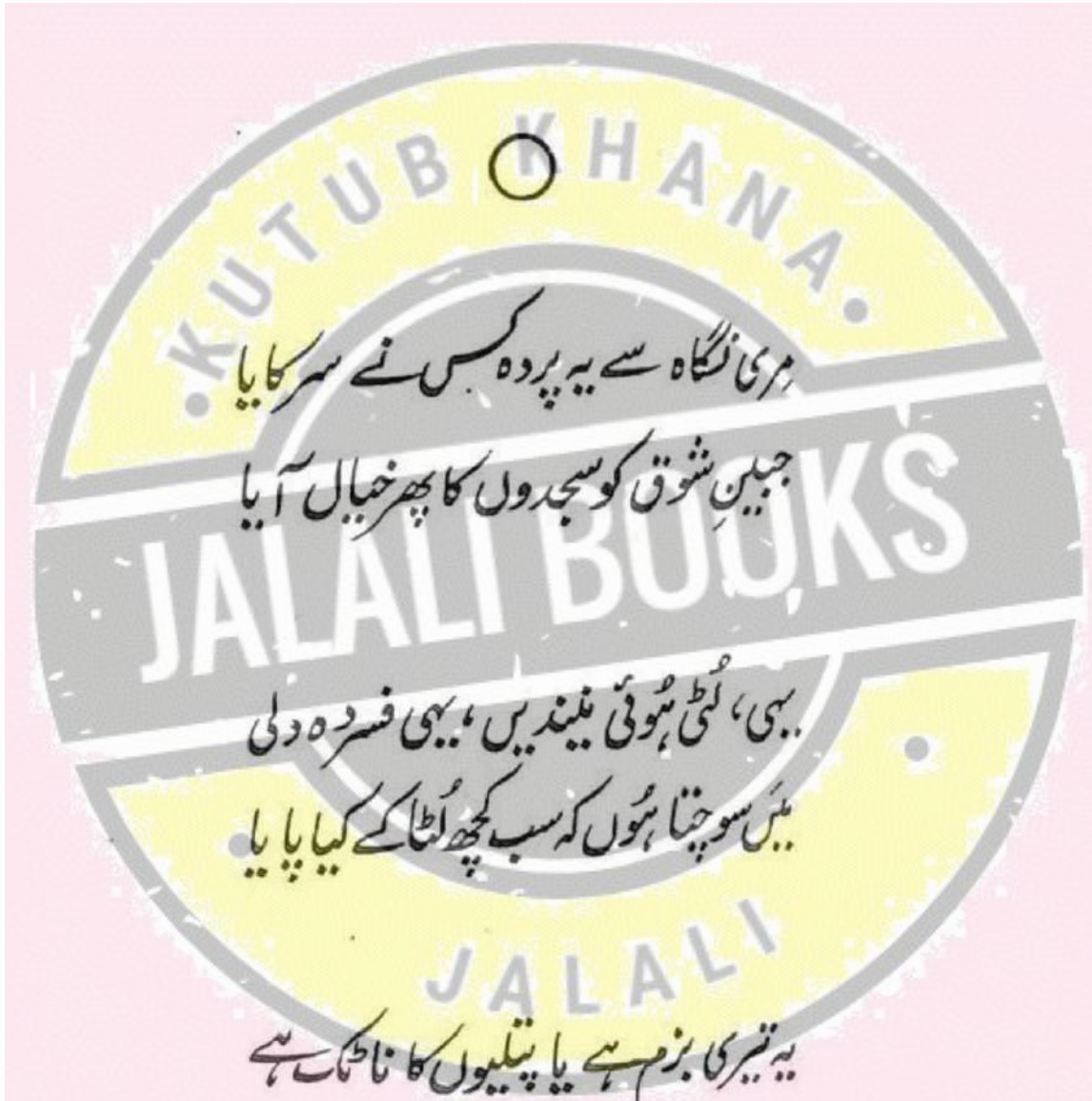
مری نگاہ سے یہ پردہ کس نے سرکایا
جبینِ شوق کو سجدوں کا پھر خیال آیا

کبھی، لُٹی ہُوئی نیندیں، کبھی فسردہ دلی
مَیں سوچتا ہُوں کہ سب کچھ لُٹا کے کیا پایا

یہ تیری بزم ہے یا پتلیوں کا ناٹک ہے
ابھی تو لا کے بٹھایا، ابھی نِکلوایا

حِنا کا اب نہ بہانہ تراش، مَیں خُوش ہُوں
کہ دل کا آخری قطرہ بھی تیرے کام آیا

خدا کے مدِّ نظر تھی جمال کی تخلیق
تو اِک فرشتہ، ہیولیٰ ترا اُٹھا لایا

ترے جہاں میں ہے کیوں پختگی فنا کی دلیل
کہ غنچہ ہنستا رہا، اور پھول مُرجھایا

مجھے بھی دیکھ ستاروں کو ڈھانپنے والے
بُجھا کے اپنا دیا تیرا نام چمکایا

۱۹۴۲ء

○

کہانیاں غمِ ہجراں کی، مَیں نے کِس سے کہیں
مرے قریب وہ بیٹھے ہُوئے بھی ہیں کہ نہیں

ترے کرم کا سہارا تو تھا امیدوں کو
مگر یہ چڑیاں شکستہ پروں سے اُڑ نہ سکیں

نہیں تو خاک ہیں یہ قوّتِ حیات ہے کیا
وہ اس جہان میں پوشیدہ ہیں کہیں نہ کہیں

مرا نیاز فلک گیر ہو چلا جب سے
ترے جمال کی پہلی لطافتیں نہ رہیں

وہ ایک تنگ سے کُوچے میں سرسری مڈبھیڑ
بس اتنی بات ہے، پھر کیا ہُوا تھا! یاد نہیں!

۱۹۴۲ء

○

مری نگاہ کا مقصود روئے یار نہیں
فدائے جلوہ ہُوں، دیوانۂ بہار نہیں

مَیں تیرے خوابِ جوانی کی تابشوں پہ نثار
کوئی چراغ سرِ راہِ انتظار نہیں

یہ التفات نہیں، انقلاب ہے دل کا
یہ میرا ذوقِ نظر ہے، جمالِ یار نہیں

ترا بہار کا وعدہ درست ہے، لیکن
مجھے بہار کے رنگوں پہ اعتبار نہیں

مری فسردہ نصیبی سے کھیلنے والے
ندیم! خاک نشیں آزمودہ کار نہیں

۱۹۴۲ء

○

جانے کہاں تھے، اور چلے تھے کہاں سے ہم
بیدار ہو گئے کسی خوابِ گراں سے ہم

اے نو بہارِ ناز! تری نکہتوں کی خیر
دامن جھٹک کے نکلے ترے گلستاں سے ہم

پندارِ عاشقی کی امانت ہے آہِ سرد
یہ تیر آج چھوڑ رہے ہیں کماں سے ہم

آؤ غبارِ راہ میں ڈھونڈیں شمیمِ ناز
آؤ، خبر بہار کی پوچھیں خزاں سے ہم

آخر دعا کریں بھی، تو کس مدعا کے ساتھ
کیسے زمیں کی بات کہیں آسماں سے ہم

۱۹۴۲ء
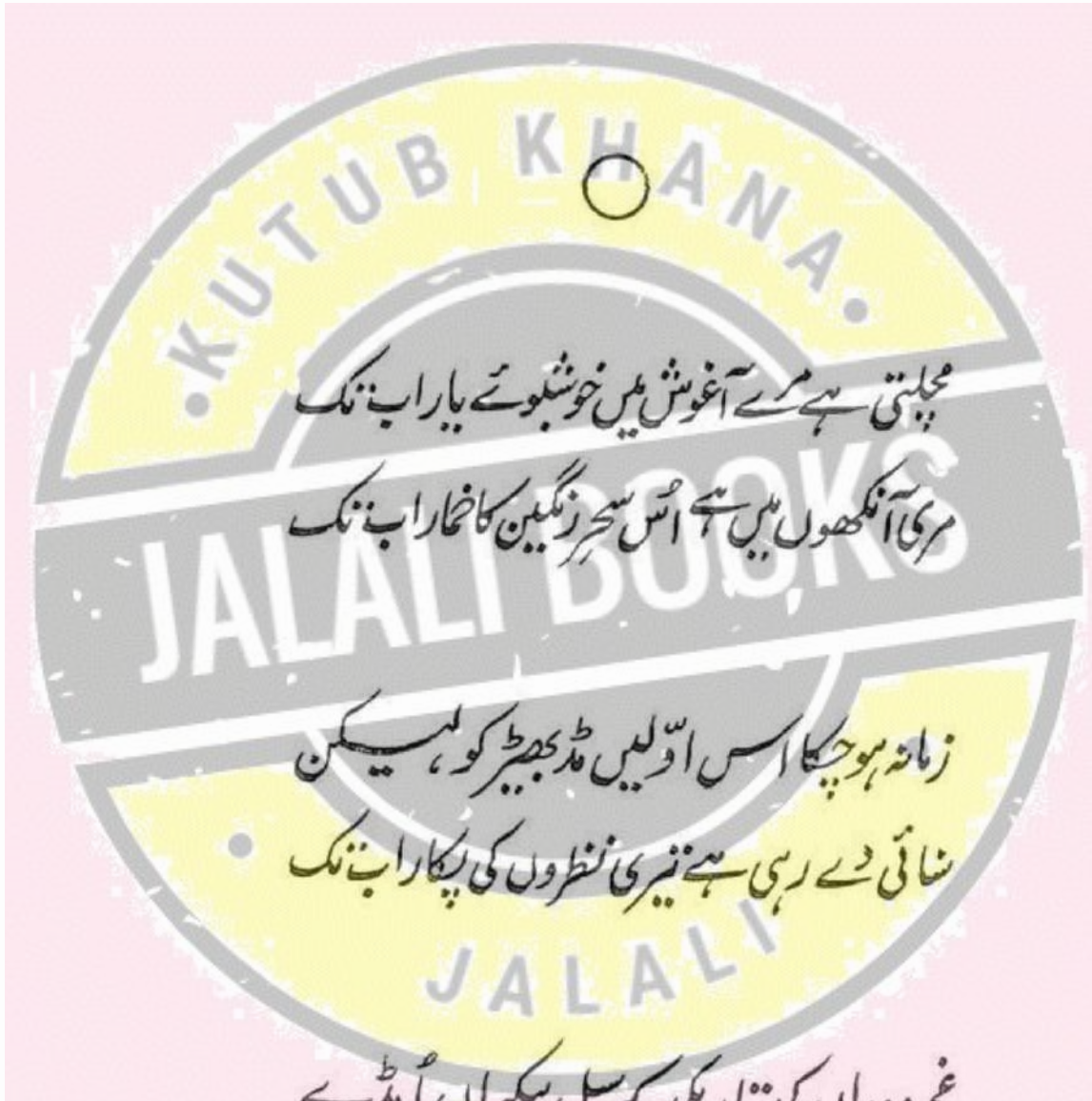
مچلتی ہے مرے آغوش میں خوشبوئے یار اب تک
مری آنکھوں میں ہے اُس سحرِ رنگیں کا خمار اب تک

زمانہ ہو چکا اس اوّلیں مڈبھیڑ کو، لیکن
سنائی دے رہی ہے تیری نظروں کی پکار اب تک

غمِ دوراں کی تاریکی کے سیلِ بیکراں اُمڈے
مگر ٹوٹا نہیں تیری تجلّی کا حصار اب تک

شبستانوں کے در ہر چند مجھ پر وا نہیں ہوتے
مگر اِک مستِ بیخود رات کا ہے انتظار اب تک

کوئی آتا نہیں اب دل کی بستی میں، مگر پھر بھی
اُمیدوں کے چراغوں سے ہیں روشن رہگزار اب تک

ابھی تک نصف شب کو چاندنی گاتی ہے جھرنوں میں
نہیں بدلی شبابِ منتظر کی یادگار اب تک

جلا رکھے ہیں شہراہوں پہ اشکوں کے دیے کب سے
نہیں گزرا مگر اس سمت سے وہ شہسوار اب تک

جو حُسن و عشق کی پیکار میں آنکھوں سے ٹپکے تھے
انھیں تاروں سے ہے دامانِ ہستی زرنگار اب تک

شکستِ آرزو کو عشق کا انجام کیوں سمجھوں؟
مقابل ہے مرے آئینۂ لیل و نہار اب تک

ندیم اِن مشعلوں کی جگمگاہٹ بڑھتی جاتی ہے
کہ لہرایا نہیں اس بزم میں دامانِ یار اب تک

دل نے صدمے بہت اُٹھائے ہیں
آپ لیکن ابھی پرائے ہیں

چھلنی چھلنی ہوئے ہیں جسم و جاں
تیر کیوں بے نشاں لگائے ہیں
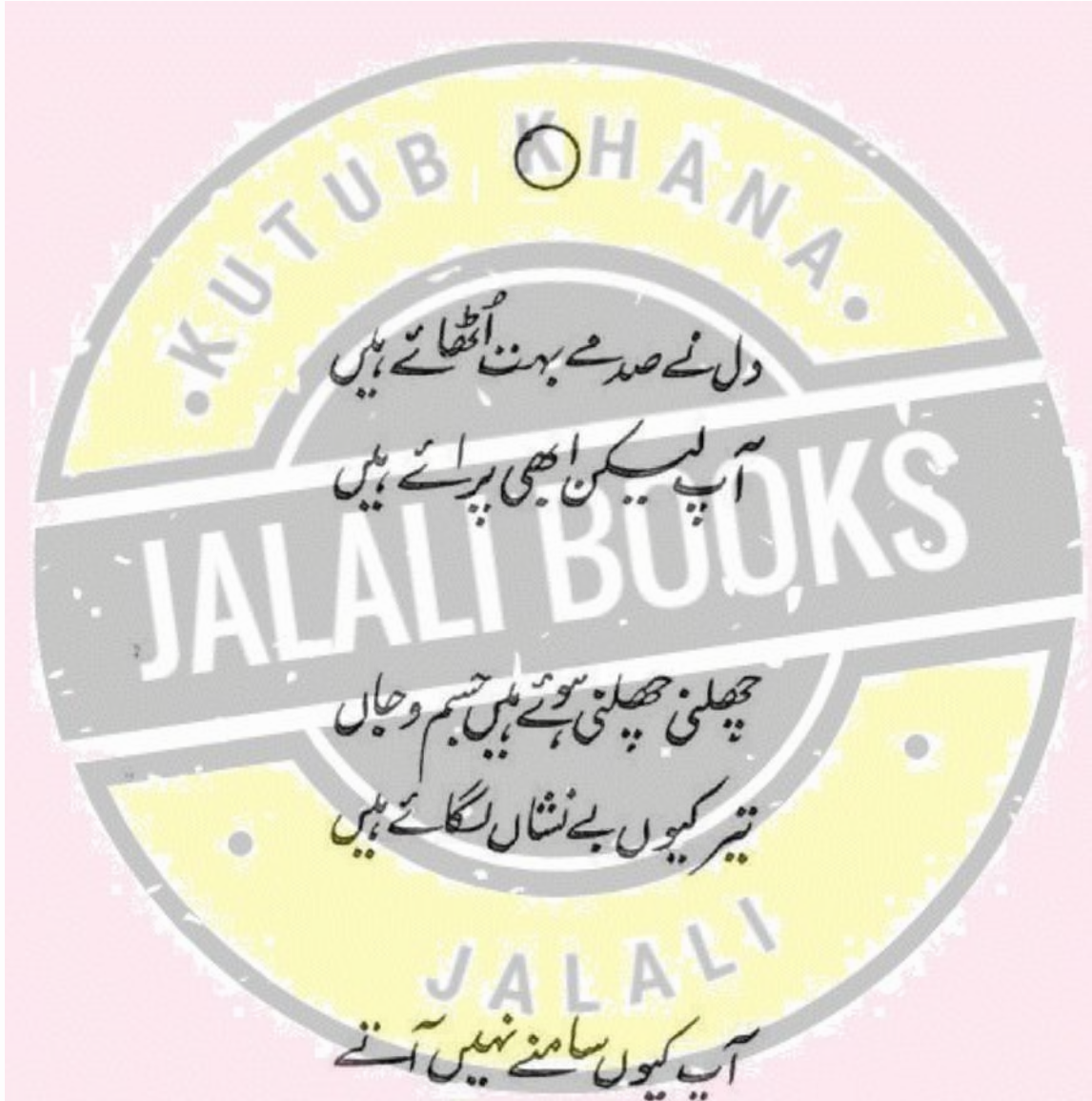
آپ کیوں سامنے نہیں آتے
آپ کیوں روح میں سمائے ہیں

مختصر یہ ہے داستانِ حیات
پھول ڈھونڈے ہیں خار پائے ہیں

آپ رستہ نہ بھول جائیں کہیں
آنسوؤں کے دِیے جلائے ہیں

ہچکیاں لے رہا ہے سازِ حیات
آپ کس دُھن میں گنگنائے ہیں

کہکشاں ہے غُبارِ راہ ندیمؔ
کِس نے یہ راستے سجائے ہیں

۱۹۴۱ء

ذرّے ذرّے میں ترا عکس نظر آتا ہے
راستہ دیکھتے رہنا بھی اب آساں نہ رہا

راتیں روتی ہیں کہ وہ چاند نہ اُبھرا اب تک
دن بلکتے ہیں کہ وہ مہرِ درخشاں نہ رہا

پردۂ ارض و سما کا یہ تکلّف کیسا!
اِن حجابوں میں تو جلوہ ترا پنہاں نہ رہا
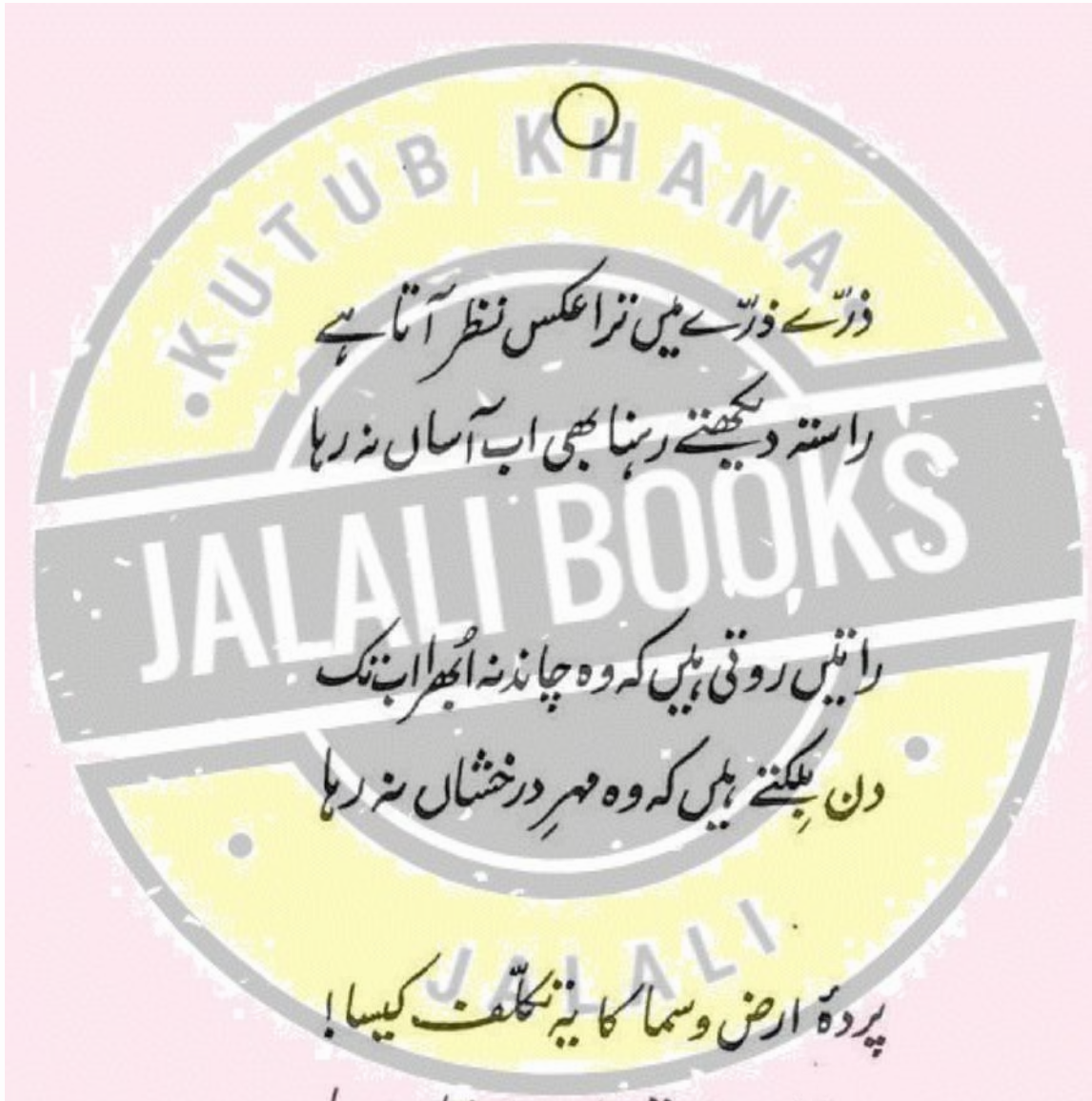
تجھ سے اِک آس لگائی تھی پر اے جانِ ندیم
یہ دیا بھی مرے سینے میں فروزاں نہ رہا

۱۹۴۱ء
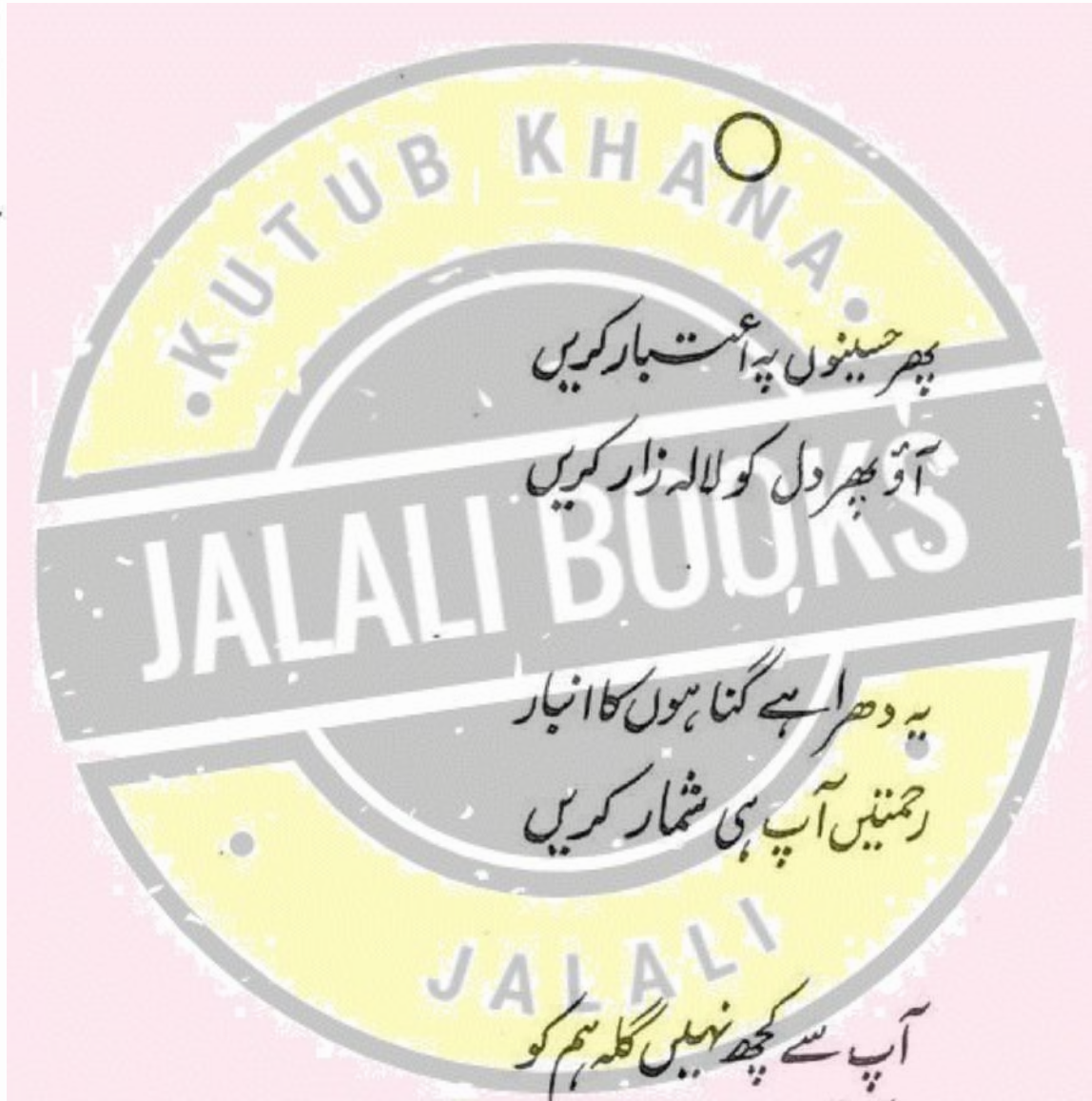
پھر حسینوں پہ اعتبار کریں
آؤ پھر دل کو لالہ زار کریں

یہ دھرا ہے گناہوں کا انبار
رحمتیں آپ ہی شمار کریں

آپ سے کچھ نہیں گلہ ہم کو
یعنی کس کس سے آپ پیار کریں

ہر طرف چھا رہی ہے تاریکی
آؤ مل جل کے ذکرِ یار کریں

جسم بھی اُن کا، جان بھی اُن کی
ہائے کیا چیز ہم نثار کریں

اُبھر آئیں گے خود بخود مینار
پہلے بنیاد استوار کریں

۱۹۴۱ء

○
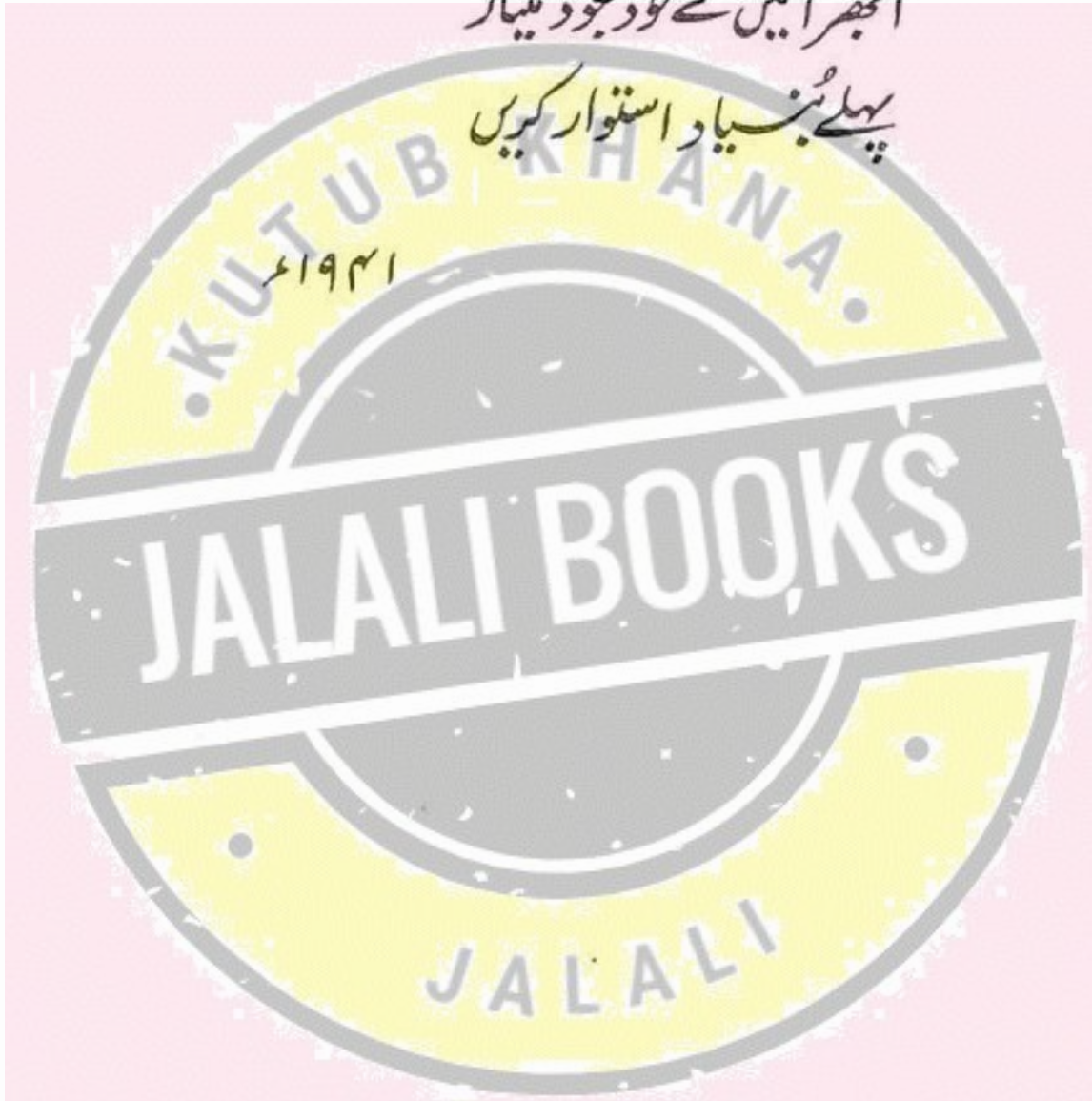
اعجاز ہے یہ تیری پریشاں نظری کا
الزام نہ دھر عشق پہ شوریدہ سری کا

اس وقت مرے کلبۂ غم میں ترا آنا
بھٹکا ہُوا جھونکا ہے نسیمِ سحری کا

تجھ سے ترے کوچے کا پتہ پوچھ رہا ہوں
اس وقت یہ عالم ہے مری بے خبری کا

یہ فرش، ترے رقص سے جو گونج رہا ہے
ہے عرشِ معلّیٰ مری عالی نظری کا

کمرے میں تڑپتے ہوئے اے صبح کے تارے
احسان ہے شاعر پہ تری چارہ گری کا

۱۹۴۱ء

○

غبارِ رنگ جو آئینۂ بہار میں ہے

وہی خزاں کے گریبانِ تارتار میں ہے

وہ شوقِ دید نگاہِ اُمیدوار میں ہے

کہ جیسے شام، ستاروں کے انتظار میں ہے

مجھے قبول ہیں غمہائے جاوداں اے دوست

مری خوشی بھی مگر تیرے اختیار میں ہے

وفا کی لذّتِ بے کیف ہے جمودِ حیات

مری جفا طلبی تیرے انتظار میں ہے

نظامِ دہر تیرے اختیار میں ہے مگر

مَیں سوچتا ہُوں کہ تُو کس کے اختیار میں ہے

۱۹۴۰ء

○

میں تجھ کو دیکھنے کی تمنا میں چور تھا
تو میرے آس پاس خراماں ضرور تھا

ناگاہ برق میرے نشیمن پہ آ گری
میں سوچتا رہا کہ مرا کیا قصور تھا

پچھلی رات خواب میں وہ مسکرائے تھے
یا میرے آنسوؤں کے ستاروں کا نور تھا

اے خلوتِ شعور میں سمٹے ہوئے حسیں
تو سرحدِ خیال سے کس درجہ دور تھا

لو بجھ گیا کسی کی تمنا لیے ہوئے
وہ دل کہ جس پہ کون و مکاں کو غرور تھا

۱۹۴۰ء

مجھے بھی رخصتِ تعمیرِ آشیاں دیجے
چلے ہیں آپ اگر بجلیاں گرانے کو

وہ مر تو جائے کہ مرنا ہے روح کی معراج
مگر ندیمؔ سے کچھ آس ہے زمانے کو

۱۹۴۰ء

مرا ہوں گا ترے مَن مَن کے رُوٹھ جانے کو
کہ بجلیوں کی ضرورت ہے آشیانے کو

نقاب ڈال رکھے ہیں دلِ فسردہ پر
کوئی سمجھ نہ سکا میرے مُسکرانے کو

یہ کہتے کہتے ستارے اُفق پہ ڈوب گئے
کہ اتنا طُول نہ دے دُکھ بھرے فسانے کو
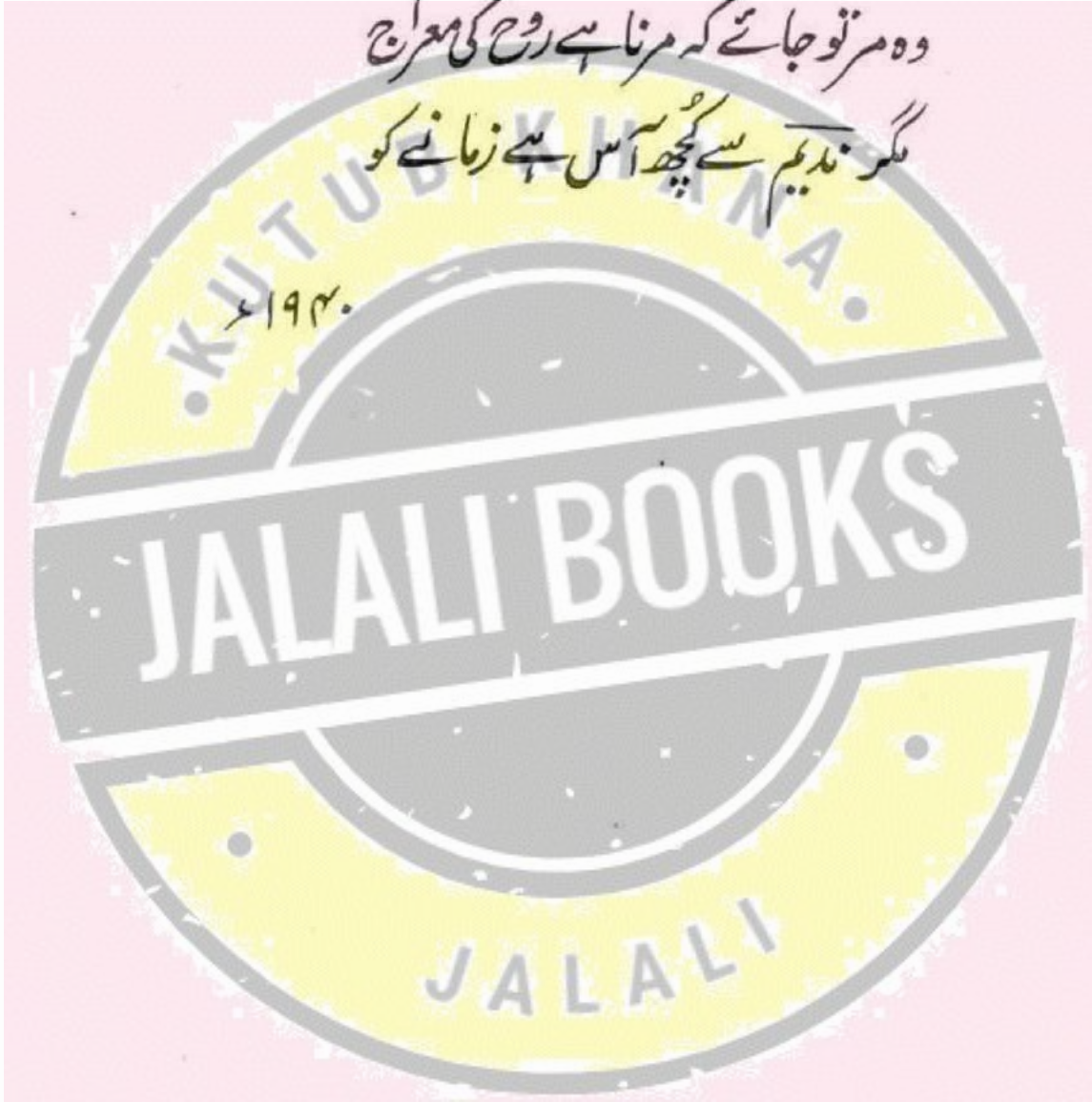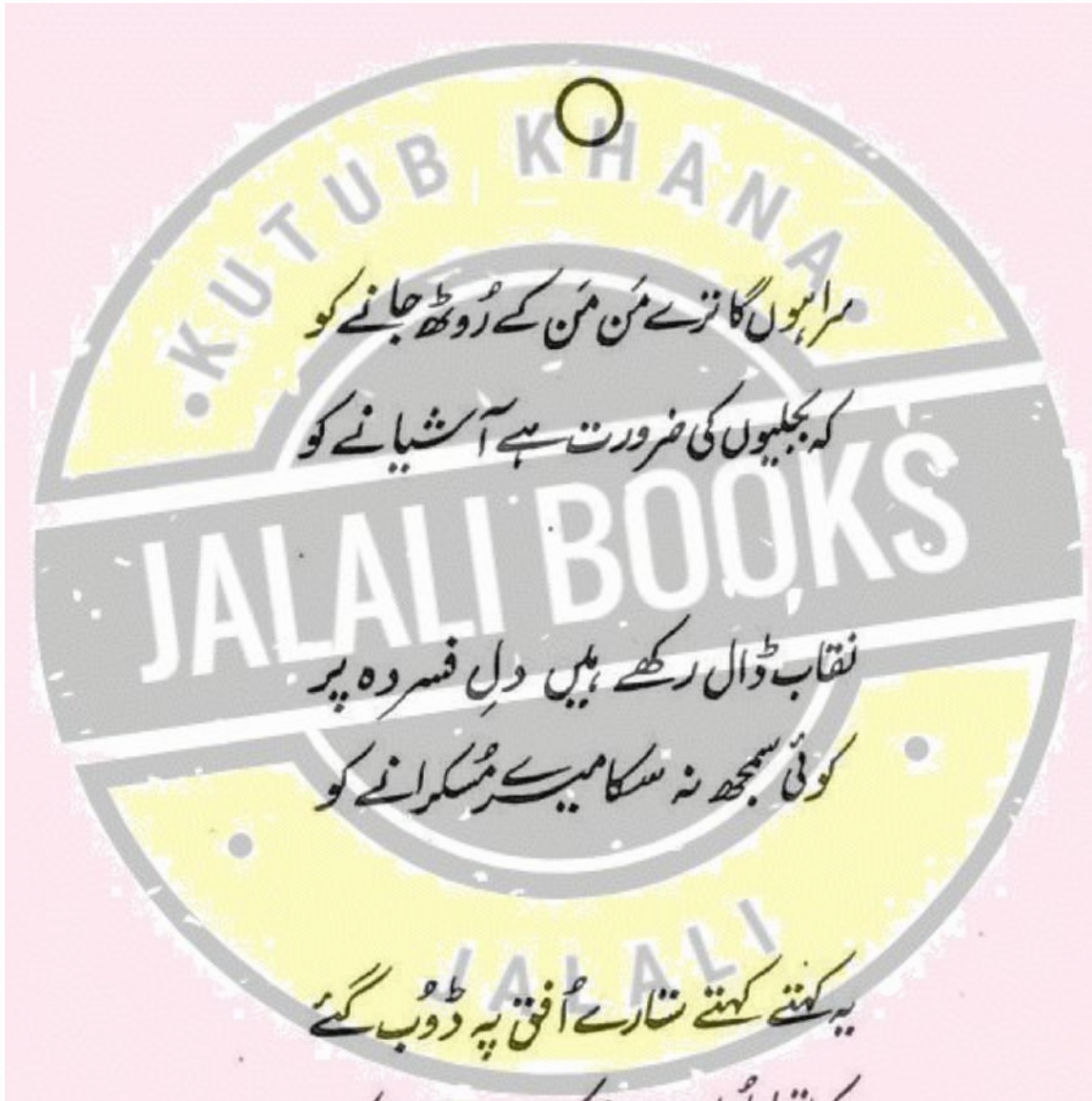
ترے جہاں میں ٹھکانا کہیں نہیں مِلنا
پروں پہ لے کے نہ اُڑ جاؤں آشیانے کو

○

میری نظر کو حوصلۂ امتحاں نہ تھا
دیکھا تو مَیں ہی مَیں تھا، کسی کا نشاں نہ تھا

تیری طلب میں کون و مکاں کی حدوں سے دُور
پہنچا ہُوں اُس مقام پہ، تُو بھی جہاں نہ تھا

نظارۂ جمال کی تابانیاں نہ پُوچھ
وہ پیکرِ حسیں بھی جہاں تھا، وہاں نہ تھا

مَیں ہی پروں پہ تنکے اُٹھا کر بڑھا اُدھر
بجلی کی زد میں ورنہ مرا آشیاں نہ تھا

مَیں بھی جلا ہُوں طور کی لَو پر، مگر ندیمؔ
ہونٹوں پہ میرے غلغلۂ الاماں نہ تھا

۱۹۴۰ء

○

گو میری بے کسی کا کوئی رازداں نہیں
تم سے تو میری بے پر و بالی نہاں نہیں

کہتے ہیں، تم بھی میری عیادت کو آئے تھے
سُنتا ہُوں، آج سر پہ مرے آسماں نہیں

دُکھ بھی مرا، تمھاری رضا کا غلام ہے
جو اشک تم نے پونچھ لیا، رائیگاں نہیں

کیسے کہوں فسانۂ بے چارگیِ شوق
تم سے نہاں نہیں ہے، جہاں پر عیاں نہیں

اب برق کو ندیمؔ مری کیوں تلاش ہے
مدّت سے شاخِ گُل پہ مرا آشیاں نہیں

۱۹۴۰ء

○

گھبرا کے شبِ ہجر کی بے کیف سحر میں
تارے اُتر آئے ہیں مرے دیدۂ تر میں

وہ آڑ میں پردے کے، تری نیم نگاہی
ٹوٹے ہوئے اِک تیر کا ٹکڑا ہے جگر میں

اب وقت کے قدموں میں تجسّس کی ہے زنجیر
میں تیری نظر میں ہُوں، جہاں میری نظر میں

اُس پھُول سے چہرے سے جب اُٹھ جاتے ہیں پردے
کانٹے سے کھٹک جاتے ہیں دامانِ نظر میں

اللہ! مرے کفر سے تُو قطعِ نظر کر
مَیں تیری جھلک دیکھتا ہُوں حُسنِ بشر میں

۱۹۴۰ء

○

بجا کہ تیرے تغافل کے شکوے کرتا ہوں
تری قسم کہ ابھی دم ترا ہی بھرتا ہوں

کٹھن ہے اپنا گلا کاٹنا کسی کے لیے
میں تیری راہ میں ایسا بھی کر گزرتا ہوں

نہ جانے نام ترا کیوں زباں پہ آتا ہے
میں ڈوب ڈوب کے جب بار بار ابھرتا ہوں

سنا ہے تو مری پرواز کا مخالف ہے
تری خوشی کے لیے اپنے پر کترتا ہوں

لرز رہے ہیں یہاں چند لرزہ خیز اسرار
میں اپنی روح کی گہرائیوں سے ڈرتا ہوں

۱۹۳۹ء

○

جب چرخ پہ تارے مجھے کرتے ہیں اشارے
جاگ اُٹھتے ہیں خاکسترِ ماضی میں شرارے

آنکھوں سے اِدھر اشک ٹپکتے ہیں ہمارے
گردوں پہ اُدھر ٹوٹتے جاتے ہیں ستارے

تھی اُن کی نگاہوں میں بہت دُور کی منزل
منزل پہ پہنچتے ہی جو منزل سے سدھارے

تا خیر کے اسرار مجھے تو نہیں معلوم
کیوں کانپ رہے ہیں ترے ہونٹوں کے کنارے

یُوں دل سے ندیمؔ اُٹھتی ہے آواز شبوں کو
جیسے کوئی بھٹکا ہُوا منزل کو پکارے

۱۹۳۹ء

نوکِ مژہ سے اشک ڈھلے، اور بہہ گئے
اِک داستان چند اشاروں میں کہہ گئے

رُکنے کا نام تک نہ لیا اہلِ شوق نے
دم لینے کو جو بیٹھے، وہ بیٹھے ہی رہ گئے

آنے کا اِتنی دُور سے کچھ مدّعا تو تھا
دیوانے خامشی میں کوئی بات کہہ گئے
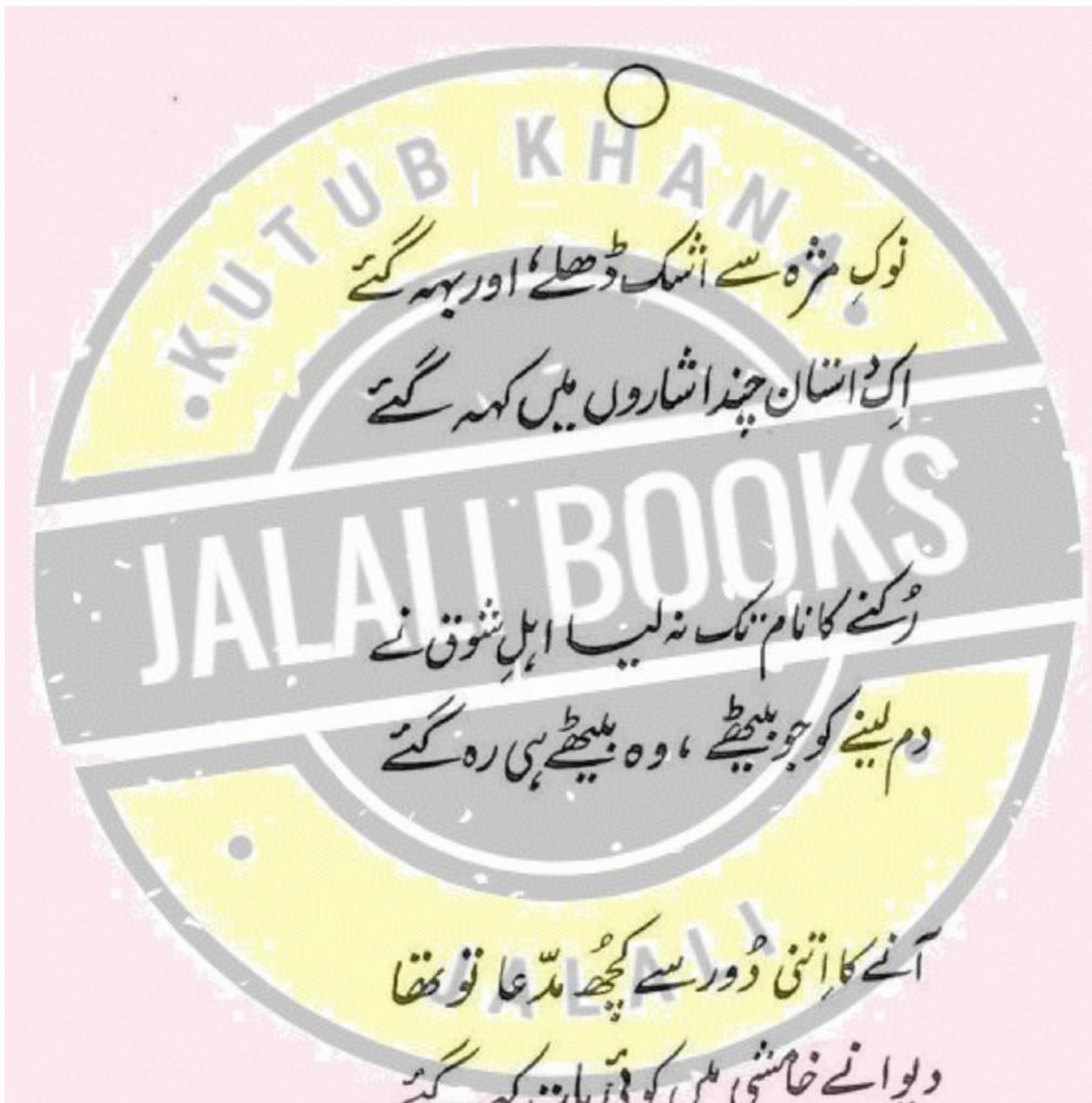
چوٹیں تو سخت تھیں پہ اسیرانِ غم نصیب
سب کچھ ترے کرم کے بھروسے پہ سہہ گئے

سیلِ حیات میں ہیں ہم انسان خار و خس
موجوں سے چند لمحہ لڑے، اور بہہ گئے

اہلِ ہوس تو پی کے چلے بھی گئے ندیم
اور آپ دستِ ناز کا رُخ تکتے رہ گئے

۱۹۳۸ء

○
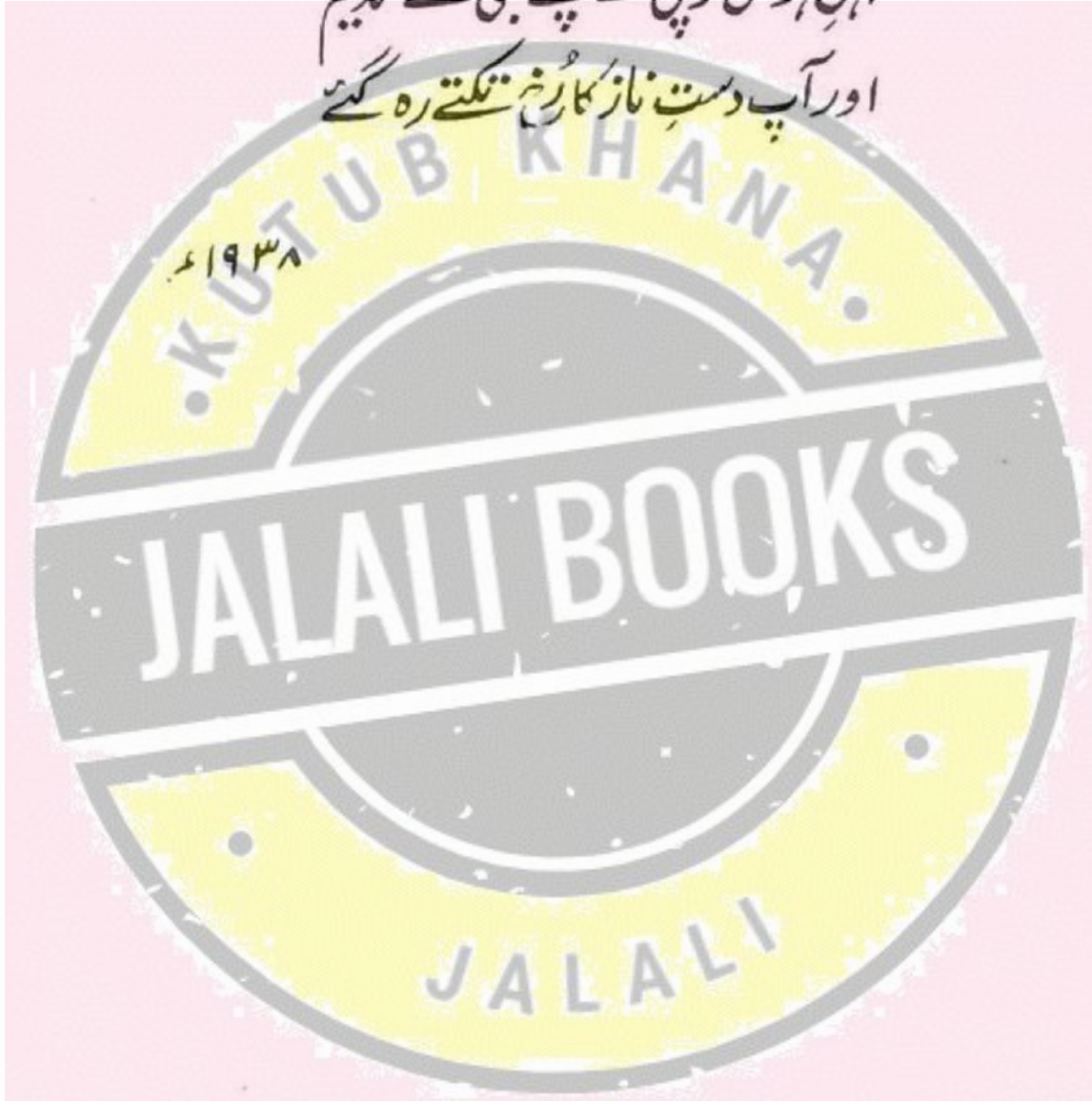
جب تیرا ظہور دیکھتا ہُوں
تنکوں میں غرور دیکھتا ہُوں

تاریکیٔ شب سے ہو کے مانوس
اب نور ہی نور دیکھتا ہُوں

جب سے مَیں قریب ہُوں تمھارے
ہر چیز کو دُور دیکھتا ہُوں

پلکوں سے نظر نہیں نکلتی
جب تیرے حضور دیکھتا ہُوں

بے فکر ندیم کوششوں میں
افکار سے چُور دیکھتا ہُوں

۱۹۳۸ء

بیٹھا ہوں تشنگی کو چھپائے نگاہ میں
ساقی کے آستانۂ عالم پناہ میں

پھر عرش و فرش میں ہے قیامت مچی ہوئی
پھر جنبشیں ہیں یار کی نیچی نگاہ میں

خاکِ درِ حبیب پہ جب مجھ کو ناز ہے
پھر کیا دھرا ہے طرّہ و تاج و کلاہ میں
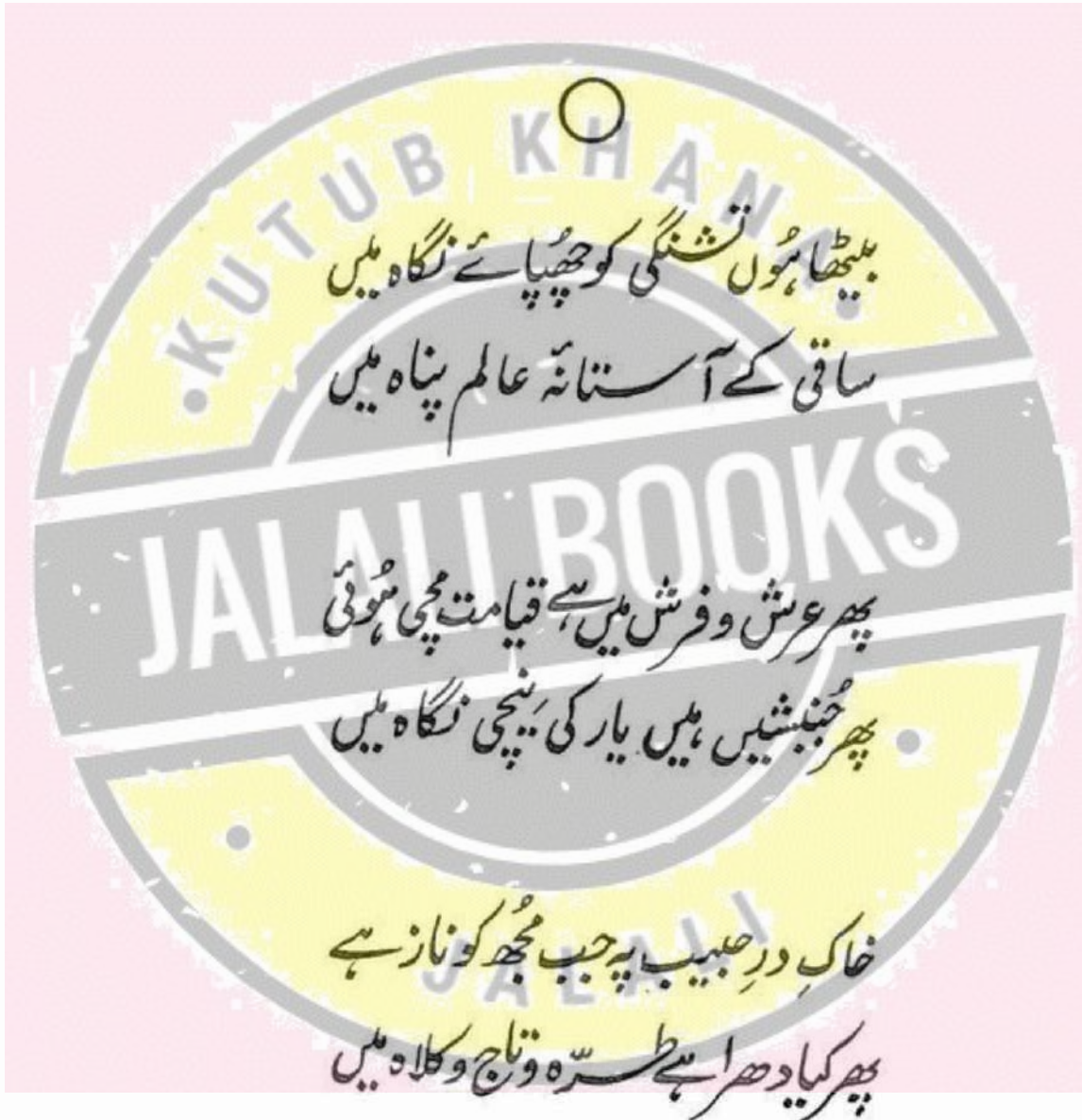
اس ماہِ نیم ماہ کو دیکھا جب اے ندیم
تارے چمک اٹھے مری لوحِ سیاہ میں

۱۹۳۷ء

○

رُک گئی عقل و فکر کی پرواز
جب نمایاں ہوئے نشیب و فراز

خم بہ خم پھیلتی ہی جاتی ہے
شاہدِ آگہی کی زُلفِ دراز

کِتنا تاریک ہے مرا انجام
کِتنا موہوم ہے مرا آغاز

نیلگوں آسماں کے محلوں سے
دے رہا ہے مجھے کوئی آواز

رفعتیں بھی انھیں کی جویا تھیں
بے محل تھی ندیم کی پرواز

۱۹۳۶ء

○

اب تو ہیں اُس شوقِ گستاخانہ سے بیگانہ ہم
بس نظر سے چوم لیتے ہیں لبِ پیمانہ ہم

رات کو تاروں سے، دن کو ذرّہ ہائے خاک سے
کون ہے جس سے نہیں سُنتے ترا افسانہ ہم

ضبط کی حد سے اگر شوقِ فراواں بڑھ چلا
آنسوؤں سے بھر کے پی جائیں گے اِک پیمانہ ہم

یہ اندھیری رات، یہ بوسیدہ کُٹیا، اور آپ!
کاش پلکوں پر اُٹھا سکتے چراغِ خانہ ہم

کچھ ہماری تیرہ روزی کا بھی درماں کیجیے
آپ کی آنکھوں میں پلتے ہیں تجلّی خانہ ہم

۱۹۳۶ء

متفرق اشعار
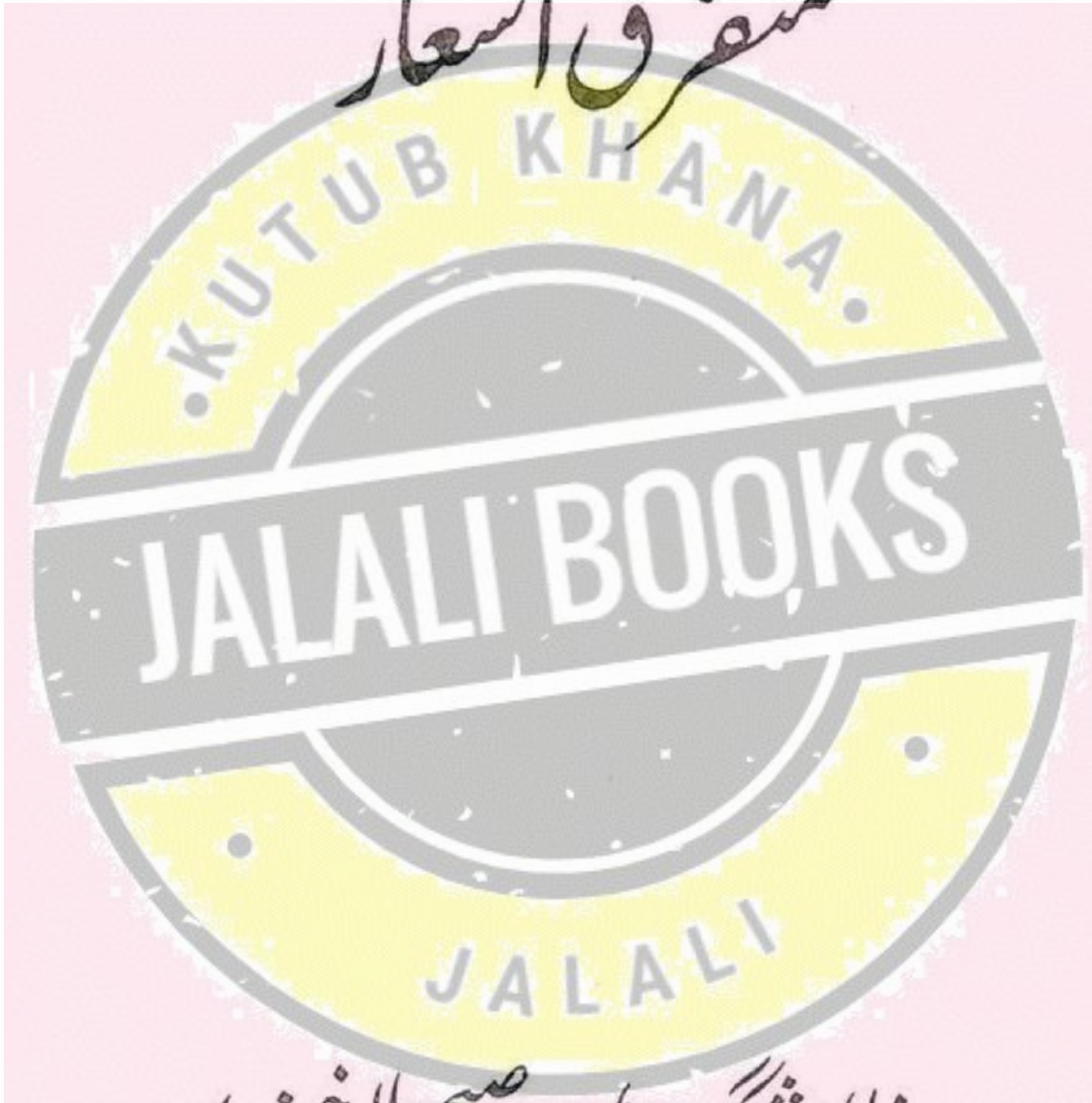
صد نالۂ شبگیرے، صد صبح بلا خیزے
صد آہِ شرر ریزے، یک شعر دلآویزے

(پیامِ مشرق)

○
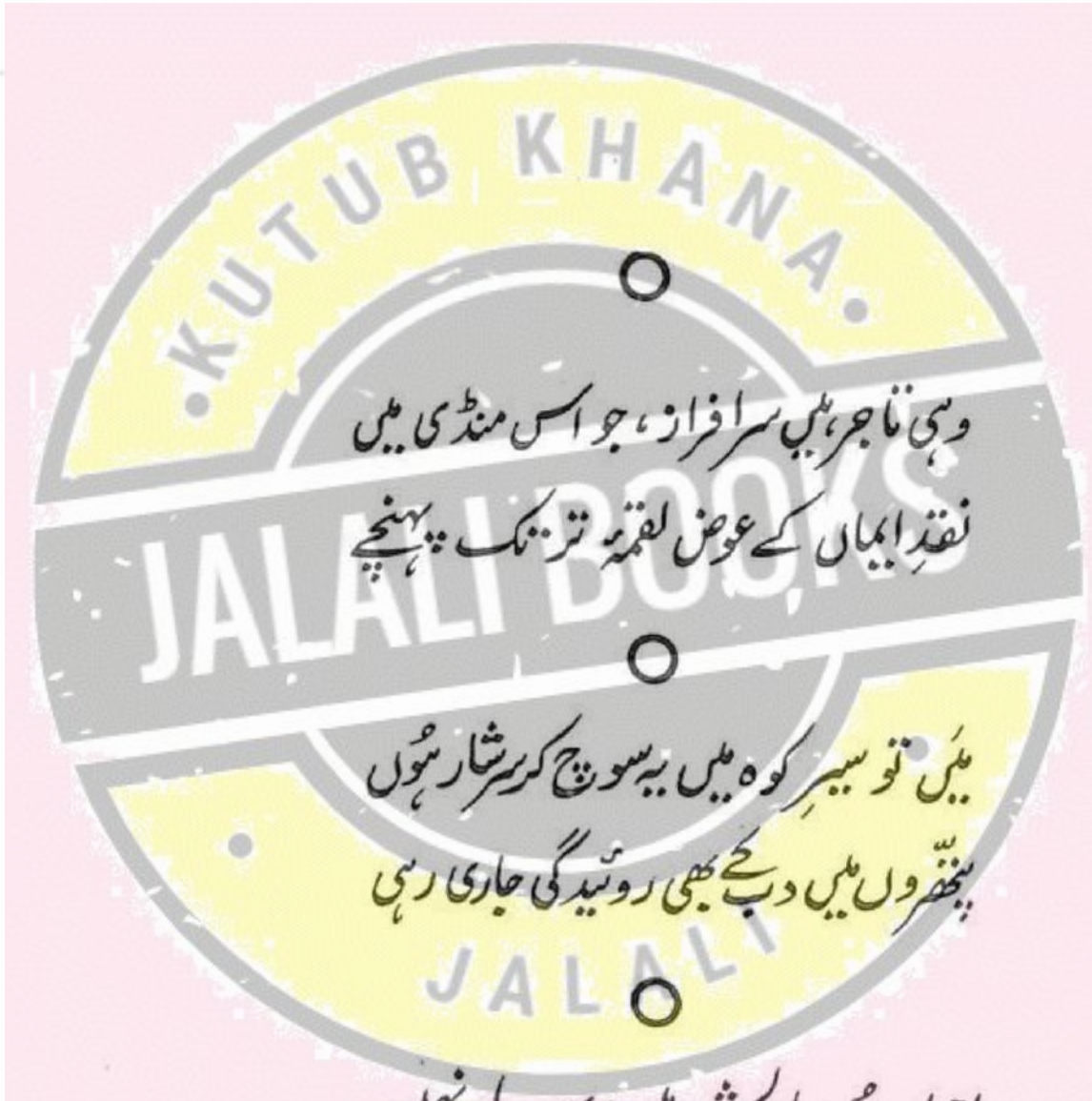
وہی تاجر ہیں سرافراز، جو اس منڈی میں
نقدِ ایماں کے عوض لقمۂ تر تک پہنچے

○

مَیں تو سبزے کو یہ سوچ کر سرشار ہُوں
پتھروں میں دب کے بھی روئیدگی جاری رہی

○

احباب دُور اندیش ہیں، بھولے نہیں
جب بولنے کا وقت تھا، بدلے نہیں

○

ہر پھول اپنے رنگ کے مرقد میں دفن تھا
خوشبو بھی جب چمن سے سدھاری، ہوا کے ساتھ

○

کسی بھی مصحفِ رُخ کو پڑھوں تو کیسے پڑھوں
حرُوف مِٹ سے گئے ہیں تمھارے نام کے بعد
شبِ سیاہ کا تریاق پا لیا مَیں نے
ندیمؔ دل میں چمکتا ہے درد، شام کے بعد

○

وقت اِک پَل کو جو رُک جائے تو احساں اس کا
چند یادیں مرے دل میں سے گزرنا چاہیں

○

دعواۓ عشق میں تم حد سے نِکل جاتے ہو
وقت پڑتا ہے تو کیوں رنگ بدل جاتے ہو

○

وہ لمس کی حِدّت ہے نہ جذبے کی وہ شِدّت
اے گُل، تو حریفِ لبِ گُل رنگ نہیں ہے

○

وفا کی دُھوپ میں جب جل بُجھا وجُود مرا
مَیں رخشِ ریگِ رواں پر سوار ہو کے چلا

○

ختم گر ہو نہ سکی عُذر تراشی تیری
اِک صدی تک تجھے جینے کی دُعا دے دُوں گا!

○

میری یادوں کا سفینہ ہے سلامت اب تک
گو مری راہ میں حائل تھے سمندر کتنے

○

ندیم میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل
مَیں صِرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا

○

کوئی گِلہ نہ کروں گا تری رضا کے بغیر
مگر لرزتے لبوں کو کہاں چھپاؤں گا مَیں
مَیں ہر کلی کی چٹک میں تجھے صدا دُوں گا
کہ رل کے خاک میں بھی، بار بار آؤں گا مَیں،

○

جس سے پوچھو، یہی کہتا ہے کہ مَیں زندہ ہُوں،
وقت کی قبر کا احساس کسی کو بھی نہیں

○

ناقد نے لغات کھول لی ہے
یُوں قدر ہُوئی مِرے ہُنر کی

○

بحر و صحرا ہوں کہ سیّارے ہوں یا افلاک ہوں
ہر ورق پر ایک ہی اسلُوب ہے تحریر کا

○

جانے کس کرب سے تپتی ہیں زمینیں اپنی
اب تو سجدوں میں بھی جلتی ہیں جبینیں اپنی

○

تاریخ بکف ہے ذرّہ ذرّہ
صحرا میں کسے کسے صدا دُوں

○

یہ نکتہ ہر حقیقت کی ہے بنیاد
کہ جو موجُود ہے مبہم نہیں ہے

○

صُبح کے نُور سے بھیگے ہوئے کھیتوں میں کسان
ہل چلاتے ہیں تو فن کار نظر آتے ہیں

○

خیرات کے لیے مرا دامن بنا نہیں
دامن دریدہ ہوں کہ میں دامن کشاں رہا

○

شاخِ گُل آبِ رواں پر جُھک کر
کِسی پتّی کا پتہ پُوچھتی ہے

○

یاد آئے نہ خال و خد اسی کے
جس شخص کو بے حساب دیکھا

○

میں تمھیں اپنا شاہکار کہوں
میری رعنائی گماں دیکھو

○

اِک جہنّم ہے زندگی جن کی
صرف جنّت سے کب بہلتے ہیں

○

اے خدا کوئی آدمی بھی تو بھیج
سب خدا ہیں تری خدائی میں

○

کھُلا، کہ اور ہی تھا میرا منتہائے نظر
مَیں اُس کو پا کے بھی آمادۂ سفر ہی رہا

○

وہی زخم کی سی رنگت، وہی یاد کی سی نکہت
کوئی میرے دل سے پُوچھے، سرِ شاخسار کیا ہے
جسے آشنا بناؤں، ترا عکس اس میں پاؤں
ترے حُسنِ بے جہت پر، مرا اختیار کیا ہے

○

صدی صدی ہیں اِک اِک پل کٹے تو کون جیے
طویل عمر کا اب حوصلہ کسی میں نہیں
تو پھر یہ زندگی کاہے کو ہے — قیامت ہے
اگر یہ طے ہے کہ تُو میری زندگی میں نہیں

○

ساحل پر انبوہ کھڑا چلّاتا رہا
اِک بچّہ دریا میں گر کر ڈوب گیا

○

یہ گھٹائیں ہیں کہ وعدے ہیں تری رحمت کے
گھر کے آئیں، مگر اک پل نہ برسنے پائیں

○

لُٹ گئی فصل تو کھلیان میں کیا باقی ہے
کچھ جو باقی ہے تو ویران ہوا باقی ہے
جشن کی روشنیاں بُجھ بھی گئیں تو کیا غم
میری دیوار پہ مٹی کا دیا باقی ہے

○

آج کے دور کا انساں ہے فقط سوداگر
حُسن کا بھاؤ نہ طے ہو تو محبت نہ کرے

○

اور اِک بار پکارو، کہ بھری دُنیا میں
عین ممکن ہے، کہیں سے کوئی انساں بولے

○

فصیلِ رنگ نے منظر چھپا لیا تھا، مگر
ہوا چلی تو گلستاں کا راز فاش ہوا

سر ہر راہگزر ایک فصیل ابھری ہے،
اور سر پھوڑ کے مرنا مجھے منظور نہیں!

○

دیوانہ ہوں میں بھی، کہ نکلتے ہیں بہ ہر لفظ
افکار کے خورشید مرے چاکِ قلم سے

○

ہم بچھڑ کر بھی بچھڑنے نہیں پاتے تجھ سے
تیری یادوں میں ترے قرب کی مہکاریں ہیں

○

عجیب حشر اُٹھا خلد میں، جب آدم زاد
بڑھا نقوشِ قدم چھوڑتا خلاؤں میں

○

دل میں یوں اس کے خیال آتے ہیں
جیسے صحرا میں غزال آتے ہیں

○

ہم جو افلاک پہ پہنچے بھی، تو کیا ہاتھ آیا
ہاں مگر خاک جو چھانی تو خدا ہاتھ آیا

مری زندگی میں، یارب! کوئی ایسا پل تو آیا
ترے ابر بھی برستے، مرے بن بھی لہلہاتے

○

میں تری کھوج میں مبہوت پھرا کرتا ہوں
میں ترے پاس سے گزروں تو صدا دے دینا

○

سو گئے لوگ کہ آزاد ہوئے
کوئی آواز سلاسل میں نہیں

○

کیوں بھولے ہوئے ہیں صدیوں سے، انداز بپھر کر چلنے کا
پیاسے دریاؤں کو مژدہ ہو، وقت آ گیا برف پگھلنے کا

○

اپنی نظروں میں بھی ہم اک لفظِ بے مفہوم ہیں
اس نے دیکھا بھی تو کیا، اس نے نہ دیکھا بھی تو کیا

○

یہ اور بات، حشر ابھی نہ مجھ کو یاد رہا
تری وفا پہ قیامت کا اعتماد رہا

○

نظر میں شرم ہے، لب نیم وا ہیں، چہرہ گلاب
سحر کی ساری صباحت ترے جمال سی ہے

○

مَیں فکرِ سخن میں کہاں آ گیا
کہ زیرِ قدم آسماں آ گیا

○

بجا، کہ جام بکف ہوں، مگر شراب کہاں ہے؟
گجر تو، خیر، بجا لیکن آفتاب کہاں ہے؟

○

اس بے بسی میں آپ ہی اپنی نظیر ہیں
ہم نکہتِ چمن کے بھنور میں اسیر ہیں

○

میری بینائی کا دھوکا ہے کہ ایّام کا پھیر
ابدیّت کا افق ہے کہ گھروندے کی منڈیر

○

سحر بدست بھی ہے شب، اگر سیاہ بھی ہے
چٹان سنگ ہے، لیکن صنم پناہ بھی ہے

عمر بھر جلنے کا اتنا تو صلہ پائیں گے ہم
بجھتے بجھتے چند شمعیں تو جلا جائیں گے ہم

○

کون یہ سوختہ جاں اُٹھا ہے
شمعِ محفل سے دُھواں اُٹھا ہے

○

آج کے دن کا بدل کیا ہوگا
کل ہی سوچیں گے کہ کل کیا ہوگا

○

اب تجھ سا کوئی کہیں نہیں ہے
اب تیرا فراق بھی حسیں ہے

○

چمکا ہے جو میرے دل میں شب بھر
اس درد کی چاندنی میں آنا

○

تاروں بھرا آسماں — محبّت
جذبات کا بحرِ بے کراں — ہم

○

یہ ترے جسم کی مہکار تھی یا پھولوں کی
ہیں ترے پاس سے یا صحنِ چمن سے گزرا

○

تم دِئے ہو جو لرزتے ہو صبا کے ڈر سے
ہم ستارے ہیں جو طوفاں سے گزر جاتے ہیں

○

میری یادوں کے افق پر آپ کے وعدوں کے چاند
اس قدر چمکے نہیں ہیں جس قدر گہنائے ہیں

○

مجھے قسم ہے مری شانِ آدمیّت کی
فریب دے نہ سکوں گا۔ فریب کھائے تو ہیں

○

حق دار فصلِ گُل کے وہی رہ نورد ہیں
جو خاک چھان کر بھی نہ بھولے چمن کا نام

○

اگر چلے ہو مسافت خزاں کی طے کرنے
بھری بہار کا بھی اہتمام کر کے چلو

○

شبِ سیہ کے ستارو، مرے قریب رہو
کہ مَیں افق پہ نگارِ سحر کو دیکھ آؤں

○

تہذیب کے طاق پر، ہمیشہ
جلتے ہیں چراغ مفلسی کے

○

اہرمن بن کے بھی دیکھا ہے، کہ انساں کا ضمیر
نُور ہی نُور ہے، شعلے کا کہیں نام نہیں

○

تاریخ کو تقدیر سمجھنے والو
تاریخ تو تخلیق ہے انسانوں کی

○

شاہد ہے شکستہ پائی اپنی
پہنچے نہیں ناگہاں یہاں ہم

○

دیدنی ہے شبِ فراق کا حُسن
موت آئی تو ہم بھی سو لیں گے

○

ترے پہلو سے اُٹھ کر کھو گئے ہم
خیالوں کی گھنی تنہائیوں میں

○

سُورج اُبھرا کہ قیامت جاگی
رات گزری کہ زمانے گزرے

○

ہر طرف پھُوٹتی پَو کو دیکھو
ڈوبتے چاند کا ماتم نہ کرو

○

بادلوں کے حاشیے روشن ہیں کوندے کی طرح
کچھ تو ہے جس نے بدل ڈالا ہے ظلمت کا مزاج

○

تمام رات اُمیدوں کے چاک سِلتے رہے
تمام شب ترے قدموں کی چاپ آتی رہی

○

مَیں اپنی تِیرہ نصیبی کا بھید کیا کھولوں
کہ مجھ کو ساحلِ شب تو ملا، سحر نہ ملی

○

ہاتھ میں آتے ہی گُل کچھ اس طرح کملائے ہیں
ہم نے جتنے دھوکے کھائے ہیں، وہ سب یاد آئے ہیں

○

صبح تیری ہے، تو اے خالقِ صبح
رات ہے کس کی کرم فرمائی

○

گرتے ہُوئے پتّے ہوں کہ مینہ کے جھالے
ہر چیز میں گنگنا رہی ہے تخلیق

○

یہ گزرتے ہُوئے پل ہیں کہ تری آنکھیں ہیں
دن ہے آنسو کی طرح، رات ہے کاجل کی سی

○

آتشِ عشق جلاؤ کہ سفر ہے دشوار
راہ میں کتنے عقیدوں کا گھنا جنگل ہے

○

اِک سفینہ ہے تری یاد اگر
اِک سمندر ہے مری تنہائی

○

اے ٹوٹتی رات کے ستارو

تم کتنے اُداس ہو رہے ہو

○

بُجھ گئی ہیں مری آنکھیں، مگر اے شامِ فراق

یہ دِیے اُن کے خیالوں میں تو جلتے ہوں گے

○

غرورِ عشق کو ضد ہے کہ تیرا عہدِ وفا

شکست کھا کے بھی تقدیس کھو نہیں سکتا

○

تخلیق کے ذوقِ جاوداں سے

انسان، خدا کا ترجماں ہے

○

بھولے گا نہ اے بہار، تیرا

چھُپ چھُپ کے کلی کلی میں آنا

○

بادل اُمڈے ہیں۔ آگ برسے گی

باغ مہکے ہیں۔ زاغ بولیں گے

○

یہ ترا تصرّفِ حُسن ہے کہ مرا غرورِ نیاز ہے
تری جستجو پہ بھی فخر ہے، تری ہمرہی پہ بھی ناز ہے

O

کیا جانے کیا اثر تھا شعورِ گناہ میں
تارے چمک اُٹھے تری چشمِ سیاہ میں

O

اُمڈی ہیں گھٹائیں ارتقا کی
برسیں گے ستارے آسماں سے

O

ندیمؔ ، شعر فقط پرتوِ حیات نہیں
حدیثِ ذات بھی، رودادِ کائنات بھی ہے

O

ہر ایک شے پہ اُجالا سا ہلکا ہلکا ہے
ترا خیال ہے یا صُبح کا دُھندلکا ہے

⁂

چاند ہے، پھُول ہیں، لبِ جُو ہے
میرے پہلو میں دل نہیں، تُو ہے

یہ کون دُور سے دامن کشاں گزرنے لگا
چراغ لو کو ہَوا کے سپرد کرنے لگا

❖

کرن کا رنگ فریبِ نگاہ ہوتا ہے
ثواب اصل میں عذرِ گناہ ہوتا ہے

❖

جب بھی جی میں امنگ پاتا ہُوں
اِک کلی زیرِ سنگ پاتا ہُوں

❖

جس قدر رنگ اختیار کیے
صرفِ ہنگامۂ بہار کیے

❖

مسلسل سرخوشی مرگِ مسلسل ہوتی جاتی ہے
کہ تیرے قرب سے اِک عمر اِک پَل ہوتی جاتی ہے

خمِ ابرو خمِ محراب نہ تھا
یہ تو اِک واقعہ تھا، خواب نہ تھا

❁

عشق سے گرمیاں حیات کی ہیں
سب تفاصیل ایک بات کی ہیں

❁

منعکس ہے حباب میں مہتاب
دونوں ضَو ریز، دونوں پا بہ رکاب

❁

رقصاں ضمیرِ دہر میں کیسی امنگ ہے
ہر پَل رُخِ جہاں پہ نئی موجِ رنگ ہے

❁
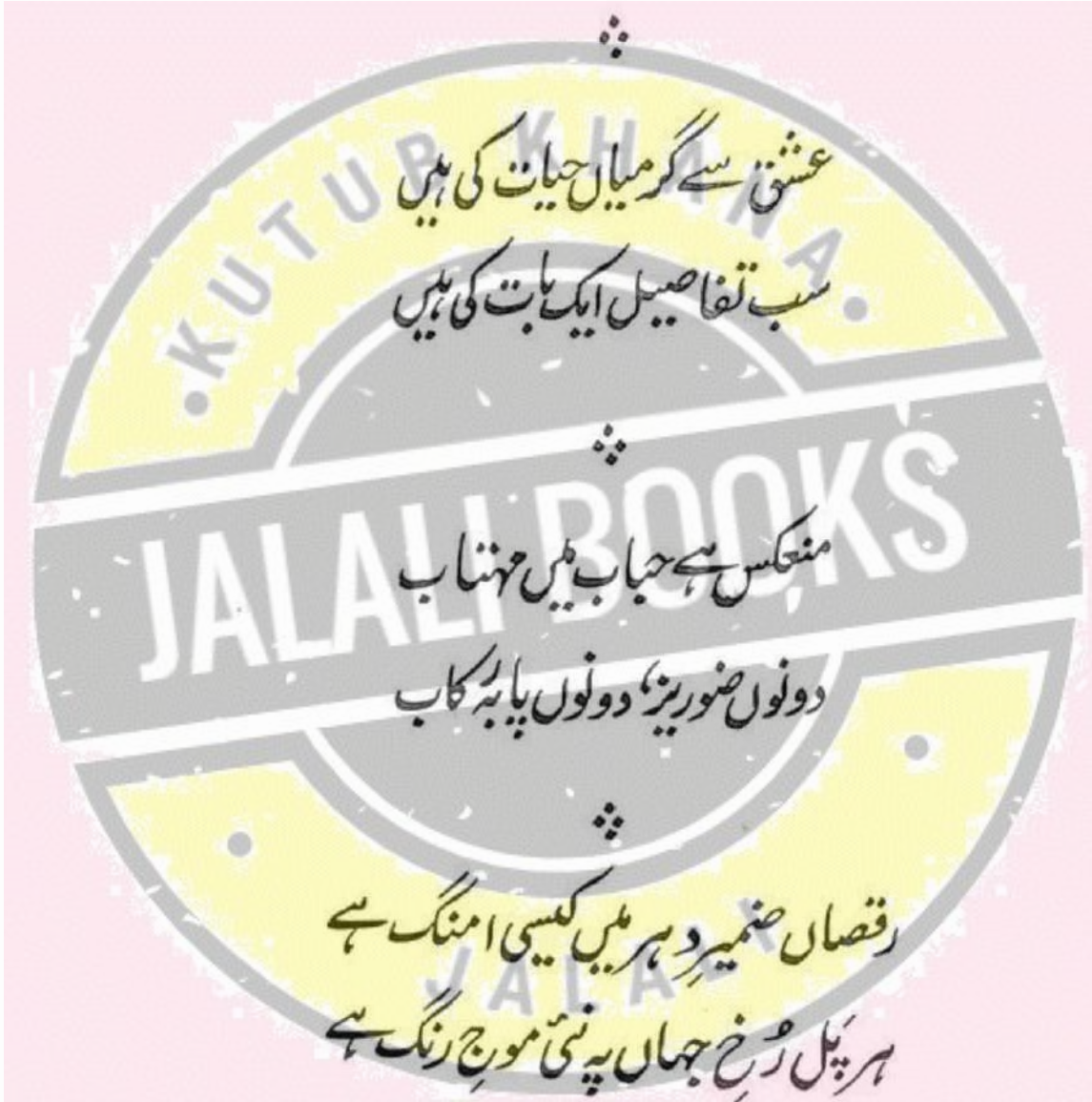
شاید یہی تضادِ قیامت کی جان ہے
فطرت ضعیف ہے مگر انساں جوان ہے

❁

سفینہ جب اپنے سہارے چلا
زمانہ کنارے کنارے چلا

⁂

کس درجہ منحنی نظر آتے ہیں دُور سے
وہ قافلے جو رُک نہ سکیں گے حضور سے

⁂

کتنا بلند، کتنا انوکھا مقام ہے
انسان اِک تسلسلِ شیریں کا نام ہے

⁂

معمارِ انقلاب و ضمیرِ عوام ہو
آزاد مملکت کے اسیرو اسلام ہو

⁂
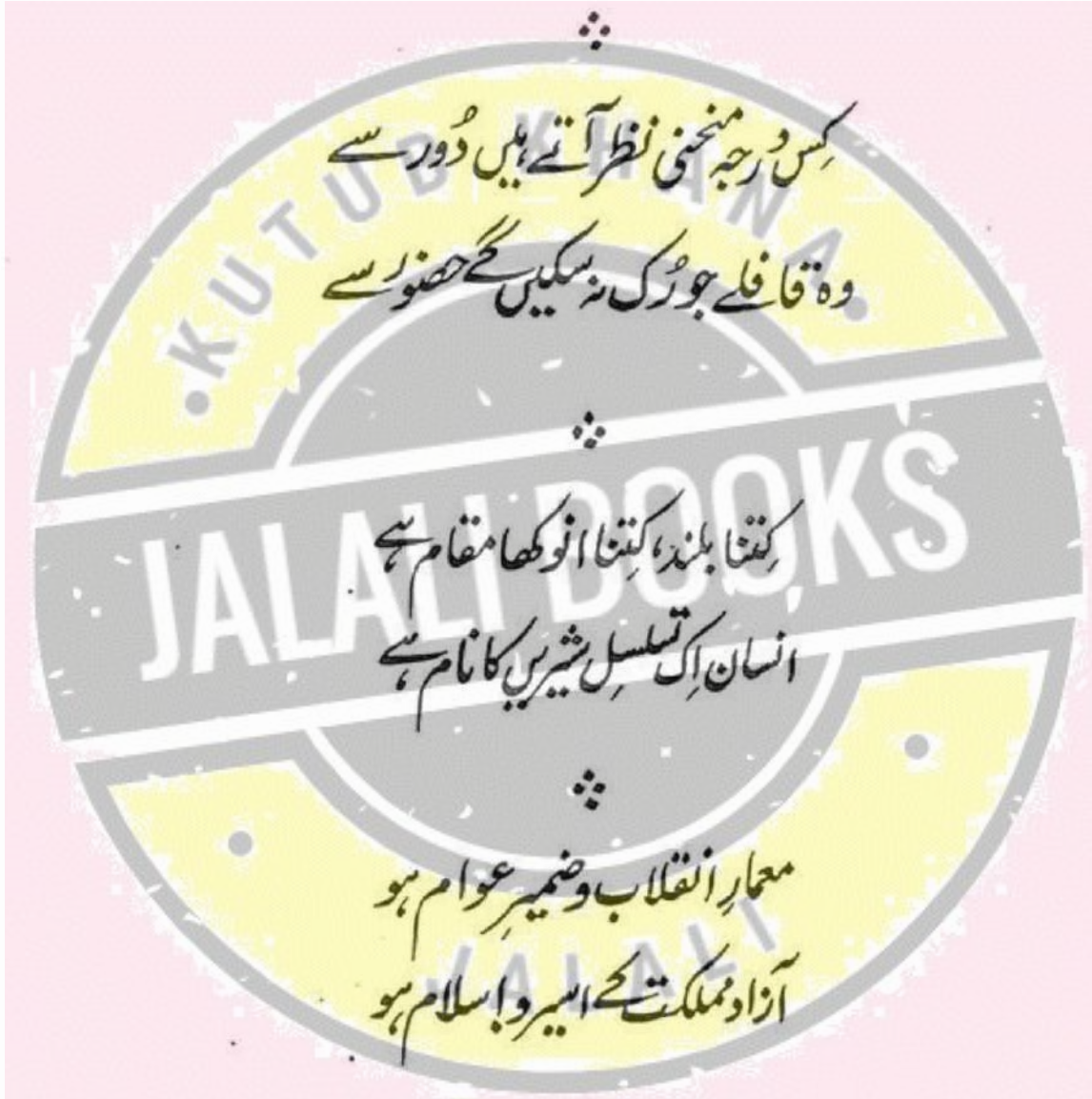
زندگی کے سانچے میں جو نظام ڈھلتا ہے
زندگی کے سانچے کو توڑ کر نکلتا ہے

⁂

وہ جن کو لوگ حقیقت پرست کہتے ہیں
حقیقتوں کے تصوّر میں مست رہتے ہیں

٭

جیا گنا ہے ابھی بہاروں کو
نیند کیوں آ چلی ستاروں کو

٭

بہارستانِ آزادی میں ہر گُل شعلہ گوں کیوں ہے
ہجومِ رنگ میں رچتی ہوئی سی بُوئے خوں کیوں ہے؟

٭

عجیب درد بھری لذّتیں بہار میں ہیں
کہ جتنے پھول ہیں، شبنم کے انتظار میں ہیں

٭

کتنا رنگیں مرے فن کا مجھے انعام ملا
مرحبا زخم شماری! کہ بڑا کام ملا

٭

تمھیں خلعت کے بدلے فرشِ پا انداز ملتا ہے
یہیں سے بات کھُلتی ہے یہیں سے راز ملتا ہے[1]

٭

مسافرو، کوئی شب بیکراں نہیں ہوتی
یہ ظلمتوں کی پہیلی کہاں نہیں ہوتی

٭

چمن میں اہلِ چمن درپئے چمن ہوں گے
خبر نہ تھی کہ بہاروں کے یہ چلن ہوں گے

٭

اگرچہ مسلکِ ماضی رہا ہے آگ ہی آگ
اجڑ سکا نہ مگر مادرِ زمیں کا سہاگ

٭

لُٹ کر بھی کوئی دشتِ جنوں کی نہ راہ لے
اپنی شکست ہی میں محبت پناہ لے

٭

[1] : پاکستان کے چند شعراء کو شاہِ ایران نے قالین بھجوائے تھے۔

تجھے نصیب ہو تیری بہار سامانی
مری خزاں سے مگر قصّۂ بہار نہ پوچھ

٭

ہنسے تو مجھ پہ ہنسے اور وہ بھی بر سرِ عام
سُنا ہے آپ تو ڈرتے تھے جگ ہنسائی سے

٭

تم اتنی دُور سے چل کر مرے قریب آئے
تو اب قریب ہی بیٹھو، تھکن مجھے دے دو

٭

وہ روشنی جو تیرے تبسّم نے عام کی
سمٹی تو ان دنوں مرے اشکوں کی ضو میں ہے

٭

مسکرانے کا یہی انداز تھا
جب کلی چٹکی تو وہ یاد آ گئے

کچھ در گزر کا کھیل، کچھ ایثار کا کمال
ورنہ وہ کون ہے جو کسی سے نباہ لے!

⁂

تفسیرِ زندگی تھا یقیناً مرا سکوت
ہیں شرحِ داستاں کا مگر مدّعی کہاں
میری وفا کو سارے جہاں کے ستم قبول
تیرے کرم کو ایک نظر کا زیاں گراں

⁂

نجوم دُور سہی، کارواں نواز تو ہیں
نگہ نہیں تو گمانِ نگاہ کیا کم ہے
غلط ہے غلغلۂ زہد و اتّقا کہ ندیم
گناہگار نہیں۔ یہ گناہ کیا کم ہے

⁂

بہت قریب نہ آؤ، کہ دُور سے بھی ہمیں
وہ آنچ آئی کہ مُرجھا گئے دلوں کے چمن

⁂

زیست تم، زیست کا تقاضا تم
اور کس سے کریں شکایت ہم

ابدیت یہی جمود نہ ہو
آؤ برپا کریں قیامت ہم

اے ستارہ نشیں! چمن پیما!
مانگتے ہیں ثبوتِ وحدت ہم

انجمن ساز! انجمن آگاہ!
جل بجھے مثلِ شمعِ خلوت ہم

٭

یوں بھی ہوتا ہے کہ طوفان کی زد میں آکر
بادل اُمڈے ہُوئے طوفان پہ چھا جاتے ہیں

٭

تجھے یقیں کہ ترا حُسن ہے سپردِ نقاب
مجھے یہ فکر کہ تارے چھُپے نہیں رہتے

مدّت کے بعد اذنِ تبسّم مِلا ہمیں
وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

٭

صُبح کی دُھن میں ستاروں کو بُجھایا مَیں نے
قبل از وقت مگر پَو کا بکھرنا معلوم

٭

اپنے ذوقِ نظر کا ماتم ہے
تیرگی ایک سیلِ نور سہی

٭

کئی چراغ کئی آئنوں میں عکس فگن
مَیں راہ بھُول گیا فضا اسی چراغاں میں

٭

ایک صحرائے بیکراں ہے جہاں
وقت اِک بے قرار آہو ہے

٭

جس کے موڑوں پہ لُٹایا گیا انساں کا سہاگ
مَیں تو اُس راہ کو تلووں کا لہو تک بھی نہ دُوں

❖

سجدہ اظہارِ ماندگی ہی تو ہے
سانس پھُولی تو لَو خدا سے لگی

❖

جیتے ہیں جو مرنے کی تمنّا میں ندیمؔ
وہ موت سے پیشتر ہی مر جاتے ہیں

❖

سکوں میں رقص کناں، رقص میں سکون پذیر
خرامِ حُسن کا آئینہ ہے خرامِ حیات

یہ کیا طلسم ہے، آئے ہو تم چمن بکنار
مگر چمن کے چمن انتظار کرتے ہیں!

❖

کوئی کلیم نہیں آج دہر میں ورنہ
جبینِ حضرتِ انساں میں طور کی لَو ہے

یہ اور بات کہ جلتا ہے قصرِ سُلطانی
یہ آگ آگ نہیں، پھُوٹتی ہُوئی پَو ہے

بھلا سحر بھی چھُپائے سے چھُپ سکی ہے ندیمؔ
گھٹا کے حاشیے پر آفتاب کی ضَو ہے

٭

وہ کفر ہے ایمان کی معراجِ کمال
جس کفر کو انساں سے محبت ہو جائے

٭

تجھے بہشت میں بھی مل سکا نہ اطمینان
ہیں دشتِ نجد کی ویرانیوں میں بھی خورسند

٭

مرے جہاں میں وہ اہلِ نظر بھی بستے ہیں
جو دیکھتے ہیں رگِ سنگ میں بھی تارِ حریر
ہیں زندہ آج بھی وہ بندگانِ استغنا
جو اپنی رُوح سے لیتے ہیں کارِ بدرِ منیر

٭
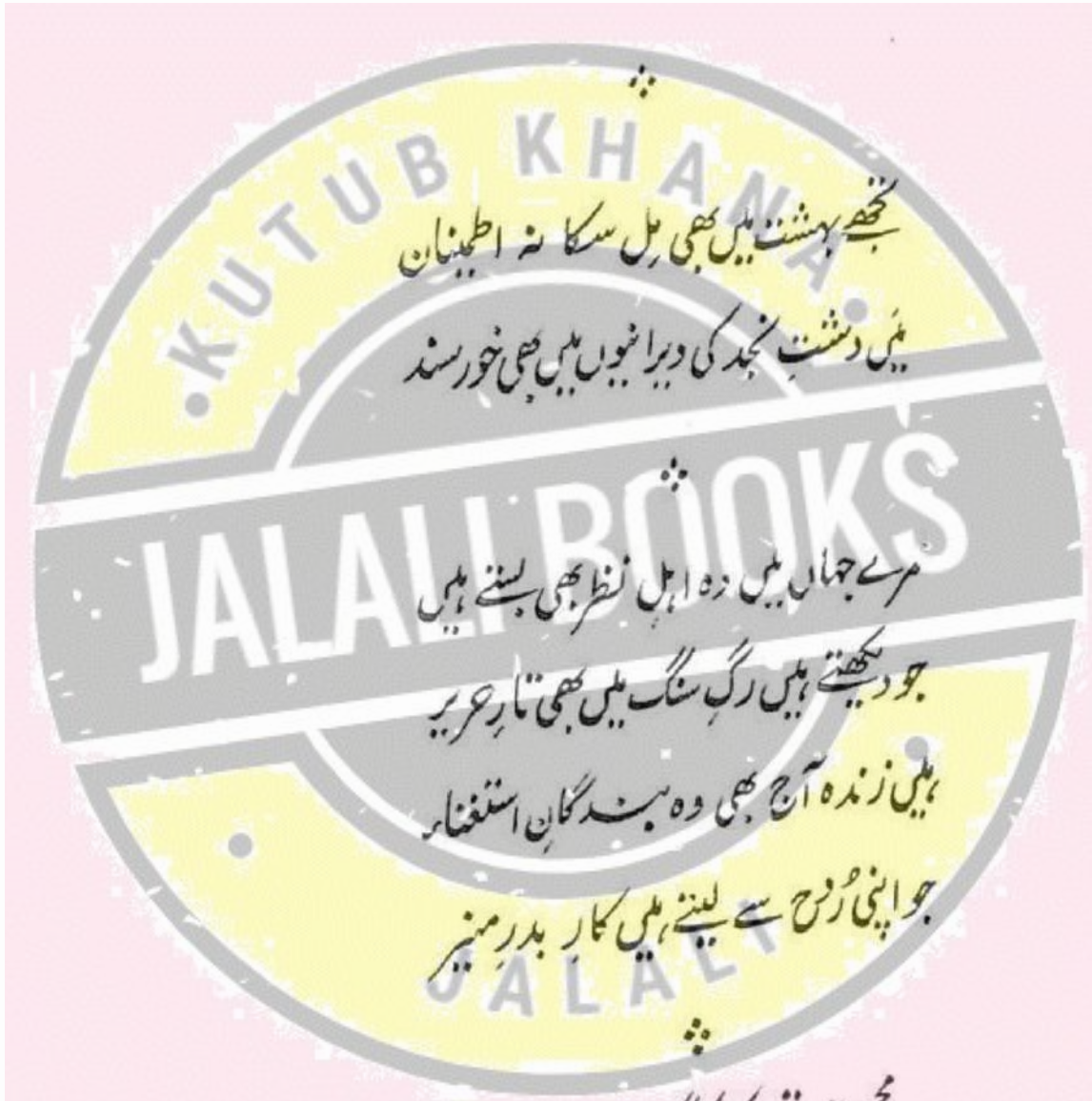
مجھے تو وقت کی یکرنگیاں نہیں بھاتیں
مجھے زمان و مکاں کے تغیّرات دکھا

٭

مجھ کو ماحول کی ظلمت سے سروکار نہیں
کیا ستارے مرے احساس کے بیدار نہیں!

٭

نورِ ابدیّت کو سرِ طور نہ دیکھو
جو دل میں ہے منور اسے دُور نہ دیکھو

٭

اے ستاروں کے جھرمٹوں سے بلانے والے
منزلیں دُور ہیں، معذُور ہیں جانے والے

٭

کون بتلائے، ہیں کس طرفہ قیامت کے نقیب
خنجر اُبھرے ہوئے تا زخم کے عنوانوں میں،

٭

شام تمہید ہے اُس مصحفِ نُورانی کی
جس کا عنوان ہے خورشید کا بڑھتا ہُوا نورُ
یہ اندھیرے تو اُجالوں ہی کے رکھوالے ہیں
کہ ہے آویزشِ اضداد میں جینے کا سرُور

٭

کوئی شکوہ نہیں تقدیر کی ناسازگاری کا
دماغ اُونچا ہے تاروں سے بھی میری خاکساری کا

❊

اُس کے آنے میں اِدھر دیر ہُوئی جاتی ہے
ساری دُنیا اُدھر اندھیر ہُوئی جاتی ہے

❊

کہاں سے اُٹھی اور کدھر جائے گی
نہیں پُوچھتے خاک سے شہ سوار

❊

یہ بھی کوئی زندگی ہے، ہو کے نومیدِ نشاط
زندگی کے پیچ و خم میں رائیگاں ہو جائیں ہم

❊

ترے غرور کے معیار سے بلند ہُوں مَیں
تری پسند کا کیا ذکر، خود پسند ہُوں مَیں

❊

یہ ریت کے ذرّے ہیں کہ الماس کے ٹکڑے
گیتی نے اُگل ڈالے ہیں قارون کے دفینے

٭

یہ طلوعِ صبح کے آثار آتے ہیں نظر
بادِ عاؤں کے لیے وا ہیں فلک کے بام و در

٭

ڈار غازوں کی کہستاں سے کماں بن کر اُڑی
جانے کیوں گھبرا کر اُٹھی ہیں کرلاتی ہوئی گم ہو گئی

٭

ایک تارہ نور کی اِک لہر بن کر بہہ گیا
جانے دل رُکنے کی دُھن میں کیوں دُھڑکتا رہ گیا

٭

تاریکیوں میں دب کے لرزتا ہے بار بار
پچھم کے پربتوں پہ شفق کا مہین تار

٭

دھنکی رُوئی کے بھٹکتے ہوئے گالوں کی طرح
برف گرتی ہے جوانی کے خیالوں کی طرح

قیامت بھیج دے کچھ روز پہلے
اگر کٹتا نہیں دورِ غلامی

*

نوجواں چہروں میں مستقبل کی کرتا ہوں تلاش
مقبروں میں ڈھونڈتا ہوں گزرے وقتوں کے قدم

*

غضب غضب! کہ رہا حرب و ضرب جن کا کام
وہ چلّہ کش ہیں زمیں دوز مقبروں میں مقیم

*

یورپ نے بھاپ اور دھوئیں کو خدا کہا
اب اُس کی شرحِ صدر کا ساماں کریں گے ہم

کیا زمانے کے نئے بت نہیں دیکھے تم نے
کہ سناتے ہو مجھے لات و ہبل کی باتیں

*

دلِ آدم پہ اِک ناسور ہے جن کی جہانبانی
میں اُن انساں فروشوں کا ثنا خواں ہو نہیں سکتا

*

پھر طُور پر نگاہِ تماشا ہے مضطرب
حیرت ہے، چھپ گیا ہے مرا شعلہ زن کہاں

٭

دل نے جو رنج اُٹھائے ہیں وہ تُو کیا جانے
تشنہ کاموں پہ جو گزری، وہ سبُو کیا جانے

٭

جہاں والے ہمیں صرف اس لیے دیوانہ کہتے ہیں
کہ ہم جو بات بھی کہتے ہیں بے باکانہ کہتے ہیں

٭

دوزخ کا حکم تیری مشیّت سہی، مگر
اے ربِّ کعبہ میرا افسانہ سُنا بھی ہے؟

٭

دام کے نیچے چٹک کر کہہ رہی ہے اِک کلی
جو یہاں آئے گا وہ گلشن بداماں جائے گا

گردشِ چشمِ یار کے الزام
آسماں پر لگائے جاتے ہیں

✤

اگر تُو خود نہ دے درویش کو بھیک
تری بندہ نوازی کا مزا کیا

✤

ہر مسرّت سے سرگرانی ہے
کیا یہی عالمِ جوانی ہے
آ تجھے ایک راز بتلاؤں
مَیں بھی فانی ہُوں، تُو بھی فانی ہے

✤

مری خاموشیوں میں کروٹیں لیتے ہیں ہنگامے
زمانے پر قیامت بن کے ٹوٹے گا سکوں میرا

✤

ہم خاک نشینوں میں، اس خاک نشینی پر
کیوں تیری مروّت کے چرچے ہیں، خدا جانے

✤

بہت مشکل ہے جینا تیرے عدووں کے بھروسے پر
جگر کٹ کٹ گیا، تب جا کے آغازِ وقتِ شام آیا

٭

کس کی آمد ہے کہ منزل سے کئی کوس اُدھر
پھر پا بوسِ مرادِ دیدۂ خوں بار گیا

٭

سر بھی ایسا ہو جو سجدوں کی حقیقت سمجھے
در بھی ایسا ہو جو شایانِ جبیں سائی ہو

٭

عمر بھر رونے سے رونے کا سلیقہ کھو دیا
ہر نفس کے ساتھ یہ دریا دلی اچھی نہیں

٭

یہ انجم بوس ایوانوں کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں
خدا انسان کو سمجھا رہا ہے استعاروں میں

٭

خود وقت کے قدموں میں زنجیر نظر آئی
جب آپ کی آمد میں تاخیر نظر آئی

٭

کیا جانے کس خیال میں گُم تھا اسیرِ نو
اپنے پَروں کو خواب میں پھیلا کے رہ گیا

٭

فصلِ گُل آئی، نشیمن جل گئے
ہائے دیوانوں کی دُور اندیشیاں!

٭

ترے وجُود سے وابستہ ہے وجودِ حیات
اب ایک تُو جو نہیں، انجمن نہیں باقی

٭

مجھ کو ہی طلب کا ڈھب نہ آیا
ورنہ ترے پاس کیا نہیں تھا

٭

سجدے بھی ہیں، ثنا بھی ہے، حمد بھی ہے، دُعا بھی ہے
اشک مگر کہیں نہیں دامنِ پاکباز میں

٭

اِک بڑا حادثہ تھا، ایک بڑا واقعہ تھا
اوّل اوّل تری نظروں سے ٹنا سا ہونا

٭

مَیں اِن کھڑکتی ہوئی خشک پتیوں کے قریب
گرجتا گونجتا ابرِ بہار دیکھتا ہُوں

٭

تیری حالت پہ حیف ہے اے دل
تیری نگری میں تیرا راج نہیں

٭

گو روح زندگی کے فسوں سے اُداس تھی
مرنے کے وقت بھی مجھے جینے کی آس تھی

٭

عام یُوں بھی کوئی کرتا ہے تجلّی حُسن کی!
کر دیا ہے آپ نے کرنِ لن کا سائل مجھے

٭

وہ آئے اور کلبۂ غم میں دِیا نہ تھا
مَیں نے جہاں کو پھُونک دیا اضطراب میں

❊

ترے ہجر کے تصدق کہ نہیں ہے جس کے دم سے

مجھے اپنی زندگی سے گلۂ گریز پائی

❊

سبھی کے دل میں تمنا ہے بار یابی کی

کسی کے مدِ نظر بحرِ بیکرانہ نہیں

❊

میری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں نشیب اور فراز

میری نظروں میں دو عالم کو برابر کر دے

❊

زخم ہوتے ہیں دلوں ہی میں مندمل

اور صدیوں تک چلی جاتی ہے بات

❊

ہم نظر تک اٹھا نہیں سکتے

آپ مصروف منہ چھپائے ہیں

❊

وہ مجھے بھولنے کی دھن میں ہیں

یہ مری فتح ہے، شکست نہیں

٭

کوئی آخر کہاں تک مسکرائے

وہ جی اُمڈا، وہ اشک آنکھوں میں آئے

٭

جلتے ہیں اضطراب کے شعلوں میں رات دن

بے نام لذّتوں کے جنوں میں دل و دماغ

٭

ابھی میں ابتدا کے پیچ و خم ہی سے نہیں نکلا

کوئی کہتا ہے دل میں، ماورائے انتہا ہو تم

٭

ہے ان کی پردہ نشینی کا راز پردہ دری

وہ راز کھل نہ سکے جو چھپائے جا نہ سکے

٭

منتشر ہو کر بھی وہ جلوے کہیں مستور ہیں

راز کے یوں عام ہونے میں بھی کوئی راز ہے

☆

نظّارۂ رُخ سے مجھے فرصت ہی نہیں ہے
کہنے کو تو کہتا ہُوں کہ تُو پردہ نشیں ہے
اِس درجہ ہُوئیں حُسن سے مانُوس نگاہیں
ذرّہ بھی حسیں اور ستارہ بھی حسیں ہے

☆

کیوں اتنی بلندی پر کاشانہ بناتے ہو
کیوں خاک نشینوں کو دیوانہ بناتے ہو
سو رُوپ میں آتے ہو، سو رنگ دکھاتے ہو
تم خود مرے سینے میں بُت خانہ بناتے ہو

☆

سر بسر پیکرِ ملال ہُوں مَیں
رُوح کے بوجھ سے نڈھال ہُوں مَیں

☆

مرنا ترے بغیر مجھے تو نہیں قبول
گو یہ بھی جانتا ہُوں کہ مرنا ضرور ہے

☆

مرنا تری طلب میں مرا رائگاں نہ ہو
ڈرتا ہوں اُس زمیں پہ بھی آسماں نہ ہو

⁂

اُس کی رحمت سے کِسے انکار ہے، لیکن ندیمؔ!
شمع کی تقدیر میں جلنا تھا، جلتی رہ گئی

⁂

مَیں نے سمجھا، مری تقدیر نے پلٹا کھایا
جب بگولا کوئی اُٹھا مرے ویرانے میں

⁂

اندھیری رات میں بلند و پستِ کائنات پر
سکوت بن کے پھیلتی چلی گئی نوائے دل

⁂

کیا جانوں آج کس کا مجھے انتظار ہے
پلکوں کی اِک جھپک بھی مجھے ناگوار ہے

⁂

احساس کی تپش سے یہیں جل گیا ندیمؔ
اللہ! اس جہاں سے ابھی ماورا ہے کیا

تُو نے جس روز کیا وعدۂ پرسش ہم سے
بس اسی روز سے آشفتہ و بیمار ہیں ہم

شاید اک تازہ جہاں کی ہیں نقیب
ابنِ آدم کی فلک پیمائیاں!

مجھے کیا امتیازِ خیر و شر سے، جب مشیّت کا
غریب انسان کی ہر سانس پر ہے اختیار اب تک

ذکر اِک روز پلٹنے کا کیا تھا تم نے
اِک دیا دل کے اندھیرے میں جلا رکھا ہے

فاش کرتی ہیں مری تنہائیاں سرِّ وجود
بار ہا شبنم کے اِک قطرے میں دُنیا آ گئی

راہ تکتے تکتے جب کھڑکا کوئی پتّا ندیمؔ
آسماں گونجا، فضا کانپی، زمیں چکرا گئی

⁂

بھلا یہ کون سی منزل ہے بے نیازی کی

کہ آج کل مرے ہونٹوں پہ تیرا نام نہیں

⁂

راستے پار اُترنے کے ابھی بند نہیں

ناخدا، تُو مری قسمت کا خداوند نہیں

⁂

اب تو وصالِ یار سے بہتر ہے یادِ یار

میں بھی کبھی فریبِ نظر کا شکار تھا

تو میری زندگی سے بھی کترا کے چل دیا

تجھ کو تو میری موت پہ بھی اختیار تھا

⁂

میرے آنسو ترے دامن کو ترستے ہی رہے

تارے گردوں سے اُتارے تری انگڑائی نے

⁂

فرازِ طور سے اُتر، نشیبِ زندگی میں

کہ حکمتِ جدید میں ترا وجود، خواب ہے

لُطف تو جب تھا طوفاں میں بھی اس کی لَو تھرّاتی رہتی
جس نے تیری راہ نہ دیکھی اب وہ دیا جلانا کیسا

❖

تصوّر آپ کا، احساس اپنا، ہمرہی دل کی!
محبّت کی اسی تقسیم نے منزل سے بھٹکایا

❖

مَیں تجھ کو بھُول چکا، لیکن ایک عمر کے بعد
ترا خیال کیا تھا کہ چوٹ اُبھر آئی

❖

فہرست

لوحِ خاک

دوام

محیط

دشتِ وفا

شعلۂ گل

جلال و جمال

احمد ندیم قاسمی کی ۷۵ ویں سالگرہ پر خصوصی پیش کش

۱۔ ندیم کی نظمیں (دو جلدیں)

احمد ندیم قاسمی کی اب تک کی تمام تر نظمیں

۲۔ ندیم کی غزلیں

احمد ندیم قاسمی کی اب تک کی کہی ہوئی ساری غزلیں ایک ساتھ

۳۔ افسانے

احمد ندیم قاسمی کے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے

۴۔ احمد ندیم قاسمی (شاعر اور افسانہ نگار)

اردو کے نامور نقاد پروفیسر فتح محمد ملک کی خصوصی تصنیف